خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

اپریل 2017

نگران اعلیٰ
معراج رسول



سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

انشائیہ 07
جون ایلیا

طرزِ زندگی اور اندازِ فکر پر
ایک صاحب نظر کا نوحہ

آپ کے خط 08
مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

کافر نعمت 16
ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

معما 55
تنویر ریاض

"بدنام جو ہوں گے تو کیا نام
نہ ہوگا" کی مکمل تفسیر

شیش محل 66
اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف طرح طرح رنگ
بدلتی واردات، سی کی عکاس دلچسپ داستان

کرشمہ 101
سلیم انور

ایسی خواہش کا احوال جو ایک دیوی
کے روپ میں پوری ہونے والی تھی

شاہکار 109
مہتاب خان

درد و اذیت کے تاثرات ابھارنے
والے ایک سنگدل مصور کا ماجرا

صلح جو 116
ملک صفدر حیات

پولیس کارروائی پر مشتمل ڈائری سے
ایک اور چونکانے والی واردات کا احوال

واپسی 145
شاکر لطیف

ابھرتے اعتبار [illegible] اور [illegible] سرد
تعلق کی عجب کہانی

جلد 47 • شمارہ 04 اپریل 2017 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون [illegible] 35802551 فیکس (021) 35865313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بظاہر 155
منظر امام
محبت کی ایک انوکھی روداد جس کا انجام ہر آنکھ کو اشکبار کر گیا

محفلِ شعر و سخن 160
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

سراب 163
علی اختر
گھمنڈ اور تکبر کی انتہا کو چھو لینے والے ایک بے ضمیر کا قصہ

باعثِ رحمت 177
اے ایچ آلانی
مغرب سے درآمد شدہ ایک ڈکیتی کا سنسنی خیز احوال

وقت 180
حسام بٹ
ایک عزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

قلمکار 217
امجد رئیس
ناکامیوں کی بھیڑ میں ایک تخلیق کار کی فتح کا قصہ

قطب الدین منورؒ 219
ضیاء تسنیم بلگرامی
کٹھن مراحل سے بے خوف و خطر گزرنے والے ایک نیک انسان کا ماجرا

ٹوٹے ہوئے لوگ 233
ڈاکٹر شیر شاہ سید
گھر، خاندان، اور دلوں کے ٹوٹنے کا دلخراش ماجرا

جواز 238
نعمان اسحاق
معمولی جواز گری کے یقین اور بھرکے آسمان کوزہ میں بند کرنے والے ایک دغاباز کی داستان

پبلشر و پروپرائٹر: دیشان رسول، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور، C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

"حاصل کلام۔ 1"

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں نازیت، فسطائیت اور غلبہ خواہی نے جوز میں گیر تباہی مچائی تھی۔ اس کی دہشت ناکی کے زیرِ اثر عالمی دائرے میں زندگی پسندی، امن طلبی، انسانیت پرستی اور عوام دوستی کا ایک پُر احساس رجحان پیدا ہوا تھا، وہ اس کے بعد بھی چند دہوں تک جاری رہا۔

اس رجحان کے سبب ساری مہذب دنیا میں ایک فرخندہ اور فرنام ادب وجود میں آیا جو شائستگی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ زندگی پسندی، امن طلبی، انسانیت پرستی اور عوام دوستی کو اس ادب کے سرچشمے کی جاوداں جاوید حیثیت حاصل ہے۔

اسی دور میں "عالمی معاشرے" کے مثالی تصور نے ایک جاں افروز اور دل انگیز فروغ پایا اور انسانی دانش نے اپنی تاریخ اور تقویم میں جو انسانیت پرور خواب دیکھے تھے، وہ خواب تعبیر نصیب ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

پر ہے یوں کہ زمانہ ابنِ آدم کے حق میں کم ہی مہربان ثابت ہوا ہے۔ ابنِ آدم (بلکہ اس موقع پر انسان کا لفظ استعمال کیا جانا چاہیے) کی معلوم تاریخ اور معلوم تاریخ سے پہلے دراز ترین دور انسان کے لیے بے حد ہمت آزما اور جاں فرسا رہا مگر روحِ انسانی نے "فطرت، دیوی دیوتاؤں" اور خود انسانیت دشمن انسانوں کے جبر سے کبھی ہار نہیں مانی۔ یہاں میں اپنی نظریاتی احتیاط پسندی کی رعایت رکھتے ہوئے یہ بات بھی کہہ دوں کہ روحِ انسانی کا فطرت "دیوی دیوتاؤں" اور خود انسانیت دشمن انسانوں کے جبر سے ہار نہ ماننا بھی روحِ انسانی کے وجود کا ایک جبر تھا اور جبر شاید آئندہ بھی کارفرما رہے گا۔

میں دوسری جنگِ عظیم اور اس کے چند دہوں کے بعد تک کی بات کر رہا تھا۔ اب جو بات کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری، نسل نوازی اور عقیدہ پرستی اس دور میں بھی پوری طرح نچلی نہیں بیٹھی تھیں۔ ہاں، ان کے کھل کھیلنے میں بہت کمی آگئی تھی اور یہ امر ناگزیر تھا مگر اس دور کے بعد سرمایہ داری نے اپنے مددگار تاریخی رویوں کے ساتھ پھر کھل کھیلنا شروع کر دیا اور یہ انسانیت سوز عالمی ناٹک اس وقت تک، اس لمحے تک اپنے اداکاروں کی ماہرانہ ہنرمندی کے ساتھ جاری ہے۔

اس عہد کی نئی نسل میں جو خوف ناک برافروختگی، مدہش برہمی، سنگین ترین دہشت گردی، بے حد مہیب ہلاکت پسندی اور انتہائی شرم آور اقدار شکنی پائی جاتی ہے، وہ کسی شوق اور اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس عہد کی غلبہ یاب سیاسی اور سماجی بے تدبیری اور مجرمانہ سوچ کا اندوختہ ہے۔

پہلے سے کہیں زیادہ پُرپیچ اور پُرفن سرمایہ دارانہ تصورِ حیات، انسانی تاریخ کے شریفانہ مثالیوں اور خوابوں کو زہر ہلاہل پلانے پر تلا ہوا ہے۔ سقراط کو "شوکران" کا قرابہ پلایا گیا تھا اور اس عہد کی نئی نسل کے حلق میں نسلی، قومی "تہذیبی" اور مذہبی ہلاکت آگینی انڈیلی جا رہی ہے۔

برادرِ عزیز معراج رسول جو عالمی اور خاص طور پر مقامی گرد و پیش کی سیاسی اور سماجی بست و شکست کے بارے میں ایک وقت طلب تجزیے اور تحلیل سے شغف رکھتے ہیں، اپنی محبت کی وجہ سے میری اس بات کی تائید نہیں کریں گے کہ میری نگارش میرے علم اور میرے تازہ ترین مطالعے کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ میری شاعرانہ اور تخیلاتی اٹکل کی زائیدہ ہوتی ہے۔ یہ ایک ذاتی یا شعبہ جاتی بات ہے کہ میں اپنی اس شاعرانہ اٹکل کو ایک الوہی اٹکل سمجھتا ہوں۔

بہر حال معراج رسول میری اس بات کی تائید کریں یا نہ کریں، حقیقت یہی ہے کہ میری قلم فرسائی کا سارا کھیل میری اٹکل کا تشریح ناپذیر کھیل ہے۔ سو میری اٹکل یہ کہتی ہے کہ پاکستان کی نئی نسل احساس کے جس ابتلا سے گزر رہی ہے، اس پر نئی نسل کی عالمی برادری کی ذہنی کیفیت سے جدا کر کے کوئی فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ فیصلہ کوئی فیصلہ نہ ہوگا بلکہ محض ایک مدعیانہ فتوا ہوگا۔

☆☆☆

ایک خط

عزیزانِ من!

اَلسلام علیکم!

اپریل 2017ء کا شمارہ آپ کے ذوق کی تسکین لیے حاضر ہے۔ یوں تو سال کا ہر مہینا کسی نہ کسی خاص بات یا خاصیت سے منسوب ہے۔ لیکن مارچ اور اپریل میں بہار جس طرح اپنے جوبن پر آتی ہے اس سے دل خوش ہو جاتا ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے نظام میں کم از کم سال میں ایک بار تو بہار کا موسم آجاتا ہے لیکن زمین پر...... انسانوں کے لیے بنائے ہوئے اس نظام میں سارا سال حبس کا موسم چھایا رہتا ہے۔ ایک ریسرچ کے مطابق اگر ارد گرد کا ماحول خوشگوار ہو تو دل و دماغ بھی خوشگواریت محسوس کرتے ہیں اور نتیجے میں بے زاری، چڑچڑا پن اور غصیلے جذبات آپ ہی سرد پڑ جاتے ہیں...... لیکن اس خوشگواریت میں خوبصورتی کے علاوہ حالات کا سازگار ہونا بھی بے حد ضروری ہے مگر...... یہاں اس باریک بینی کو اہمیت نہیں دی جاتی...... ورنہ دہشت گردی، بم دھماکے اور لوٹ مار کا بازار پھر سے گرم نہ ہوتا۔ قیمتی جانوں کے زیاں نے دل کو ایک بار پھر خوفزدہ اور افسردہ کر دیا ہے۔ گویا ایک مختصر وقفے کے بعد دہشت گردوں کے حوصلے پھر سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جس سے ہماری روزمرہ زندگی انتہائی غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ عارضی اور وقتی نوعیت کے اقدامات نہ تو ماحول کو بدل سکتے ہیں اور نہ ہی حقائق اور واقعات کو۔ غیر سنجیدہ طرزِ عمل سیاست، ملک اور قوم کے مفاد میں ہرگز مثبت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس جن پر قابو پانے کے لیے سول اور فوجی قیادت کا اشتراک بے حد ضروری ہے...... ورنہ عمومی طور پر دلوں میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا ہے کہ شاید اصول، قانون اور رواداری کی جگہ اب بے زاری، مکاری اور بے کاری نے لے لی ہے۔ لہٰذا بے روزگاری کے ہاتھوں لاکھوں خالی ذہن شیطان کے کارخانے بن چکے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق چین میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا سب سے بڑا ہدف سمجھا جاتا ہے اور ایک موقع پر وہاں کے قومی و ترقی و اصلاحات کمیشن کے سربراہ ہی لی فینگ نے یہ بہت واضح الفاظ میں کہا بھی ہے کہ ”ہمارا تجربہ ہے کہ مجموعی قومی پیداوار میں ایک پوائنٹ کے اضافے سے روزگار کے 17 لاکھ مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسے حاصل کرنا ہمارا مقصد ہے۔“ کاش ایسا شعور اور خلوص ہمارے بااختیار طبقے کی میراث بھی ہوتا تو شاید آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا اور نہ ہی مجرمانہ ذہنوں کی یوں آبیاری آسان ہوتی...... بہرکیف ہر حال میں اچھے کی امید رکھنی چاہیے...... ہم نہ سہی آنے والی نسل ہی سہی، ممکن ہے کچھ اچھے حالات اور ماحول میں زندگی گزار لیں...... اچھی امیدوں کے سہارے اب ہمیں بھی اپنی اس محفل کا رخ کرنا چاہیے جہاں بہت سے پُرخلوص دوست ہمارا رستہ دیکھ رہے ہیں۔

⊠ طاہرہ گلزار، پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ”ہر مہینے کی طرح اس بار بھی ڈاک خانے والوں نے اور ادارے والوں نے میرے خط کے ساتھ وہ سلوک کیا جو امریکا انڈیا کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کر رہا ہے۔ (ہاہاہا...... ایسا بالکل نہیں ہے جناب)۔ اپنا سویٹ سویٹ جانِ محبوب سسپنس آج 17 فروری کو دن کے 4 بجے ملا۔ ہاتھوں میں لے کر ایسے چوما جیسے میں اپنے تین ماہ کے بھتیجے مصطفیٰ عطاء کو چومتی ہوں پیار سے۔ میرے کالج کے دوست سب مجھے سسپنس، جاسوسی کی دیوانی کہتے ہیں۔ بس کرو اس عمر میں بھی ان کتابوں کو نہیں چھوڑتیں تو میں ہنس کے کہتی ہوں کوئی اپنے محبوب اپنے بیسٹ فرینڈز کو کیسے چھوڑ سکتا ہے، چاہے میری عمر سو سال بھی ہو جائے۔ (آپ کی محبتوں کا بے حد شکریہ)۔ خیر ٹائٹل گرل بھی میری طرف حیرانگی سے دیکھ کے کہنے لگی، ہائے باجی اس بار بھی آپ کا خط غائب ہے۔ میں نے بھی کہا جاجا۔ اگلی بار میں پھر حاضر ہوں گی۔ انشائیہ میں آج پھر جون ایلیا صاحب ہمارے ذہنوں میں لفظوں کے تیر مار کے ہمارے سوئے ہوئے بے دم شریروں کو جگا رہے تھے۔ ہمیں نفرت، حسد، کینہ اور ایک دوسرے کو برباد کرنے سے روک رہے تھے اور محبت، سچائی، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ چلتی ہوں دوستوں کی محفل میں، دیکھتی ہوں کس کس نے مجھے یاد رکھا ہے واہ پہلے نمبر پر میری سویٹ سسٹر اور رضوان سلطان تنولی کی بیلو آئی ہے، سویٹ ہارٹ مبارکاں مبارکاں۔ ویلکم بیلو جی! طاہرہ دوستوں کی دوست ہے۔ تبصرہ بہت ہی جامع، شاندار اور پیار بھرا تھا۔ دوسرے نمبر پر زرین آفریدی بینش صدیقی میرے بارے میں زہر اگلتی نظر آئیں۔ رمضان پاشا بھائی بھی زبردست تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ بھائی دوستوں کی تھوڑی سی تعریف بھی کر لیا کرو۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ شکر ہے کہ میرا چھوٹا سا بھائی غلام یٰسین نوناری بھی اپنا جاندار تبصرہ لے کر حاضر تھا۔ یٰسین میری التجا پر آنے کا شکریہ۔ میرا خط چاہے 10 مرلے کا ہو یا 20 مرلے کا، یہ میری سسپنس سے محبت کی مثال ہے۔ یہ سال ہمارے خاندان کے لیے دشمن نکلا۔ 15 دنوں کے اندر اندر ایک چچی، ایک چچا اور

ان کی سگی بہن یعنی میری پھوپھی فوت ہو گئیں، کچھ عرصہ خود بہت بیمار رہی۔ (اوہ...... اللہ آپ کو صحت دے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں)۔ اشفاق شاہین بھی بہت زبردست تبصرہ لے کر حاضر ہوئے۔ اللہ آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا کرے۔ آمین۔ پائندہ خان بھی پاکستان زندہ باد کی تشہیر کرنے والے نام کے ساتھ حاضر۔ تبصرہ بہت ہی جاندار اور جامع رہا۔ سسپنس کے تمام تبصرہ نگار ایک خاندان کی طرح ہیں۔ کہانیوں میں پہلے شیش محل پڑھنا شروع کی۔ جب ختم شد دیکھا تو ہوش آیا۔ فاروق نے رمیش کے ساتھ بہت اچھا کیا۔ فاروق، کیتھرائن، وجے، گولو اور بجو کے ساتھ۔ فاروق اب انتقام کی راہ پر گامزن، اسد اللہ کو بھائی کے ساتھ پھوپی اور جولیٹ کے زندہ ہونے کی خوشی۔ صد افسوس جانی جیسا بہادر بھی جان سے گیا۔ معلوم نہیں اب جولیٹ کس حال میں پاکستان پہنچے گی۔ ثمر عباس کی مختصر تحریر بے خبری سر پر سے گزر گئی...... آخر کار ماروی اختتام کو پہنچ گئی۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ جو ذی روح دنیا میں آیا ہے اس نے اپنے خالق کے پاس واپس بھی جانا ہے۔ آخر مراد کتنا بھی طاقتور صحیح ہے تو وہی مٹی کا پتلا، جانا اس کو بھی پڑا۔ نواب انکل کی یاد بہت آئی۔ منظر امام انکل دردمند جیسی انمول تحریر لے کر آئے۔ ڈاکٹر ہمارے معاشرے کا بہت حساس دل رکھنے والا طبقہ ہے۔ بے شک کچھ کالی بھیڑیں ان کے اندر بھی ہوں گی۔ ماشاء اللہ میری ایک بہن اور دو بھائی ڈاکٹر ہیں۔ منظر امام انکل سے بہت گلہ ہے کہ سسپنس کے لیے شروع کے صفحات اور آخری صفحات کے لیے نہیں لکھتے، پلیز لکھیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر معما انسانی رشتوں کی عکاس کہانی۔ اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے، لالہ اگر سودا گر تھا تو ساتھ ہی انسان بھی تو ہے۔ کافی عرصے کے بعد نشور ہادی کی اتنی شاندار تحریر منقسم عورت پڑھی۔ رفعت، شفیق، مشکور اور خاص کر طارق جیسے کردار صرف تحریروں میں ہی ملتے ہیں۔ نہ تو رفعت جیسی طلاق شدہ عورت کو شفیق جیسا لڑکا ملتا ہے اور نہ طارق جیسا کوئی اتنا اچھا شوہر کہ بیوی کو ایسی خوشیاں دے۔ اس کے باوجود بھی تحریر بہت دلچسپ رہی...... اس بار ضیا تسنیم بلگرامی شیخ بدرالدین اسحاق پر تحریر لائیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تعریف سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یہ تو سسپنس کا ہی ہم سب پر احسانِ عظیم ہے کہ ہمیں اسلامی موضوع پر ایسی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جس سے دل و دماغ منور ہو جاتا ہے۔ اس بار پھر مرزا امجد بیگ ایک منفرد اور دلچسپ کیس کے ساتھ حاضر۔ اس کیس میں 1986ء کے ذکر سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بیگ صاحب کی عمر کم از کم اب 70 کے قریب ہو گئی۔ سلیم انور ایک بار پھر ایک نئے اندازِ تحریر موروثی ٹیکلس کے ساتھ حاضر۔ اچھی تحریر ہے۔ نصرت شاہنواز کی تحریر حیرت کدہ مجھے تو بہت پسند آئی زبردست کہانی ہے۔ واقعی انسان کتنا بے حس بھی ہے، ایک کتے کے لیے کتنا کچھ خرچ کیا۔ عبداللہ نے اچھا کیا...... باقی اشعار اور کترنیں بہت زبردست اور معیاری تھیں۔ (آپ کی نوازشوں کا بے حد شکریہ)۔"

✠ ساگر تلوکر، چشمہ بیراج میانوالی سے حاضرِ محفل ہیں۔ "سسپنس میں پہلی پہلی حاضری ہے۔ سواگت تو بنتا ہے۔ (بے شک...... بھئی خوش آمدید)۔ ٹائٹل گرل عام سی تھی۔ کوئی خاص تاثر قائم نہ کر پائی۔ جون ایلیا ہمیشہ کی طرح موتی بکھیر رہے تھے۔ ان سے موتیوں کی مالا لی۔ واقعی فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے۔ اسی میں ہماری کامیابی اور نجات ہے۔ پیارے سے لوگوں کی خوبصورت سی محفل میں داخل ہوئے۔ ابتدائیہ سے سو فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ محفل میں بھی دوستوں سے ہیلو ہائے کی۔ عمر جادواں کی تلاش بہت عمدہ تحریر تھی۔ شیخ بدرالدین اسحاق کے ایمان افروز واقعات سے دل کو منور کیا۔ حسام بٹ کی لاتوں کے بھوت اچھی کہانی تھی۔ پھر شیش محل میں داخل ہوئے جہاں فاروق سراپا انتقام بنا ہوا ہے۔ رمیش، بھابیہ سیٹھ، فیکا اور مجودادا کو بغیر کسی مشکل کے پھڑکا دیا۔ فاروق کا انگلیاں کاٹنا ٹھیک نہیں لگ رہا۔ گردن کاٹنی چاہیے۔ ربن کے جنازے کے مناظر بہت اذیت ناک لگے۔ یوں لگا جیسے کوئی اپنا قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو۔ جولیٹ ابھی تک ناکام اور پریشان پھر رہی ہے۔ پاکستان بن گیا، بہت خوش ہوئی۔ معما ممتا سے لبریز کہانی بہت اچھی لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ منفرد کہانی لاتے ہیں۔ دردمند ڈاکٹر زبیری کی دردمندی نے بہت متاثر کیا۔ کاش ایسے نرم دل ڈاکٹرز ہمارے اسپتالوں میں بھی ہوتے۔ اب تو ڈاکٹر اور ڈاکو میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ منقسم عورت سسپنس سے بھرپور کہانی تھی۔ ڈاکٹر شی کا کردار پر اسراریت میں ڈوبا ہوا تھا۔ طارق کی قربانی نے دل جیت لیا۔"

✠ اشفاق شاہین، لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "اس بار بھی ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ سرورق کچھ خاص نہ تھا، سو پسند نہیں آیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیں جھنجوڑنے کے لیے کافی تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں بلقیس خان کرسیِ صدارت پر بہترین خط کے ساتھ موجود تھیں۔ زرین بینش کا مشترکہ خط بھی زبردست رہا۔ باقی تمام احباب کے خطوط بھی اس بار خوب اور تبصرے سے بھرپور تھے۔ حسبِ معمول سب سے پہلے شیش محل میں پہنچے۔ نواب اسد اللہ ہنوز تلاش میں ہیں جو سانحے سے بچ گئے، فاروق کا انتقام عروج پر ہے جو کہ متوقع بھی تھا، ٹیمپو کافی تیز ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کہانی اب اختتام کی طرف گامزن ہے۔ ماروی کا اختتام بھی ہو گیا۔ اب نئی ہنگامہ خیز تحریر "وقت" کب سے آرہی ہے۔ آخری صفحات کی کہانی "منقسم عورت" نشور ہادی کی بہترین تحریر تھی۔ یہ مینا نزم کا نچ تھا۔ اتار چڑھاؤ بھی خوب رہا اور بہر حال اینڈ بھی عمدہ رہا اور ثابت ہوا کہ قربانی صرف عورت ہی نہیں، مرد بھی دے سکتا ہے۔ ضیاء تسنیم بلگرامی نے شیخ بدرالدین اسحاق کے حالاتِ زندگی سے ہمیں منور کیا۔ "لاتوں کے بھوت" مرزا امجد بیگ ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر کے ساتھ رونق بکھیرتے نظر آئے۔ مختصر کہانیوں میں بابر نعیم کی احساسِ جرم بہت

پسند آئی۔ محفلِ شعر و سخن میں انتخاب بھی لاجواب رہا، خصوصاً عماد وسیم، سید عبادت کاظمی، غلام یٰسین نوناری اور مدحت کا انتخاب بہترین تھا۔''

✻ زرین آفریدی، بینش صدیقی، حیدرآباد، سے شاملِ محفل ہیں۔ ''ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ مارچ 2017ء...... 15 فروری کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ خوبصورت رنگوں سے مزین ٹائٹل نظروں کو بھا گیا۔ گرل کی آنکھوں میں خوش رنگ ادائیں اور اپنے محبوب کا تصور ہے۔ کافی دنوں بعد اتنا حسین سرورق دیکھنے کو ملا۔ ویلڈن ذاکر صاحب۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی کا نعرہ، واقعی وقت کا تقاضا ہے۔ اے کاش اس نعرے پر عمل ہو جائے۔ ہم پاکستانی عوام کی بے بسی اور بے کسی دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ حالیہ بم بلاسٹ میں دل خراش مناظر دیکھ کر زندگی سے مایوسی ہونے لگی۔ ہم پاکستانی اتنے مجبور و بے حال کیوں ہیں؟ پاکستان کا حصول جن مقاصد پر ہوا تھا، وہ آج بھی حاصل نہ ہو سکے۔ پھر مسلم دشمن عناصر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ رب کریم ہم پاکستانیوں اور مسلم امہ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے تو بلقیس خان کو کرسیٔ صدارت پر پایا۔ تبصرہ اچھا تھا، مبارک باد۔ اللہ سائیں ان کی والدہ کو کلی شفا عطا فرمائے۔ وزارت پر آفریدی اور صدیقی قابض رہے۔ خوشی سے بتیسی باہر نکل آئی۔ شکریہ اسٹاف سسپنس۔ اپنے تبصرے ڈائجسٹ کے اوراق پر خود پڑھنا بہت لطف دیتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے کہ اتنی اچھی ورڈنگ کر لی۔ (بہت خوب...... اپنے منہ میاں مٹھو......) رمضان پاشا سر ہماری وزارت کیسی لگی بتایئے گا ضرور۔ بابر عباس بھائی، صدارت ایک ماہ کی ہو یا پانچ سال کی یہ ایک اعزاز حوصلہ افزائی اور ہمت بڑھانے کی وجہ ہے۔ یٰسین نوناری صاحب نے کستوری کو یاد کیا اور ان کے دس مرلے کا خط والے الفاظ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ اشفاق شاہین سر! اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا صدمہ نہ لیا کریں۔ محمد صفدر معاویہ صاحب بھی کھلے ہاتھ کے مالک ہیں، بہاتت مرلے کا خط وہ بھی لکھ لیتے ہیں۔ ناہید یوسف اسلام آباد سے ماروی کی پرستار نکلیں، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ آپ نے آتے ہی ماروی ختم کروا دی۔ باقی سب نے، پرانے تبصرہ نگاروں نے اچھے تبصرے پیش کیے۔ عمر جاوداں کی تلاش، الیاس سیتاپوری (دی گریٹ، مین) ویلڈن سر جی۔ قراقرم، جمیل بیکال اور منگول، ہمارا موسٹ فیورٹ ٹاپک، بہت بہت انجوائے کرتے ہیں۔ کیغا تو خان ایک بہترین منگول کردار۔ رفعیہ اور تہمینہ نے اپنے دادا کا بدلہ لیا، ہندو وید نے اپنی اصلیت دکھائی۔ ارغون نے عمر جاوداں کی تلاش میں زندگی گنوا دی۔ زبردست۔ شیش محل میں اسما قادری جی نے پھر کمال کر دیا۔ فاروق پکا دادا بن گیا چن چن کر دشمنوں سے بدلے لے رہا ہے۔ آگے لگتا ہے یہ داستان کراچی پاکستان کے ماحول میں چلے گی۔ مرزا امجد بیگ کا سامنا اس بار لاتوں کے بھوت سے ہوا۔ جہاں آرا جیسے لوگ کیسے اتنی ہمت کر لیتے ہیں۔ اوپن فراڈ، دھوکا، پھر مرزا صاحب نے ان بھوتوں کا بھرکس بھی نکال دیا۔ ثمر عباس صاحب کی بے خبری بھی اچھی رہی۔ دردمند، منظر امام کی ہارٹ ٹچنگ اسٹوری تھی۔ ظاہری اور باطنی نظر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ لوگ ڈاکٹر زبیری کو گالیاں دے رہے تھے، وہ فرشتۂ زندگی بن کر آیا۔ اپنا دکھ ایک طرف رکھ کر۔ شیخ بدرالدین اسحاق کے روح پرور حالاتِ زندگی پڑھ کر دلی سکون ملا۔ سلامتی ہو بلگرامی صاحب۔ سلیم انور کی موروثی نیکلس بھی خوب رہی۔ ایلکس نے نیکلس چرانا چاہا، لیکن اسپاٹنگ کی صورت میں چور کو ل گئے مور۔ ماروی آخرکار اختتام پذیر ہوئی اور اختتام بھی ابھارا رہا، کہیں تشنگی نہیں رہی۔ اب شاید وقت کا آغاز ہوگا۔ شیر شاہ سید صاحب، ہمیشہ حقیقت کے قریب اور دل لگتی کہانی لاتے ہیں، معما واقعی معما تھی۔ ہم ہر چیز پیسوں سے خرید سکتے ہیں مگر اولاد نہیں۔ لالہ جیسے بندے بھی دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں جو پیسے اور کامران کو واپس کر گئے۔ منتقم عورت اور نشور ہادی، مصنف اس بار ہمیں متاثر نہ کر سکے۔ یہ کیا اسٹوری تھی کہ کان دائیں ہاتھ سے پکڑ دیا یا بائیں ہاتھ سے، ایک ہی بات ہے۔ معذرت صاحب۔ محفلِ شعر و سخن میں تینوں اعزازی اشعار واقعی لاجواب تھے۔ بلکہ پوری محفل بھرپور اعلیٰ ذوق ثابت ہوئی۔ مراسلے کی کیا بات ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک...... آخر میں ایک گزارش ہے کہ ہر ماہ ایک پُرمزاح اسٹوری ضرور دیا کریں۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے جناب)۔''

✻ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے حاضر ہوئے ہیں۔ ''میں پچھلے ماہ دوستوں کی محفل میں شرکت نہ کر سکا۔ خاندان کی 3 بزرگ ہستیاں دنیا چھوڑ گئیں۔ بڑا رنجیدہ وقت گزرا (اللہ آپ کو ہمت اور صبر دے)۔ ایلیا جی قلم نہیں نشتر استعمال کرتے ہیں۔ زندہ لوگ تڑپ اٹھتے ہیں۔ مُردہ لوگوں کو کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک جملہ کتنا بھاری ہے۔ ''جن باتوں سے زندگی میں زندہ دلی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ باتیں خواب ہو کر رہ گئی ہیں۔'' ایک یہودی مفکر نے لکھا ہے کہ جو لوگ مذہب کے نام پر خون خرابا کرتے ہیں، دراصل انہیں اپنے مذہب پر یقین نہیں ہوتا۔ خطوط کی محفل میں بلقیس خان کو کرسیٔ صدارت پر مبارک باد۔ زرین آفریدی، رمضان پاشا بڑا مختصر لکھنے والے بھی اس دفعہ تھوڑا زیادہ وقت دے دیا۔ ستاروں کی محفل میں کوئی کم چمکتا ہے تو کسی کی روشنی تیز ہوتی ہے۔ عمر جاوداں کی تلاش: الیاس سیتاپوری کہاں سے اتنی قدیم تہذیبوں کو انتہائی عمدہ پیرائے میں لکھتے ہیں کہ اس کا مزہ ہی کرارا ہوتا ہے۔ بے نقاب: ایک اچھی کہانی۔ ایک لڑکی کی فرض شناسی اور ذہانت نے ایک اسکینڈل کو بے نقاب کر دیا۔ شیش محل: ایک لاجواب لکھاری کی قسط ہر مرتبہ دل دھڑکا دیتی ہے۔ مختلف کہانیوں کو یکجا کرنا۔ ربن دادا کی موت نے بڑا دل گرفتہ کیا۔ بہادری، عظمت، محبت کو انتہا تک پہنچا کر مصنف جانے آگے قیامت سے گزاریں گی۔ فاروق کا انتقامی کارروائی پر آنا کہانی کو ایک نئے ٹریک پر لے آیا۔ مصنفہ کا کمال ہے قسط ختم ہوتی ہے تو تشنگی اور بڑھ جاتی ہے۔ لاتوں کے بھوت: سسپنس کی لاجواب ترین قسط یا

کہانی۔ انتہائی بامقصد۔ شعلہ صفت کارنامے۔ ایسا وکیل جو انسان دوست ہے قدم قدم پر بے قصوروں کا ہمدم۔ ناممکن حالات کو اپنے بس میں کرنا اور اصل مجرم کو الٹا لٹکانا، اس کہانی میں ایک مجبور عورت جو انتہائی مکار اور مکروہ رشتے دار کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔ اس پر ظلم یہ کہ کوئی قانونی دستاویز یا ثبوت بھی نہیں لیکن واہ...... وکیل صاحب کی چابکدستی اور ذہانت، وہ مجرم کو عبرت کا نشان بنا دیتے ہیں۔ بے خبری: ایک مختصر کہانی...... ایک عجیب وغریب غلطی یا بے وقوفی۔ بہرحال برا وقت آئے تو عقل بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن غلطی کی جلد ہی اصلاح ہوگئی اور ایک بے قصور پر سے مصیبت ٹل گئی۔ محفل شعروسخن: اس دفعہ جن اشعار کو شامل کیا گیا، وہ شاید پہلے نہ پڑھے ہوں۔ جن کے اشعار نے دل پر گہرا اثر چھوڑا وہ ہیں عنبرین احمد، ظفر عباس زیدی، جنید ملک، ظفر اقبال ظفر، رمضان پاشا، وزیر محمد خان لیکن سارے ہی تعریف کے قابل۔ حیرت کدہ: جرم وسزا کی کہانی جو ایک کتے کی موت یا قتل سے شروع ہوئی۔ بڑی بھاگ دوڑ رہی لیکن قدرتی طور پر بیچارے سراغ رساں کو سراغ ہاتھ لگ ہی گیا۔ ماروی: انتہائی طویل کہانی آخر انجام کو پہنچی۔ اب آپ کونسی سلسلہ وار کہانی پیش کرنے والے ہیں۔ (آپ اپریل کے شمارے میں پڑھ لیجیے نئی کہانی) منقسم عورت: نشور ہادی اچھے لکھاری ہیں۔ یہ ایک بہترین کہانی، ہر قدم پر وفاشعاری، محبت، برداشت اور قربانی، اس ماہ کی شاہکار کہانی۔ آخری کہانیاں یوں بھی بڑی عمدہ ہوتی ہیں لیکن اس کہانی میں زیادہ دلچسپی تھی۔“

✽ محمد شہباز ناز، گجر کالونی سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”بڑی خوشی ہوئی اپنے خط کے ساتھ لطیفہ اور شعر بھی شائع دیکھ کر، بہت شکریہ جناب۔ ٹائٹل گرل سبز کپڑے، کھلے بال، مسکراتا چہرہ لیے اپنے محبوب کو ویلکم کر رہی تھی۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ جس میں خودکشی تفرقہ بازی کے بارے میں بتایا گیا۔ سب سے پہلے نصرت شاہ نواز کی کہانی حیرت کدہ پڑھی اور پڑھ کر واقعی حیرت ہوئی کہ جب بندے کے پاس پیسا آجاتا ہے تو وہ بہت ہی مغرور بن جاتا ہے۔ وہ عام لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے حالانکہ وہ بھی انسان ہیں۔ اس طرح ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔ ملازموں کا پورا خیال رکھا جائے۔ ایک سبق آموز کہانی تھی۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی کہانی لاتوں کے بھوت پڑھی۔ بیگ صاحب نے بڑی چالاکی کے ساتھ جہاں آرا اور اس کے شوہر ماجد سے اپنی فیس بھی لے لی اور مقدمہ بھی ان کے خلاف لڑا۔ واہ بیگ صاحب۔ اس کے بعد ثمر عباس کی کہانی بے خبری پڑھی۔ اس بار ثمر عباس صاحب غیر ملکی کہانی لے کر آئے، اچھی تحریر تھی۔ اپنی پسندیدہ کہانی شیش محل پڑھی۔ اسماء قادری صاحبہ آپ نے اصل کردار کو ہٹا کر زیادتی کی (چلو کوئی گل نہیں) اب ربن دادا کا کردار محب اللہ عرف فاروق ادا کر رہا ہے۔ بیسٹ کہانی تھی۔ بابر نعیم صاحب کی کہانی احساسِ جرم پڑھی۔ ایک سمجھ نہ آنے والی تحریر تھی۔ منظر امام صاحب کی کہانی دردمند پڑھی، عمدہ تحریر تھی۔ الیاس سیتاپوری کی کہانی عمر جاوداں کی تلاش پڑھی، ہمیشہ کی طرح پہلے نمبر پر آنے والی تحریر تھی۔ سیما کمال کی کہانی پڑھی، پرچھائیاں تین جنم لیے وہ بھی اس دور میں ناممکن۔ ماروی کی آخری قسط بہت شاندار تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد وشاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔“

✽ دوست محمد چارسدہ روڈ، پشاور سے شاملِ محفل ہیں۔ ”18 تاریخ کو مارچ کا شمارہ ملا۔ کسی کو ہو یا نہ ہو لیکن سسپنس ڈائجسٹ ہمیں جتنا عزیز ہے شاید کہ کسی کو ہو۔ (بہت خوب) سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی۔ بڑی خوبصورت غزالی آنکھوں اور لہراتے بالوں کے ساتھ حسینہ اتنے غور سے پتا نہیں کس کی باتیں سن رہی ہے۔ یہ ذاکر انکل کا کمال ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ گزرے مہینے میں اپنا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر دل بڑا اداس ہوا اور وہی چند مخصوص نام تھے جن کو جگہ ملتی ہے۔ (یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ بروقت ملنے والے خطوط محفل کی زینت ضرور بنتے ہیں)۔ جون ایلیا صاحب نے بڑی اچھی باتیں کی ہیں۔ کاش ہم سب مسلمان ایک ہو جائیں۔ سب سے پہلے دی کنگ آف دی ہسٹری جناب الیاس سیتاپوری صاحب کی عمر جاوداں کی تلاش پڑھی۔ ارغون کی جاہلیت پر بڑی ہنسی آئی۔ جو اپنی عمر بڑھانے کی فکر میں تھا مگر اس کا انجام بہت برا تھا اور شاعر کی یہ بات کہ سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔ تنویر ریاض کی بے نقاب گزارے لائق تھی۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی لاتوں کے بھوت پڑھی۔ اس دفعہ اتنا مزہ نہیں آیا۔ ثمر عباس صاحب کی بے خبری اچھی اسٹوری تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں ثمر عباس صاحب کا فین ہوں۔ حیرت کدہ نصرت شاہنواز کی سبق آموز کہانی جس میں عبداللہ نے ٹھیک کہا کہ انسان کو انسان سمجھنا چاہیے۔ ہمارے اردگرد کتنے بھوکے ہیں مگر وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ دردمند منظر امام صاحب کی اچھی کہانی۔ منظر صاحب ہمیشہ مختلف موضوعات پیش کرتے ہیں۔ فرید کو پتا لگ گیا کہ ہمیشہ طاقت اور دولت سے سب کچھ نہیں ہوتا۔ کاش ہمارے ڈاکٹر حضرات ڈاکٹر زبیری جیسے فرض شناس ہو جائیں۔ شیخ بدرالدین اسحاق ضیاء، تسنیم بلگرامی کی ایک اور کاوش۔ اولیاء کے واقعات پڑھ کر دل میں ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی معما میں ایک بے اولاد جوڑے کی کہانی .... اللہ سب بے اولاد جوڑوں کو اولاد سے نوازے۔ (آمین)۔ منقسم عورت ہمارے فیورٹ مصنف جناب نشور ہادی صاحب کی بہترین کہانی۔ طارق نے جس طرح قربانی دی، شاید کوئی اور دے سکے۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ وہ ڈاکٹر شی جیسی شیطان عورت سے بچ گیا۔ آخر میں کہانی بڑی اداس کردینے والی تھی لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ لسٹ میں بلقیس خان، زرین آفریدی، بینش صدیقی، سید عبادت کاظمی، محمد صفدر معاویہ، بابر عباس، فضل عباس اور عبدالجبار رومی انصاری کے خطوط پسند

آئے۔ محفلِ شعروسخن میں عماد وسیم، عنبرین احمد ظفر عباس زیدی، جنید احمد ملک، بشریٰ زیدی داؤد اشفاق کے شعر پسند آئے۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آخر میں...... ہماری خالہ وفات پا گئی ہیں ان کے لیے دعا کی درخواست۔ یہ 4 مہینوں میں دوسرا جھٹکا ہے جو ہم پر آیا ابھی ہم اپنی والدہ کی وفات کا سوگ منا رہے تھے کہ یہ بھی روٹھ گئیں۔ (اوہ! اللہ آپ کو صبر دے۔ ہمیں آپ کے غم کا احساس ہے)۔''

✠ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے چلے آرہے ہیں۔ ''مارچ کا سسپنس 17 فروری کو مل گیا۔ پشاور صدر سے جا کر خریدا اس دفعہ دل اتنا بوجھل ہے کہ کیا بتایا جائے۔ لاہور، پشاور، کوئٹہ اور سیہون شریف۔ لال شہباز قلندر کے مزار کو خون سے لال کر دیا۔ ظلم کی ایک حد ہوتی ہے لیکن ہمارے بے حس دشمن ہر قسم کی انسانیت سے گرے ہوئے ہیں اور درندوں کی جبلت رکھتے ہیں۔ ہو کیا رہا ہے پاکستان میں، سمجھ سے بالاتر ہے۔ دشمن لابی اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ ہم کہیں بھی اور کسی بھی وقت موت کے منہ میں جا سکتے ہیں۔ پاکستانی افواج بھرپور جواب بھی دے رہی ہے دشمن کو لیکن جب تک ہمارے ملک میں ان کے ہمدردوں اور سہولت کاروں کا خاتمہ نہیں کیا جاتا، تب تک یہ جنگ جیتنا مشکل ہے۔ یا باری تعالیٰ پاکستان کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دے۔ اسے ہر قسم کے دشمنوں سے محفوظ و مامون فرما کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے پاکستان کو قربان ہوتے ہی دیکھا ہے۔ شاید جون ایلیا نے ٹھیک کہا یہ ان ہی نعروں کا ثمر ہے شاید جو کہ دیواروں کی زینت بنے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ دراصل گندگی کی وجہ سے بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ ان لوگوں کا کیا جن لوگوں نے اے سی کار، اے سی دفتر اور اے سی والے گھر میں رہنا ہو۔ وہ بھی عوام کے خرچ پر چاہے سب کچھ برباد ہو جائے ان کو پروا نہیں۔ باقی ٹرمپ کا معاملہ تو میرے خیال میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی غلط پالیسیوں کو اس کی اپنی عوام نے مسترد کر دیا ہے۔ اپنی محفل میں بلقیس خان کو کرسی صدارت پر بہت عمدہ تبصرے کے ساتھ براجمان پایا۔ واقعی بیسٹ تبصرہ تھا۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی بیسٹ تھے۔ کہانیوں میں صرف ماروی اور شیش محل کی بابت ہی تبصرہ کر پاؤں گا کہ باقی دل نہیں کر رہا۔ ایک طبیعت کی خرابی اور دوسرا پاکستان کے حالات نے بے حال کر رکھا ہے۔ ایک بہترین اور لازوال تحریر ماروی آخرکار اختتام کو پہنچی۔ بہت ہی خوبصورت لکھی تھی۔ شیش محل کی بات کریں تو فاروق نے جہاں ربن دادا کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کا کام شروع کر دیا ہے وہیں کیتھی نے فاروق کو اس کے ساتھیوں سے ملا دیا۔ جولیٹ اپنے مشن کے لیے کراچی کی طرف گامزن ہے۔ اس کی خاطر جانی اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ اگلی قسط کا انتظار اب شدت سے ہے، باقی تمام شمارہ بھی بیسٹ رہا۔''

✠ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''مارچ کا سسپنس ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل حسینہ کی نشیلی آنکھوں میں ایک جادوگرنی والا جادو دیکھا تو ان آنکھوں میں کھو گیا۔ واہ ذاکر انکل کیا خوبصورت ٹائٹل ہے۔ مارچ کا سسپنس بہت زبردست لگا خط لکھنے کا ٹائم نہیں ملتا، کچھ ماہ بعد خط لکھ رہا ہوں۔ سسپنس ڈائجسٹ اس دور کا سب سے بہترین رسالہ ہے جس کا ہر ماہ بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے کہ جلد سے جلد سسپنس ہمارے ہاتھوں میں ہو جس کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے، اسی لیے تو اس دور میں سسپنس آج بھی بہت مقبول ہے اور ان شاء اللہ رہتی دنیا تک مقبول اور بلند رہے گا۔ ہم یہ دعا دل سے کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ کہانیوں میں شیش محل بہت زبردست اسٹوری ہے۔ اسما قادری بہت اچھا لکھتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی عمر دے اور نواب صاحب اور کاشف زبیر بہت اچھے رائٹر تھے۔ بہت کم ایسے رائٹر ملیں گے۔ ابھی سسپنس کی کچھ کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں بھی دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ آخر میں دعا کرتا ہوں اور آپ سب بھی مل کر دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کشمیر کے مسلمانوں کو آزادی نصیب کر دے۔ آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور ہمارے پیارے ملک پاکستان کی اللہ تعالیٰ ہر طرف سے ہر وقت حفاظت کرے اور اس ملک کو رہتی دنیا تک قائم اور دائم رکھے۔ آمین۔ (ہم سب آپ کی دعا میں شامل ہیں)۔''

✠ بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس گلیانہ روڈ کھاریاں سے شریکِ محفل ہیں۔ ''سر جی! سسپنس کا نیا شمارہ جو ماہ مارچ کی شکل میں تھا، سولہ فروری کو ملا اور کچھ اس طرح ملا کہ دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ ہلکا سا سانس لیا تو اردگرد برف سی جم گئی اور لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ سر جی بس اتنا ہی بہت ہے یا کچھ اور (بس بس...... اتنا ہی کافی ہے)۔ سرورق کی خوب صورت حسینہ کا تکلیف زدہ چہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سائڈ سے اس کے بال کوئی کھینچ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تکلیف میں ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سرورق زبردست کے قریب ایویں ہی تھا۔ جون ایلیا مرحوم خود تو دنیا سے چلے گئے مگر ہم کو دو مغزوں کے درمیان اپنی پُرمغز اور معیاری باتیں چھوڑ گئے جو نئے قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اس بار ایک ماہ کے لیے کرسیِ صدارت ملی ہے۔ بلقیس خان آپ کی والدہ کے لیے ربِ کریم کے حضور دعا گو ہوں خدا آپ کی والدہ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔ بہت بہت شکریہ زرین آفریدی اور بینش صدیقی خدا کی عطا کردہ خوبصورت نعمت پر مجھے مبارک باد دینے کا۔ آپ دونوں کو بھی عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر میں مبارک باد دیتا ہوں۔ غلام یسین نوناری صاحب بڑی دیر کی مہربانیاں آتے آتے۔ رضوان تنولی کو آپ ہی کیا بہت سارے لوگ یاد کرتے ہیں۔ سید عبادت کاظمی صاحب مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی واقعی؟ چلیں خدا آپ کو بھی خوش و خرم رکھے۔ محمد شہباز ناز صاحب بوڑھے بندے کو سب ہی

بوڑھے اور بڑھیا ہی نظر آتے ہیں۔ یہ کچھ عمر کا تقاضا ہوتا ہے تو کچھ بینائی کا۔ سرجی ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی اختراع کے جہاز اتارتا ہے۔ جو بہترین لینڈنگ کرتا ہے اسی کا جہاز یعنی خط پہلے نمبر پر آ جاتا ہے۔ بہت سے پرانے پائلٹ جو جہاز چلانے میں ماہر تھے آپ نے ان کو ایسے غائب کیا ہے ان کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔ ان پائلٹ حضرات میں رضوان تنولی، ہمایوں سعید، تفسیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان، اعجاز احمد راحیل اور بہت سے دوسرے۔ حسب معمول سب سے پہلے ماروی سے کیا آغاز جس کا دی اینڈ کر دیا گیا اور دی اینڈ بھی بڑی عجلت سے اور زبردستی کیا گیا۔ اپریل کے سسپنس میں جب میرا خط شائع ہوگا وہیں پر اپریل کے سسپنس میں حسام بٹ صاحب کی تحریر کردہ وقت بھی شائع ہوگی۔ وقت وقت کی بات ہے دیکھیں حسام بٹ صاحب وقت کے ذریعے کونسا تیر چلاتے ہیں۔ اسماء قادری صاحبہ شیش محل کو پاکستان لے آئی ہیں مگر کہانی کا ہیرو ابھی انڈیا میں ہی ہے۔ اسماء قادری صاحبہ سے ایک بار پھر میں عرض کروں گا کہ منظر نامہ ذرا چھوٹا رکھیں۔ آخری صفحات کی ذمے داری پوری کرتے ہوئے اس بار نشور ہادی صاحب منقسم عورت لے کر آئے۔ یقین کریں سرجی نشور ہادی صاحب کی تحریر نے ذرا متاثر نہیں کیا جبکہ ڈاکٹر شی کا کردار بھی زبردستی کا لگا۔ حسبِ معمول اور حسبِ دستور حسام بٹ نے لاتوں کے بھوت میں مرزا امجد بیگ صاحب کو جیت دلا دی۔ ونڈر فل حسام بٹ کیا کہنے۔ تاریخ کے جھروکوں سے الیاس سیتاپوری مرحوم کی عمر جادواں کی تلاش کا انتخاب کیا گیا۔ سرجی اس میں کوئی شک نہیں کہ الیاس سیتاپوری کی تحریریں سر چڑھ کر بولتی ہیں۔ اس کی ایک مثال عمر جادواں کی تلاش ہے۔ منظر امام صاحب اس بار ایک مختصر سی تحریر دردمند لے کر آئے اور ہمارے دل کو دردمند کر دیا۔ شاباس منظر صاحب، آپ کے ڈاکٹر صاحب نے کمال کر دیا۔ سیما کمال کی پرچھائیاں بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ صاحب جب بھی آتے ہیں خاصے کی چیز لاتے ہیں۔ معما بھی ایک خوب صورت اور معیاری تحریر تھی، بے نقاب تنویر ریاض، موروثی نیکلس سلیم انور، احساس جرم بابر نعیم، بے خبری ثمر عباس، حیرت کدہ نصرت شاہ نواز سسپنس کے معیار کے عین مطابق تھیں۔ ضیاء تسنیم کے بارے میں بھلا کیا کہوں جن شخصیات کا ذکر ہوتا ہے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ بہت چھوٹے ہیں۔ ویل ڈن زبردست ضیاء تسنیم بلگرامی بہت اچھے۔ خدا آپ کو اس کارِ خیر کا ثواب عطا فرمائے (آمین)۔“

✽ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں۔ ”سسپنس ڈائجسٹ کا حصول 21 فروری کو ممکن ہو سکا ادارے کی اعلان کردہ تاریخ کے برعکس۔ خیر ہم اس میں بھی راضی ہیں۔ بر ضا سرورق کو ہمیشہ کی طرح سراہتے ہوئے اس کے بعد انشائیہ ملاحظہ کیا۔ ”ایک نعرہ“ جی ہاں اب صرف نعروں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے، عمل کرنا تو خال خال نظر آتا ہے۔ چند دن پیشتر سیہون میں دھماکا ہو گیا۔ جس میں درجنوں لوگ شہید اور سوڈیڑھ کے قریب زخمی ہو گئے۔ ہفتہ بھی مشکل سے نہیں ہوا ہوگا کہ چارسدہ دھماکا ہو گیا اس میں بھی متعدد شہید و زخمی ہو گئے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ خونِ ناحق کب تک بہایا جاتا رہے گا؟ خون بہانے والے کیا یہ بھول جاتے ہیں کہ ان سارے جرموں اور ناانصافیوں کا حساب کتاب لینے والا بھی کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا انصاف جب ہوتا ہے تو مجرم چاہے دنیا کی عدالت سے اپنے آپ کو بچالے مگر اس قادرِ مطلق کے سامنے کیسے بچ پائے گا۔ سارے دوستوں کے تبصرے خوبصورت تھے جو بھرپور آراء سے نواز رہے تھے۔ عبدالجبار رومی و محمد صفدر معاویہ کا بھی شکریہ جو یاد رکھتے ہیں، سارے دوستوں کو۔ عمر جاوداں کی تلاش الیاس سیتاپوری صاحب کی ایک عمدہ تحریر تنویر ریاض کی بے نقاب بھی اچھی تحریر تھی اور دلوں کو دھڑکا دینے والی تحریر ”شیش محل“ روانی و کامیابی سے جاری ہے۔ لفظ لفظ میں دلچسپی و تجسس کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے ”ماروی“ اپنے اختتام کو پہنچی۔ احساسِ جرم، بے خبری، حیرت کدہ اور منظر امام کی دردمند، معما، پرچھائیاں اچھی لگیں۔ دلوں کو ایمان کی روشنی سے جلا دینے والی تحریر ”شیخ بدر الدین اسحاق“ بھی خوبصورت تحریر تھی۔ آخری صفحات کی تحریر منقسم عورت بہترین تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن اور لطیفے و اقوال زریں پر مشتمل ”کترنیں“ بھی خوب تر تھیں۔“

✽ بلوچستان سے مہیش کمار کا محبت نامہ۔ ”پہلی مرتبہ محفل یاراں میں شریک ہو رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے جگہ مل جائے۔ تاریخ کے حوالے سے آپ کی کاوشیں بہترین ہیں کیونکہ تاریخ سے سبق ملتا ہے، انسانیت کو جاننے اور انسان کو پرکھنے کا۔ دولت کے لالچی کو بے نقاب ہونے تک سب جائز نظر آتا ہے۔ موروثی نیکلس پر ایک ہی جملہ ہے، نہلے پر دہلا۔ شیش محل کو بائی پاس کر کے میں پہنچا احساس جرم پر، ڈیوڈ کارلسن کی جلد بازی ہی اسے لے ڈوبی، ورنہ قدرت نے تو اس کے لیے مستقبل شاندار کر دیا تھا۔ مرزا امجد بیگ کا تو میں دیوانہ ہوں۔ لاتوں کے بھوت تو ان لوگوں پر طمانچہ ہے جو شخص اپنی بیوی کی خوشامد کے لیے، ہر رشتہ بھول جاتے ہیں لیکن بے شک وہ بہترین انصاف کرنے والا ہے۔ بے خبر سے میں بے خبر رہا اور شعر و شاعری سے دور ہوں (اس لیے معذرت) نصرت شاہنواز نے سسپنس ڈائجسٹ کے تمام قارئین کا آنکھوں دیکھا حال الفاظ میں ڈھال دیا ہے۔ ڈاکٹر لفظ کی مکمل تعریف کو منظر امام نے ایک اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔ معما نے ثابت کیا کہ ایک بدمعاش، اسمگلر بھی ایک دردمند دل کا مالک ہو سکتا ہے۔ ویل ڈن سیما کمال۔ منقسم عورت نے مجھے آبدیدہ کر دیا۔ رفعت تو بیچاری ایک مشرقی بیوی کا کردار بخوبی نبھا رہی تھی لیکن طارق نے بھی قربانی کی حد کر دی۔ ڈاکٹر شی کے ماضی کو پوشیدہ ہی رکھا گیا کہ وہ جرائم پیشہ تھی یا کوئی نفسیاتی مریضہ۔ اگر وہ

وسیما رتھی تو طارق کے رویّے سے خوفزدہ ہو کر ملک ہی چھوڑ کر چلی گئی (کیوں؟) خیر کہانی بہت اچھی تھی۔''

✽ عبدالجبار رومی انصاری کا چونگ سٹی لاہور سے بھرپور تبصرہ۔ ''خوب صورت سسپنس کا شمارہ 18 تاریخ کو مل گیا۔ دوشیزہ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ محبت سے بھرپور ہے مگر آنکھوں کی سرخی سے کسی طرح کی پشیمانی بھی عیاں تھی اور عقب میں سر جھکائے مرد کا خاکہ بھی جو ہو گیا سو ہو گیا پر قناعت کیے نظر آ رہا تھا۔ فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالو۔ جون ایلیا نے نعرہ پڑھا اور پھر اس کی تہ تک پہنچ گئے لیکن ضروری ہے کہ ہر انسان اس کی گہرائی کو ناپے، تب یقیناً دنیا میں امن و محبت اور رواداری کا فروغ چل سکتا ہے اور دشمن پاکستان کا امن ایک بار پھر خراب کرنے کے درپے ہے۔ شکر ہے اب کچھ نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد ہوتا نظر آ رہا ہے، ویسے بھی پاکستان اس وقت تاریخی موڑ پر ہے۔ امید ہے یہ تاریخ سنہری حروف سے لکھی جائے گی اور عوام کی دیرینہ خواہش بھی پوری ہوگی۔ طاہرہ گلزار کی پکار پر لبیک کہتیں بلقیس خان کی آمد زبردست رہی جو بارش، پھول، پرندوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ فرسٹ تبصرہ بہت بہت مبارکاں، ساتھ ہی زرین آفریدی، بینش صدیقی کی انٹری بھی بہت عمدہ رہی۔ رمضان پاشا کا اپنا ہی گیٹ اپ تھا۔ سید عبادت کاظمی بھائی اتنا دور بھی نہیں رہنا چاہیے۔ اشفاق شاہین کی اپنائیت بھی اچھی لگی، باقی بھرپور تبصرے کے ساتھ محمد صفدر معاویہ، بابر عباس، فضل عباس، زاہد احمد اور پائندہ خان بھی عمدہ رہے اور آخر میں مہتاب احمد کے ساتھ ناہید یوسف کا تبصرہ بھی ایک دم زبردست رہا۔ ''عمر جاوداں کی تلاش'' میں ارغون خان ایسا اندھا ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کر لیا اور رفیعہ اور تہمینہ کا بھی انتقام پورا ہوا اور کیتا تو خان کا صبر و حوصلہ بھی رنگ لایا۔ دشمن اسلام اپنی موت مر گئے اور وحشی قوم میں اسلام کیتا تو خان کی صورت زندہ ہو گیا۔ عبرت اثر واقعات سے لبریز ''عمر جاوداں کی تلاش'' زبردست کہانی تھی۔ جیت ہمیشہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے والوں کی ہوتی ہے۔ بے شک راہ میں چاہے جتنی بھی مشکلات کھڑی ہوں اور اسی طرح ''ماروی'' کا مراد بھی زندگی بھر اپنے اور اسلام کے دشمنوں سے نبرد آزما رہا اور بالآخر جیت سے ہمکنار ہوا۔ ماروی کے بھی کردار اہمیت کے حامل تھے۔ سسپنس اور قارئین کے ساتھ اس کا بہت اچھا ساتھ رہا جسے قارئین مدتوں یاد رکھیں گے۔ ماروی ختم ہو گئی اس کے لکھنے والے کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور بہت بہت سلام اینڈ سلام ماروی۔ انتقام...... زندگی جیسے اب اسی ایک لفظ کا نام تھی اور ''شیش محل'' کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر سب کو لہولہان کر رہا تھا۔ ایک طرف بٹوارے میں مسلم خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی جس میں جولیٹ زندہ ہو کر بھی خون میں رنگین ہو رہی تھی تو دوسری طرف فاروق اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنے دشمنوں سے انتقام لے رہا تھا جس میں فیکا اور مجو بھی نرک میں پہنچ چکے تھے۔ اسماء قادری کا قلم بہت عمدگی سے چل رہا ہے، بہت ہی زبردست اسٹوری جاری ہے۔ منتقم عورت، رفعت اتنی منتقم بھی نہیں تھی اس نے جتنی بھی خاموشی کے ساتھ قربانی دی تھی پھر بھی مشرقی بیوی کی طرح طارق کے ساتھ محبت کے ساتھ رہ رہی تھی۔ شفیق کو تو اور لڑکی بھی مل جاتی لیکن طارق کو اپنی قربانی دے کر خود کو عظیم کرنا تھا سو رفعت سے جدائی لی اور دوستی قبول کی۔ باقی شی نے آواگون بننے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ کامران کی وجہ سے نائلہ اور اس کے شوہر کی خوشیاں لوٹ آئیں مگر لالہ نے بچے کے ساتھ پیسے بھی واپس لوٹا دیے، کیوں؟ یہ معما وہ بھی نہ حل کر سکے۔ شاید زندگی میں کی گئی کوئی نیکی کام آ گئی ہو۔ شیر شاہ سید کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ''موروثی نیکلس'' کو واپس آنے میں بھی دھوکے باز چالاک لوگوں کے ہاتھوں سے گزرنا پڑا۔ سلیم انور کی کہانی تو نہلے پہ دہلا ثابت ہوئی۔ ''لاتوں کے بھوت'' کی ڈائن نے بھی نئے نئے رنگ دکھا دیے۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی وکالت نے جہاں آرا کے مجرمانہ راز افشا کیے تو ماجد بھی راہ راست پہ آ گیا اور عالیہ کو اپنا فلیٹ واپس مل گیا، اور مجرم گئے جیل میں۔ بہت محظوظ کیا لاتوں کے بھوت نے۔ ''میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔'' یادالٰہی میں مشغول رہنے والے داماد بابا فرید گنج شکرؒ...... شیخ بدرالدین اسحاقؒ کا ذکر خیر ایمان افروز اور دل کو چھو لینے والا تھا۔ اولیاء اللہ کی اتباعِ سنت رسولؐ ہی سب سے بڑی کرامت ہوتی ہے اور ان کے ولی ہونے میں یہی دلیل سب سے بڑی ہے۔ محفل شعر و سخن سے جنید احمد ملک، وردا، آریز ملک اور مرینہ احمد کے شعر بہت عمدہ تھے۔''

✽ ابرار احمد ساقی کی ملیر کینٹ، کراچی سے جسارت۔ ''کافی عرصے کے بعد محفلِ یاراں میں حاضری کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے جگہ مل جائے گی۔ (جی بالکل ملے گی)۔ محفل میں جگہ نہ ملی تو ردی کی ٹوکری تو موجود ہی ہے۔ ہمارا پیارا راج دلارا سسپنس 17 فروری کو ملا لیکن اس سے پہلے میرا ملک لہولہو ہو چکا تھا۔ اس لیے افسردہ دل کے ساتھ ڈائجسٹ کو کھولا اور سب سے پہلے محفل میں حاضری دی جہاں پر بلقیس خان کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ (مبارکاں) باقی سب کے نامے بھی دلچسپ تھے۔ محفل کے بعد اس معاشرے کے جراح جون ایلیا کے نشتروں کو سینے سے لگایا۔ کاش اس قوم کو جون ایلیا جیسے جراحوں کی بات سمجھ میں آ جائے تو تقدیر بدل جائے، ہمارے پیارے وطن کی۔ انشائیہ کے بعد چھلانگ لگا کے سیدھا شیش محل میں انٹری دی جس کا ہر ماہ بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ یہ قسط بھی بہترین تھی۔ ڈیوٹی کی مصروفیات کی وجہ سے باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔''

✽ سید محی الدین اشفاق کی فتح پور (لیہ) سے حاضری۔ ''تھوڑی سی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں۔ مگر جاسوسی اور سسپنس تسلسل

کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔ جون ایلیا کا ''ایک نعرہ'' پڑھا۔ محفل میں بلقیس خان ونگ سیٹ پر براجمان تھیں۔ زرین آفریدی، بینش صدیقی، تبصرے کے شائع نہ ہونے کا شکوہ کرتی نظر آئیں۔ آخر کار میرے بھائی سید عبادت کاظمی کی آواز پر محفل میں حاضر ہوا ہوں (بہت شکریہ)۔ ایم صفدر کا طویل تبصرہ پُرمغز تھا۔ بابر عباس، فضل عباس کا تبصرہ جاندار تھا۔ طاہر گلزار، ہمایوں سعید، ماہا ایمان، آمنہ پٹھانی اور باقی سب دوستوں سے گزارش ہے واپس آجاؤ۔ آپ کے دلچسپ تبصرے پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ ''شیش محل'' اسما قادری صاحبہ بڑا ظلم کیا۔ اس کہانی کے اصل ہیرو کو ہی مار دیا۔ سارا خاندان نوابوں کا بھی اجڑ گیا۔ بہر حال منظر نگاری، مکالمہ نگاری سب بہترین ہے۔ فاروق اور کیتھی مل کر ربن کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا رہے ہیں۔ جولیٹ کی پریشانی کم نہیں ہو رہی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں جولیٹ اور فاروق آپس میں کزن ہیں۔ ''منقسم عورت'' نشور ہادی کی اچھی تحریر تھی مگر کچھ عجیب بھی لگی۔ طارق اور رفعت کی طلاق کروانا اور پھر سابقہ محبوب سے شادی کروانا، اس طرح کی بات بُری فیل ہوتی ہے۔ احمد اقبال اور مغل انکل دونوں سے سسپنس میں لکھوائیں۔ ملکی حالات بھی خطرناک صورتِ حال اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ لاہور سمیت ملک بھر میں حالیہ دہشت گردی کی لہر کے باعث ملکی معیشت اور انسانی جانوں کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں قائد کے فرمان کے مطابق ایک ہونے کی ضرورت ہے تاکہ اس چھپے ہوئے دشمن کو ختم کیا جاسکے۔ ملکی بیروزگاری، غربت، بیماریوں کے حل کے لیے ان سیاستدانوں وحکمرانوں کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ ایک خوشخبری کہ لاہور میں (PSL) کا فائنل کروانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین)''

❋ فضا شاہ ماڈل ٹاؤن، لاہور سے محفل کی زینت بن رہی ہیں۔ ''پہلے خط کی اشاعت اور کرسی صدارت کے اعزاز نے اس قدر پُرجوش کر دیا کہ ادارے کو فون کر دیا کہ شکریہ ادا کرسکوں۔ مارچ کا شمارہ ملا تو سب سے پہلے سرورق کا جائزہ لیا۔ سرورق کی خاتون جاگتے میں خواب دیکھنے میں مصروف نظر آئی۔ پس منظر میں مرد حضرات پرچھائیوں کی شکل میں جوڑ توڑ میں مصروف نظر آئے۔ ''فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالو'' انشائیہ کا خلاصہ اور مرکزی آئیڈیا تھا۔ انشائیہ کو سمجھنے کے لیے میں نے بادام منگوا لیے ہیں' اداریہ کافی سلیس رہا۔ نئے امریکی صدر کے مسلمان دشمن اقدامات کو بہت خوبصورتی سے آپ نے پیش کیا۔ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنا مسلمانوں کی تمام دشمن قوتوں کا مشترکہ منصوبہ ومقصد رہا ہے۔ ٹرمپ نے اس عمل کے لیے مہمیز کا کام کیا ہے۔ بلقیس خان کو کرسیِ صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس بار آپ کے خط کو پسندیدہ ترین کی سند مل چکی، امید ہے ادارے سے کوئی شکایت نہیں رہی ہوگی۔ آپ کی والدہ کی جلد شفایابی کے لیے دعا گو ہیں۔ زرین آفریدی، بینش صدیقی، آنکھیں اور منہ کھلے نہ رکھیں ورنہ اسپتال والے لے جائیں گے۔ تبصرہ آپ کو پسند آیا یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میں نے تو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا تھا۔ عمرے کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ غلام یٰسین نوناری! میرے تبصرے نے آپ کو کسی کی یاد دلادی تو سمجھیں میری محنت وصول ہوگئی۔ محفل کے تمام ساتھیوں کا شکریہ جنہوں نے میرے تبصرے کو سراہا اور اس بات سے ہمت ہوئی کہ پھر تبصرہ لکھ سکوں۔ صفدر معاویہ، پائندہ خان اور ناہید یوسف کے تبصرے بھی پسند آئے۔ محفل میں حاضری کے بعد سب سے پہلے شیش محل سے مطالعے کا آغاز کیا جہاں فاروق اور روبے، ربن دادا کے قاتلوں سے دو، دو ہاتھ کرنے میں مصروف نظر آئے۔ رمیش، بھانیہ سیٹھ، مجو اور فیکا کو ختم کرنے کے بعد اگلا شکار لازماً راٹھور ہی ہوگا۔ جولیٹ اور جانی کی کراچی روانگی کی روداد سے اس وقت پاکستان ہجرت کرنے والوں کی تکالیف کا درست اندازہ ہوا۔ کہانی اب کراچی اور لاہور میں اپنا رنگ جمائے گی کیونکہ کرداروں نے ادھر کا رخ کرلیا ہے۔ اس کے بعد ماروی کی آخری قسط پڑھی محی الدین نواب سے منسلک ہونے کی وجہ سے ماروی پڑھتے ہوئے انہی کا خیال ذہن میں رہتا ہے۔ نشور ہادی کی منقسم عورت پڑھ کر لگا جیسے رائٹر خود منقسم خیالات کا حامل ہو جس قسم کی تحریر انہوں نے لکھی، اس کی ہمارے معاشرتی نظام میں کوئی جگہ نہیں۔ حیرت کدہ میں شاید فولادی کی شکل میں ہم ایک ایسے کردار کو پڑھ رہے ہیں جس کی کہانیاں سیریز کی شکل میں پڑھنے کو ملیں گی۔ رائٹر نے خوبصورتی سے ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی بدصورتی کو اجاگر کیا ہے۔ آج بھی غربت زدہ لوگ کچرا چننے اور کچرے سے روٹی چن کر کھانے پر مجبور ہیں۔ بے نقاب اگرچہ مختصری کہانی تھی لیکن اس میں کرداروں کی بھرمار نے چکرا کر رکھ دیا۔ انگریزی ناموں والی کہانی پڑھتے ہوئے اکثر کوفت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی معما بھی کافی پُراثر رہی۔ لالہ گل رحمٰن کے دل میں موجود انسانی ہمدردی نے کام کر دکھایا اور رقم کے ساتھ ساتھ بچہ بھی واپس کر گیا۔ سیما کمال کی پرچھائیاں پڑھ کر عجیب احساس ہوا۔ زرینہ گورمانی کی محرومی اسے خیالی دنیا میں لے گئی جہاں وہ فرضی کرداروں کے ساتھ رہنے لگی۔ یہی حال صوفیہ کا ہوا۔ اختتام میں شاید صوفیہ کی محرومی تو ختم ہوگئی مگر زرینہ گورمانی اپنے احساسِ محرومی کے ساتھ منوں مٹی تلے جا سوئی۔ کترنوں میں وزیر محمد خان کی کترنیں پسند آئیں۔ اشعار میں عنبرین احمد، کمال انور اور وردا ملک کا شعری انتخاب پسند آیا۔ (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

خلیق ربانی انجم، خیبر پختون خوا۔ آصف محمود، گوجرانوالا۔ عائشہ احمد، فیصل آباد۔ انعم کمال، حیدر آباد۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ طیب شاہین، کٹھیالہ شیخاں۔ جعفر رضا، لیہ۔



کافر نعمت

ڈاکٹر ساجد امجد

اللہ رب العزت اپنے بندوں کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کرتا... جو جیسا ہوتا ہے، بالآخر اسے ویسا ہی کاٹنا بھی پڑتا ہے، خواہ بادشاہ ہو یا فقیر... اعمال، نیت اور نتائج سے فرار ممکن ہی نہیں ہے۔ ظرف کسی کا بھی ہو گنجائش اور پیمائش کے مطابق ہی آزمائشوں پر پورا اترتا ہے... تاریخ نے ہر موڑ پر ثابت کیا ہے کہ جس کا جتنا ظرف تھا اتنا ہی وہ حق ادا کرسکا اور جب پیمانہ لبریز ہوگیا تو اپنی اپنی فطرت کے مطابق کسی نے اپنے نفس پر پہرا بٹھادیا اور کسی نے حرص وہوس کے در پر دستک دے ڈالی۔ علائو الدین خلجی کا عہد بھی انہی واقعات کا آئینہ دار ہے... اور پھر اس کے بیٹے مبارک شاہ اور اس کے چہیتے منظورِ نظر خسرو کے کارنامے اور کردار لالچ، طمع... بے مروتی اور مفاد پرستی کی انتہا کو چھو لینے والے کم ظرف تعلقات کی کڑوی حقیقتوں کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ماضی کا ہر گزرا لمحہ ویسے تو اپنے دامن میں بہت سی یادیں لپیٹ کر لے جاتا ہے مگر ساتھ ہی عبرت اثر داستانیں بھی چھوڑ جاتا ہے... یہ اور بات کہ کون ان سے کیسا اثر قبول کرتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



ایک کارواں دکن کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔
اب وہ اس شاہراہ پر آگیا تھا جو سیدھی دہلی کی طرف جاتی تھی یا اس شاہراہ سے گزرنے والے قافلے یہ احساس دلاتے تھے کہ یہ دہلی تک جا کر دم لیں گے۔ یہ کارواں بگھیوں اور محافظ گھڑسواروں پر مشتمل تھا۔

اس شاہراہ کو عموماً تجارتی قافلے استعمال کیا کرتے تھے کیونکہ اس راستے میں کئی آبادیاں آتی تھیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ شاہراہ آبادیوں سے ہو کر گزرتی تھی۔ اکثر چھوٹے سوداگر اپنا مال راستے میں فروخت کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ کئی مرتبہ تو دہلی پہنچنے سے پیشتر ہی ان کا مال فروخت ہو چکا تھا۔ تجارتی قافلوں میں اکثر اونٹ استعمال ہوتے تھے لیکن اس قافلے میں ایک بھی اونٹ نہیں تھا۔ اسے کوئی فوجی دستہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ فوج آبادیوں سے ہٹ کر چلتی تھی۔

یہ قافلہ.... ایک ایسے راستے سے گزرا جس کے دونوں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں کی نظر جیسے ہی محافظ دستے کے سپاہیوں پر پڑی وہ اپنی جگہ دبک گئے کہ جانے یہ کون لوگ ہیں اور کس نیت سے گزر رہے ہیں۔ ان سپاہیوں کو بھی جیسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ موسم اور مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ شاید انہوں نے غور بھی نہ کیا ہو کہ کھیتوں میں کتنے آدمی دبکے بیٹھے ہیں۔ اس انتظار میں سانس روکے بیٹھے ہیں کہ یہ گزریں تو یہ کھل کر سانس لے سکیں۔

کوئی تجارتی قافلہ ہوتا تو یہی لوگ کھیتوں سے نکل کر ان کے گزرنے کا تماشا دیکھتے لیکن یہ تجارتی قافلہ نہیں تھا۔

جب اس قافلے کا آخری سپاہی بھی گزر چکا تو ان گونگے دیہاتیوں کو زبان مل گئی۔
"بھائی کیا پھر جنگ لگ گئی؟"

"ارے نہیں۔ جنگ لگتی تو قافلہ دہلی سے دکن کی طرف جا رہا ہوتا۔ بادشاہ دہلی میں ہے، دکن میں نہیں۔ مارا کاٹی بھی دکن میں ہو رہی ہے اور یہ فوجی لشکر کب تھا جو تم کہہ رہے ہو جنگ لگ گئی۔"

"پھر کون تھا جو اس دھوم دھام سے جا رہا تھا۔ بادشاہ تو ہو نہیں سکتا۔ وہ ہوتا تو ہاتھی پر ہوتا۔"

"کوئی امیر ہوگا۔ بادشاہ کے بلانے پر دہلی جا رہا ہوگا۔"

"کہیں الغ خاں تو نہیں تھا۔ کچھ دن پہلے وہی ادھر سے گزرا تھا۔"

"وہ دکن میں کہاں، وہ تو گجرات میں ہے۔"

"آگے جا کر یہی سڑک گجرات کی طرف بھی مڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہی ہو۔"

"سنا ہے بادشاہ بیمار ہے۔"

"کیا خبر مر ہی گیا ہو اور یہ امیر اس کی تعزیت کو جا رہا ہو۔"

"ایسے ظالم بادشاہوں کو جلدی موت نہیں آتی۔ ایڑیاں رگڑ رہا ہوگا۔"

"چھوڑو یار و! ہمیں کیا۔ جو خبر ہوگی سامنے آجائے گی۔ ابھی تو اس قافلے کو پہنچنے میں بھی چار پانچ دن لگ جائیں گے۔"

☆☆☆

دہلی کی سڑکوں پر ابھی دھوپ کی حکومت پوری طرح قائم نہیں ہوئی تھی کہ یہ قافلہ شہر میں داخل ہوا۔ دہلی کے شہریوں کے لیے یہ تماشے روز کے تھے اس لیے کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ قصر ہزار ستون کے سامنے پہنچتے ہی یہ قافلہ رک گیا۔ محافظ سواروں نے ان بگھیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ صدر دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے اپنے نیزے سرنگوں کر لیے۔ سب سے آگے چلنے والی بگھی دروازے کے اندر چلی گئی۔ باقی دو بگھیاں باہر کھڑی رہ گئیں۔ اگلی بگھی میں شاید کوئی اہم شخصیت تھی جسے اندر تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس بگھی نے دروازے سے محل تک کا راستہ طے کیا اور ایک فوارے سے ذرا ہٹ کر پھر رک گئی۔

اس بگھی سے دو افراد ایک ساتھ نیچے اترے۔ ایک ذرا پختہ عمر کا اور پوری طرح مسلح تھا جبکہ دوسرا نوعمر تھا، یہی کوئی بیس یا پچیس سال کا۔ پختہ عمر کے آدمی نے اس نوجوان سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ وہ وہیں ٹھہر گیا اور پختہ عمر کا آدمی چند مسلح غلاموں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ نوجوان کو شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس نوجوان کا نام شاہین خاں تھا۔ آنے والی شخصیت کو ایسے خوبرو نوجوانوں کی صحبت پسند تھی۔ ان دنوں وہ شاہین خاں پر فریفتہ تھا اور پل بھر کے لیے اسے خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ وہ بادشاہ سے ملنے کے لیے جا رہا تھا اور وہاں وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔

ہزار ستون کی بالائی منزل پر قدم رکھتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہرے داروں کی جگہ خاموشی پہرا دے رہی تھی۔ جہاں ہر طرف نازنینوں کے قہقہے گونجتے تھے، اب اداسی گونج رہی تھی۔ ایک غلام نے اسے اس کمرے تک پہنچا دیا جہاں بادشاہ آرام فرما تھا۔ اندر اطلاع کی گئی اور بادشاہ

نے اسے طلب کرلیا۔

"آؤ ملک نائب آؤ۔ ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔"

"آقا نے یاد فرمایا اور غلام حاضر ہوگیا۔"

"ہم نے الغ خاں کو بھی گجرات سے بلالیا ہے۔ ایک آدھ دن میں وہ بھی حاضر ہوجائیں گے۔"

"انہیں تکلیف نہ دیتے تو اچھا تھا۔ گجرات کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ان کا وہاں رہنا ضروری ہے۔"

"یہاں کے حالات کون سے درست ہیں۔" بادشاہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ "آج میری سلطنت کابل وسندھ کی سرحد سے لے کر بنگالہ، دکن اور گجرات کی حدود تک پہنچ گئی ہے۔ سارے ہندوستان میں دس بیگہ زمین بھی ایسی نہیں جہاں میرے نام کا خطبہ وسکہ جاری نہ ہو۔ بس یوں سمجھو کہ میں پورا ہندوستان اٹھا کرلے آیا ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"شک تو اس میں بھی نہیں کہ آج میں بیمار پڑا ہوں تو کوئی میری عیادت تک کے لیے آنا گوارا نہیں کرتا۔ خضر خاں جسے ہم نے اپنا ولی عہد بنایا ہے، اسے دیگر مشاغل اور ہاتھیوں کی لڑائی سے فرصت نہیں۔ ہمارے پاس آنا تک گوارا نہیں کرتا۔ ملکہ جہاں جو ہماری بڑی بیگم ہیں جنہیں اس وقت ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا، انہیں تقریبات اور بزم آرائیوں سے فرصت نہیں۔ ہمارے سوا انہیں سب کچھ یاد ہے۔ کنیزوں نے بھی انہی کے رنگ ڈھنگ سیکھ لیے ہیں۔ ایک کنولا دیوی ہیں جو کبھی کبھی ہمارے پاس آتی ہیں۔ دیگر رانیوں کو تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ ہم کوئی تھے۔"

"حضور، اس کا اندازہ مجھے ہزار ستون میں داخل ہوتے ہی ہوگیا تھا۔"

"کچھ دن رہو گے تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ حالات کتنے مخدوش ہوگئے ہیں۔"

"آپ فکر نہ فرمائیں۔ بس آپ ایک فرمان جاری فرمادیجیے کہ آپ نے امورِ سلطنت ہمیں مرحمت فرمادیے ہیں۔ ہم آپ کے خلاف ہونے والی ہر سازش کا دروازہ بند کردیں گے۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی ملک نائب۔ اب تم آرام کرو۔ تمہاری مرضی کے مطابق فرمان جاری ہوجائے گا۔"

ملک نائب نے سلطان کو سلام رخصتی کیا اور بسترِ علالت کے قریب سے اٹھ آیا۔ اسے تجویز کردہ محل میں پہنچادیا گیا۔

رات ہوتے ہی اسے شاہین خاں کی طلب ہوئی۔ اس نے اسے بلا بھیجا۔ محل کے دروازے بند کیے اور اسے آغوش میں لے کر بیٹھ گیا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔

"میں دیکھ آیا ہوں۔ بادشاہ کا عروج، زوال کی طرف گامزن ہے۔ اس کا دل اپنی اولاد اور بیویوں کی طرف سے کھٹا ہوچکا ہے۔ اپنے کسی امیر پر اسے بھروسا نہیں ہے، میں اگر ذرا صبر سے کام لوں تو بادشاہت مجھ سے دور نہیں ہوگی۔ پھر شاہین خاں میں تجھے سونے کے بستر پہ لٹاؤں گا۔"

"آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ خضر خاں کو وہ اپنا ولی عہد مقرر کرچکا ہے۔"

"اس کانٹے کو نکالنا مشکل نہیں۔ بادشاہ نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بھی بادشاہت کے لائق رکھا ہی نہیں۔ وہ انہیں بے وقت اور اس سے پہلے کہ ان میں ذرا بھی عقل آتی محافظت کی حدود سے باہر لے آیا۔ خضر خاں کو چترِ شاہی عطا کیا اور اس کا محل اور دربار الگ کردیا۔ تجربہ کار اور سمجھ دار لوگوں کو اس پر مقرر نہیں کیا چنانچہ وہ محافظت کی حدود سے باہر آگیا اور عیش وعشرت اور ہوا پرستی میں مصروف ہوگیا۔ سلطان کی بیویوں نے مہمانداری اور خوشیاں منانے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کررکھا ہے۔ یہ تقریبات اور سلطنت کے کاموں میں رکاوٹیں ڈال رہی ہیں۔ چاپلوس امراء اس بدنظمی سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔"

"آپ کو تو ان حالات کو سدھارنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑے گی۔"

"میرے سر پر کوئی سینگ ہیں جو میں ان حالات کو سدھاروں گا۔ ہاں، مجھے ان حالات کو بگاڑنے کے لیے بہت محنت کرنا ہوگی۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" شاہین خاں نے تعجب سے پوچھا۔

"جو ماحول اب ہے، وہ سازشوں کو پروان چڑھانے کے لیے بہت مناسب ہوتا ہے۔ مجھے ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے جو شاہی خاندان کو تنکے کی طرح بکھیر دیں۔ بادشاہ کو اپنے لوگوں سے بدظن کرنا میرا مشن ہوگا تاکہ میری بادشاہت کے لیے راستہ صاف ہوجائے۔"

"بادشاہ آپ کو ایسا کرنے دے گا؟"

"وہ بادشاہ نہیں میرا عاشق ہے۔ مجھ پر فریفتہ ہے۔ بادشاہ کو جتنی فتوحات میسر ہوئی ہیں، وہ سب میری مرہون منت ہیں۔ میں نے ہی دریائے عمان کے ساحلی علاقوں کے دھور، سمندر اور میسر کو فتح کیا اور وہاں کے مندروں سے

جواہرات نکال کر دہلی لایا۔ اب میں اتنی آسانی سے اس دولت پر دوسروں کو قبضہ نہیں کرنے دوں گا۔ بادشاہ مجھ پر اعتبار کرتا ہے۔ میں اس کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا۔ اس کی دولت اس کے بیٹوں تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ نمک حرام امیروں کا ایسا پتا صاف کروں گا کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"آپ شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے پھر آپ تخت پر کیسے بیٹھیں گے؟"

"بادشاہت کرنے کے لیے تخت پر بیٹھنا ضروری نہیں ہوتا۔ بس تم دیکھتے جاؤ، میں کرتا کیا ہوں۔ صرف اس وقت تک انتظار کروں گا جب تک مجھے بااختیار کرنے کا شاہی فرمان میرے ہاتھ میں نہیں آجاتا۔"

"اس سب تک و دو کا مجھے کیا فائدہ ہوگا پھر تو آپ مجھے یاد بھی نہیں کریں گے۔ آپ کے منظورِ نظر اور بہت سے ہوں گے۔" شاہین خاں نے مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ موقع مجھے تمہارے قدموں کی برکت سے مل رہا ہے۔ اقتدار میں آتے ہی تمہیں اپنا وزیر بناؤں گا تاکہ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو۔"

رات کو یہ باتیں ہوئیں اور دوسرے ہی دن بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعے ملک نائب کو ساری مملکت کے لشکر کا سردار بنایا اور تمام اعوان و انصار سے اس کا مرتبہ زیادہ بلند کردیا۔ اسی فرمان کے ذریعے امراء کو یہ حکم بھی ہوا کہ ملک نائب کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔

ملک نائب کافور ہزار دیناری ایک خواجہ سرا تھا اور جس بادشاہ کا ذکر ہو رہا ہے وہ علاؤ الدین خلجی تھا جو ملک نائب پر بری طرح فریفتہ تھا اور معشوقوں کی طرح اس کے ناز اٹھایا کرتا تھا۔ ملک نائب نے بھی وفاداری خوب نبھائی تھی لیکن اب موجودہ حالات دیکھ کر اس کی نیت میں فرق آ گیا تھا۔ فرمان مل گیا تو وہ گویا جنگ کے لیے بالکل تیار ہوگیا۔ اس نے کسی پر اپنے عزائم ظاہر نہیں ہونے دیے اور مملکت کے سدھار کے نام پر سازشوں میں مشغول ہوگیا۔

اس کی تجربہ کار آنکھوں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کی راہ میں اگر کوئی مزاحم ہوگا تو وہ الغ خاں، ملکہ جہاں اور خضر خاں ہوں گے۔ یہ تینوں شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اپنا حق جتائیں گے۔ اس نے اپنی توجہ ان تینوں پر مرکوز کردی۔ جب بھی بادشاہ کے پاس جاتا، ان تینوں میں سے کسی کا ذکر ضرور چھیڑتا اور ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں برائی ضرور ڈالتا۔ ایک روز اس نے یہاں تک کہنے کی جرأت کرڈالی۔

"میں ان حالات کے پیشِ نظر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خضر خاں، ملکہ جہاں اور الغ خاں کو آپ کی موجودگی بھلی معلوم نہیں ہوتی اس لیے تہ دل سے وہ آپ کی موت کے خواہاں ہیں۔"

"ملک نائب! میں تمہاری کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا۔ تم ہر طرح سے میرے وفادار ہو لیکن ان تینوں کی طرف سے میں بدگمان بھی نہیں ہوسکتا۔"

"حضور بادشاہت کی نزاکت سے مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے۔ کیا ماضی میں ایسا نہیں ہوتا رہا کہ تخت کے لیے باپ نے بیٹے اور بیٹے کو باپ نے قتل کرا دیا؟"

"اگر یہ بات کوئی اور کہتا تو میں قطعی یقین نہ کرتا لیکن تم کہہ رہے ہو اس لیے میں یقین کرتا ہوں کہ میرے قصر میں یہ کھیل ضرور کھیلا جا رہا ہوگا۔"

یہ کہنے کے بعد علاؤ الدین خلجی نے آنکھیں بند کرلیں۔ بادشاہ کو دوا پلانے کا وقت ہوگیا تھا۔ شاہی طبیب حاضر ہونے کو تھا لہٰذا ملک نائب نے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔

طبیب اٹھ کر گئے تھے کہ ملکہ جہاں (زوجہ بادشاہ) حاضرِ خدمت ہوگئیں۔ بادشاہ کے دل میں ان کی طرف سے اتنی نفرت پیدا ہوگئی تھی کہ اس نے چاہنے کے باوجود آنکھیں کھولنا گوارا نہیں کیا۔ ملکہ جہاں نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔

"دشمنوں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

بادشاہ کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ فرضی دشمنوں کو نہیں خود اسی کو دشمن کہہ کر اس کی طبیعت دریافت کررہی ہیں۔ اس کے باوجود اس نے تحمل سے کام لیا۔

"بدر الدین دمشقی ابھی دوا پلا کر گئے ہیں۔ قدرے بہتر محسوس کررہا ہوں۔"

"اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے چاہا تو آپ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔" بادشاہ چپ رہا تو ملکہ جہاں نے خود ہی بات کو آگے بڑھایا۔ "الغ خاں گجرات سے آئے ہوئے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے ہی انہیں بلایا ہے۔"

"آگے تو سنیے۔"

"سن رہا ہوں۔"

"الغ خاں کی بیٹی جہاں آرا سیانی ہوگئی ہے۔ دیکھنے میں بھی ایسی خوبصورت ہے کہ بس کیا کہیے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"ہمارا بیٹا شادی خاں بھی کسی سے کم نہیں۔ دونوں کی جوڑی خوب سجے گی۔ میں چاہتی ہوں شہزادے کی شادی جہاں آرا سے ہو جائے۔ آپ کی اجازت لینے آئی تھی۔"

"تم اب بھی میری عیادت کو نہیں کسی تقریب کا بہانہ تلاش کرنے آئی ہو۔" بادشاہ نے دل میں سوچا۔ اٹھنا چاہا تو قریب کھڑی کنیز نے پشت پر تکیے لگا دیے۔

"ہم نے مانا کہ الغ خاں شہزادے کے خالو ہیں لیکن ہیں تو ہمارے نوکر۔"

"لو، یہ بھی کوئی بات ہوئی...... نوکر ہیں لیکن ہیں تو شاہی خاندان سے۔ کہیں باہر کے تو ہیں نہیں۔"

"میری حالت دیکھ رہی ہو۔ تخت پر نہیں بستر پر ہوں۔ سلطنت کے کام تک تو ملک نائب کے سپرد کر رکھے ہیں، ایسے میں تم شادی کا قضیہ لے بیٹھیں۔"

"آپ نے ملک نائب کو خیر خواہ سمجھ کر اور اسے بااختیار بنا کر سخت غلطی کی ہے۔"

"اب آپ ہماری غلطیاں پکڑیں گی۔"

"وہ نہایت سازشی آدمی ہے۔ تخت پر قبضہ کرنے کے لیے ہر جگہ ساز باز کرتا پھر رہا ہے۔"

"بس بیگم، عورتوں کو عورتوں کی باتیں ہی زیب دیتی ہیں۔ امورِ مملکت بادشاہ جانتے ہیں۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔"

ملکہ جہاں نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ اس وقت خاموش رہیں۔ انھوں نے اجازت طلب کی اور وہاں سے اٹھ آئیں۔

قریب کھڑی کنیز نے بادشاہ کی پشت سے تکیے ہٹائے اور اسے بستر پر لٹا دیا۔

"کسی سے کہو ملک نائب کو میرے پاس لائے۔"

"حضور فرمائیں تو میں خود ان کے پاس چلی جاؤں؟"

"ٹھیک ہے، تم چلی جاؤ۔"

کنیز کمرے سے نکلی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور محل کی پشت سے ہوتی ہوئی سینہ تانے درختوں کی طرف چل دی۔ یہ وہ راستہ تھا جو ملک نائب کے محل کی طرف جاتا تھا۔ اس نے یہ راستہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ محل تک جلدی پہنچ جائے۔

ملک نائب کے محل کے پہرے داروں کے لیے وہ اجنبی نہیں تھی۔ ملک نائب کو خبر کی گئی اور اسے بلا لیا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے شاہین خاں کو ملک نائب کے پاس بیٹھے دیکھا۔ ایسے خوبرو نوجوان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے لیکن اس کی یہ مجال نہیں تھی کہ اس کے بارے میں کچھ پوچھتی۔

"کیا خبر لائی ہو؟" ملک نائب کی آواز گونجی۔ کنیز نے شاہین خاں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کیا ان کی موجودگی میں؟ ملک نائب نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔

"کوئی حرج نہیں۔ جو کہنا ہے ان کی موجودگی میں کہہ سکتی ہو۔"

کنیز نے جو باتیں سنی تھیں، اسے تفصیل سے بتا دیں۔

"تم چلو، میں تم سے پہلے پہنچتا ہوں۔"

کنیز نے ایک مرتبہ پھر شاہین خاں کی طرف دیکھا اور محل سے باہر آکر اسی راستے پر چل دی جس طرف سے آئی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے پھر شاہین خاں کا خیال آیا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ شاہین خاں کون ہے اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے ملک نائب کے "شوق" کے بارے میں اڑتی اڑتی باتیں سن رکھی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ملک نائب مرد نہیں خواجہ سرا ہے۔ محل میں خواجہ سرا اور بھی تھے لیکن ملک نائب کے لیے مشہور تھا کہ وہ دن میں مرد بنا رہتا ہے اور رات کو عورت بن جاتا ہے۔ اسے ارباز منشی یاد آیا جو کبھی ملک نائب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا پھر نہ جانے کیوں اسے قتل کرا دیا گیا۔ بے چارہ یہ نوجوان۔ نہ جانے یہ کب قتل ہو جائے۔ میں کوشش کروں گی کہ اسے خطرے سے آگاہ کر دوں۔ صورت تو ایسی ہے کہ میں بھول ہی نہیں سکتی۔

ملک نائب نے اس کنیز کو بھاری رقم دے کر خرید لیا تھا کہ اندر کی خبریں اسے پہنچاتی رہا کرے۔ وہ ملک نائب سے کئی مرتبہ مل چکی تھی لیکن اس سے پہلے اس نے شاہین خاں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ دعا کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی کہ خدا کرے اس سے پھر ملاقات ہو جائے۔

وہ قصر ہزار ستون تک پہنچی اور بادشاہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے ملک نائب کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

بادشاہ یا تو اتنا غیر محتاط تھا کہ کنیز کے سامنے ملکہ جہاں سے تمام باتیں کہہ ڈالی تھیں یا اب اتنا محتاط ہو گیا کہ کنیز کو وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دے دیا۔ اب اسے یوں بھی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اب جو کچھ سننا تھا ملک نائب کو خود سننا تھا۔

بادشاہ نے ملکہ جہاں سے ہونے والی گفتگو سے ملک

نائب کو آگاہ کیا اور مشورے کا طالب ہوا۔

"خداوندِ نعمت! میں کئی دن سے چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا لیکن آپ کی طبیعت کے پیشِ نظر نہ کر سکا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔"

"آپ وہ سوچ بھی نہیں سکتے جو یہاں ہو گیا ہے۔ آپ نے مجھے بلا لیا ورنہ میں خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ خضر خاں اور شادی خاں کسی وقت بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔"

"ملک کافور (ملک نائب) تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"پوری تحقیق کے بعد کہہ رہا ہوں۔ میں ان لوگوں تک پہنچ چکا ہوں جو خضر خاں کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"کیا ہم نے تمہیں اتنا با اختیار نہیں بنا دیا ہے کہ تم ان لوگوں کو سزا دو؟"

"حضور، میرے اختیارات کے باوجود خضر خاں میری پہنچ سے دور ہیں اور ان لوگوں کے پشت پناہ خضر خاں ہیں۔ اگر وہ کسی طرح یہاں سے دور چلے جائیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

بادشاہ اس کی ہر بات مان لیا کرتا تھا، یہ بات بھی مان لی اور خضر خاں کو سیر و شکار کے بہانے امروہہ کی طرف روانہ کر دیا اور چلتے وقت یہ بھی کہہ دیا کہ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں خود بلواؤں گا۔

خضر خاں نے اس وقت یہ منت مانی کہ اگر علاؤ الدین صحت یاب ہو گیا تو وہ امروہہ سے دہلی تک مشائخ کی زیارت کے لیے پیدل آئے گا۔

باپ کے حکم پر وہ امروہہ روانہ ہو گیا۔

ولی عہد درمیان سے ہٹ گیا تو ملک نائب کو موقع مل گیا۔ اس نے سازش کے پاؤں دراز کرنے شروع کر دیے۔ امراء سے ربط ضبط بڑھانے لگا۔ اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا لیکن بادشاہ پر اس کا اثر دیکھ کر سب اس سے ڈرنے لگے تھے۔ خضر خاں کے امروہہ چلے جانے کے بعد تو سب پر خوف طاری ہو گیا کہ جس شخص کے کہنے پر بادشاہ اپنے بیٹے کو دربار سے دور کر سکتا ہے، وہ کسی کے خلاف کچھ بھی کر سکتا ہے لہٰذا سب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اس سے بنا کر رکھی جائے۔

ملکہ جہاں نے بھی اس خطرے کو بھانپ لیا۔ الغ خاں اس کے ساتھ تھا۔ چند اور امیروں کو بھی اس نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب حدودِ شاہی میں واضح طور پر دو گروہ سامنے آ گئے۔ کچھ ملک نائب کے ساتھ تھے کچھ ملکہ جہاں کے ساتھ ہو گئے۔

یہ رسا کشی چل ہی رہی تھی کہ اچانک بادشاہ کی حالت سنبھلنے لگی۔ ملک نائب کو چال چلنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اس نے ایک سوار کو خضر خاں کے پاس امروہہ بھیجا۔

"خضر خاں، تمہاری منت پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ بادشاہ سلامت صحت یاب ہو گئے ہیں۔ تم حضور کے کہنے کے مطابق واپس چلے آؤ۔"

یہ پیغام جب خضر خاں کو ملا تو اس نے اپنے لشکر کو ساتھ لیا اور دہلی چلا آیا۔ یہ سفر اس نے اپنی منت کے مطابق پیدل طے کیا۔

وہ باپ کی صحت یابی کی خوشی میں فرمانِ شاہی کو بھلا بیٹھا تھا۔ علاؤ الدین نے اسے رخصت کرتے وقت یہ فرمایا تھا کہ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں بلواؤں گا۔ اس میں یہ شرط چھپی ہوئی تھی کہ خود مت چلے آنا۔

خضر خاں نے جیسے ہی محل میں قدم رکھا اور اس کے آنے کا شور مچا ملک نائب بادشاہ کے حضور پہنچ گیا۔ بادشاہ کی خاص کنیز دلبر بیگم اس وقت بھی کمرے میں موجود تھی۔

"حضور، آپ کے گوشِ مبارک تک ایک خاص خبر پہنچی۔"

"ہمیں اطلاع ہوئی ہے کہ ہمارا بیٹا خضر خاں امروہہ سے واپس آ گیا ہے۔ بس وہ سلام کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ اپنی ماں کے پاس ہوگا۔"

"گستاخی معاف، آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ شہزادہ آپ کی اجازت کے بغیر دہلی آیا ہے۔ کیا یہ شہزادہ حضور کی خودسری نہیں؟"

"وہ ہماری صحت یابی کی خوشی میں ہمارا فرمان بھول گیا ہوگا۔"

"مجھے تو یہ ڈر ہے کہ بلکہ تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ امیروں کے ساتھ مل کر کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دے۔"

ابھی بادشاہ کوئی جواب دینے بھی نہیں پایا تھا کہ خضر خاں کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ ملک نائب کو مجبوراً وہاں سے اٹھنا پڑا۔

چند دن نہیں گزرے تھے کہ ملک نائب، بادشاہ کی خدمت میں پھر حاضر ہو گیا۔

"میں نے پوری تحقیق کر لی ہے۔ خضر خاں نے پوری سازش تیار کر لی ہے۔ آج کل ہی میں حضور کے دشمنوں کی جان کو خطرہ ہے۔"

''ملک نائب، تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔''
''میں ان لوگوں تک پہنچ گیا ہوں۔ اس سازش میں شہزادہ خضر کے علاوہ شہزادہ شادی خاں، الغ خاں، ملکہ جہاں اور دوسرے کئی امیر شامل ہیں۔''
''کیا میں تم پر اعتبار کرلوں؟''
''مجھ پر اعتبار نہ کریں۔ میں گواہ پیش کرسکتا ہوں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔''
ملک نائب نے کام پکا کیا تھا۔ ہر بڑے آدمی کی کنیزوں اور غلاموں کو خرید لیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو بادشاہ کی کنیز خاص دلبر بیگم سے گواہی مانگی۔ اس نے جان کی امان مانگ کر ملکہ جہاں اور شہزادہ خضر کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بادشاہ کو آگاہ کیا۔ پھر چند غلاموں کو پیش کردیا جنہوں نے فرضی داستانیں بیان کرکے بادشاہ کو قائل کردیا۔ بادشاہ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے کسی اور ذریعے سے تصدیق کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اپنے دونوں بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کی گرفتاری کے احکام جاری کردیے۔ ان احکامات پر عملدرآمد خود ملک نائب کو کرنا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں خضر خاں اور شادی خاں کو گرفتار کرکے گوالیار بھیج دیا۔ ملکہ جہاں کو محل سے نکلوا کر کسی جگہ نظر بند کرادیا۔
اب وہ سیاہ سفید کا مالک تھا۔ تمام امیر اس کی خوشنودی کے لیے اس کے ساتھ مل گئے۔
ملک نائب کو اب جس شخص سے خطرہ ہوسکتا تھا، وہ الغ خاں حاکمِ گجرات تھا جو ان دنوں بادشاہ کے بلانے پر دہلی آیا ہوا تھا۔
ملک نائب نے بادشاہ کے ایسے کان بھرے کہ الغ خاں کی موت کا فرمان جاری کرالیا۔ اس کے قتل کے ساتھ ہی گجرات کی فوج نے بغاوت کردی مگر ملک نائب کو اس کی کیا پروا ہوسکتی تھی۔
ملک نائب کو جس جس سے خطرہ ہوسکتا تھا اس نے اس کے قتل کا فرمان جاری کرالیا۔
قتل و غارت گری کے اس بازار میں پورا ملک انتشار کا شکار ہوگیا۔ گجرات و دکن خاص طور پر اس ہنگامے کی لپیٹ میں تھے۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ علاؤ الدین کے اختیار سے نکل گئے۔ ملک نائب بھی بے بس نظر آرہا تھا۔
سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے کے مصداق بادشاہ پر ملک نائب کی حقیقت کھل گئی تھی لیکن وقت گزرنے کے بعد اب ملک نائب بھی ایسا خودسر ہوگیا تھا کہ بادشاہ کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ بادشاہ کے جتنے ہمدرد تھے خود بادشاہ کے حکم سے قتل کردیے گئے تھے۔ اب چلے ہوئے تیر، کمان میں واپس نہیں آسکتے تھے۔ اس صدمے نے بادشاہ کو ایک مرتبہ پھر بیمار کرڈالا۔ اب جو وہ بستر پر گرا تو اٹھ نہ سکا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرگیا۔
ملک نائب یہی چاہتا تھا۔
بادشاہ کی وفات نے سب کچھ ملک نائب کے ہاتھ میں دے دیا۔
ملک نائب نے بادشاہ کی تدفین کے دوسرے ہی روز تمام امراء اور ارکانِ سلطنت کو جمع کیا اور مرحوم بادشاہ کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔
''میں اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو ولی عہدی سے معزول کرتا ہوں اور اس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔''
تمام امراء کو اس وصیت نامے پر شک تھا لیکن کسی کو اختلاف کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ وصیت نامہ اس لیے جعلی معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ شہاب الدین کی عمر صرف سات سال تھی۔ وہ کسی طرح بھی امورِ مملکت سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے تخت پر بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ پس پردہ ملک نائب ہی بادشاہ ہوگا۔ تمام کام اسی کے حکم سے انجام پائیں گے۔ شہزادہ قطب الدین مبارک شاہ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان تھا اور ہر طرح سے بادشاہت کے قابل تھا۔ وہ اگر تخت پر بیٹھتا تو ملک نائب عضوِ معطل ہوکر رہ جاتا۔ اسی لیے وصیت نامے میں اس کا نام نہیں ڈالا گیا تھا بلکہ اسے ایک جگہ قید کردیا گیا تھا تاکہ وہ کوئی دعویٰ نہ کرسکے۔ شہاب الدین کے تخت پر بیٹھتے ہی ملک نائب نے شاہی احکامات اپنے نام سے جاری کرنا شروع کردیے۔ پہلا حکم یہ جاری کیا کہ خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کردیا جائے۔ ایک عہدیدار کو گوالیار بھیجا گیا۔ اس شخص نے گوالیار پہنچتے ہی دونوں شہزادوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں۔
اب ملک نائب کو مبارک شاہ کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ اس کی موجودگی میں اس کی بادشاہت کو کسی وقت بھی خطرہ ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

مبارک شاہ ایک ایسے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا جو کسی طرح بھی اس کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اس کی والدہ بی بی مالک اس کے برابر پڑے دوسرے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ دونوں کے درمیان وہی باتیں ہورہی تھیں جو روز ہوا کرتی تھیں۔

ماضی کی یادیں اور آنے والے دنوں کا دھڑکا۔ دروازے پر کسی نے ہلکی ہلکی دستک دی۔ بی بی مالک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر کنیز دلبر بیگم کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اس طرح اندر آئی جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بی بی مالک نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''خیر تو ہے دلبر بیگم...... اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''میں نے بادشاہ سلامت کی برسوں خدمت کی ہے اور آپ اسی مرحوم بادشاہ کی زوجہ ہیں اور مبارک شاہ ان کے صاحبزادے۔''

''تو کیا تم مجھے یہی بتانے آئی تھیں؟''

''چھوٹی بیگم صاحبہ، آگے تو سنیے۔ میں یہ بتانے آئی ہوں کہ شہزادہ حضور کی جان خطرے میں ہے۔''

''کیا بکتی ہے۔''

''نامراد خواجہ سرا ملک نائب دو شہزادوں کو اندھا کروا چکا ہے اور اب مبارک شاہ پر دانت جمائے بیٹھا ہے۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ شہزادے کو قتل کرا دے یا اندھا کرا دے۔''

''تیرا اللہ بھلا کرے کہ تو نے بر وقت مجھے آگاہ کر دیا۔ بس تو میرا ایک کام کر دے۔ مجھے کسی طرح شیخ نجم الدین تک پہنچا دے۔''

''میں کیا جانوں یہ کون صاحب ہیں اور کہاں ہیں۔''

''ہیں ایک صاحب کشف بزرگ۔''

''اس کے لیے تو محل سے باہر جانا پڑے گا۔''

''ہاں، بس تو ایک پالکی کا انتظام کر دے۔''

''قدم قدم پر پہرے لگے ہوئے ہیں۔ یہ انتظام کس طرح ہوگا۔ اچھا میں کچھ کرتی ہوں۔''

دلبر بیگم نے ملک نائب کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ اسے اپنی بہن سے ملنے کے لیے محل سے باہر جانا ہے۔ ملک نائب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چند گھنٹوں کی تو بات تھی، اس نے اجازت دے دی۔ دلبر بیگم پالکی میں بیٹھی اور پالکی والوں کے ہاتھ میں اشرفی رکھ کر کچھ دیر کے لیے پالکی کو بی بی مالک کے ہاں رکوایا۔ بی بی مالک سوار ہوگئیں اور پالکی محل سے باہر آ گئی۔ بی بی مالک شیخ نجم الدین کی خانقاہ سے واقف تھیں۔ پالکی کو خانقاہ کے سامنے رکوایا۔ دلبر بیگم پالکی میں بیٹھی رہی اور بی بی مالک خانقاہ کے اندر چلی گئیں اور شیخ صاحب کی خدمت میں فریادی ہوئیں۔

''ملک نائب نے محل میں بڑی قیامت مچائی ہوئی ہے۔ خضر خاں اور شادی خاں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا چکا ہے اور اب مبارک شاہ کو اندھا کرانے کی فکر میں ہے۔ آپ ہی بتائیے میرے بچے کا کیا قصور ہے۔ آپ سے امداد کی طالب ہوں۔''

شیخ نجم الدین نے تمام باتیں نہایت غور سے سنیں اور بی بی مالک کو تسلی دی۔

''ملک نائب اپنے ناپاک ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو اور کسی غیبی مدد کا انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر شیخ صاحب نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور اسے الٹ کر دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا اور کہا۔

''اب میں اس ٹوپی کو اسی وقت سیدھا کروں گا جب مبارک شاہ تخت پر بیٹھے گا۔''

بی بی مالک مطمئن ہو کر اپنے مکان پر آ گئیں۔

اسی رات، ہر رات کی طرح ملک نائب چند خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں مشغول تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ بی بی مالک شیخ نجم الدین کے پاس گئی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے ساز باز کر رہی ہیں۔

''میں مبارک شاہ کو زندہ ہی نہیں چھوڑوں گا کہ وہ بادشاہ بنے۔'' ملک نائب اتنی زور سے چیخا کہ وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے سن لیا۔ یہ شکر ہوا کہ دلبر بیگم کا نام درمیان میں نہیں آیا ورنہ اس کی خیر نہیں تھی۔

اس رات ملک نائب نے خواجہ سراؤں کی اس جماعت سے خفیہ ملاقات کی جو ہزار ستون کی حفاظت پر متعین تھی اور انہیں مبارک شاہ کے قتل پر آمادہ کر لیا۔

یہ خواجہ سرا موقع دیکھ کر مبارک شاہ کے سر پر پہنچ گئے۔ مبارک شاہ جانتا تھا کہ ان لالچیوں کو کیسے رام کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا جڑاؤ گلوبند اتارا اور اس جماعت کی طرف اچھال دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ میرا باپ کیسا فیاض تھا اور اس نے تمہارے ساتھ کیسی کیسی مہربانیاں کی تھیں۔ میں بھی اسی کا بیٹا ہوں۔ اگر تم مجھے قتل کرو گے تو نمک حرامی کے مرتکب ہوگے۔ دین و دنیا میں تمہاری سرخروئی اسی میں ہے کہ تم اپنے محسن کی یادگار کو زندہ رہنے دو۔ اگر ملک نائب کے کہنے پر تم مجھے قتل بھی کر دو تو تمہیں کیا حاصل ہوگا...... تھوڑا سا انعام۔ اس کے برخلاف اگر میں زندہ رہا اور بادشاہ بن گیا تو تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا اور تمہیں نوازتا رہوں گا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہو تو میرا گلا حاضر ہے۔''

یہ خواجہ سرا اس کی تقریر سے اتنے متاثر ہوئے اور ایسی شرمندگی ہوئی کہ سر جھکا کر واپس چلے گئے۔ یہاں سے وہ سیدھے اپنے سرداروں بشیر اور مبشر کے پاس پہنچے اور سارا قصہ بیان کیا۔ یہ شیخ نجم الدین کی دعاؤں کا اثر تھا یا مبارک شاہ کی قسمت میں بادشاہت لکھی تھی کہ ان سرداروں کے دل بھی نرم ہو گئے اور انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ملک نائب اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے۔

جب رات خوب ڈھل گئی۔ محل کے دروازے بند ہو گئے اور لوگ خوابِ غفلت میں ڈوب گئے تو خواجہ سراؤں کے سردار اپنی جماعت کو لے کر ملک نائب کے محل میں گھس گئے۔ ملک نائب اس وقت ہتھیار اتار چکا تھا۔ اس کے محافظ بھی بے فکر ہو کر سو گئے تھے۔ خواجہ سراؤں نے محافظوں کو قتل کیا اور ملک نائب کی خواب گاہ میں گھس کر اس کا سر اتار لیا۔ شاہین خاں بھی اس کے ساتھ قتل ہوا۔

یہ جماعت وہاں سے روانہ ہوئی اور مبارک شاہ کو قید سے چھڑا لیا۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو محل میں شور مچ گیا۔ ملک نائب کا قتل معمولی بات نہیں تھی لیکن امراء اور ارکینِ سلطنت اس سے تنگ آ چکے تھے۔ کسی صورت اس کا خاتمہ چاہتے تھے۔ یہ کام خواجہ سراؤں نے کر دکھایا تو کسی طرف سے بھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی بلکہ بشیر اور مبشر کے شکر گزار ہوئے اور مبارک شاہ کو سات سالہ سلطان شہاب الدین کا نائب مقرر کر دیا۔

شہاب الدین بدستور بادشاہ تھا۔ مبارک شاہ اس کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا تھا لیکن اسے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ بادشاہ کوئی اور ہو اور وہ نائب بنا رہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے ہمدرد خواجہ سراؤں کو اپنے ساتھ ملایا اور ظلم کی انتہا کر دی۔ سات سالہ شہاب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔

اب خلجی خاندان کی حکومت قطب الدین مبارک شاہ کے ہاتھ میں تھی۔

مبارک شاہ خواجہ سراؤں کی مدد سے تخت نشین ہوا تھا اس لیے خواجہ سراؤں کی جماعت اس کے تخت پر بیٹھتے ہی اس پر حاوی ہو گئی۔ بادشاہی رعب کا خاتمہ ہو گیا۔ بڑے بڑے امراء کی عزت خاک میں مل کر رہ گئی۔ شاہی محل تاڑی خانے کا منظر پیش کرنے لگا۔ یہ خواجہ سرا بعض اوقات تو خود مبارک شاہ سے گستاخی سے پیش آتے تھے۔ بھرے دربار میں بلا اجازت چلے آتے تھے۔ مبارک شاہ ان کی ناشائستہ حرکات دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا لیکن ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا اور جب ان کی ناشائستہ حرکات حد سے تجاوز کرنے لگیں تو اس نے خود کو بالائے طاق رکھا اور ایک دفعہ خواجہ سراؤں کے دونوں سرداروں بشیر اور مبشر کو دھوکے سے اپنے پاس بلوا کر قتل کرا دیا اور ان کے ساتھیوں کو ملک کے مختلف حصوں میں بھیج کر ان کی قوت کو منتشر کر دیا۔

اسے معلوم تھا کہ بہت سے امیر ان خواجہ سراؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔ انہیں خوش کرنے کے لیے ہر امیر کو خلعت و انعام سے نوازا۔ ایسی دریا دلی کا مظاہرہ کیا کہ سب اس کا دم بھرنے لگے۔

انعام و اکرام کی اس بارش میں اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ کس زمین کو کتنی بارش کی ضرورت ہے۔ ملک شادی، نائب خاص جو علاؤالدین خلجی کا پروردہ تھا، اسے خسرو خاں کا خطاب دیا گیا۔ معشوق پرستی میں مبتلا ہو کر خسرو خاں کے ناز اٹھانے لگا۔ اسے معتبر امراء کا سردار بنا کر لوازماتِ شاہی عطا کیے اور اپنے لیے دوسرا ملک نائب پیدا کر لیا۔ خسرو خاں کا ہر مشورہ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ خسرو خاں کی سواری اس شان سے نکلتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا خود مبارک شاہ سوار ہو کر نکلا ہے۔ مبارک شاہ کے ہمدرد امیر اسے ملک نائب کا دورِ اقتدار یاد دلاتے تھے لیکن خسرو خاں کا جادو ایسا تھا کہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

بی بی مالک ایک روز پالکی میں سوار ہوئیں اور مبارک شاہ کے محل میں پہنچ گئیں۔ وہ خسرو خاں کے اقتدار سے خوف زدہ تھیں اور اسی سلسلے میں مبارک شاہ سے بات کرنے آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مبارک شاہ بادشاہ بن کر نہیں بیٹا بن کر ان سے بات کرے گا۔

خسرو خاں کے آدمیوں نے مبارک شاہ کے محل کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ بادشاہ کی والدہ ملاقات کے لیے آئی ہیں تو انہوں نے راستہ دینا چاہا لیکن ان کے سردار نے انہیں روک دیا۔

''خسرو خاں سے اجازت لیے بغیر ہم آپ کو اندر نہیں بھیج سکتے۔''

''میں مبارک شاہ کی ماں ہوں۔''

''ہم آپ کا احترام کرتے ہیں لیکن حکم یہی ہے۔''

''پھر جلدی اجازت لے کر آؤ۔''

''آدمی دوڑا دیا ہے۔''

بی بی مالک اس وقت تک پیچ و تاب کھاتی رہیں جب تک خسرو خاں کی طرف سے اجازت نہیں آ گئی۔ وہ نہایت غصے کے عالم میں مبارک شاہ کے پاس پہنچیں۔

''بادشاہ تم ہو یا خسرو خاں؟''

''یہ سوال پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟''

''جب تک خسرو خاں کی طرف سے اجازت نہیں آ گئی، ہم اپنے بیٹے سے ملاقات کے لیے بھی نہ آ سکے۔''

''وہ نائبِ خاص ہیں۔ تمام انتظامات ان کے ہاتھ میں ہیں۔''

''تم بادشاہ نہیں، میرے بیٹے ہو۔''

''یہ شاہی محل ہے، یہاں سب کے لیے قانون برابر ہیں۔''

''قطب الدین!'' بی بی مالک نے آواز بلند کی۔ ''ہمیں تم سے اس لہجے کی امید نہیں تھی۔''

''آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے کس لیے زحمت فرمائی؟''

''پہلی بات تو یہ کہ جب سے تم بادشاہ بنے ہو ہم تمہارے سلام کو ترس گئے ہیں۔''

''اور دوسری بات؟''

''دوسری بات یہ کہ ہم خسرو خاں کے بڑھتے ہوئے اختیار کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے والد نے ملک نائب پر حد سے زیادہ اعتماد کیا تھا جس کا نتیجہ پوری سلطنت کو بھگتنا پڑا۔ اب وہی غلطی خسرو خاں کی شکل میں تم دہرا رہے ہو۔''

''اماں جان، آپ کو بے جا تشویش ہے۔ وہ نہایت اہل امیر ہیں۔ ان کی وفاداری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔''

''جس اندیشے کا میں نے اظہار کیا ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کرو۔ عہدے ضرور بانٹو لیکن کسی پر ضرورت سے زیادہ اعتبار مت کرو۔''

''آپ کے مشوروں کا شکریہ۔ کیا اچھا ہے کیا برا، میں خوب سمجھتا ہوں۔ سلطنت کے کاموں میں عورتوں کا عمل دخل قطعی مناسب نہیں۔''

ماں بیٹوں کی یہ ملاقات تلخی پر ختم ہوئی۔ خسرو خاں کا عمل دخل اسی طرح برقرار رہا۔

خسرو خاں کو اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ ماں بیٹوں کی ملاقات ہوئی ہے۔ دلبر بیگم کی زبانی تفصیلات کا علم بھی ہو گیا تھا لیکن یہ وقت بادشاہ سے شکایت کرنے کے لیے مناسب نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ ترکیب اسی وقت کارگر ہو سکتی تھی جب خسرو خاں، مبارک شاہ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب مبارک شاہ کی جوانی کو رنگین سہاروں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ سہارے اس وقت اور رنگین ہو جاتے ہیں جب بادۂ رنگیں کا دور چلے۔ مبارک شاہ ایسی مجالس کا دلدادہ پہلے سے تھا، بس اب اسے اس سمندر میں غرق کرنے کے لیے کسی تحریک کی ضرورت تھی۔ نادرہ بیگم شہر کی مشہور طوائف تھی۔ خسرو خاں کا اس کے پاس آنا جانا تھا۔ وہ اسے کوٹھے سے اٹھا کر محل میں لے آیا اور مبارک شاہ کے حضور پیش کر دیا۔ نادرہ بیگم نے صورت بے مثال پائی تھی۔ موسیقی پر پوری دسترس تھی۔ رقص کرتی تو بدن کا ایک ایک حصہ منہ سے بولتا تھا۔ وہ واقعی بادشاہوں کے لائق تھی اور بادشاہوں کے پاس آ گئی تھی۔ مبارک شاہ نے اس کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ فوراً لگا لیا اور اسے اپنی حضوری کا اعزاز عطا کر دیا۔ خسرو خاں کے کہنے پر ساقی گری کا اعزاز بھی اسے مل گیا۔ اس سے پہلے ایک کنیز چھوٹی بیگم یہ فرض انجام دے رہی تھی۔

نادرہ بیگم خسرو خاں کی ہدایت یافتہ تھی۔ اسے یہ شغل محض شغل کی طرح انجام نہیں دینا تھا بلکہ مبارک شاہ کو ایسی مدہوشی میں مبتلا کرنا تھا جو ہر وقت قائم رہے۔ پہلی ہی رات اس نے اداؤں کے وہ جوہر دکھائے کہ پینے سے پہلے ہی مبارک شاہ کے ہوش اڑ گئے۔ ساقی کو معلوم ہوتا ہے کہ ہوش والے میں ہوش کتنا ہے۔ ہاتھ کب دراز کرنا ہے، مٹھی کب بند کرنی ہے لیکن نادرہ بیگم نے وہ فیاضی دکھائی کہ بادشاہ کا سر کنیز کے قدموں پر جھک گیا۔

''سنو لڑکی، تمہارا نام کیا ہے؟'' مبارک شاہ نے بوجھل لہجے میں ٹوٹتے لفظوں کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

''عالی جاہ، بندی کو نادرہ بیگم کہتے ہیں۔''

''تم یہاں آئیں کیسے؟''

''حضور کی بندہ نوازی کھینچ لائی ہے۔''

''باتیں بہت اچھی کرتی ہو۔''

''یہ باتیں مجھے آپ کی حوصلہ افزائی نے سکھائی ہیں۔''

''تم باتیں کرتی رہو، ہم سن رہے ہیں۔'' مبارک شاہ نے کہا اور اس کی آغوش میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

نادرہ پریشان تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ اس کی ذرا سی جنبش بادشاہ کے آرام میں خلل ڈال سکتی تھی جو کسی عتاب کا شاخسانہ بن سکتا تھا۔ اس سے تو کہا گیا تھا کہ جب بادشاہ کو نشہ ہو جائے تو وہ دروازے پر کھڑے خواجہ سراؤں میں سے کسی کو بلا لے، وہ اسے خواب گاہ تک پہنچا دیں گے لیکن اب تو

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آواز تک نہیں دے سکتی تھی۔

جب کچھ دیر گزر گئی اور بادشاہ کی نیند گہری ہوگئی تو انہوں نے اس کا بھاری سر اپنی آغوش سے پیچھے سرکا دیا اور دروازے پر آکر خواجہ سراؤں کو بتایا۔ انہوں نے بھی معذوری ظاہر کی کہ اگر اس حال میں بادشاہ سلامت کو ان کی خواب گاہ تک پہنچا دیا گیا اور راستے میں ان کی نیند اچٹ گئی تو غضب ہی تو ہوجائے گا۔

''پھر کیا کیا جائے؟''

''انہیں یہیں آرام کرنے دیں۔ آپ بھی ان کے پاس رہیں۔ اگر وہ خود بیدار ہوگئے تو ہمیں بلا لیجیے گا، ہم انہیں ان کی خواب گاہ تک لے جائیں گے۔''

نادرہ بیگم نے وہ رات وہیں گزاری۔ اس خوف سے سوئی بھی نہیں کہ کہیں بادشاہ بیدار نہ ہوجائے۔ صبح ہوئی اور ذرا دن چڑھا تو کنیزوں کی قطار اندر داخل ہوئی۔ کوئی بادشاہ کا منہ دھلانے پر مقرر تھی، کوئی غسل کراتی تھی، کوئی لباس تبدیل کرواتی تھی۔ اس چہل پہل نے بادشاہ کو بیدار ہونے پر مجبور کردیا۔ خمار ابھی تک باقی تھا۔ آواز میں لکنت ابھی تک باقی تھی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان نے پریوں کے ہجوم کو ٹٹولا اور پھر آنکھیں نادرہ بیگم پر جما دیں۔

''ہم دن میں نہیں پیتے۔ تم اس وقت یہاں کیوں آگئیں؟''

''حضور! میں تو رات سے آپ کے پاس ہوں۔''

''اب تم جاؤ لیکن رات کو ضرور آنا۔''

وہ وہاں سے نکلی اور سیدھی خسرو خاں کے پاس پہنچ گئی۔ کامیابی کی داستان سنا کر انعام وصول کیا اور اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔

نادرہ بیگم کو بادشاہ نے حکم دیا تھا۔ رات ہوتے ہی اسے بادشاہ کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ اپنی قیام گاہ سے نکلی اور خسرو خاں کے محل تک پہنچ گئی۔ صرف ایک رات میں وہ عام سے خاص ہوگئی تھی۔ اس کی پالکی کے چاروں طرف محافظ چل رہے تھے۔ پالکی رکتے ہی دو خواجہ سراؤں نے اسے سہارا دے کر پالکی سے باہر نکالا اور خسرو خاں کے حضور پہنچا دیا۔ یہاں سے اسے مزید ہدایات لے کر بادشاہ تک جانا تھا۔

وہ خسرو خاں کے پاس پہنچی تو وہاں ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تبسم پھیل گیا کہ بادشاہ کے پردے میں خسرو خاں بھی رنگوں میں نہار رہے ہیں، جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

''نادرہ بیگم، یہ چھوٹی بیگم ہیں۔ چھوٹی بیگم اس لیے ہیں کہ بڑی بیگم یعنی ان کی بڑی بہن عمرہ کرنے گئی ہوئی ہیں۔ وہ گناہ بخشوا کر آجائیں تو پھر یہ جائیں گی۔ وہ جب تک نہیں آجاتیں، یہ بادشاہ کا دل بہلائیں گی۔''

''حضور نے تو ہمیں تاکید کی تھی کہ جب درختوں سے دھوپ اترے تو تم ہمارے محل میں اتر آنا۔''

''ہم تمہاری حشر سامانیوں سے انکار کب کررہے ہیں۔ چھوٹی بیگم کو لے کر تم ہی تو بادشاہ کے پاس جاؤ گی۔''

''تو کیا چھوٹی بیگم بھی جائیں گی؟''

''بادشاہ کی ساقی گری کے لیے شاید دو ہاتھ کم پڑ رہے تھے۔''

نادرہ بیگم کو رقابت کا احساس ہوا تھا لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب ہر روز ایک نئی چھوٹی بیگم کو ساتھ لے جانا ہوگا لہٰذا کڑھنے سے کیا فائدہ۔

نادرہ بیگم کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ہر رات ایک نئی چھوٹی بیگم بادشاہ کے حضور پہنچنے لگی۔ ایک خسرو خاں پر ہی کیا منحصر، امراء کو بھی کھیل ہاتھ لگ گیا تھا۔ فاحشہ عورتوں کو جگہ جگہ سے تلاش کرتے اور بادشاہ کی خلوت کا حصہ بنا کر اپنا کام نکلواتے۔ ایسے مواقع پر ہمدرد مشیر کام آتے ہیں۔ اسے راہِ راست پر لانے کا کام خسرو خاں کرسکتا تھا لیکن وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ بادشاہ شراب وشباب میں ڈوبا رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ کا محل بازاری عورتوں سے بھر گیا۔ اس کی فاسقانہ حرکتیں اس حد تک بڑھ گئیں کہ وہ اکثر اوقات عورتوں کی طرح زیور پہن لیتا اور اسی عالم میں مجمع میں آکر لوگوں سے بات چیت کرلیا کرتا تھا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ وہ کس حلیے میں ہے۔ یہ فاحشہ عورتیں اتنی بے باک ہوگئی تھیں کہ عین الملک اور قراء بیگ جیسے نامور امراء سے ہنسی مذاق کرکے ان کی بے عزتی کیا کرتی تھیں۔ بادشاہ اس انداز سے ان کی بے عزتی ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں تھی کہ یہ امراء اس وقت تو خاموش ہیں لیکن کبھی وقت پڑا تو وہ اس کا ساتھ ہرگز نہیں دیں گے۔

ان فاحشہ عورتوں کی ایسی حرکتوں کے باعث وہ اور اس کا خاندان اس تیزی سے تباہی کی طرف جارہا تھا کہ ان عورتوں ہی میں سے بعض کو اس کی اس حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک گلبدن خاتون بھی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہوتا تھا کہ ایک مسلمان بادشاہ تیزی سے تباہ ہورہا ہے۔ اس نے اپنے قد سے بڑا بیڑا اٹھایا۔ رات کے

اندھیرے میں بی بی مالک سے ملنے گئی اور ان کے سامنے اس ارادے کا ذکر کیا جو بادشاہی محل میں آج تک کسی نے نہ کیا ہوگا۔ بادشاہت کی دنیا میں بادشاہ کے کردار کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالنا کسی سازش کی داغ بیل ڈالنے کے برابر تھا اور وہ یہی کر رہی تھی۔

''بادشاہ سلامت بازاری عورتوں کے ہاتھوں تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہر وہ قبیح عادت اختیار کرلی ہے جو ہرگز انہیں زیب نہیں دیتی۔ اگر ان کی حالت یہی رہی تو کوئی بھی آگے بڑھے گا اور بادشاہت پر قبضہ کرلے گا۔ آپ ان کی والدہ ہیں اس لیے میں یہ بات آپ سے کہہ رہی ہوں۔''

''بی بی! تم جو اتنی پارسا بن رہی ہو تو یہ کہو کہ تم خود کس طبقے سے تعلق رکھتی ہو اور بادشاہ کو بگاڑنے میں کیا تمہارا ہاتھ نہیں؟''

''میں اپنی پارسائی بیان نہیں کر رہی ہوں، بس اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ کوئی ہو جو بادشاہ کو راہِ راست پر لے آئے۔ آپ ان کی والدہ ہیں اس لیے آپ کے پاس چلی آئی۔''

''اے لڑکی! سچ سچ بتا۔ کس نے تجھے میرے پاس بھیجا ہے۔ میرے بیٹے کے خلاف کیا سازش تیار ہو رہی ہے؟''

''آپ یقین فرمائیں، میں کسی سازش کا حصہ نہیں ہوں۔''

''تجھے یہاں لے کر کون آیا تھا؟''

''خسرو خاں۔''

''بس تو وہی تیرے خلاف تحقیقات کرے گا بلکہ میں اس سے پوچھوں گی اس نے کیسی گستاخ لڑکیوں کو محل میں جگہ دے رکھی ہے۔''

''بی بی صاحبہ، آپ کو خدا کا واسطہ۔ مجھے محل سے نکال دیجیے۔ میں چپ چاپ اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں گی۔ خسرو خاں تک میری شکایت نہ پہنچایئے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''نہ تو میں تیری خسرو خاں سے شکایت کروں گی اور نہ محل سے باہر نکالوں گی بس تو آج کے بعد سے مبارک شاہ کی شکایت کسی سے نہیں کرے گی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تو اپنی سادگی میں کسی سازش کا حصہ نہ بن جائے۔''

''میں سمجھ گئی۔ کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں سمجھ گئی۔''

وہ اتنی گھبرا گئی تھی کہ ایک جملے کو بار بار دہرا رہی تھی۔ بی بی مالک نے اسے تسلی دی اور وہ رخصت ہوگئی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی بی بی مالک کی کنیز محل سے نکلی اور ملک اسد الدین کے دروازے پر پہنچ گئی۔ محل کے دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے اسے آسانی سے جانے دیا تھا۔ ملک اسد الدین کی خواب گاہ کا دروازہ بھی... بہ آسانی صرف ایک دستک پر کھل گیا تھا۔

''کہو گلاب جان، کیا خبر لائیں؟''

''خبر تو ایسی ہے سرکار کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔''

''جلدی بتاؤ بات کیا ہے۔''

''گلبدن خاتون نامی ایک لڑکی بی بی مالک کے پاس آئی تھی۔''

''کون گلبدن خاتون؟''

''ان بازاری عورتوں میں سے ایک ہے جو بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے مقرر ہیں۔ سنا ہے نئی آئی ہے اور ساقی گری کے فرائض آج کل اسی کے ہاتھ میں ہیں۔''

''اسے بی بی مالک سے کیا کام پڑ گیا؟''

''وہ یہ کہنے گئی تھی کہ بادشاہ سلامت بازاری عورتوں کے ہاتھوں بگڑتے جا رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ لڑکی مبارک شاہ کے خلاف ہے۔''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''اگر خلاف نہیں بھی ہے تو بھی ہمارے کام آسکتی ہے۔''

ملک اسد الدین نے اپنے گلے سے ہار اتارا اور گلاب جان کی طرف اچھال دیا۔ ''اب تم جاؤ۔ گلبدن خاتون کو ہم خود طلب کرلیں گے۔''

ملک اسد الدین شاہی خاندان کا فرد تھا۔ رشتے میں مبارک شاہ کا چچا ہوتا تھا۔ مبارک شاہ کی بے راہ روی کو دیکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اپنی بادشاہت کے خواب دیکھنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح مبارک شاہ کو قتل کرا دے۔ ایک مرتبہ اس نے یہ جسارت کی بھی تھی لیکن وقت سے پہلے سازش پکڑی گئی تھی۔ گلبدن خاتون کے عزائم دیکھ کر اس کے دل میں شوقِ بادشاہت نے پھر کروٹ لی تھی۔

بازاری عورتوں سے حرم شاہی بھرا پڑا تھا۔ اتنی عورتوں میں گلبدن خاتون کی تلاش اور اسے اپنے حضور تک لے کر آنا آسان نہیں تھا لیکن اس کے لیے زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ یہ کام اس وقت اور آسان ہوگیا جب گلبدن خاتون نے ایک نامور امیر عین الملک سے ملاقات کی۔ اس وقت اتفاق سے ملک اسد الدین بھی عین الملک کا ہم صحبت تھا۔ گلبدن خاتون مبارک شاہ کے سلسلے میں بات کرنے عین الملک کے پاس آئی تھی لیکن ظاہر ہے وہ اس کی حوصلہ

افزائی نہیں کر سکتا تھا۔
''ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ بازاری عورتیں بادشاہ کی شہ پا کر ہم امیروں کی بے عزتی کرتی ہیں لیکن ہم بادشاہ کے خوف سے خاموش رہتے ہیں۔ جب ہمارا یہ عالم ہے تو تم کیوں اپنی جان گھلا رہی ہو۔ اس ارادے سے باز آجاؤ اور اگر تم نے اپنی اصلاح کر ہی لی ہے تو خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔ کسی بیماری کا بہانہ کرو اور محل سے چلی جاؤ۔''
''اب یہی کرنا پڑے گا۔ میں نے حضور کی والدہ سے بھی ملاقات کی تھی۔ مجھے تو وہ بھی بے بس نظر آئیں۔''
''خسرو خاں کے علاوہ وہ کسی کی نہیں مان سکتے اور خسرو خاں انہیں سیدھی راہ کیوں دکھائیں گے۔ انہیں اس راہ پر ڈالنے میں خسرو خاں ہی کا تو ہاتھ ہے۔''
''اس میں خسرو خاں کا کیا مفاد ہے؟'' گلبدن نے دریافت کیا۔
''اس محل کی دیواروں کے بھی کان ہیں بی بی۔ ادھر منہ سے بات نکلی ادھر پرائی ہوئی۔ اس لیے بعض باتیں نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ یہاں باتوں کے معنی خود بخود ظاہر ہوتے ہیں تلاش نہیں کیے جاتے۔''
گلبدن خاتون کی پالکی تیار کھڑی تھی۔ ادھر وہ پالکی میں بیٹھی ادھر ملک اسدالدین نے اجازت چاہی۔ پالکی اپنی راہ ہو لی۔ ملک اسدالدین ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کس طرف جائیں۔
گلبدن خاتون کو کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ کوئی سوار ان کی پالکی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ کسی خطرے نے انہیں آواز دی۔ انہوں نے پالکی سے باہر جھانکا۔ ایک سوار دائیں اور ایک بائیں تھا۔ وہ بھی کوئی معمولی خاتون نہیں تھیں۔ وہ اس وقت جان بوجھ کر محافظ ساتھ نہیں لائی تھیں ورنہ محافظ تو ان کے ساتھ بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر ان سواروں کو کچھ نہیں کہا کہ ساتھ چلنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر کچھ کہتے ہیں تو پھر دیکھا جائے گا۔ ایک جگہ پہنچ کر ان سواروں نے پالکی اٹھانے والوں کو بائیں طرف مڑنے کا حکم دیا۔ ''ہمیں تو دائیں طرف جانا ہے۔'' پالکی اٹھانے والوں نے کہا۔
یہ شور سنا تو گلبدن خاتون پالکی سے باہر نکل آئی۔ وہ کوئی عفت مآب خاتون تو تھی نہیں کہ شرم و حیا کی پتلی بنی پالکی میں بیٹھی رہتی۔ وہ بادشاہ کی سر چڑھی تھی۔ کسی کو کیا خاطر میں لاتی۔ پالکی سے اترتے ہی سواروں پر سوار ہو گئی۔
''کیڑے مکوڑوں کی اوقات والو! تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ میری پالکی روکو۔''
''ہم واقعی کیڑے مکوڑے ہیں۔ ہمیں اتنی جرأت بھی نہیں کہ اپنی مرضی سے آپ کی پالکی روکیں۔ ہم تو ملک اسدالدین کے حکم پر آئے ہیں۔''
''کون ملک اسدالدین؟''
''مبارک شاہ کے چچا۔''
''یہ حضرت ابھی تو ہم سے مل کر رخصت ہوئے ہیں۔ عین الملک کے پاس یہ بھی تشریف فرما تھے۔ اب انہیں ہم سے کیا کام پڑ گیا؟''
''ہم نوکروں کو رائے زنی کا حق نہیں۔ آپ خود ان سے مل لیں۔ شاید اس میں آپ ہی کا کوئی فائدہ ہو۔''
''اگر اسی وقت میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو ملک اسدالدین یہ سمجھے گا کہ میں اس سے ڈر کر چلی آئی ہوں...... اس سے کہنا میں جب بھی آئی، اپنی مرضی سے آؤں گی۔''
گلبدن خاتون نے اپنے نوکروں سے کہا کہ پالکی اٹھائیں اور پالکی میں بیٹھ گئی۔ اس کی شخصیت میں ایسا رعب تھا کہ سواروں کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ الٹے قدموں لوٹ گئے۔
گلبدن خاتون نے ملک اسدالدین کے پاس جانے سے انکار تو کر دیا تھا لیکن یہ فکر ضرور لاحق تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کیا کہنے کو بلایا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ خوب تیار ہوئی اور ملک اسدالدین کے محل پر پہنچ گئی۔
''سنا ہے آپ بادشاہ مبارک شاہ کے بہت خلاف ہیں۔''
''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟''
''ڈرو مت۔ یہاں ہونے والی بات کہیں اور نہیں جائے گی۔''
''آپ نے غلط سمجھا۔ میں مبارک شاہ کے خلاف نہیں ہوں۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ اسے بری عادتوں سے چھٹکارا مل جائے تاکہ وہ امورِ مملکت کی طرف توجہ دے سکے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ہاتھوں مسلمانوں کی حکومت ہی کا خاتمہ ہو جائے اور کوئی راجا اس کی حکومت پر قابض ہو جائے۔''
''کسی راجا کی یہ مجال نہیں لیکن اتنا بتا دوں کہ مبارک شاہ کو برائیوں سے چھٹکارا موت کے بعد ہی مل سکتا ہے۔''
''مایوسی کفر ہے۔''
''میں مایوس نہیں ہوں بلکہ میں نے ایک تدبیر سوچی ہے اور تم اس میں اہم کردار ادا کر سکتی ہو۔''

"آپ جو کہیں گے، میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"تمہیں یقیناً ایک ایسا بادشاہ درکار ہوگا جو بری صحبتوں سے دور ہو اور مسلمانوں کے لیے بھلائی کے کام سوچے۔"

"میں تو یہی سوچ سکتی ہوں۔"

"تمہارا یہ ارادہ اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب مبارک شاہ کی جگہ کوئی اور بادشاہ آ جائے۔"

"اب خلجی خاندان کا کون بچا ہے؟"

"تم مجھے کیوں بھولے جاتی ہو۔ میں علاؤ الدین خلجی کا چچازاد بھائی ہوں۔ کیا بادشاہت پر میرا حق نہیں؟"

"ہوگا مجھے اس سے کیا۔"

"اتنی بے نیاز نہ بنو۔ تم نے ایک سازش کی بنیاد رکھ ہی دی ہے تو اس کی تکمیل تک ساتھ بھی دو۔"

"میں نے کسی سازش کی بنیاد نہیں رکھی ہے۔"

"تم مبارک شاہ کو بڑی آسانی سے راستے سے ہٹا سکتی ہو۔"

"میں مبارک شاہ کو قتل کرنا نہیں چاہتی۔"

"ذرا سوچو اگر میں بادشاہ بن گیا تو تمہاری کیا شان ہوگی۔"

"شان کیا ہوگی، بس یہ فرق پڑے گا کہ مبارک شاہ کے بجائے آپ کی ساقی گری کر رہی ہوں گی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے حرم میں داخل ہو جائیں اور ایک پاکیزہ زندگی گزاریں۔"

"ہماری ایسی قسمت کہاں۔"

"مایوس نہ ہو گلبدن خاتون۔" ملک اسد الدین نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم نے توبہ کی ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ تمہیں سہارا دیں۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ بادشاہ بنتے ہی تم سے شادی کر لیں گے۔"

"میں بھلا مبارک شاہ کو کیسے قتل کر سکتی ہوں؟"

"تمہارے لیے یہ کام اس لیے آسان ہے کہ مبارک شاہ کے پیالے میں شراب تم ڈالتی ہو۔ تمہیں بادشاہ کے پیالے میں زہریلا سفوف ڈالنا ہوگا جو میں تمہیں فراہم کروں گا۔"

"بادشاہ کی موت کے بعد کیا یہ ثابت نہیں ہو جائے گا کہ شراب میں زہر ملایا گیا تھا۔ اس طرح میں مجرم ثابت نہیں ہو جاؤں گی؟"

"بادشاہ کی موت کو زہر خورانی کا سبب قرار نہیں دیا جا سکے گا۔"

"وہ کیسے؟"

''وہ ایسے کہ اس سفوف کے اثر سے بادشاہ بے ہوش ہوجائے گا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی میرے آدمی اندر داخل ہوں گے۔ بادشاہ مقابلہ کرنے کے لائق نہیں ہوگا اور اسے قتل کردیا جائے گا۔''

''آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ دروازے پر بادشاہ کے محافظ اور چوبدار موجود ہوتے ہیں۔''

''ان سب کو خریدنا یا ان سے مقابلہ کرنا ہمارا مسئلہ ہے۔ تمہیں تو صرف وہ کرنا ہے جو بتایا گیا ہے اور بادشاہ کے بے ہوش ہوتے ہی دروازے پر آکر اطلاع کرنی ہوگی کہ بادشاہ سلامت بے ہوش ہوگئے ہیں۔ حکیم صاحب کو خبر کی جائے۔ ہمارے آدمی وہاں موجود ہوں گے جو تمہاری آواز سن رہے ہوں گے۔ وہ اندر کی طرف بھاگیں گے اور بادشاہ کو قتل کردیں گے۔ چند امیر بھی ہمارے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے ہمیں تخت پر بٹھادیا جائے گا۔ کسی کو یہ شک نہیں ہوگا کہ شراب میں کچھ ملایا گیا تھا بلکہ اسے بغاوت سمجھا جائے گا۔ اگر بغاوت ناکام بھی ہوگئی تو قصوروار ہم ٹھہریں گے گلبدن خاتون تم پر کسی کو شک نہیں ہوگا۔''

''یہ سب کچھ ہمیں کب کرنا ہوگا؟''

''جس دن عمل کرنا ہوگا میں تمہیں باخبر کردوں گا۔''

''یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا اچھا ہے۔''

''بس دو ایک دن کی بات ہے۔''

ملک اسدالدین نے زہریلا سفوف اسے دے دیا کہ حفاظت سے رکھے اور جب اشارہ ملے تو مبارک شاہ کے پیالے میں اسے گھول کر پلادے۔

ملک اسدالدین نے اس سے شادی کا وعدہ کیا اور بہت سا انعام واکرام دے کر رخصت کیا اور اپنی دانست میں گلبدن خاتون کو خرید لیا۔

گلبدن خاتون گھر چلی آئی لیکن سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ بات ایسی بھی نہیں تھی کہ کسی سے مشورہ کرتی اور ایسی بھی نہیں تھی کہ چھپالیتی۔ یہ ڈر بھی تھا کہ اگر وہ اس سازش پر عمل کر بیٹھی تو غضب ہوجائے گا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ مبارک شاہ کو قتل کردیا جائے لیکن نادانستگی میں اس کے قتل کی سازش کا حصہ بن گئی تھی اور اب سوچ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اگر وہ اس سازش کا حصہ نہ بھی بنے تو بھی مبارک شاہ کی جان کو خطرہ ہے۔ ملک اسدالدین یہ کام میرے انکار پر کسی اور سے لے لے گا بلکہ انکار کی صورت میں میری جان کو بھی خطرہ ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ میں مبارک شاہ کو اس سازش سے باخبر کردوں۔

گلبدن خاتون کے لیے مبارک شاہ سے ملاقات کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ شام ڈھلتی اور مجلسِ نشاط برپا ہوتی، گلبدن خاتون بادشاہ کی خلوت میں پہنچ گئی اور ملک اسدالدین سے ہونے والی گفتگو سے بادشاہ کو آگاہ کردیا۔

شاہی محلوں میں ہونے والی ہر گفتگو کسی نہ کسی سازش کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی لیے جو ہو رہا ہوتا تھا، ہونے دیا جاتا تھا۔ کوئی حق بات کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ سب وہ کہتے تھے جو بادشاہ کہہ رہا ہوتا تھا۔ گلبدن خاتون نے یہ راز کھول کر خود مصیبت مول لے لی تھی۔ بادشاہ خود اسی کو کسی سازش کا حصہ سمجھ رہا تھا۔

مبارک شاہ نے ایک حکم کے ذریعے گلبدن خاتون کو معزول کرکے قید خانے میں ڈال دیا اور اس کے بیان کی روشنی میں تحقیقات کا ارادہ کیا۔

اس نے خسرو خاں کو طلب کیا اور اس واقعے کی تحقیق اس کے سپرد کردی۔ خسرو خاں کے تو جیسے پکے پکائے پھل ہاتھ آگئے۔ وہ اس سازش کی آڑ میں اپنے کئی مقاصد حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے دکھانے کے لیے گلبدن خاتون سے ملاقات کی اور پھر ملک اسدالدین کی خدمت میں پہنچ گیا۔

خسرو خاں اس سازش میں ملک اسدالدین کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

''آپ کو ایک فاحشہ عورت کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت کیا تھی۔''

''یہ کام وہی کرسکتی تھی۔''

''آپ نے مجھ سے تو مشورہ کرلیا ہوتا۔ میں کوئی اور ترکیب نکال لیتا۔''

''وہ عورت کچھ بھی کہے، تحقیق تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''دکھانے کے لیے کچھ لوگوں کو تو سزائیں دینی ہوں گی۔''

''نام تو میرا بھی آئے گا۔''

''میں آپ کا نام نہیں آنے دوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔''

خسرو خاں جب ملک اسدالدین سے ملاقات کے بعد واپس آرہا تھا تو اگلے پچھلے کئی واقعات اس کے ذہن میں رقص کررہے تھے۔ وہ نام بھی اسے معلوم تھے جو اس سازش میں ملک اسدالدین کے ساتھ شامل تھے۔ ان ناموں کے ساتھ وہ کئی اور نام بھی جوڑ سکتا تھا جو آئندہ اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس کا بھی نام لیتا، مبارک شاہ اسے سزا دینے کو تیار ہوجاتا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر ایک فرضی داستان گھڑی۔

"میں نے پوری تحقیق کرلی ہے۔ آپ کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ یہ سازش کہیں باہر سے نمودار نہیں ہوئی، یہ آپ کے خاندان کے با اثر افراد سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا سلسلہ آپ کے بھائیوں شہزادہ خضر خاں اور شادی خاں سے لے کر ملک اسدالدین تک پھیلا ہوا ہے۔"

"ملک اسدالدین!" مبارک شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں گلبدن نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، وہ درست ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ بے قصور ہے؟"

"بے قصور وہ بھی نہیں ہے۔ وہ آپ کی شکایت لے کر آپ کی والدہ کے پاس گئی تھی۔ عین الملک کے پاس گئی تھی اور انہیں آپ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ ملک اسدالدین کے پاس خود چل کر گئی تھی اور آپ کے دشمنوں کو قتل کرنے کی ہامی بھری تھی۔ پھر شاید وہ ڈر گئی اور وقت سے پہلے راز افشا کردیا۔ اس کی سانسیں اس لیے چھین لینا ضروری ہیں کہ وہ خطرناک عورت ہے۔ کسی اور وقت کسی اور کے ساتھ مل کر تاریخ دہرا سکتی ہے۔"

خسرو خاں نے ملک اسدالدین کو مطمئن کرنے کے لیے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اس سازش میں اس کا نام نہیں آنے دے گا لیکن پھر اس نے سوچا ملک اسدالدین کو زندہ چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ وہ بھی شاہی خاندان کا ہی ایک فرد تھا۔ جب تک شاہی خاندان کا ایک بھی فرد زندہ رہے گا میرے مقاصد ادھورے رہیں گے۔

ملک اسدالدین کے پاس فرار ہونے کے لیے بہت وقت تھا لیکن خسرو خاں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اس کا نام درمیان میں نہیں آنے دے گا اس لیے وہ مطمئن تھا۔ اسے تو ہوش اس وقت آیا جب فوج کے ایک دستے نے اس کے محل کا محاصرہ کرلیا۔ وہ نادان اس وقت بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ خسرو خاں کی کوئی چال ہوگی۔ وہ مجھے دکھاوے کے لیے گرفتار کررہا ہے۔ مقدمہ چلے گا اور اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

خسرو خاں نے اس کے قتل کا پروانہ پہلے ہی حاصل کرلیا تھا لہٰذا گرفتار کرنے کی تھوڑی دیر بعد ہی اسے قتل کردیا گیا۔ اس کے علاوہ بیس دوسرے افراد بھی جو اس کے ساتھی تھے، موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان لوگوں میں کچھ بے گناہ بھی تھے اور وہ دہلی سے کبھی باہر نہ نکلے تھے۔

مبارک شاہ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ

اس سازش کے بانی خضر خاں اور شادی خاں ہیں لہٰذا اس نے سردار شادی کہنہ کو گوالیار کی طرف روانہ کیا۔ قلعہ گوالیار میں تینوں شہزادے خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین قید تھے۔ تینوں شہزادے بصارت سے محروم کردیے گئے تھے۔ مبارک شاہ نے مخصوص ہدایت کے مطابق شادی کہنہ کے ہاتھوں انہیں قتل کرادیا۔ شادی کہنہ نے انہیں قتل کیا اور ان کے بیوی بچوں کو لے کر دہلی آ گیا۔

اس سازش سے نمٹنے کے بعد وہ گجرات کی طرف متوجہ ہوا۔ الغ خاں کے قتل کے بعد سے ہی گجرات کے حالات بگڑنا شروع ہوگئے تھے۔ کئی مرتبہ ان حالات کو سنوارنے کی کوشش کی گئی لیکن حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ اور اب تو یہ خبریں آرہی تھیں کہ آس پاس کے علاقے بھی اس بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

اس بغاوت کو کچلنا بہت ضروری تھا ورنہ سلطنت کا استحکام خطرے میں پڑ جاتا۔ اس نے عین الملک ملتانی کو ایک زبردست فوج کا سردار بنا کر گجرات روانہ کیا۔ عین الملک علاؤالدین خلجی کے معتبر سرداروں میں سے تھا۔ علائی عہد میں اس نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ اس معرکے میں بھی وہ سرخرو رہا۔ گجرات پہنچ کر باغیوں کو شکست دی اور نہروالا اور گجرات کے مختلف علاقوں کو ازسرِنو مبارک شاہ کی سلطنت میں شامل کیا۔ قرب وجوار کے زمینداروں کو بادشاہ کا اطاعت گزار بنا کر دہلی واپس آیا۔

فسق و فجور کی محفلیں عروج پر تھیں۔ مملکت کے کام اللہ توکل چل رہے تھے ورنہ مبارک شاہ کو تو شراب پینے، گانا سننے اور عیش وعشرت میں وقت گزارنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ مغلوں کے کسی لشکر نے دہلی کا رخ نہیں کیا یا اس کے کسی ہمسر نے حکومت پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس کی مملکت کو کسی آسمانی بلا نے بھی نہیں گھیرا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی فتنہ برپا بھی ہوا تو اس کے دفاع کے لیے علاؤالدین خلجی کے دور کے قدیم نمک خوار موجود تھے۔

عین الملک بھی انہی بندگانِ علائی میں سے ایک تھا جس نے گجرات سے واپس آتے ہی اپنی تلوار اس کے قدموں میں رکھ دی۔

''حضور والا تبار کے طالع بلند کے طفیل گجرات کی بغاوت کا سر کچل دیا گیا ہے۔ وہ سردار جن کی وجہ سے بغاوت کا فتنہ رونما ہوا تھا یا تو مار دیے گئے یا وہ دور دراز کے علاقوں کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ اگر شاہی انتظام مستحکم ہو اور کوئی سخت گیر والی وہاں مقرر کردیا جائے تو یہ سردار کبھی گجرات واپس نہ آسکیں گے۔''

''ہمیں تم سے یہی امید تھی۔ ہم تم سے کسی اور وقت ملاقات کر کے تفصیل معلوم کریں گے۔''

عین الملک اس کے پاس سے اٹھ تو گیا لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ اس وقت اسے ایسا کون سا ضروری کام درپیش تھا کہ اس نے گجرات کی بغاوت میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ کیا ہم نمک خواروں کی قربانیاں اسی طرح ضائع ہوتی رہیں گی؟ عین الملک کو اس کا جواب اس وقت مل گیا جب اس نے چند لڑکیوں کو سازندوں کے ہمراہ مبارک شاہ کی نشست گاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

''جب بادشاہوں کے دربار طوائفوں کے کوٹھوں کا منظر پیش کرنے لگیں تو زوال لازمی ہے۔'' عین الملک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے محافظوں کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

مبارک شاہ کی خلوت گاہ میں اس وقت اس کے ایک پسندیدہ غلام شاہین کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ غلام مبارک شاہ کے باپ علاؤالدین خلجی کے دور میں داخلِ دربار ہوا تھا۔ اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی لیکن ایک دن اچانک اس کے حسن و جمال پر مبارک شاہ کی نظر پڑ گئی۔ آنکھوں پر جوانی کا چشمہ لگا تھا۔ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اسے ''وفا بیگ'' کا خطاب دیا اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ اس وقت بھی بادشاہ زادہ اور غلام زادہ یک جان دو قالب ہوئے بیٹھے تھے کہ مبارک شاہ نے ''دیوگڑھ'' کا قصہ چھیڑ دیا۔

''عہدِ علائی میں ایک نمک حرام ملک نائب ہوا کرتا تھا۔''

''مجھے یاد ہے سرکار۔''

''وہ جب اپنی حرکاتِ ناشائستہ کی بدولت قتل کردیا گیا تو راجا رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے دکن کے چھوٹے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر مرہٹواڑی پر قبضہ کرلیا تھا۔''

''مجھے یہ بھی یاد ہے سرکار۔''

''اب اس کی اتنی ہمت ہوگئی کہ اس نے شاہی عہدے داروں کو شہر سے نکال دیا اور خود دیوگڑھ کے قلعے کے محاصرے میں مشغول ہوگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دیوگڑھ کا علاقہ ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔''

''اس میں بھی فکر کی کیا بات ہے۔ اتنے نامور سردار اور امراء موجود ہیں، کسی کو بھی دیوگڑھ کی طرف روانہ

کر دیجیے۔"

"یہ اتنا معمولی معرکہ نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس قبضے سے نمٹنے کے لیے مابدولت کو خود جانا ہوگا۔"

"اس طرح تو سلطنت کے کاموں میں رخنہ اندازی ہوگی۔"

"اس رخنہ اندازی کو سنبھالنے کے لیے تم جو موجود ہو۔" مبارک شاہ نے اس کے رخساروں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں؟"

"ہاں تم۔ میری غیر موجودگی میں دہلی میں رہوگے اور میرے نائب کے طور پر کام کروگے۔ خزانے تمہارے سپرد ہوں گے۔ تمہارا حکم، حکمِ شاہی ہوگا۔ تمام امراء تمہارے ماتحت ہوں گے۔"

"بندہ تو آپ کا غلام ہے۔ آپ کے حکم پر سر کٹانے کو تیار ہے لیکن تجربہ کار امراء مجھے اپنا آقا ماننے کو تیار ہو جائیں گے؟"

"کس کی مجال ہے جو میرے حکم کو ماننے سے انکار کرے۔"

"انکار کرنے کی جرأت تو کسی میں نہیں ہوگی لیکن یہ فیصلہ دل سے کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور ممکن ہے ان کی یہ بے دلی کسی فتنے کا باعث بن جائے۔"

"ان فتنوں کا سدباب کرنا ہی تمہارا کام ہوگا۔"

مبارک شاہ اپنی جوانی اور مستی کے نشے میں ایسا مدہوش تھا کہ اس نے کسی بڑے سردار یا تجربہ کار امیر کو دہلی میں اپنا نائب نہیں بنایا بلکہ ایک غلام بچے کو بلند مرتبہ عطا کیا اور انتہائی بے باکی اور بے اتفاقی کے ساتھ دہلی اور شاہی خزانے اس کے سپرد کردیے اور اپنی غیر موجودگی کے زمانے کے لیے اس کو نائب مقرر کردیا۔ جوانی اور مستی کے غلبے کی وجہ سے مبارک شاہ کے دل میں کسی حادثے اور فتنے کا خیال تک نہیں آیا جو بادشاہ کی عدم موجودگی میں واقع ہوسکتے تھے۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ امراء و ملوک کے ساتھ دیوگڑھ پر لشکر کشی کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی سے چلا اور متواتر کوچ کرتا ہوا دیوگڑھ کی حدود تک پہنچ گیا۔

ابھی مبارک شاہ نے دیوگڑھ کے دروازے پر دستک بھی نہیں دی تھی کہ اس کی فوج کی کثرت اور جنگی سازوسامان کی شہرت ہرپال دیو کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے ان ہندو سرداروں کو طلب کیا جن کے ساتھ مل کر اس نے دیوگڑھ پر قبضہ کیا تھا۔

"آپ لوگوں نے غلط اطلاعات پر بھروسا کیا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔"

"مہاراج! آپ کس اطلاع پر بھروسے کی بات کررہے ہیں؟"

"اطلاعات تو یہ آئی تھیں کہ مبارک شاہ کو عیش و عشرت کی محفلوں ہی سے فرصت نہیں۔ بدکار عورتوں کی صحبت ہی سے وقت نہیں ملتا۔ سلطنت کے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ملتا اور تم دیکھ رہے ہو اس نے لشکر کسی امیر کی سربراہی میں روانہ نہیں کیا بلکہ لشکر لے کر خود ہی دیوگڑھ پہنچ گیا۔"

"ہماری اطلاع غلط نہیں تھی۔" ہندو سرداروں نے کہا۔ "اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے لشکر میں ناچنے گانے والی عورتوں کی بڑی تعداد موجود ہے جنہیں وہ دہلی سے ساتھ لے کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ہماری اطلاع تو یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگا ہے۔ انہی کی طرح زیورات پہنتا ہے۔"

"ایسا شخص ہم سے کیا جنگ کرے گا۔"

"ہمیں اس سے نہیں اس کے لشکر سے سامنا ہے۔ وہ اتنا بڑا لشکر لے کر آیا ہے کہ ہمارا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔"

"تو کیا ہم مقابلہ کیے بغیر ہی دیوگڑھ اس کے حوالے کردیں؟"

"اس سے جنگ کیے بغیر ہم نے دیوگڑھ پر قبضہ کیا تھا۔ جنگ کیے بغیر اگر دیوگڑھ اس کے حوالے کردیں تو کوئی حرج نہیں۔"

ہرپال دیو خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے ان سرداروں کی بزدلی پر سخت غصہ تھا۔ اس نے جس مشکل سے دیوگڑھ پر قبضہ کیا تھا اب اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی آسانی سے اسے ہاتھ سے نکال دے۔ اس نے تمام سرداروں پر زور دیا کہ وہ بھرپور مقابلے کی تیاری کریں۔ ان سرداروں نے اس سے اتفاق بھی کیا اور اپنے اپنے لشکر جمع کرنے کا وعدہ کرکے اس کے پاس سے اٹھ گئے۔

ہرپال دیو اس امید میں رات بھر جاگتا رہا کہ صبح ہوتے ہی مبارک شاہ سے مقابلے کے لیے نکلے گا لیکن ابھی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ اسے ہندو سرداروں کے فرار کی خبریں ملیں۔ سلطانی افواج کے مقابلے کی تاب نہ لاکر اس کے سردار بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب اسے اپنی جان کا خطرہ ہوا۔ اس نے بھی اسی میں عافیت سمجھی اور دیوگڑھ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مبارک شاہ کو جنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں

پڑی۔ دیوگڑھ پہنچ کر اس نے خود تو وہیں قیام کیا اور چند امرا کو فوجی دستوں کے ہمراہ ہر پال دیو کی گرفتاری کے لیے ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ان امیروں نے بڑی ہمت اور کوشش کر کے ہندوؤں کی بھاگتی ہوئی فوج کو قتل کیا اور ہر پال دیو کو زندہ گرفتار کر کے مبارک شاہ کے روبرو پیش کر دیا۔

مبارک شاہ نے نفرت کی ایک نظر اس پر ڈالی اور اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

''ہر پال کی کھال کھینچ کر اس کا سر دیوگڑھ کے قلعے کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔''

قریب تھا کہ وہ اس عظیم الشان فتح کے بعد دہلی روانہ ہو جاتا لیکن اڑتے ہوئے بادلوں نے اس کے ارادوں کو توڑ دیا...... اس کے ساتھ آئے ہوئے سازندوں نے ساز جوڑے اور رقاصاؤں نے گھنگرو باندھے۔ امراء کو بھی دائرہ بنا کر بیٹھنا پڑا۔ خوبصورت عورتیں ساقی گری کے لیے حاضر ہو گئیں۔ شراب کا دور چلا تو بادلوں نے رقاصاؤں کے استقبال کے لیے رم جھم شروع کر دی۔ بادشاہ نے اس وقت ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے رقاصہ کا ہاتھ پکڑا اور کھلی جگہ پر آ گیا۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ بادشاہ بھیگتا رہے اور دوسرے لوگ اس کا ساتھ نہ دیں۔ بڑے بڑے امراء بادشاہ کے ساتھ ساتھ ان طوائفوں کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ مبارک شاہ کی یہی حرکتیں تھیں جو امراء کے لیے باعثِ تذلیل بن جاتی تھیں۔

رات بھر کی بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا۔ اس علاقے میں شدید بارشیں ہوا کرتی تھیں۔ ندی نالے دریا سب بھر جاتے تھے۔ راستے بند ہو جاتے تھے۔ امراء کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر بادشاہ نے کچھ دن اور قیام کیا تو سب دریا بھر جائیں گے اور عرصے تک یہیں رکنا پڑ جائے گا لہٰذا بادشاہ کو چلنے کا مشورہ دینا چاہیے۔ چند امراء بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے واپسی کا مشورہ دینے کی جسارت کی۔

''حضور! دیوگڑھ کی بارشیں بہت مشہور ہیں۔''

''دیکھتے نہیں ہو یہاں کا آسمان ہی دوسرا ہے۔ گھٹاؤں کا رنگ ہی کچھ اور ہے اور کیا تم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہاں کی رقاصائیں کس غضب کا رقص کرتی ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے حضور لیکن چند روز اور بارش ہوتی رہی تو راستے مسدود ہو جائیں گے، ہمیں جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہیے۔''

''دہلی میں ایسی بارش کہاں۔ ہمیں اس کے ایک ایک قطرے سے لطف اندوز ہونے دیا جائے۔'' اس کے بعد کس کو جرأت جو اس سے واپسی کی بات کرتا۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ واپسی کے راستے بند ہو گئے اور مبارک شاہ کو مجبوراً کچھ عرصے تک دیوگڑھ ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ اس نے اپنے دورانِ قیام میں مرہٹواڑی پر پوری طرح قبضہ کر لیا اور دیوگڑھ میں عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور دیوگڑھ کی وزارت ملک یک لکھی کے سپرد کی جو علاؤالدین کے غلاموں میں سے تھا۔

خسرو خاں کو اس نے چتر عنایت کیا اور قرب و منزلت میں اس کا مرتبہ ملک نائب سے بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ معشوق پرستی میں مبتلا ہو کر خسرو خاں کے ناز اٹھانے لگا۔ وہ خسرو خاں پر اس سے بھی زیادہ دیوانہ ہو گیا جتنا اس کا باپ علاؤالدین ملک نائب پر تھا۔ یہ بھول گیا کہ ملک نائب نے اس کے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا اور ملک نائب کے ہاتھوں اس کے خاندان پر کیا گزری تھی۔

مبارک شاہ کے باپ علاؤالدین خلجی نے ملک نائب کو لامحدود اختیارات دے رکھے تھے اور لشکر کا سردار بنا کر دور دراز کے علاقوں میں فتوحات حاصل کرنے کے قابل بنا کر بھیجتا رہتا تھا۔ دیوگڑھ کے گناہ زدہ ماحول میں مبارک شاہ کو بھی یہ تاریخ دہرانے کی سوجھی۔ ایک دن عالم مستی میں خسرو خاں کو لوازماتِ شاہی عطا کر کے مالا بار کی طرف روانہ کیا۔

مبارک شاہ کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات قطعی طور پر نہ آئی کہ سلطان علاؤالدین کو ملک نائب پر دیوانہ ہو جانے، اس کا مرتبہ بلند کرنے اور لشکر کا سردار بنانے اور دور دراز اقالیم میں بھیجنے کا آخر کیا فائدہ ہوا۔ خسرو خاں کو بلند مراتب، وزارت کا عہدہ اور خطاب دینا اور دور دراز شاہانہ آداب اور طریقوں کے ساتھ روانہ کرنا آخر ان سب کا کیا نتیجہ ہو گا۔

مبارک شاہ کی بہت سی نادانیوں میں سے ایک نادانی یہ بھی تھی کہ وہ جوانی کی مستی اور معشوق پرستی میں خسرو خاں کی مکاری اور خبث کو دیکھ ہی نہ سکا۔ وہ خسرو خاں کو معشوق سمجھتا رہا، بادشاہ ہوتے ہوئے اس کا عاشقِ زار بنا رہا۔ خسرو خاں کا حال یہ تھا کہ بدکار عورت کی طرح اپنا جسم بادشاہ کے حوالے کرتا رہتا تھا لیکن دل میں سوچتا رہتا تھا کہ کب موقع ملے اور کب وہ اسے قتل کر دے۔ کمینے آدمی کی فطرت میں شامل ہوتا ہے کہ اس کی ہوس کا

پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ بادشاہ نے خسرو خاں کو سیاہ سفید کا مالک بنایا ہوا تھا لیکن اس کا حال یہ تھا کہ بادشاہ کو قتل کر کے خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس نے دیوگڑھ سے نکلتے ہی خفیہ مشورے شروع کر دیے۔

خسرو خاں کا یہ اعزاز و مرتبہ کسی کو بھی ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ خوفِ شاہی سے آوازیں پست ہو رہی تھیں لیکن خاموشی باتیں کر رہی تھی۔ اندر ہی اندر بادشاہ کے خلاف رائے ہموار ہو رہی تھی۔ چند امراء یہ طے کر چکے تھے کہ مبارک شاہ کے خلاف بغاوت برپا کر کے اسے تخت سے اتار دیا جائے۔ دیوگڑھ میں ان دنوں عجیب و غریب پراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ راتوں کو خفیہ اجلاس ہو رہے تھے۔ مبارک شاہ تو غفلت کی نیند سویا ہوا تھا لیکن اس کے خلاف باغیوں کا ایک گروہ پوری طرح سرگرم عمل تھا۔ بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے تھے، صرف طریقۂ کار تلاش کیا جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں بادشاہ نے دہلی واپسی کا ارادہ کر لیا۔

مبارک شاہ اپنے لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ باغیوں کا یہ گروہ بھی اس کے ساتھ تھا اور تاک میں تھا کہ موقع ملے اور وہ مبارک شاہ کو قتل کر دیں۔

یہ باغی سفر کے دوران مشاہدہ کر رہے تھے کہ وہ شراب خوروں کے ساتھ مستی کر رہا ہے۔ جو عورتیں بے حیائی کے لباس میں اس کے ساتھ ہیں ان سے بے حجابانہ ہنسی مذاق کرتا جا رہا ہے۔ ایسے غافل کو قتل کرنے کے لیے دس بارہ افراد ہی کافی ہو سکتے تھے لیکن خطرہ تھا تو اس کے محافظوں سے جو اس کے ساتھ ساتھ لگے چل رہے تھے۔

باغیوں کے لیے سخت مشکل تھی لیکن جب بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ ساگون کی گھاٹی سے نکل کر منزل کرے گا تو باغیوں نے امیدیں باندھ لیں اور یہ طے ہوا کہ مبارک شاہ جب ساگون کی گھاٹی سے گزرے اور حرم سرا میں جائے تو اس پر حملہ کر دیا جائے۔ اس وقت سلاح داروں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوگا لہٰذا دس بارہ آدمی ہی بادشاہ کو قتل کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔

اس رات کو جب سلطان گھاٹی ساگون میں منزل کرنا چاہتا تھا اور باغی اسے قتل کرنے والے تھے، ان باغیوں میں سے ایک شخص سلطان کے پاس آیا اور بغاوت کے منصوبے اور باغیوں کے فتنہ بپا کرنے سے متعلق مشوروں کا مفصل حال اس کے سامنے عرض کیا۔ دوسرے لفظوں میں بغاوت کی پول کھول دی۔ بادشاہ کی قسمت میں ابھی موت نہیں لکھی تھی کہ یہ منصوبہ تکمیل سے پہلے منظرِ عام پر آ گیا۔ وہ جہاں تھا، وہیں ٹھہر گیا۔ اسی رات اس نے ان تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا جو اس بغاوت میں شامل تھے اور درگاہِ سلطانی کے سامنے سب کی گردنیں اڑوا دیں۔

وہ فسق و فجور پر اتنا دلیر ہو گیا تھا کہ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کی عیش پرستی اور شراب خوری کی وجہ سے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا گیا تھا، اس نے اپنی اصلاح کے بجائے اور شدت سے خود کو عیش و نشاط میں ڈبو لیا۔ اسی مقام پر اس نے اپنی کامیابی کا جشن منایا۔ اس جشن کو اس نے ''جشنِ حیات'' کا نام دیا کیونکہ اسی مقام پر اسے دوسری زندگی ملی تھی۔ تین دن تک مسلسل شراب کے دور چلتے رہے۔ ''گھاٹی ساگون'' میں شیطان رقص کرتا رہا۔ بدکار عورتوں کو اجازت تھی کہ جس امیر کو جس طرح چاہیں بے عزت کریں۔ یہ عورتیں اتنی گستاخ ہو گئی تھیں کہ خود بادشاہ کے ساتھ شوخی کے ساتھ پیش آتی تھیں تو امیر کس گنتی میں تھے۔

فتح کے غرور میں مبتلا مبارک شاہ دیوگڑھ سے دہلی پہنچا تو ہر طرف اس کی خوش بختی کا شور مچا ہوا تھا، اس نے دیکھا کہ گجرات اور دیوگڑھ فتح ہونے اور اس کے خلاف ہونے والی بغاوت ایک ہی دن میں فرو ہو جانے سے اس کے رعب میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جو اراکینِ سلطنت اسے نااہل سمجھنے لگے تھے، اس کی اہلیت کے قائل ہو گئے ہیں۔

ملوک و امرائے علائی جو اس کے باپ کی ملازمت میں تھے اس کے مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔ جب اس نے دیکھا کہ تمام امراء اور باج گزار حاکم اس کی اطاعت اور فرماں برداری کا دم بھرنے لگے ہیں اور حکومت کے تمام مدعی قتل کیے جا چکے ہیں تو شراب اور غرور کے نشے میں کچھ ایسا مست ہوا کہ احتیاط اور عاقبت اندیشی کا دامن چھوڑ کر بے احتیاطی اور غفلت کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کی تمام اچھی عادتیں غیظ و غضب، فحاشی اور ظلم میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ناحق لوگوں کو قتل کروانے لگا۔ منطق یہ تھی کہ اس طرح لوگوں پر اس کا رعب طاری ہوگا۔ اسے کسی کی پروا نہ رہی۔ نہ کسی ہمدرد اور بہی خواہ کے کسی مشورے پر عمل کرتا اور نہ ہی کسی وفادار امیر کی کوئی گزارش سنتا۔ اگر کوئی امیر، بادشاہ کی خیر خواہی میں کوئی بات بادشاہ کی رائے کے خلاف کہتا تو مبارک شاہ نہ صرف یہ کہ اس کی رائے کو رد کر دیتا بلکہ اسے خوب جی بھر کے گالیاں بھی دیتا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ کسی حاشیہ نشیں کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ محض اشارے

کنائے ہی سے بادشاہ کی خیر خواہی کا دم بھر سکے۔
اس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تمام اچھی عادتوں کو ترک کر دیا اور ان کی جگہ قبیح عادات اختیار کر لیں۔ اس کا غصہ اور ظلم پسند سرشت اپنے شباب پر آ گئی اور بے گناہوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔
اس کی اس سفاکی کا پہلا نشانہ ظفر خاں والیِ گجرات بنا جسے اس نے بغیر کسی جرم یا خیانت کے اعلانیہ قتل کروایا۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ ظفر خاں کی بیٹی کو وہ اپنی بیوی بنائے بیٹھا ہے۔ یہ قتل ایسا تھا جیسے اپنی حکومت کی دیوار کو خود اپنے ہی ہاتھ سے گرا دیا۔
جب ظلم و زیادتی حاکموں کا مشغلہ بن جائے تو بھڑکانے اور اکسانے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہی اس دربار میں بھی ہو رہا تھا۔ بادشاہ کے کان کچے تھے اور بھڑکانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ صاحبان عہدہ کو اپنی جانیں بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ ان بازاری عورتوں اور بھانڈوں سے تھا جن سے مبارک شاہ کا محل بھر گیا تھا اور جن کی گالیاں ہزار ستون میں ہر وقت گونجتی رہتی تھیں۔ ان بازاری لوگوں کا آپس کا حسد بھی قتل و غارت گری کا سبب بنتا تھا۔ اس حسد کا ایک نشانہ وہ غلام بھی بنا جس کا نام شاہین تھا اور جسے دیوگڑھ جاتے ہوئے مبارک شاہ نے اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا تھا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جس کی گونج اس کی آواز میں صاف سنائی دیتی تھی۔ بادشاہ گجرات سے ایک مسخرہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسے دربار میں اتنا غلبہ حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے امیروں کی بے عزتی کر دیا کرتا تھا۔ ایک روز اس کے مذاق کا نشانہ ملک شاہین بھی بن گیا۔ ملک شاہین نے اسے اس کی حیثیت یاد دلا دی۔ بس یہی غضب ہو گیا۔ دونوں میں رسا کشی شروع ہو گئی۔ اس مسخرے نے مبارک شاہ کے ایسے کان بھرے کہ مبارک شاہ کے فرمان سے اس بے گناہ قتل کر دیا گیا۔ ملک شاہین کا قتل کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ لوگ یہ دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگے کہ ایک مسخرے کے کہنے پر بادشاہ اپنے محبوب کو قتل کرا سکتا ہے تو دوسروں کی کیا حیثیت ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورتِ حال تھی کہ دربار میں موجود بھانڈوں اور طوائفوں کی خوشامد میں دن گزارے جائیں۔ یہ خیال رکھا جائے کہ وہ خفا نہ ہو جائیں۔ لوگ ان طوائفوں کو خوش رکھ کر بادشاہ کو خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
مبارک شاہ کی یہ حرکتیں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ اس کا زوال قریب ہے لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کی توجہ اس طرف مبذول کراتا۔ جبکہ مبارک شاہ ایسا خودسر ہو گیا تھا کہ اس پر کسی کی نصیحت اثر انداز تو کیا ہوتی، وہ کچھ سننے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس کی مستیاں اور بداعمالیاں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے جو نکلے اس پر فوراً عمل ہو جائے۔ اپنے سوا کسی اور کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ خود ستائی اتنی بڑھ گئی کہ وہ خود کو مذہبی شخصیات سے بھی بالاتر سمجھنے لگا۔ اس کا عملی مظاہرہ اس وقت ہوا جب مبارک شاہ نے نئی مسجد بنوائی اور تمام علما و مشائخ کو کہلا بھیجا کہ جمعے کی نماز وہیں ادا کریں۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ بادشاہ کا فرمان ہے۔ اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔
بادشاہ کا یہ پیغام نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بھی پہنچا۔ وہ اس وقت چند مریدوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے کہ شاہی کارندہ ان کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے پیغام سے انہیں آگاہ کیا۔ آپ نے بے پروائی سے پیغام سنا اور بادشاہ کو پیغام بھجوا دیا۔
''جو مسجد میری رہائش گاہ سے قریب ہے میرا حق اس پر ہے۔ میں جمعے کی نماز وہیں ادا کروں گا۔''
مبارک شاہ کو کوئی ایسا جواب لکھ بھیجے اور وہ اس کی حدودِ مملکت میں رہ سکے۔ ایک مرتبہ تو اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ تک کہہ دیا کہ وہ غیاث پورہ میں شیخ کی خانقاہ کو اکھڑوا کر پھینک دے لیکن فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے لوگوں تک نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔
''حضور...... وہ اللہ کے خاص بندے ہیں۔ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ دہلی سے ملتان تک کتنے ہی علمائے دین ہیں، کسی کو بھی برکت کے لیے اپنا مقرب بنائیے۔ کوئی نظام الدین اکیلے تو ہیں نہیں دہلی میں۔''
''کیا ضروری ہے کہ دربار میں ان اللہ والوں کے ڈھیر لگا لوں۔''
''حضور! بہت سے کام دنیا دکھاوے کے لیے بھی کیے جاتے ہیں۔''
مبارک شاہ اپنی سیاہ کاریوں میں ڈوب کر شیخ زادہ جام کو بھولا ہوا تھا۔ یہ وہی صاحب کشف بزرگ تھے جن کی دعاؤں سے اسے بادشاہت ملی تھی۔ جب ملک نائب اسے اندھا کرا دینے کے درپے تھا تو اس کی والدہ بی بی مالک انہی بزرگ کے پاس گئی تھیں اور ان بزرگ نے تسلی دینے کے بعد اپنی ٹوپی کو الٹا کر کے پہنا تھا اور فرمایا تھا۔ ''اب

میں اس ٹوپی کو اسی وقت سیدھا کروں گا جب مبارک شاہ تختِ حکومت پر بیٹھے گا۔''

یہ واقعہ ذہن میں تازہ ہوتے ہی اسے شیخ زادہ کی یاد آئی۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ وہ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ بادشاہ کی بہت سی عادات واطوار ان کے علم میں بھی تھیں۔ انہوں نے بادشاہ کو بہت سی نصیحتیں کیں جنہیں وہ بہ غور سنتا رہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ نصیحت کرنے والے کو ٹوک دیتا لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ چپ رہا اور سنتا رہا۔

مبارک شاہ کا ارادہ تھا کہ انہیں کبھی کبھی دربار میں حاضر ہونے کی تاکید کرے گا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ بزرگ کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ اس نے کوئی اور ہی قصہ چھیڑ دیا۔

''آپ کے علم میں ہے کہ میرا بڑا بھائی خضر خاں، شیخ نظام الدین سے عقیدت رکھتا تھا۔ ان سے ملنے غیاث پورہ پابندی سے جایا کرتا تھا۔ اب خضر خاں قتل کر دیا گیا تو شیخ نظام الدین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قتل میں نے کرایا ہے اس لیے مجھ سے دشمنی رکھنے لگے ہیں اور میری مخالفت پر اتر آئے ہیں۔ میرے بلانے پر میری تعمیر کردہ مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آئے۔ شیخ ضیا الدین رومی کے سوئم کے موقع پر احاطہ قبرستان میں نظر آئے۔ سلام ضرور کیا لیکن بادشاہوں کے حضور اس طرح سلام پیش نہیں کیا جاتا جس طرح انہوں نے کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ماضی میں بھی بادشاہوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے ہیں۔ خضر خاں کو بھی ابا حضور کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ اب میرے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔''

''بادشاہ حضور، آپ جانتے ہیں کہ میں شیخ نظام الدین کے خلاف ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ آپ کے خلاف سازش کیوں کریں گے؟''

''اس لیے کہ ان کا مرید خضر خاں، میرا بڑا بھائی بادشاہ نہ بن سکا اور آپ کی دعا سے میں بن گیا۔ یہی کانٹا ان کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔''

''خضر خاں کے بادشاہ بننے میں شیخ کا کیا مفاد تھا؟''

''بادشاہِ وقت اگر کسی فقیر کا مرید ہو تو وہ فقیر، فقیری میں امیری کرتا ہے۔ بس یہی مفاد ہو سکتا تھا۔''

''بادشاہ حضور، ہم فقیر ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بری الذمہ ہوتے ہیں۔''

''ہم نے تو سنا تھا کہ آپ شیخ نظام الدین کو اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ تو ان کی حمایت کر رہے ہیں۔''

''ہماری ان سے مخالفت شرعی نکات پر ہے، دنیاوی معاملات پر نہیں۔''

مبارک شاہ ان کے پاس سے اٹھ کر آ تو گیا لیکن ان کی باتیں سن کر اس کا دل نظام الدین اولیاء کی طرف سے مزید برا ہو گیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ دربار سے منسلک لوگوں میں سے کوئی شیخ کی زیارت کے لیے غیاث پورہ نہ جائے۔ اس کی مخالفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر مستی کے عالم میں کہہ اٹھتا تھا کہ جو بھی نظام الدین کا سر لائے گا، اس کو ہزار سونے کے تنکے دوں گا۔

جب اس کی مخالفت بہت بڑھ گئی اور اس کے ہمدردوں کو اس کا زوال روز روشن کی طرح نظر آنے لگا تو چند نامور امیر خاموشی کے ساتھ شیخ زادہ جام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دربار میں جو کچھ گزر رہی تھی، سب ان کے گوش گزار کیا۔ شیخ زادہ جام نے بادشاہ کی حالت پر کفِ افسوس ملتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ شیخ رکن الدین ملتانی کو ملتان سے بلا کر اپنے دربار میں جگہ دے تا کہ ان کی نصیحتیں اور دعائیں تیرے کام آئیں۔

☆☆☆

مبارک شاہ کا محبوب نظر دہلی سے کوسوں دور تھا اور یہاں یہ افتاد آن پڑی تھی کہ ظفر خاں کے قتل کے بعد گجرات کی حکومت کس کے سپرد کی جائے کا سوال سامنے تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ خسرو خاں کو خط لکھا کہ وہ مالابار میں کسی کو اپنی جگہ متعین کر کے گجرات چلا جائے لیکن مالابار میں خسرو خاں کے چند ایسے مفادات تھے کہ وہ وہاں سے ہلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ گجرات کی حکومت اس کے بھائی حسام الدین کے سپرد کر دی جائے۔

اس مشورے میں خسرو خاں کے کئی مفادات پوشیدہ تھے۔ مبارک شاہ ان مفادات سے تو واقف نہیں تھا لیکن وہ حسام الدین کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا کہ گجرات کی حکومت اس کے حوالے کی جائے۔

جب سے خسرو خاں مالابار گیا تھا، حسام الدین بادشاہ کے بہت قریب آ گیا تھا۔ خسرو خاں کی غیر موجودگی میں وہی بادشاہ کا دل خوش کر رہا تھا۔ اسے گجرات نہ بھیجنے میں بادشاہ کا یہ جذبۂ محبت بھی کارفرما تھا۔ ادھر خسرو خاں سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ ہر حال میں چاہتا تھا کہ گجرات کی حکومت کسی بھی طرح حسام الدین کو مل جائے تا کہ وہ اپنے خاص منصوبے کو آگے بڑھا سکے۔ وہ کسی طرح

مالا بار چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بار بار اپنے قاصدوں کو دہلی کی طرف دوڑا رہا تھا کہ کسی طرح حسام الدین کو گجرات کی حکومت دلا سکے اور بالآخر اس کی سفارشیں رنگ لائیں۔ مبارک شاہ نے اس کو امراء، معارف اور دیگر کارکنوں کے ہمراہ نہروالا کی طرف روانہ کر دیا۔ ظفر خاں مقتول کے تمام نوکر اور لشکر اس کے تحت کر دیے۔

اس کے گجرات پہنچتے ہی خسرو خاں نے مالا بار سے قدم نکالا اور گجرات پہنچ گیا۔ یہ کوئی ایسی نامعقول بات نہیں تھی جسے گجرات کے امراء تشویش کی نظر سے دیکھتے۔ خسرو خاں اپنے بھائی سے ملنے کسی بھی وقت آ سکتا تھا اور پھر خسرو خاں کا مقام و مرتبہ ایسا تھا کہ کسی کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ تشویش تو اس وقت ہوئی جب چند دن گزارنے کے بعد خسرو خاں مالا بار کی طرف روانہ ہوا اور اس کے رشتے داروں اور بہی خواہوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اس کے ہم قوم افراد پٹن اور دیگر علاقوں سے آ آ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔

حسام الدین بڑی ہوشیاری سے اپنی قوت میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ملکی بندوبست سے بالکل غافل ہو چکا تھا۔ باثر امراء اسے اس کی نااہلی سے تعبیر کر رہے تھے لیکن ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا منصوبہ کیا ہے۔ بعض امراء اس کے رشتے داروں کی وجہ سے خائف ضرور تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

حسام الدین جب اپنے رشتے داروں کے بل بوتے پر خوب قوت جمع کر چکا تو اس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کے تیار کردہ لوگ بہت سے امیروں کے محلات میں گھس گئے اور انہیں قتل یا گرفتار کرنے کے در پے ہوئے۔ شاہی لشکر سے ہتھیار رکھوا کر انہیں اطاعت پر مجبور کیا لیکن چونکہ ان امراء کی قوت میں بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اس لیے سب نے مل کر اس کا مقابلہ کیا اور یہ بغاوت ناکام ہو گئی۔ حسام الدین کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا گیا۔

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈالے جب حسام الدین دربارِ شاہی میں پیش کیا گیا اور بادشاہ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو جذبۂ محبت غالب آ گیا۔ حکم شاہی ہوا کہ فوراً اس معشوق نما کو بیڑیوں سے آزاد کرو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے پوچھ گچھ کی جاتی لیکن اس کے بجائے اسے عنایاتِ شاہی سے سرفراز کیا اور اپنی درگاہ کا مقرب بنایا۔ گجرات کے امراء اس خبر کے انتظار میں تھے کہ حسام الدین کے قتل کی خبر آئے گی۔ اس کے برعکس جب ان تک یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ نے اسے مقربِ خاص بنا لیا ہے اور اس کی تمام گستاخیاں معاف کر دی گئی ہیں تو ان کے پاس کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں تھا بلکہ وہ خوف زدہ ہو گئے کہ کہیں بادشاہ کا عتاب ان پر نازل نہ ہو جائے۔

مبارک شاہ نے اپنی دلداری کے لیے حسام الدین کو اپنے پاس روک لیا اور اپنے ایک لائق امیر کو صاحبِ نسب اور بہترین منتظم دیکھ کر گجرات کا حکم بنا دیا۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ گجرات میں بغاوت کے آثار جوان ہوئے تو دکن کے وزیر ملک یک لکھی کے دل میں بھی حکومت کرنے کا خیال آیا اور مبارک شاہ کی طرف سے نمک حرامی پر کمر باندھی۔ یہ شخص علاؤ الدین خلجی کے غلاموں میں سے ایک تھا۔ مبارک شاہ نے اسے دکن کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔

مبارک شاہ کی غلط حرکات دیکھ کر قدیم غلاموں پر بے چینی طاری ہو گئی تھی۔ ملک یک لکھی کی بغاوت بھی اسی بے چینی کا حصہ تھا۔ مبارک شاہ نے بغاوت کے آثار دیکھتے ہی ایک زبردست فوج دیوگڑھ روانہ کی۔

”بھیا، تمہیں یاد ہے۔ سال دو سال ہوئے ہم انہی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا۔“

”ہاں بھیا، یاد تو ہے۔“

”اس وقت یہ قافلہ دکن سے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ جنگ لگ گئی اور میں نے کہا تھا کہ جنگ لگتی تو قافلہ دہلی سے دکن کی طرف جا رہا ہوتا۔“

”ہاں یاد تو آ رہا ہے۔“

”اب یہ قافلہ دہلی سے دکن کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دکن کی طرف گڑبڑ ہے۔ لشکر کسی دوسرے راستے سے جا رہا ہوگا۔ یہ خاص لوگ ہیں جو جلدی کی وجہ سے ادھر سے جا رہے ہیں۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک اور شخص ان کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔

”سنا ہے دکن کے وزیر نے بغاوت کر دی ہے۔ بادشاہ کی فوجیں اسی بغاوت کو کچلنے کے لیے جا رہی ہیں۔“

”ہاں بھیا، جب بادشاہ کمزور ہو تو بغاوتیں جوان ہو ہی جاتی ہیں۔“

”مبارک شاہ کمزور تو نہیں لیکن اس کی عیاشیوں نے اسے یہ دن دکھا دیے ہیں۔ دیکھنا گجرات کی طرح یہاں کی بغاوت کو بھی وہ کچل ڈالے گا۔“ اس شخص نے کہا اور سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

ملک یک لکھی کو یہ امید نہیں تھی کہ بادشاہ اتنی جلدی فوجیں روانہ کردے گا۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ فوجیں اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ شاہی لشکر کا مقابلہ کرتا۔ اس کے باوجود مقابلے پر آ گیا۔ چاہتا تھا کہ لڑتے لڑتے جان دے دے لیکن شاہی فوج نے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ اس کے ساتھیوں میں کچھ لوگ شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور جان کی امان کا وعدہ لے کر یہ وعدہ کرلیا کہ وہ ملک یک لکھی کو زندہ گرفتار کرادیں گے۔ یہ وعدہ کر کے وہ ملک یک لکھی کے پاس پہنچے اور اسے یہ باور کرایا کہ اگر وہ خود کو شاہی لشکر کے سردار کے حوالے کردے تو بادشاہ اس کا قصور معاف کردے گا۔ اسے کسی صورت یقین نہ آتا تھا لیکن بالآخر دام فریب میں آ گیا اور ان باغی ساتھیوں کے ہمراہ لشکر میں پہنچ گیا۔ دہلی سے آئے ہوئے امراء نے اس کا اس طرح استقبال کیا جیسے سارے قصور ابھی معاف ہو گئے ہیں۔

اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار رکھ دیے۔

اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب دہلی کی طرف روانگی سے کچھ دیر قبل اسے باقاعدہ گرفتار کرلیا گیا اور قیدیوں کی طرح دیوگڑھ سے دہلی پہنچا دیا گیا۔

قصر ہزار ستون میں ایک مرتبہ پھر دربار سجا۔ لوگ ابھی گجرات کی بغاوت کو بھولے نہیں تھے۔ انہیں یہ بھی یاد تھا کہ حسام الدین والی گجرات کو معاف کردیا گیا تھا۔ بیشتر کا خیال یہ تھا کہ ملک یک لکھی کو بھی معافی مل جائے گی لیکن وہ کسی منظورِ نظر کا بھائی نہیں تھا۔

دربار میں معزز امراء صف در صف بیٹھے تھے کہ گجراتی بھانڈ جس کا نام "بوتہ" تھا اس طرح داخل ہوا جیسے اصل بادشاہ وہی ہے۔ اس نے اراکینِ سلطنت پر ایک نظر ڈالی اور ایسی شکل بنائی کہ کئی امیروں کی غصے کے باوجود ہنسی نکل گئی۔ پھر اس نے مبارک شاہ کی نقل اتاری اور اس کے انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی اسی کے لیے مخصوص تھی۔ جب وہ بیٹھ چکا تو ملک یک لکھی کو پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ ملک یک لکھی نے حاضر ہوتے ہی اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ دو ایک ہمدرد امیروں نے بھی سفارش کی لیکن بادشاہ کی آنکھیں درباری بھانڈ "بوتہ" پر لگی ہوئی تھیں۔

"بوتہ تم بتاؤ، اس نمک حرام کے ساتھ ہم کیا سلوک کریں۔"

"حضور اس نے آپ سے زیادہ آپ کے والد کا نمک کھایا ہے، اس لیے وہی آئیں گے تو اسے قتل کریں گے اور وہ آ نہیں سکتے۔"

"تو کیا تم بھی اس کی معافی کے حق میں ہو؟"

"میں کیا بادشاہ ہوں جو ایسی بے وقوفی کے فیصلے کروں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ اس کے کان ناک کاٹ کر عبرت کا نشان بنا دیا جائے۔"

بادشاہ اس کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ اس نے ملک یک لکھی کو تو یہ سزا دی کہ اس کے کان اور ناک کاٹ کرا سے رہا کردیا لیکن اس کے ساتھیوں کو بڑی بری طرح اذیتیں دے دے کر قتل کیا۔

ملک یک لکھی کو نشانِ عبرت بنانے کے بعد دیوگڑھ کی حکومت عین الملک ملتانی کے سپرد کی اور ملک وجیہہ الدین کو گجرات سے بلا کر "تاج الملک" کے خطاب سے سرفراز کیا اور اسے وزیر السلطنت بنایا جس نے گجرات کے فتنے پر بڑی خوبی سے قابو پایا اور انتظام سنبھالا تھا۔

ان فتنوں سے نمٹنے کے بعد مبارک شاہ ایک مرتبہ پھر عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

خسرو خاں جب مالابار پہنچا تو وہاں کے حاکم شاہی فوج کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور اپنا خزانہ لے کر کسی سمت فرار ہو گئے۔ ایک سوداگر جس کا نام علی تقی تھا، وہ کہیں نہ گیا اور اس خیال سے کہ شاہی فوج کا سردار مسلمان اور لشکری بھی ہم مذہب ہیں اس لیے وہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے لہٰذا وہ مالابار چھوڑ کر کہیں نہیں گیا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ خسرو خاں نے زبردستی اس سے بے شمار دولت حاصل کی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس بے چارے کو قتل بھی کردیا۔

مالابار سے شاہی لشکر تلنگانہ پہنچا۔ یہاں کا راجا بھی مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور قلعہ بند ہو گیا۔ خسرو خاں نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ جب محاصرے نے طول پکڑا تو راجا نے مجبور ہو کر ایک سو ایک ہاتھی اور دیگر گراں قدر تحائف خسرو خاں کو بھیج کر اپنی جان چھڑائی۔

یہاں سے خسرو خاں کئی اور علاقوں کو فتح کرتا ہوا مالابار واپس آ گیا۔

طاقت میں اضافہ ہوا، دولت کے انبار لگے تو خسرو خاں بادشاہت کے خواب دیکھنے لگا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ علائی دور کے وفادار ملوک تھے جو مبارک شاہ کے ہمدرد بھی تھے اور نہایت بااثر بھی تھے۔ اب خسرو خاں کی ساری توجہ ان کی طرف تھی۔ وہ اپنے

راز داروں سے مشورے کرتا رہتا تھا کہ علائی ملوک کو کس طریقے سے پکڑا جائے اور کیسے ان کو ختم کیا جائے۔ لشکر میں سے کس کس کو ہم اپنے ساتھ لے لیں اور کس کس کو ختم کردیں۔ یہ ارادے محض ارادے تھے ورنہ ان امراء کے پاس کثیر لشکر تھے۔ انہیں زیر کرنا آسان نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ خسرو خاں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا امراء کو اس کے ارادوں کی اطلاع ہوگئی۔ ان امراء کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ وہ بغاوت پر کمر بستہ ہے اور بہت جلد فتنہ بپا ہونے والا ہے، ان امراء نے اس کے پاس پیغام بھیجا۔

"ہم نے سنا ہے کہ تو دن رات بغاوت کرنے کے متعلق سوچتا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہاں سے دہلی واپس نہ جائے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے اور تیرے درمیان جو پردہ ہے، وہ چاک ہو اور ہم تجھے گرفتار کریں تو واپسی کا ارادہ مصمم کرلے۔"

خسرو خاں ان علائی ملوک کی طاقت سے واقف تھا لیکن لشکر تو اس کے پاس بھی تھا۔ ایک طرف اپنی طاقت پر ناز دوسری جانب بادشاہت کا لالچ...... ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔

جب ان امراء نے دیکھا کہ وہ کسی صورت دہلی جانے کو تیار نہیں تو تمام حالات لکھ کر مبارک شاہ کی خدمت میں بھجوا دیے۔

ان حالات کو سن کر مبارک شاہ کو یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ امراء اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیں۔ اس سے پہلے کہ وہاں حالات خراب ہوں، خسرو خاں کو واپس بلا لیا جائے۔ مبارک شاہ نے ان امراء کو لکھا کہ خسرو خاں جس جگہ پہنچے، اسے فوراً پالکی میں سوار کر کے دوسری منزل تک پہنچا دیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد دہلی تک پہنچ جائے۔ اس پیغام نے خسرو خاں کو دہلا کر رکھ دیا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا کہ دہلی پہنچنے کے بعد مبارک شاہ نہ جانے اس کے بارے میں کیا فیصلہ سنائے۔ اس نے بادشاہ اور امراء کو خوش کرنے کے لیے یہاں کی حکومت چند امراء میں تقسیم کی اور دہلی کی طرف چل پڑا۔

مبارک شاہ گجرات کے علما کی شکایتوں پر یقین کرچکا تھا۔ خسرو خاں کی محبت کے باوجود اسے اس بات پر غصہ تھا کہ خسرو خاں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ اس کے لیے طرح طرح کی سزائیں سوچ رہا تھا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ خسرو خاں کے پہنچنے کی اطلاع پہنچی۔ دیکھے بغیر خسرو خاں کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کئی مہینوں کی دوری نے کام کر دکھایا۔ محبت نے جوش مارا۔ حکم ہوا خسرو خاں قیدی نہیں، ہمارا محبوب نظر ہے۔ اسے مہمانوں کی طرح ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا لیکن بادشاہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا محبوب رسوا ہو۔

خسرو خاں بادشاہ کے جذبات سے بے خبر خوف زدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اتنی شکایتوں کے بعد وہ عتاب کا نشانہ ضرور بنے گا۔ ڈرتا کانپتا بادشاہ کے حضور پہنچا ضرور لیکن بادشاہ کی نظر جونہی اس پر پڑی سارا غصہ کافور ہوگیا۔ خسرو خاں کا ہاتھ پکڑا اور خلوت گاہ میں لے گیا۔ دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ گلے سے گلے ملے تو سارے شکوے جاتے رہے لیکن پھر بھی وضاحت ضروری تھی۔

"خسرو خاں! میں تمہارے بارے میں یہ کیا سن رہا ہوں؟"

"میں خود راستے بھر یہی سوچتا آیا ہوں کہ مجھ سے کیا قصور سرزد ہوا کہ مجھ پر یہ تہمت لگائی گئی اور حضور نے بھی بے سوچے سمجھے مجھے طلب کرلیا۔ میں حاضر ہوں، ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔"

"تم میری طرف سے بدگمان نہ ہو۔ میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلوا لیا کہ وہاں رہ کر تمہاری جان کو خطرہ ہوسکتا تھا۔" جب خسرو خاں نے یہ دیکھا کہ بادشاہ اس پر مہربان ہے تو اس نے مکاری سے کام لیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"امراء میری شان و شوکت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں اس لیے انہوں نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے کے لیے مجھ پر نمک حرامی کا زبردست الزام لگایا ہے۔"

بادشاہ اس پر ایسا دیوانہ تھا کہ امراء کی شکایتیں بے اثر ہوکر رہ گئیں۔ اسے خسرو کی باتوں پر یقین ہوا اور وہ دل ہی دل میں گجراتی امراء سے ناراض ہوگیا۔

خسرو خاں کے آنے کے بعد سارا لشکر بھی دہلی واپس آ گیا۔ لشکر کے ساتھ یہ امراء بھی دہلی آئے تاکہ بادشاہ کو خسرو خاں کے فاسد خیالات سے آگاہ کریں۔ ان امراء میں ملک تمر اور ملک تلبغہ پیش پیش تھے۔ ان امراء نے مبارک شاہ کو خسرو خاں کے مالابار میں ٹھہرے رہنے، منصوبے بنانے اور علم بغاوت بلند کرنے کے ارادے کی کیفیت بتائی اور اپنے بیانات پر گواہ بھی پیش کیے لیکن بادشاہ پر خسرو خاں کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ خسرو کے سوا کسی پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ نامور اور سچے امیر جتنا اسے یقین دلاتے، اتنا ہی وہ انہیں جھٹلاتا۔ جب یہ لوگ

برابر اپنی بات پر اڑے رہے تو بادشاہ نے ان کے لیے زبان بندی کا فیصلہ کرلیا۔ ملک تمر کا مرتبہ کم کردیا اور حکم دے دیا کہ اس کو درگاہ کے اندر نہ آنے دیا جائے۔ ملک تلبغہ سے اس کا عہدہ اور لشکر واپس لے لیے اور اس کو قید کردیا۔ جن لوگوں نے گواہی دی تھی، انہیں سخت سزائیں دیں اور قید میں ڈلوادیا یا اطراف میں بھجوادیا۔

ان سزاؤں نے دربار سے منسلک ہر شخص کو خوفزدہ کردیا۔ ہر شخص کو یقین آگیا کہ نمک حلالی کے لیے جو شخص بھی سلطان کے سامنے کچھ کہے گا، اس کو وہی سزا ملے گی جو ان امراء کو ملی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح رائے دینے والوں کی زبانیں یکسر بند ہوگئیں۔ وہ تمام بزرگ اور سردار جن کو دربار میں کوئی کام بھی ہوتا، خود کو خسرو خاں کی پناہ میں دے دیتے۔ بادشاہ عضوِ معطل ہوتا جارہا تھا۔ تمام نظام سلطنت خسرو خاں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ بادشاہ اس کے عشق میں ایسا گرفتار تھا کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ خسرو خاں جس کو چاہتا سزا دلواتا، جس کو چاہتا معافی دلوادیتا۔

خسرو خاں نے ایسا انتظام کررکھا تھا کہ معافی اس کے حق میں جاتی اور سزا مبارک شاہ کے کھاتے میں لکھ دی جاتی۔ لوگ اس کی بے انصافی، اس کے قہر اور تکبر سے عاجز ہوتے چلے جارہے تھے۔

خسرو خاں نے ایک ایک کرکے اپنے مخالفین کو قتل کرادیا۔ کچھ قتل ہوئے، کچھ خاموش ہوگئے تو وہ خاموشی سے ایسے اقدام اٹھانے لگا جس سے بغاوت کا کام آسان ہوجائے۔ اسے ایسے لوگوں کی تلاش ہونے لگی جو اس کے کام آسکتے تھے۔ بہت سے تھے جو مبارک شاہ سے کدورت رکھتے تھے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ وہ خسرو خاں کی چھتری تلے جمع ہونے لگے۔

☆☆☆

فاخرہ بیگم ایک مغل خاتون تھی۔ علاؤ الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں مغلوں کا ایک سردار جس کا نام اقبال مند تھا، ایک زبردست لشکر لے کر ہندوستان کی طرف آیا تھا اور غارت گری کا بازار گرم کیا تھا لیکن اس کا ستارہ گردش میں تھا کہ اس کے لشکر کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اس کو زندہ گرفتار کرکے قتل کردیا گیا۔ اس کا لشکر اپنے وطن کی طرف فرار ہوگیا لیکن چند لشکری ایسے بھی تھے جو ہندوستان ہی میں کہیں روپوش ہوگئے۔ فاخرہ بیگم ایسے ہی ایک خاندان کی بیٹی تھی۔ جب مبارک شاہ کا زمانہ آیا تو اس کے والد قصر ہزار ستون کے پہرے داروں میں شامل ہوگئے۔ اس طرح فاخرہ بیگم کا دربار میں آنا جانا ہوگیا۔ ایک روز اس کا آمنا سامنا امیر دربار بہاء الدین دبیر سے ہوگیا۔ انہوں نے اس لڑکی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیران ہورہے تھے کہ یہ لڑکی کون تھی جو ایک جھلک دکھا کر کسی طرف غائب ہوگئی۔ انہوں نے اسے محض ایک حادثہ قرار دیا تھا لیکن جب کئی دن تک اس کا خیال ذہن سے نہیں نکلا تو انہیں فکر لاحق ہوگئی۔ سوال یہ تھا کہ اس لڑکی کا انہیں نام تک معلوم نہیں تھا، اسے تلاش کرتے تو کہاں۔ پہلے یہ خیال ہوا کہ مبارک شاہ کے حرم میں بازاری عورتیں داخل ہوتی رہتی ہیں وہ بھی ان میں سے کوئی ہوگی لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا کہ ایسی پاکیزہ صورت کسی بازاری عورت کی ہوسکتی ہے۔ پھر یہ بھی عجیب معما تھا کہ وہ مبارک شاہ کی حرم سرا کے بجائے قصر ہزار ستون میں کیا کررہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی دن گزر گئے۔ ان کی قسمت کہ ایک دن وہ پھر انہیں نظر آگئی۔ وہ کسی کام سے محل میں آئے تھے۔ وہ چند کنیزوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس بتارہا تھا کہ وہ کنیز نہیں۔ کوئی معمولی عورت بھی نہیں ورنہ یہ کنیزیں اس کے ساتھ نہ ہوتیں۔ بہاء الدین دبیر اچانک اس کے سامنے آگئے۔ انہیں اپنے مرتبے کا خیال بھی نہ رہا اور اس سے مخاطب ہوگئے۔

"خاتون! آپ کس خوش نصیب کی صاحبزادی ہیں اور قصر ہزار ستون سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"پہلے تو ہم آپ کا تعارف چاہیں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ ہم سے یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہیں۔" فاخرہ بیگم نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، کنیز نے فاخرہ بیگم کو ادب کی تلقین کی۔

"ان کے حضور ادب سے گفتگو کیجیے۔ یہ امیر بہاء الدین دبیر ہیں۔ بادشاہ کے مقرب خاص۔"

"ہمیں ان کے مرتبے کا پاس ہے۔ ہمارے لہجے میں تندی لاعلمی کے سبب سے آئی۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔"

"ہم پھر پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں اور محل میں کیوں ہیں؟"

"ہمارا نام فاخرہ بیگم ہے۔ ہمارے والد بہروز خاں پہرے داروں میں ملازم ہیں۔ یہاں چند کنیزیں ہماری سہیلیاں بن گئی ہیں۔ ہم انہی سے ملنے کبھی کبھی یہاں آجاتے ہیں۔"

بہاءالدین دبیر کو اس کے سوا کچھ پوچھنا نہیں تھا لہٰذا کنیزوں نے اجازت طلب کی اور فاخرہ بیگم ان کنیزوں کے جھرمٹ میں آگے بڑھ گئی۔

بہاءالدین دبیر، بہروز خاں کو نہیں جانتے تھے لیکن نام معلوم ہوجانے کے بعد اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اسی شام انہیں معلوم ہوگیا کہ بہروز خاں ایک مغل ہے۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں اقبال مند مغل کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آیا۔ مغلوں کی شکست کے بعد وہ شکست خوردہ لشکر کے ساتھ واپس نہیں گیا بلکہ یہیں رک گیا۔ کچھ عرصہ روپوش رہا۔ مبارک شاہ کا عہد آیا تو اس نے اس کی ملازمت کرلی۔ فاخرہ بیگم اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔

بہاءالدین دبیر پہلی ملاقات میں فاخرہ بیگم کے حسن سے متاثر ہوئے تھے، دوسری ملاقات میں اس کی شائستہ گفتگو نے ان کا دل موہ لیا۔

وہ بہروز خاں سے ملاقات کے متمنی تھے لیکن ایک معمولی ملازم سے ملاقات کے لیے ازخود جانا ان کی شان کے خلاف تھا۔ اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ بادشاہ سے ملاقات کے بعد بہروز خاں کو اپنے محل کی حفاظت پر مامور محافظوں میں شامل کرلیا۔

بہاءالدین دبیر نے پہلے ہی دن اسے اپنے حضور طلب کیا اور جو باتیں وہ پہلے ہی معلوم کرچکے تھے، بہروز خاں سے معلوم کیں۔ بہروز خاں نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ ہر بات تفصیل سے گوش گزار کردی۔ بہاءالدین دبیر نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کردیا اور اسے اجازت مرحمت فرمادی کہ وہ جب چاہے ان سے ملاقات کے لیے آسکتا ہے۔ یہ رعایت ہر محافظ کو حاصل نہیں تھی۔

بہاءالدین دبیر کی بے قراری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن اپنے چند محافظوں کے ہمراہ بہروز خاں کے گھر پہنچ گئے۔ ان کا ہاتھی بہروز خاں کے مکان کے سامنے جاکر کھڑا ہوا تو خلقت کو تعجب کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ بہروز خاں اس وقت گھر پر ہی تھا۔ گھبرا کر گھر سے باہر نکلا کہ شاید کوئی گستاخی ہوئی ہے جو امیر خود اس کے گھر چلے آئے، شاید سزا سنانے۔

”امیرِ محترم! میں حقیر اعتراض کا حق تو نہیں رکھتا لیکن کہاں میرا غریب خانہ کہاں آپ کے قدم۔ بندے سے کوئی گستاخی ہوئی ہے تو مجھے طلب فرماسکتے تھے۔“

”گستاخی کیسی، میں تو آپ کے حالات سن کر بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی گفتگو آپ کے اعلیٰ نسب ہونے کا پتا دیتی ہے۔“

”اسے میں آپ کے حسنِ نظر کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ جب ناچیز کی اتنی تعریف فرما رہے ہیں تو غریب خانے کو رونق فرمائیے۔“

”ہم تو اس طرف سے گزر رہے تھے۔ اچھا نہیں لگا کہ آپ سے ملاقات کیے بغیر چلے جائیں۔“

”اب مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ آپ مجھے خدمت کا موقع دیے بغیر چلے جائیں۔ میری عزت افزائی کے لیے گھر کے اندر تشریف لائیے۔“

بہاءالدین تو چاہتے ہی یہی تھے۔ اس کی درخواست قبول کی اور اس کے مکان میں قدم رکھ دیا۔ بہروز خاں نے انہیں دیوان خانے میں لے جاکر بٹھایا اور وہیں سے اپنی بیٹی فاخرہ کو آواز دی۔

”فاخرہ بیٹی، جلدی دیوان خانے میں آئیے۔ دیکھیے تو کون آیا ہے۔ ہمارے گھر کا تو مقدر جاگ گیا۔“ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ خوشبو کے جھونکے کے ساتھ فاخرہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی اور ایک ادائے خاص سے آداب کرکے ایک جانب بیٹھ گئی۔

”آپ تو ان سے ناواقف ہوں گی۔ یہ امیر بہاءالدین دبیر ہیں۔ ان کا غائبانہ تذکرہ میں نے آپ سے کل ہی کیا تھا۔“

”ابا جان، آپ نے اچھا یاد دلایا۔ میں نے قصر ہزار ستون میں ان کی غریب پروری کے کئی قصے سنے ہیں۔ آپ نے نام لیا تو مجھے یاد آیا۔ مجھے ان سے ملنے کا خود بڑا اشتیاق تھا۔ اللہ نے میری سن لی کہ انہیں ہمارے گھر بھیج دیا۔“

”اب باتیں ہی کرتی رہوگی یا کوئی خاطر تواضع بھی کروگی۔“ بہروز خاں نے کہا۔

”وہ نہیں، آج صرف باتیں ہوں گی۔“ بہاءالدین نے کہا۔ ”خاطر تواضع اگلی ملاقات پر اٹھا رکھیے۔“ بہروز خاں کو دھچکا سا لگا۔ کیا وہ آئندہ آنے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔ یہ واقعی غریب پرور ہیں کہ آئندہ آنے کا بھی دلاسا دے رہے ہیں۔

”بہروز خاں، تمہاری صاحبزادی بہت شستہ گفتگو کرتی ہیں۔“

”اس لیے بھی کہ یہ بہت اچھی شاعرہ بھی ہیں۔“

”ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کے خیالات کی پرواز

کہاں تک ہے۔ کچھ سنایئے۔"

فاخرہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی اور پھر خیالات ایسے اعلیٰ کہ بہاء الدین تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس شعر پر تو بہاء الدین کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"باغ میں ایک پھول ایسا بھی تھا جو میرے ہاتھ کی دسترس سے بہت دور تھا۔ میں نے دعا مانگی اور پھول میری آغوش میں آ گرا۔"

بہاء الدین نے یہی سمجھا کہ یہ شعر اس نے ان کے لیے کہا ہے۔

بہروز خاں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ بہت اچھی مصور بھی ہے۔ لیکن بہاء الدین یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ وہ آئندہ آئے گا تو اس کے شاہکار بھی ملاحظہ کرے گا۔

بہاء الدین دراصل یہ چاہتے تھے کہ آئندہ آنے کا بھی کوئی بہانہ ہو۔ انہوں نے دو دن بڑی مشکل سے گزارے اور ایک مرتبہ پھر بہروز خاں کے گھر پہنچ گئے۔ فاخرہ نے انہیں اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھائیں تو اس کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ وہ ایک ماہر مصورہ کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ اسی ملاقات میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتی ہے۔ ایک ملاقات کا بہانہ اور مل گیا۔ پھر یہ محفلیں ہر دوسرے تیسرے دن برپا ہونے لگیں۔ اب بہروز خاں کی موجودگی بھی شرط نہیں تھی۔

بہاء الدین نے ایک روز تجویز پیش کی کہ شکار پر چلا جائے۔ بہروز خاں سے پہلے فاخرہ نے اس تجویز کی حمایت کی۔

بہاء الدین کوئی معمولی آدمی تو تھا نہیں۔ شکار پر اس طرح روانہ ہوا جیسے برات جاتی ہے۔ نوکر چاکر، ماہر نشانچی، خیمے، باورچی سب ساتھ تھے۔ بہروز خاں، فاخرہ اور بہاء الدین ایک ہی ہاتھی پر سوار تھے۔ دہلی سے بہت آگے نکل کر ایک جنگل میں خیمے لگا دیے گئے۔ یہاں بھی بہاء الدین، بہروز خاں اور فاخرہ ایک ہی خیمے میں ٹھہرے۔ رات کو درختوں پر مچان بنا دیے گئے تاکہ جو جنگلی جانور اس طرف سے گزرے، اسے نشانہ بنایا جا سکے۔

پورے چار دن تک جنگل میں منگل بنا رہا۔ اس دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ فاخرہ بہادر بھی ہے اور اچھی نشانہ باز بھی۔ یہ بھی ہوا کہ فاخرہ اس کے بہت قریب آ گئی۔ فاخرہ کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرنے لگی ہے۔ اب موقع تھا کہ بہروز خاں سے فاخرہ کا رشتہ مانگا جا سکتا تھا۔

شکار سے واپس آنے کے بعد انہوں نے بہروز خاں سے بات کی۔ بہروز خاں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس سے بہتر رشتہ اسے اور کیا مل سکتا تھا۔ اس نے سوچنے کی مہلت تک طلب نہیں کی اور اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی امیر شادی کرتا تھا تو بادشاہ کی اجازت لینا ضروری ہوتا تھا۔ یہ ایک رسم تھی ورنہ بادشاہ کو کیا پڑی تھی کہ مخالفت کرتا۔ یہاں بھی کسی مخالفت کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا بہاء الدین بلا خوف و خطر مبارک شاہ کے حضور پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنا عندیہ ظاہر کیا اور اپنے انتخاب پر بادشاہ کو قائل کرنے کے لیے فاخرہ کے حسن اور صلاحیتوں کی ایسی مبالغہ آمیز تعریف کی کہ مبارک شاہ جیسا حسن پرست متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بہاء الدین کو کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ سوچ کر اجازت دے گا۔ بہاء الدین کی یادداشت میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شادی کی اجازت دینے کے لیے بادشاہ نے مہلت مانگی ہو۔ انہیں شک ضرور ہوا تھا لیکن وقت سے پہلے یقین کیا آتا۔

بہاء الدین اٹھ کر گئے ہی تھے کہ بہروز خاں کے دروازے پر شاہی کارندہ پہنچ گیا۔ وہ ملازمت پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ طلبی کا فرمان آ گیا۔

"بادشاہ سلامت نے ابھی اسی وقت آپ کو طلب کیا ہے۔"

"تمہیں تو معلوم ہوگا کہ مجھے کس لیے بلایا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

بہروز خاں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ حکم کی تعمیل کرے۔ تیار تو تھا ہی، گھوڑے پر سوار ہوا اور بادشاہ سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔

اسے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ مبارک شاہ جیسا متکبر بادشاہ ایک معمولی ملازم سے اس خوش اخلاقی سے پیش آئے گا۔ بہرحال وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ مبارک شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے بہروز خاں کو بیٹھنے کے لیے بھی کہا تھا۔

"بہروز خاں! بہاء الدین دبیر آپ کی صاحبزادی کی بہت تعریف کر رہے تھے۔"

"یہ ان کا حسنِ نظر ہے۔"

"ہم نے سنا ہے وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔"

"جی ہاں، کچھ مصرعے جوڑ تو لیتی ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے، ہم اچھی شاعری کے عاشق ہیں۔"

"میں آپ کے ذوق ادب سے واقف ہوں۔"

"ہم چاہیں گے کہ ان کا کلام ان کی زبانی سنیں۔"

"وہ میری بیٹی ہے لیکن آپ کی باندی ہے۔ آپ کا کہا نہ میں ٹال سکتا ہوں، نہ میری جرأت۔"

"ہم اپنے درباری شعرا کو حکم دیں گے کہ وہ اس نوخیز شاعرہ کا کلام ملاحظہ فرمائیں اور دادِ سخن سے نوازیں۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

بہروز خاں قصر ہزار ستون سے نکل کر سیدھا بہاء الدین دبیر کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بہاء الدین کو تعجب ضرور ہوا لیکن اسے بادشاہ کی ادب دوستی سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا۔ درباری شعرا کے درمیان مقابلے ہوتے ہی رہتے تھے۔ اس نے اسے بھی ایسا کوئی مقابلہ تصور کیا۔

"حرج کیا ہے۔ وہاں اور بھی شعرا ہوں گے۔" بہاء الدین نے کہا۔

"آپ کی بات اور تھی ورنہ ہمارے ہاں پردے کا اہتمام ہوتا ہے۔"

"بادشاہ کا حکم ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا۔ ویسے بادشاہ کو خود بھی اس کا خیال ہوگا۔"

بہروز خاں کے چلے جانے کے بعد بہاء الدین اپنی حرکت پر خود نادم ہو رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے فاخرہ کی شاعری کا ذکر بادشاہ کے سامنے کیوں کیا۔

بہروز خاں کو امید نہیں تھی کہ بادشاہ پردے کا اہتمام کرے گا کیونکہ یہ اہتمام صرف معزز عورتوں کے لیے ہوتا تھا اور فاخرہ کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ ایک معمولی ملازم کی بیٹی ہی تو تھی۔

مشاعرے کا آغاز ہوا تو درباری شعرا اور فاخرہ کے درمیان ایک باریک پردہ ڈال دیا گیا۔ بادشاہ بھی پردے کے پیچھے ہی تشریف فرما ہوا۔

درباری شعرا نے دو دو اشعار سنا کر ماحول بنایا اور اس کے بعد فاخرہ نے اپنا کلام سنایا۔ اس کا کلام واقعی ایسا تھا کہ سب نے بے پناہ تعریف کی۔ بہروز خاں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ فاخرہ کی شاعری اگر بادشاہ کے دل کو لگ گئی تو اسے درباری شعرا میں جگہ مل جائے گی۔

مشاعرے سے واپسی پر جب فاخرہ بیگم کو شاہی رتھ نے اس کے گھر چھوڑا تو خوشی اور فخر سے اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ بہروز خاں کے قدم بھی خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

دوسرے دن شاہی کارندہ پھر بہروز خاں کے مکان پر دستک دے رہا تھا۔ بہروز خاں کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے فاخرہ سے بھی ذکر کیا اور خوش خبری سنادی کہ بادشاہ نے یہ خبر سنانے کے لیے بلایا ہے کہ تمھیں درباری شعرا میں شامل کیا جارہا ہے۔ فاخرہ کا بھی خوشی سے برا حال تھا۔

ایک مرتبہ بہروز خاں پھر بادشاہ کے روبرو تھا اور پہلے سے زیادہ عزت واحترام کے ساتھ۔

"بہروز خاں! جانتے ہو، ہم نے تمھیں کیوں بلایا ہے۔"

"حضور کے دل کا حال میں کیسے جان سکتا ہوں البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ حضور نے جو فیصلہ کیا ہوگا، اس غلام کی بہتری کے لیے ہوگا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ تمہارے اعلیٰ نسب کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں اپنے خاندان کا حصہ بنالیں۔"

"حضور! میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"تم بھی دیگر مغلوں کی طرح بہت بھولے ہو۔ ہمارا اشارہ فاخرہ بیگم کی طرف ہے۔ وہ اتنی صلاحیتوں کی مالک ہیں کہ انہیں ہمارے حرم میں ہونا چاہیے۔ ہم نے تمھیں یہی اطلاع دینے کے لیے بلایا ہے۔"

بہروز خاں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے، اس نے بڑی مشکل سے لب کھولے۔

"امیر بہاء الدین دبیر فاخرہ بیگم کا ہاتھ مانگ چکے ہیں۔ میں انکار بھی نہیں کر سکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں اب انہیں کیا جواب دوں گا۔"

"بہروز خاں! میں بادشاہ ہوں۔ یہاں سے دکن تک میری حکومت ہے۔ بہاء الدین کی کیا مجال ہے جو میری پسند کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔ آپ آرام سے گھر جائیں، میں خود ان سے بات کروں گا۔"

بہروز خاں وہاں سے اٹھ تو گیا لیکن اب بہاء الدین سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا ان کے مکان پر پہنچا اور بادشاہ سے ہونے والی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

"آپ کیا کہتے ہیں؟"

"بادشاہ کے حکم سے انکار کی میری کیا مجال۔"

"لیکن میری مجال ہے۔ میں بادشاہ سے خود بات کروں گا۔"

"حضور! بڑوں کی لڑائی میں میرا نقصان نہ ہوجائے۔"

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس کسی طرح بادشاہ سے کچھ مہلت طلب کرلو۔''

''میرے لیے تو یہ بھی مشکل ہوگا۔''

''یہ مشکل میں آسان کردوں گا۔ آج ہی رات اپنے گھر والوں کو لے کر گجرات کی طرف نکل جاؤ۔ میرے چند آدمی تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ ہوں گے۔ وہ تمہیں گجرات میں میرے ایک دوست تک پہنچا دیں گے۔''

''گجرات بھی تو بادشاہ کی مملکت ہی کا ایک حصہ ہے۔ وہاں میری حفاظت کی کیا ضمانت ہے۔''

''تمہاری حفاظت کی ضمانت میں ہوں۔ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں، وہ مجھے سوچنے دو۔''

بہروز خاں نے گھر پہنچ کر فاخرہ سے بات کی۔ اس نے بھی اتفاق کیا اور ضروری سامان تیار کرلیا۔ بس ان لوگوں کا انتظار تھا جن کی نگرانی میں انہیں گجرات پہنچنا تھا اور گھر کو تالا لگانا تھا۔

رات کے اندھیرے نے چادر تانی تو تیز رفتار رتھ بہروز خاں کے دروازے پر آکر کھڑا ہوگیا جس میں بہروز خاں اور فاخرہ کو سوار ہونا تھا۔ بہاء الدین دبیر کے دس وفادار سپاہی اس رتھ کو گھیرے ہوئے تھے۔

بہروز خاں اور فاخرہ سوار ہوئے اور رتھ آگے بڑھ گیا۔

جس وقت یہ رتھ شہر کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا، اسی وقت بہاء الدین دبیر خسرو خاں سے ملاقات کے لیے اس کے مکان پر پہنچا تھا۔ یہ ملاقات ایسی تھی کہ رات کے اندھیرے میں ہی ہوسکتی تھی۔ خسرو خاں کو بھی کوئی تعجب نہیں ہوا تھا کیونکہ کئی امراء رات کے اندھیرے ہی میں اس سے ملے تھے اور بغاوت میں اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے خوب اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد بہاء الدین کو خسرو خاں کے سامنے پیش کردیا۔ خسرو خاں نے بھی سوچا تھا کہ ملاقات میں کیا حرج ہے۔ معلوم تو کیا جائے کہ بہاء الدین کس مقصد کے تحت آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے بادشاہ سے انہیں کچھ کام ہو اور وہ سفارش کے لیے اس کے پاس آئے ہوں لیکن اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ بہاء الدین نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

''خسرو خاں! اب بادشاہ کی زیادتیاں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں آپ کے ارادوں کی تکمیل کے لیے آپ کا ساتھ دوں۔''

''آپ کس ارادے کی تکمیل کی بات کررہے ہیں؟''

خسرو خاں نے احتیاط کے طور پر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''خسرو خاں! مجھے معلوم ہے کہ ان معاملات میں احتیاط ضروری ہوتی ہے لیکن آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ میں اپنے وسائل کے ساتھ آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔ جو کام میں اکیلا نہیں کرسکتا، وہ آپ کے ساتھ مل کر ضرور کروں گا۔''

''میں پھر بھی نہیں سمجھا۔''

''دیکھو خسرو خاں! بادشاہ نے میرے ساتھ ایک ایسی زیادتی کی ہے کہ مجھے غیرت سے مرجانا چاہیے لیکن یہ بھی میری بزدلی ہوگی۔ میں بادشاہ کو قتل کرنے کے ارادے سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ جو کام میں اکیلا نہیں کرسکتا، وہ تمہارے ساتھ مل کر کروں گا۔''

''بہاء الدین! میرا مقصد مبارک شاہ کو قتل کرنا نہیں۔''

''اس کے بغیر تمہاری بغاوت بے اثر ہوگی۔''

''بادشاہ کو قتل کرنا آسان نہیں۔''

''مشکل کو آسانی میں تبدیل کرنے کے لیے ہی میں تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''آخر ایسی کیا بات ہوگئی کہ آپ اس حد تک پہنچ گئے۔''

بہاء الدین دبیر نے تمام واقعات ایک ایک کرکے دہرا دیے اور خود کو خسرو خاں کی پناہ میں دے کر یہ عہد کیا کہ وہ مبارک شاہ کو قتل کرنے اور خسرو خاں کو تخت پر بٹھانے میں اس کا پورا پورا ساتھ دے گا۔

بہاء الدین نہایت تجربہ کار امیر تھا۔ اس نے خسرو خاں کو چند ایسے مشورے دیے جن پر عمل کرکے خسرو خاں کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوسکتا تھا اور بغاوت کے کام میں آسانی ہوتی۔

خسرو خاں کو ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ اس نے بہاء الدین کے مشوروں پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا۔

بہاء الدین کو معلوم تھا کہ آج کی رات کا دن چڑھنے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ مبارک شاہ کو یقیناً بہروز خاں کے فرار کی خبر مل جائے گی اور وہ معلومات کے لیے اسے (بہاء الدین کو) ضرور بلائے گا۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا اور خوب اچھی طرح دن چڑھ گیا تو بادشاہ کی طرف سے پیغام آگیا۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ بہروز خاں اور فاخرہ بہت دور نکل گئے ہوں گے۔ بادشاہ نے

اگر آدمی دوڑائے بھی تو وہ ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔ انھوں نے مزید وقت گزارنے کے لیے تیار ہونے میں خوب دیر کی۔ قصر ہزار ستون پہنچے تو مبارک شاہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

''آپ کو کچھ معلوم ہے، بہروز خاں دہلی سے فرار ہو چکا ہے۔'' مبارک شاہ نے کہا۔

''وہ رات کو پہرے پر بھی نہیں آیا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔''

''بہاء الدین! اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اسے فرار کرانے میں آپ کا ہاتھ ہے تو میں آپ کے قتل کا فرمان جاری کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔''

''میں اسے فرار کیوں کراؤں گا؟ میں تو اس کی صاحب زادی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ میں نے تو آپ سے اجازت طلب کی تھی۔''

''اگر آپ کا اس میں ہاتھ نہیں تو چوبیس گھنٹے کے اندر اسے کہیں سے بھی لاؤ اور میرے سامنے پیش کرو۔''

''آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ وہ اگر پاتال میں بھی ہوگا تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔'' بہاء الدین نے کہا۔

''اب وہ آپ کا نہیں میرا دشمن ہے۔ اس نے میری توہین کی ہے۔ وہ شاید اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے نہیں کرنا چاہتا اسی لیے وہ کہیں روپوش ہو گیا ہے۔''

رات ہوئی اور خسرو خاں حسب معمول بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے اس کی خلوت گاہ میں آیا تو بادشاہ نے اس سے بھی بہروز خاں کے فرار کا قصہ بیان کیا۔ خسرو خاں کو سب کچھ معلوم تھا لیکن وہ جان بوجھ کر لاعلم بنا رہا اور بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ دکن و گجرات میں بہروز خاں کو تلاش کرنے کے احکامات جاری کرے گا۔

بہاء الدین دبیر کو خبر موصول ہو چکی تھی کہ بہروز خاں بہ حفاظت گجرات پہنچ چکا ہے۔ وہ بادشاہ کو برابر دلاسے دے رہا تھا کہ اس نے بہروز خاں کی گرفتاری کے لیے جال پھیلا رکھا ہے۔ بادشاہ نے بھی گجرات اور دکن کے حاکموں کو لکھ دیا تھا کہ وہ بہروز خاں کو تلاش کریں لیکن یہ کام خسرو خاں کے سپرد کیا گیا تھا اس لیے ایسے خطوط ان حاکموں تک کبھی نہ پہنچ سکے۔

بہاء الدین، خسرو خاں سے برابر رابطے میں تھے۔ انہی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے خسرو خاں نے ایک روز بادشاہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''حضور! کبھی کبھی مجھ نمک خوار پر مہربانی فرما کر دور دراز کے ممالک کی فتح کا ایک اہم فریضہ سونپتے ہیں۔ ان مہمات میں چونکہ یہ خادم لشکر کا سردار ہوتا ہے اس لیے اکثر درباری امراء اپنی شرافت نسبی اور عالی خاندانی کے پیش نظر میری سرداری کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اگر حضور اجازت دیں تو میں اپنے خاندان کے ان گنت لوگوں کو جمع کر کے ایک لشکر تیار کرلوں جو میری ماتحتی میں اس قسم کے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔''

خسرو خاں اس وقت بادشاہ کی خلوت گاہ میں تھا اور اس کا دل بہلا رہا تھا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا کہ وہ خسرو خاں کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اس درخواست کو بڑی محبت کے ساتھ اسی وقت منظور کرلیا۔

خسرو خاں کو تو بس اس رسمی اجازت کی ضرورت تھی ورنہ تمام انتظامات وہ پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ اس نے گجرات کے بے شمار خانہ بدوش ہندوؤں کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر اپنے لشکر میں بھرتی کرلیا۔ یہ تعداد بڑھتے بڑھتے بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس نے اپنے جمع کردہ روپے سے اس لشکر کے گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ خریدا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

انہی دنوں یہ خبر اڑی کہ بادشاہ شکار پر جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ خسرو خاں نے پکا ارادہ کرلیا کہ بادشاہ کو عین شکارگاہ میں قتل کردیا جائے۔

خسرو خاں نے اپنے ہمدرد اور بہی خواہوں کو طلب کیا اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔

''بادشاہ شکار کے لیے ''سیر سادہ'' کی طرف روانہ ہونے کو ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ ہم اسے شکارگاہ میں قتل کر سکتے ہیں۔''

بہاء الدین اور دوسرے امراء نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

''اگر ہم نے راستے میں بادشاہ کو قتل کیا تو شاہی لشکر ہمارے خلاف ہو جائے گا۔''

''کیا ہم یہ موقع ضائع کردیں؟''

''بہتر یہ ہے کہ ہم کسی روز موقع پا کر اسے شاہی محل میں موت کے گھاٹ اتار دیں۔''

''کیا وہاں خون خرابا نہیں ہوگا؟''

''وہاں لشکر نہیں ہوگا۔ تھوڑے سے لوگ ہوں گے جن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔''

''اور بادشاہ کے ہمدرد امراء۔''

''تمام امراء کو اپنے پاس بلا کر نظر بند کرلیں گے۔

اگر یہ امراء بادشاہ کے خون کا انتقام نہ لیں اور ہماری اطاعت کے دائرے میں داخل ہو جائیں تو ان کی جان بخشی کردی جائے ورنہ انہیں بھی بادشاہ کی طرح قتل کر دیا جائے۔''

یہ مشورہ خسرو خاں سمیت سب کو پسند آیا اور طے پایا کہ جب بادشاہ شکار سے واپس آجائے تو ہنگامہ برپا کر کے قصر ہزار ستون کی بالائی منزل پر اسے قتل کریں اور اسی محل میں پناہ لیں۔ ملوک کو ان کے گھروں سے بلوا کر نظر بند کر دیں وغیرہ وغیرہ۔

اب سلطان کی شکار سے واپسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ روزانہ نئے نئے مشورے کیے جا رہے تھے۔ سب سے زیادہ جلدی بہاء الدین کو تھی کیونکہ اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بادشاہ کے قتل کے بعد ہی فاخرہ بیگم اسے مل سکتی تھیں۔

مبارک شاہ جلد ہی شکار سے واپس آگیا۔ اس کے قتل کا سامان مہیا کرنا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سے پہلے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ خسرو خاں کو ہر طرف سے مشورے مل رہے تھے اور وہ ایک ایک کر کے ان پر عمل کر رہا تھا۔

تمام انتظامات مکمل تھے، اب صرف ایک مرحلہ باقی تھا۔ یہ مرحلہ ایسا تھا جس پر صرف خسرو خاں ہی عمل کر سکتا تھا کیونکہ وہ بادشاہ کی خلوت کا ساتھی تھا۔ اس خلوت میں مدہوشی کے ایسے مراحل آئے تھے کہ بادشاہ خسرو خاں کی کسی بات کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات میں خسرو خاں نے مبارک شاہ کو شیشے میں اتارا۔

''حضور! کیا میں آپ کا معشوق بے بدل نہیں ہوں ؟''

''میں حرم کی لاتعداد عورتوں سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔'' نشے میں مدہوش مبارک شاہ نے کہا۔

''کیا میں اپنی راتیں آپ کے عیش کے سپرد نہیں کرتا ہوں؟''

''میں بھی تو اس کے صلے میں تمہیں مالا مال کرتا ہوں۔''

''آپ کی مہربانیاں ہر وقت مجھ پر سایہ فگن رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مہربانی کا اور طالب ہوں۔''

''میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ بادشاہت بھی طلب کرو تو دینے کو تیار ہوں۔''

''حضور! میں اکثر اوقات بہت رات گئے تک حضور کے ساتھ رہتا ہوں۔ جب رخصت ملتی ہے تو محل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ مجبور ہو کر ہیں حضور کے محل کے کسی کونے میں پڑا رہتا ہوں اور رات کا باقی حصہ بسر کر دیتا ہوں۔ مجھے تو آپ کے محل کا ہر کونا جنت کی طرح لگتا ہے لیکن اس سے میرے عزیزوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میرے وہ عزیز جو میری خاطر اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے ہیں میرے پاس نہیں آسکتے اور نہ ملاقات کر سکتے ہیں۔ اگر محل کے عقبی دروازے کی چابیاں میرے پاس ہوں تو میں اپنے عزیزوں کو رات کے وقت بلا سکتا ہوں اور وہ مجھ سے ملاقات کر سکتے ہیں۔''

مبارک شاہ مستی میں ایسا مدہوش اور غافل تھا، حکم دے دیا کہ چابیاں خسرو خاں کے حوالے کر دی جائیں۔

''بھلا تجھ سے اور تیرے ہم قوم جوانوں سے بڑھ کر میرے لیے اور کون صاحب اعتبار ہو سکتا ہے۔ میں آج سے شاہی دولت خانے کے تمام انتظامات تیرے سپرد کرتا ہوں۔''

چابیاں حاصل کرتے ہی خسرو خاں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے یقین ہو گیا کہ شاہی تخت پر بیٹھنے کے دن اب قریب آگئے ہیں۔

جب شاہی بارگاہ پوری طرح خسرو خاں کے قبضے میں آگئی تو اس کے لشکر کے لوگ اسلحے سے آراستہ ہو کر رات دن خسرو خاں کے شبستان میں چکر لگانے لگے۔ قریب ہی ملک نائب کا مکان (فروخانہ) تھا۔ خسرو خاں کے ہم قوم افراد دو تین سو کی تعداد میں رات بھر جمع رہتے اور صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاتے۔ پہرے دار جو محل ہی میں سوتے تھے یہ سب تماشے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان لوگوں کا اس طرح محل میں آنا مصیبت سے خالی نہیں ہو سکتا لیکن مبارک شاہ اس قدر بدمزاج ہو گیا تھا کہ کسی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کی جان کی سلامتی کے متعلق کوئی بات اس کے سامنے کہے لیکن محل میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے۔ مبارک شاہ کو خسرو خاں کی محبت نے اندھا کر دیا ہے اور وہ خسرو خاں کے ہاتھوں خود کو قتل کرانے والا ہے۔ بڑے بڑے بلند مرتبے رکھنے والوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ سلطان سے کہتا کہ خسرو خاں کی بغاوت کا منصوبہ گلے تک پہنچ گیا ہے۔ اگر تو چاہے تو اپنی جان بچا سکتا ہے۔ ان لوگوں میں سے جو راتوں کو محل کے اندر آتے ہیں، کسی ایک کو پکڑوا کر تحقیق کرتا کہ وہ خسرو خاں کے مشوروں کا حال تجھ پر ظاہر کر دے اور یہ بتلا دے کہ معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ محل کے تمام بزرگ خسرو خاں کی بغاوت سے متعلق مشورے سنتے تھے اور خسرو خاں کے

ہم قوم لشکریوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اندر ہی اندر آپس میں باتیں کرتے اور غصہ کھاتے تھے لیکن سلطان کے بے ہودہ برتاؤ سے ڈرتے تھے لہٰذا دم نہیں مار سکتے تھے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

جب معاملات بہت آگے بڑھنے لگے تو قاضی ضیا الدین سے نہ رہا گیا۔ وہ چونکہ مبارک شاہ کا استاد رہ چکا تھا اس لیے اسے یہ اعتماد تھا کہ بادشاہ اس کی بات کو بہ غور سنے گا۔ وہ نمازِ عصر کے بعد بادشاہ کے پاس گیا اور اپنی جان پر کھیل کر اس کے سامنے سارا ماجرا کہہ دیا۔

''خسرو خاں کے گھر میں ہر روز رات کے وقت اس کے ہم قوم جمع ہوتے ہیں اور ہتھیاروں وغیرہ سے لیس اور مستعد رہتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ خسرو خاں بغاوت کی فکر میں ہے لیکن وہ آپ کے ڈر سے کچھ نہیں کہتے ہیں' بادشاہ کے کرم پر اعتماد رکھتا ہوں اس لیے جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں ..... وہ عرض کر دیتا ہوں۔ خداوند عالم خوب جانتے ہیں کہ سلطان علاؤ الدین کے زمانے میں اگر کوئی شخص اپنے گھر کے اندر بھی پانی زیادہ پیتا تھا تو اس کی خبر سلطان کو پہنچ جاتی تھی اور اب بادشاہ کے محل میں اتنی بڑی مصیبت کے متعلق مشورے ہو رہے ہیں اور خداوند عالم کو خبر نہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اس معاملے کی تفتیش کرائیں۔ اگر تفتیش کے بعد کچھ نہ نکلے اور ہم غلاموں کا وہم غلط ثابت ہو تو خسرو خاں پر سلطان کو ہزار گنا زیادہ اعتماد ہو جانا چاہیے اور اگر تفتیش سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو بادشاہ کی جان محفوظ ہو جائے گی۔''

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مبارک شاہ اس ہمدرد کی باتوں پر غور کرتا لیکن اس پر تو خسرو خاں کا جادو چڑھا ہوا تھا۔ یہ باتیں ایسی ناگوار گزریں کہ یہ خیال کیے بغیر کہ وہ اس کے استاد رہ چکے ہیں' انہیں سخت سست سنا ڈالیں۔

''آپ کو جرأت کیسے ہوئی خسرو خاں کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کی۔ آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں جنہیں خسرو خاں سے میری محبت گوارا نہیں۔ آئندہ خسرو خاں کے خلاف ایک لفظ نہ سنوں ورنہ میں یہ خیال نہیں کروں گا کہ آپ میرے استاد رہ چکے ہیں۔''

قاضی صاحب اپنا سا منہ لے کر بادشاہ کے پاس سے اٹھ آئے۔ شامتِ اعمال کہ اسی وقت خسرو خاں بھی بادشاہ کے پاس آیا۔ بادشاہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ جو باتیں قاضی ضیاء الدین نے اس کے بارے میں کہی تھیں، اس سے کہہ دیں۔

خسرو خاں نے یہ باتیں سنتے ہی فرضی آہ و بکا شروع کر دی۔ جھوٹ موٹ کے آنسو بہانے شروع کر دیے۔

''خداوند عالم مجھ پر بے حد مہربان ہیں اور دوسرے امراء سے میرا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ جملہ بزرگانِ مملکت میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مجھ کو قتل کروا دیں۔''

بادشاہ اس کی گریہ وزاری سے ایسا متاثر ہوا کہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''اگر سارا جہان زیر و زبر ہو جائے اور میرے تمام مقربین یک زبان ہو کر بھی تیرے خلاف مجھ سے کچھ کہیں، تب بھی میں تجھ پر ایسا عاشق اور دیوانہ ہوں کہ تیرے ایک بال پر سب کو قربان کر دوں۔ تو اطمینان رکھ کہ کوئی شخص بھی ہو، میں تیرے متعلق اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر دوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد مبارک شاہ نے خسرو خاں کو رخصت کر دیا اور خود حرم سرا میں داخل ہو گیا۔

خسرو خاں وہ تمام باتیں سن چکا تھا جو قاضی ضیاء الدین نے اس کے بارے میں کہی تھیں۔ اس کی چالاکی سے یہ خطرہ ٹل تو گیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ قاضی صاحب کوئی اور چال چل سکتے تھے۔ کسی اور انداز سے بادشاہ کے کان بھر سکتے تھے۔ خسرو خاں نے یہی بہتر سمجھا کہ قاضی صاحب کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو طلب کیا اور قاضی صاحب کے قتل کی تیاری کے لیے مشورے کرنے لگا۔

اس کارِ بد کے لیے دوسری رات مقرر ہوئی تھی لہٰذا جب رات آئی تو خسرو خاں کے تمام نمک حرام ساتھی دربارِ شاہی کے انعقاد کے بہانے قصر ہزار ستون میں آئے اور کمیں گاہوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

جب رات کچھ گزر گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ان امراء کے علاوہ کہ جن کی پاسبانی ہزار ستون پر تھی اور کوئی محافظ نہ رہا تو قاضی ضیا الدین پاسبانوں کی حاضری کے لیے ہزار ستون میں داخل ہوئے۔ خسرو خاں کا چچا صندل سامنے آیا اور قاضی صاحب کو باتوں میں لگا لیا تاکہ وہ اردگرد کے ماحول سے غافل ہو جائیں۔ اس عیار شخص نے قاضی صاحب کو ایک گلوری پان کی دی اور باتوں میں الجھائے رکھا۔ کمیں گاہ میں چھپا ہوا ''جاہر'' نام کا ایک شخص موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے جیسے ہی دیکھا کہ قاضی صاحب باتوں میں محو ہیں، خاموشی سے کمیں گاہ سے نکلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا قاضی صاحب کے قریب پہنچ گیا۔ تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ قاضی صاحب پر مارا کہ ان کا جسم دو ٹکڑے

ہو گیا۔ قاضی صاحب کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ انہوں نے یہ منظر دیکھ کر چلّانا شروع کر دیا کہ قاضی صاحب قتل ہو گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ شور سن کر دوسرے پہرے دار تحقیقات کے لیے اپنی جگہ سے اٹھے۔ خسرو خاں کے آدمی بھی کمیں گاہ سے باہر نکل آئے اور تلواریں لہراتے ہوئے ہزار ستون میں داخل ہوئے۔ پہریدار بھی ڈٹ گئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

جس وقت یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، خسرو خاں بادشاہ کے پہلو میں بیٹھا تھا اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ نیچے ایسا شور شرابا ہوا کہ اوپر تک آواز گئی۔ بادشاہ نے یہ شور سنا تو خسرو خاں کی طرف دیکھا۔

''اتنی رات گئے یہ شور کیسا ہے۔''

''حضور! میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔''

خسرو خاں کو معلوم تھا کہ یہ شور کیسا ہے پھر بھی وہ بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا۔ چند لمحے باہر کھڑا رہا اور پھر اندر آ گیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ نوبت کے گھوڑے ہزار ستون میں آئے تھے، جلو داروں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ لوگ ان کو پکڑنے کے لیے دوڑ رہے ہیں اور اسی بنا پر شور ہو رہا ہے۔''

بادشاہ مطمئن ہو گیا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ حملہ آور ہزار ستون کے دروازے سے کوٹھے پر پہنچے اور خاص شاہی چوبداروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ شاہی خلوت گاہ شور سے گونج اٹھی۔ بادشاہ نشے میں تھا لیکن سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ پریشانی اور گھبراہٹ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ جوتے پہننا بھی بھول گیا اور بے تحاشا حرام سرا کی طرف بھاگا۔ خسرو خاں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھا اور بادشاہ کے بل کھاتے ہوئے بال مضبوطی سے پکڑ لیے۔ بادشاہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے باہر آ گئیں۔ جسے وہ معشوق بنائے ہوئے تھا، جس کی خاطر بڑے بڑے امراء کو ناراض کیا تھا، وہ اس کے بالوں کو پکڑ کر اسے نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے بغل میں دبوچ لیا اور اسے نیچے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چاہتا تھا کہ اپنے بال خسرو خاں کے ہاتھوں سے چھڑا لے لیکن خسرو خاں کسی صورت اس کے بال چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی حالت میں جبکہ سلطان، خسرو خاں کو نیچے گرا کر اس کے سینے پر بیٹھا ہوا تھا اور خسرو خاں نیچے لیٹا ہوا اس کے بال اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا، خسرو خاں کے باقی ساتھی بھی خلوت گاہ میں داخل ہو گئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو زور سے چیخا۔

''جلدی آؤ اور مجھے اس سے چھڑاؤ۔'' یہ فریاد سن کر وہی جاہر نامی شخص جس نے قاضی ضیا الدین کو قتل کیا تھا، آگے بڑھا اور تلوار کا ایسا وار کیا کہ بادشاہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ جاہر نے مردہ بادشاہ کو سر کے بالوں سے گھسیٹ کر خسرو خاں کے اوپر سے کھینچ لیا اور اس کا سر کاٹ کر ہزار ستون سے نیچے پھینک دیا۔ لوگوں نے اس بے تن سر کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی، وہاں جا کر چھپ گیا۔ محل کی بالائی منزل خسرو خاں کے آدمیوں سے بھر گئی۔ چوکیدار بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی نہیں تھا جو بادشاہ کے لیے آواز بلند کرتا۔

سلطان قطب الدین کو قتل کرنے کے بعد خسرو خاں کا ماموں ''رندھول'' اس کا بھائی حسام الدین اور اس کے کئی دوسرے رشتے دار بادشاہ کے حرم میں گھس گئے۔ انہوں نے سلطان علاؤ الدین کی بیوی یعنی فرید خاں اور عمر خاں کی ماں کو قتل کیا۔ جتنے نوعمر لڑکے تھے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جی بھر کے اہل حرم کی بے عزتی اور توہین کی۔ مبارک شاہ کی جن بیویوں کا آنچل تک کسی نے نہیں دیکھا تھا، ان کی عزتیں پامال ہوئیں۔

ہاتف غیبی آواز دے کر کہہ رہا تھا۔ ''تو جو بوئے گا وہ کاٹے گا۔''

جب کاٹنے کے لیے کوئی سر باقی نہ بچا اور مکمل غلبہ ہو گیا تو اسی آدھی رات کے وقت وہ امرا اور دوسرے معتبر لوگوں کو ان کے گھروں سے محل میں لے آئے اور ہزار ستون کے اوپر لے گئے اور ان سے اپنی تخت نشینی کا عہد لینے کے لیے نظر بند کر دیا۔

جب صبح ہو گئی اور دن نکل آیا تو ان گرفتار امراء کو طلب کیا اور ان سب لوگوں کے سامنے ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے تختِ سلطنت پر بیٹھ گیا۔

عین الملک ملتانی جو ان دنوں دیوگڑھ سے آیا ہوا تھا، ملک جونا جو بعد میں محمد شاہ تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اور دوسرے کئی نامی گرامی امراء جو اس واقعے سے بے خبر تھے اور اپنے گھروں میں پڑے سو رہے تھے، بھاگنے سے پہلے گرفتار ہوئے اور ان معزز لوگوں کو اپنے سامنے مؤدب کھڑے رہنے کا حکم دیا۔

خسرو خاں نے تخت پر بیٹھتے ہی حکم دیا کہ سلطان قطب الدین کے ان چند غلاموں کو جن کے ساتھ اس کو

خصوصیت تھی اور جو عظیم امراء میں شمار کیے جاتے تھے، گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔ اس کے حکم کی اسی روز تعمیل ہوئی۔ ان میں سے بعض کو تو ان کے گھروں میں قتل کر دیا گیا اور بعض کو محل میں لا کر کسی کونے میں لے جایا گیا اور وہیں ان کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ ان کی مسلمان بیویوں کو گجرات کے ہندوؤں کو بخش دیا گیا۔ یہ ہندو وہ تھے جو گجرات سے آ کر اس کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔

قاضی ضیا الدین کا مکان جملہ اسباب کے ساتھ خالی پڑا تھا۔ ان کے بیوی بچے ان کے قتل کی خبر سنتے ہی فرار ہو گئے تھے ورنہ مارے جاتے۔ یہ مکان خسرو خاں نے اپنے ماموں ''رندھول'' کو دے دیا۔ بہاء الدین دبیر کو ''اعظم الملک'' کے خطاب سے نوازا۔ اسی طرح دوسرے امراء کے درمیان عہدے تقسیم کیے گئے۔ جس شخص نے بادشاہ کو قتل کیا تھا، اسے موتیوں اور جواہرات سے سجا دیا گیا۔

علاؤالدین خلجی اور مبارک شاہ کی بیویوں اور ان سے متعلقہ عورتوں کو خسرو خاں اور اس کے لشکریوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔

☆☆☆

خسرو خاں کو تخت نشیں ہوئے دو تین ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ اس کی ناشائستہ حرکات دیکھ کر امراء میں بے چینی پھیل گئی۔ ان میں سے چند نے ارادہ کر لیا کہ خسرو خاں سے مبارک شاہ کے قتل کا بدلہ لیا جائے۔ ان میں جونا خاں سب سے آگے تھا۔ وہ ایک دن آدھی رات کے وقت بھاگ نکلا اور چند خدمت گاروں کے ساتھ دیپالپور پہنچ گیا جہاں اس کا باپ غازی ملک دیپالپور کا حاکم تھا۔

خسرو خاں نے ملک جونا کے فرار کی خبر سنی تو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ اس کی بہادری سے واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ غازی ملک اور وہ مل کر اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ خسرو خاں نے اس کے تعاقب میں آدمی دوڑائے ضرور تھے لیکن یہ کم ہمت اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے اور راستے ہی سے لوٹ آئے۔ ملک جونا بہ حفاظت دیپالپور پہنچ گیا۔ غازی ملک پہلے ہی خسرو خاں کے خلاف تھا۔ اب جو بیٹے کو اپنے پاس دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور خسرو خاں سے انتقام لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آس پاس کے علاقوں کے امراء اور صوبہ داروں کو خطوط لکھے اور انہیں خسرو خاں سے جنگ کرنے پر اکسایا۔

☆☆☆

خسرو خاں کے اقتدار میں آتے ہی بہاء الدین دبیر کو فاخرہ بیگم کی یاد آ گئی۔ رسم کے مطابق انہیں فاخرہ بیگم کو یہاں لانے اور اس سے شادی کرنے کی اجازت خسرو خاں سے لینے کی ضرورت تھی کیونکہ اب وہ بادشاہ تھا۔ انہوں نے خسرو خاں کا ساتھ دیا تھا اس لیے یہ امید تھی کہ اجازت مل جائے گی لیکن ہزار ستون کا ماحول دیکھ کر وہ ڈر گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ خسرو خاں نے مبارک شاہ کی بیوہ سے عدت کے دوران نکاح کیا تھا۔ انہیں مبارک شاہ کا بھی تجربہ تھا کہ اس نے اجازت دینے کے بجائے اپنی شادی کا پیغام بھیج دیا تھا۔ اب وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ انہیں اب ایک اور چال سوجھی، انہیں خسرو خاں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو محض مبارک شاہ سے انتقام لینے کے لیے خسرو خاں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مبارک شاہ قتل ہو چکا تھا۔ قصر ہزار ستون میں ہندوؤں کی عمل داری تھی۔ یہ لوگ محرابوں میں ''بت'' رکھ کر پوجا پاٹ کرنے لگے تھے۔ خسرو خاں ان لوگوں کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا لہٰذا انہیں روکنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ ایسے میں انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس جال کو توڑ کر اڑ جائیں۔ آسمان بہت بڑا تھا۔ قدم قدم پر پہرے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ جائیں تو کہاں جائیں۔ ایک ہی راستہ تھا کہ ملک جونا کے پاس دیپالپور چلے جائیں اور جس طرح خسرو خاں کا ساتھ دیا تھا، اب اس کا ساتھ دیں۔

انہوں نے خسرو خاں سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ وہ گجرات جائیں اور فاخرہ بیگم کو دہلی لے آئیں۔ خسرو خاں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اجازت ملتے ہی دو سو سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیا اور گجرات کی طرف روانہ ہو گئے۔

بہروز خاں اور فاخرہ بیگم وہاں خیریت سے تھے اور غالباً ان کا انتظار کر رہے تھے۔ پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے کہ کب حکم رہائی ملے اور کب وہ دہلی جائیں لیکن اب ایک اور سفر درپیش تھا۔ بہاء الدین انہیں دیپالپور لے جانے پر بضد تھے۔

وہ سب گجرات سے نکلے اور ایک غیر معروف راستہ اختیار کرتے ہوئے دیپالپور پہنچ گئے۔ ملک جونا اس وقت خسرو خاں سے مقابلے کے لیے لشکر جمع کر رہا تھا۔ بہاء الدین کو دیکھا تو خوش آمدید کہا۔ بہاء الدین نے اسے یقین دلایا کہ اس کا باقی لشکر جو دہلی میں ہے، وہ

بھی اگر ہم دہلی پہنچے تو ہمارا ساتھ دینے کے لیے ہماری صفوں میں آ جائے گا۔

جب ملک جونا نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس کی معاونت قبول کر لی تو بہاء الدین نے یہ سوچ کر کہ آئندہ نہ جانے کیا حالات ہوں، فاخرہ بیگم سے شادی کر لی۔

☆☆☆

ملک جونا کا فرار ہو کر دیپالپور پہنچ جانا خسرو خاں کے لیے کچھ کم حادثہ نہیں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ بہاء الدین دبیر بھی دیپالپور پہنچ گیا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ملک جونا بہت جلد دہلی کا رخ کرے گا۔ اس نے اپنے ہمدرد امراء کا اجلاس طلب کیا جس میں طے پایا کہ پرندے کے پر اڑنے سے پہلے کاٹ دو۔

خسرو خاں نے امراء کی اجازت ملتے ہی لشکر تیار کیا لیکن کسی تجربہ کار امیر کے بجائے اپنے بھائی کو لشکر کا سردار بنایا جسے اس نے خان خاناں کا لقب دیا ہوا تھا۔ خانِ خاناں ہاتھیوں، خزانے اور لشکر کے ساتھ ملک جونا اور غازی ملک سے جنگ کرنے کے لیے دیپالپور کی طرف روانہ ہوا۔

خانِ خاناں نہ تو زمانے کی گردشوں سے واقف تھے، نہ کوئی تجربہ رکھتے تھے اور نہ حق پر تھے۔

خان خاناں کی آمد کی خبر سن کر غازی ملک بھی آگے بڑھا۔ سرستی کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے خان خاناں سرستی کے قلعے کو غازی ملک کے پیادوں اور سواروں سے نہ لے سکے۔ غازی ملک وہ بہادر تھا جو بیس مرتبہ مغلوں سے فتح یاب ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے ہی حملے میں خسرو خاں کے لشکر کو شکست دے دی۔ خسرو خاں کے بھائی کا چتر اور وہ تمام خزانہ اور ہاتھی گھوڑے جو خسرو خاں نے اپنے بھائی کے ساتھ بھیجے تھے، سب غازی ملک کے قبضے میں آ گئے۔ اس کے کچھ امیر مارے گئے، کچھ گرفتار ہو گئے۔

خان خاناں بچے کھچے لشکر کے ساتھ ایسا فرار ہوا کہ خسرو خاں کے پاس پہنچ کر دم لیا۔

اس شکست نے خسرو خاں کو پریشان کر دیا۔ وہ کیا کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ غازی ملک اور اس کا بیٹا جونا خاں اس فتح کے بعد دہلی کا رخ کریں گے۔ اب خسرو خاں کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ خزانہ اپنے ساتھ لے کر کسی طرف بھاگ جائے لیکن لشکر کے بغیر جہاں جاتا مارا جاتا اور پھر اس کے لالچی امیر اسے خزانہ لے کر کیسے بھاگنے دیتے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ غازی ملک کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نے یہی راستہ اختیار کرنے کی ٹھانی اور خزانہ لٹا کر وفاداریاں خریدنے کی راہ اختیار کی۔ اس نے دہلی سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور حوض علائی کے قریب ایک میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اب اس کا محل وقوع یہ تھا کہ باغات سامنے تھے اور پشت کی طرف دہلی کا قلعہ تھا۔ یہ مقام ”لہراوت“ کہلاتا تھا۔

غازی ملک کے ڈر سے اس نے جہاں پناہ کے اندر ہی لشکر گاہ قائم کی۔ کیلوکھری اور دہلی دونوں جگہوں سے خزانہ لشکرگاہ میں لے آیا اور دولت لٹانے والوں اور ہارے ہوئے جواریوں کی طرح خزانے میں جھاڑو دلوا دی۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ حکومت جانے والی ہے اس لیے اس نے بیت المال کا سارا روپیا ڈھائی مہینے کی تنخواہ اور انعامات کی شکل میں لشکر کے سپاہیوں کو دے دیا۔ خزانے میں ایک کوڑی بھی نہ چھوڑی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح دولت لٹانے سے لوگ اس کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے لیکن سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ روپیا لیتے تھے اور جب موقع ملتا تھا گھروں کو چلے جاتے تھے۔

غازی ملک اپنے لشکر کے ساتھ منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا دہلی کے نزدیک آ گیا تھا اور بالآخر اندرپت کی آبادی کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔

جس روز جنگ ہونے والی تھی، خسرو خاں کو زبردست جھٹکا لگا۔ عین الملک ملتانی جو ایک نہایت بااثر امیر تھا، اس کے خلاف ہو گیا اور اپنا لشکر لے کر اجین کی طرف چلا گیا۔ خسرو خاں کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا لیکن اب جنگ سر پر کھڑی تھی۔ اس مصیبت سے مفر نہیں تھا۔

دن کی روشنی نے اندھیرے کو للکارا تو غازی ملک نے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا۔ خسرو خاں اپنی قیام گاہ سے روانہ ہوا۔ لہراوت کے میدان میں دونوں لشکر آمنے سامنے آ کر صف آرا ہو گئے۔ پہلی ہی جھڑپ میں خسرو خاں کا وفادار امیر ملک تلبغہ ناگوری مارا گیا۔ اس کے لشکر کے بھی ٹکڑے اڑ گئے۔ ایک اور امیر شائستہ خاں اس خونریزی کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ حادثہ کچھ کم نہ تھا لیکن خسرو خاں نے صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور عصر کے وقت تک ڈٹا رہا لیکن موت اس کے قدموں کے ساتھ چل رہی تھی۔ غازی ملک کے حملوں کی تاب نہ لا کر اس کا لشکر منتشر ہو گیا۔ خسرو خاں اپنے لشکر سے جدا ہو گیا۔ اس نے میدانِ جنگ سے فرار ہی میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



عافیت ڈھونڈی۔ اس وقت اس کا کوئی ساتھی اس کے ساتھ نہ تھا۔ ''تلپت'' پہنچنے سے پہلے ہی چھپنے کے لیے ایک محفوظ مقام اسے سوجھ گیا۔ یہ اس کے قدیم ولی نعمت ملک شادی علائی کا باغ تھا۔ وہ چوروں کی طرح چہار دیواری میں داخل ہوا اور چھپ کر بیٹھ گیا۔

میدانِ جنگ میں رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ غازی ملک نے واپسی کا ارادہ ملتوی کیا اور اندرپت ہی میں اپنی قیام گاہ پر فروکش ہو گیا۔

اس کی فوج کا ایک دستہ رات ہی کو خسرو خاں کی تلاش میں روانہ ہو گیا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی اسے تلاش کرلیا گیا۔ اس کا بھائی خان خاناں بھی اسی باغ میں چھپا ہوا مل گیا۔ دونوں کو غازی ملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ غازی ملک اسے دیکھ کر بے اختیار چیخا ''کافر نعمت'' اور دونوں کی گردنیں اڑانے کا حکم جاری کردیا۔

فتح کے دوسرے دن جبکہ ملک غازی اندرپت میں مقیم تھا۔ شہر کے اکابر اور عہدے داروں کی اکثر تعداد اس کی خدمت میں حاضر ہوئی اور محل اور دروازوں کی کنجیاں اس کی خدمت میں پیش کردیں۔ ملک غازی سوار ہوا اور بہت بڑی جمعیت کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا اور ان سب بزرگوں کے سامنے قصر ہزار ستون میں بیٹھا۔ اس جلسے میں سب سے پہلے تو ان سب بزرگوں نے جو اس مجلس میں، مبارک شاہ اور اس کے لواحقین کی مصیبتوں پر گریہ وزاری کی، اس کے بعد وہ بلند آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔

''میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جن کو سلطان علاؤالدین اور مبارک شاہ نے بلند مرتبے پر پہنچایا۔ اسی جذبۂ نمک حلالی کی وجہ سے میں نے اپنی جان کی بازی لگائی اور ان کا انتقام لیا۔ اب یہ عام اعلان کرتا ہوں کہ اگر ہمارے ولی نعمتوں کے خاندان میں سے کوئی زندہ بچا ہوا ہے تو اسی وقت اس کو لاؤ اور تخت پر بٹھلا دو۔ میں اپنے مربی کے سامنے کربستہ ہو کر کھڑا ہوں گا اور اس کی خدمت بجالاؤں گا۔ اگر دشمنوں نے اس خاندان.... کا کلیتہً صفایا کردیا ہے تو آپ بزرگ یہاں جمع ہیں۔ آپ لوگ جس کو تخت کا سزاوار سمجھتے ہیں تخت پر بٹھلا دیں، میں بھی اس کی اطاعت کروں گا۔ میں نے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان کی بازی اس لیے نہیں لگائی ہے کہ تخت حاصل کروں۔''

ان سب بزرگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''سلطان علاؤالدین اور مبارک شاہ کی اولاد میں سے کوئی زندہ نہیں بچا ہے جو بادشاہی کے لائق ہو اور خسرو خاں کے غلبے کی وجہ سے مملکت کے تمام علاقوں میں فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور معاملات ضبط سے باہر ہو چکے ہیں۔ ہم سب لوگ جو یہاں جمع ہیں، بادشاہی کے لائق اور حکمرانی کا سزاوار تیرے سوا کسی اور کو نہیں دیکھتے۔ تیرے سوا نیابت تخت کے لیے کسی اور کو مناسب نہیں سمجھتے۔ تو کہ غازی ملک ہے۔ ہم پر تیرے بہت سے حقوق ہیں۔ کئی سال سے تو مغلوں کے حملے روکنے کے لیے دیوار بنا ہوا ہے اور تیری وجہ سے ہندوستان میں مغلوں کی آمد کا راستہ بند ہے۔ اس موقع پر بھی تو نے وہ کام کیا ہے کہ تیری نمک حلالی کا ذکر تاریخ میں لکھا جائے گا۔ ہمارے ولی نعمتوں کے قاتلوں سے ان کا انتقام لے کر تو نے اس ملک کے خواص وعوام پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ سلطان علاؤالدین کے اتنے ملازموں اور غلاموں میں سے یہ توفیق تجھ ہی کو عطا ہوئی ہے اور اس سرخ روئی سے تجھ ہی کو نوازا ہے۔''

اس نے اسلام اور مسلمانوں کی فریاد رسی کی تھی لہٰذا لوگوں کی زبانوں پر اس کا خطاب سلطان غیاث الدین جاری ہو گیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق شاہ خواص وعوام کے اتفاق رائے سے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔ امراء ملوک، وزراء اور معارف واکابر میں سے ہر ایک کربستہ ہو کر اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق تختِ غیاثی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

خسرو خاں ہمیشہ کے لیے کافرِ نعمت کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)... تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی ...... مترجم: ڈاکٹر سید معین الحق... طبقاتِ اکبری، خواجہ نظام الدین احمد ...... مترجم محمد ایوب قادری... تاریخ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد سرہندی... مرتبہ ہدایت حسین۔



معما

تنویر ریاض

کاروبارِ حیات چلانے کے لیے انسان کو بھی کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں... حتیٰ کہ چھوٹے موٹے کاروبار کو بڑھانے کے لیے بھی بڑے بڑے ہاتھ مارنا پڑتے ہیں جیسا کہ اس نے مارا تھا... زیادہ شہرت حاصل کرنے کے لیے تھوڑی سی بدنامی مول لینے میں اسے کوئی حرج محسوس نہ ہوا اور مزے کی بات یہ کہ اس کا تیر بیٹھا بھی بڑے نشانے پر تھا۔

"بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"
کی مکمل تفسیر

"کتابوں کی دکان کے فرش پر یقیناً ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔" رینی نے کہا۔

"ہاں، وہ لاش ہی تھی۔" ویلری نے اس سے اتفاق کیا۔

دونوں بہنیں جوڈی کی مستقل گاہک تھیں۔ ایک معالج کے طور پر اس کا واسطہ مختلف لوگوں سے پڑتا تھا لیکن رینی اور ویلری نے ہمیشہ یہی اصرار کیا کہ وہ ایک ساتھ آئیں گی اور ایک ہی وقت میں علاج کروائیں گی۔ جوڈی کو ان کی بات معقول لگی، وہ دونوں ویسٹ سیکس میں

رہتی تھیں جو ایک ساحلی گاؤں تھا۔ اصل وہ وہیں پیدا ہوئیں اور سب کام ایک ساتھ کرنے کی عادی تھیں۔ ان دونوں کی حیرت انگیز مشابہت اور ذہنی ہم آہنگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ انہیں جڑواں بہنیں سمجھتے تھے لیکن رینی اپنی بہن سے دو سال بڑی تھی۔ ان کے انداز دیکھ کر لگتا تھا کہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں لیکن ان کی شادیاں ہو چکی تھیں، جب ان کے شوہر ایک ہی سال میں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ دونوں ساٹھ کے پیٹے میں تھیں اور وہ واپس فیدرنگ کے اس مکان میں آگئیں جو ان کے اس مکان جیسا ہی تھا جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی اور بیس سال گزر جانے کے باوجود وہ وہیں مقیم تھیں۔

جوڈی سے ان کی پہلی ملاقات مارکیٹ میں ہوئی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ یہی وہ معالج ہے جو وڈ سائڈ کاٹیج میں رہتی ہے تو انہوں نے اسے اپنے جوڑوں کے درد کے بارے میں بتایا۔ جوڈی انہیں اپنے گھر لے آئی اور ان کا علاج شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ایک لاعلاج مرض ہے لیکن وہ مساج کرنے کے کچھ ایسے طریقے جانتی تھی جس سے ان عورتوں کی تکلیف میں کمی ہو سکتی تھی۔

”ہم نے یقیناً وہاں ایک لاش دیکھی تھی۔“ رینی بار بار یہی بات دہرا رہی تھی۔

”تم اس بارے میں بہت پُریقین لگ رہی ہو۔“ جوڈی نے کہا۔

اس روز وہ مساج کروانے نہیں آئی تھیں بلکہ علی الصباح رینی نے جوڈی کو فون کر کے بتایا کہ ان دونوں بہنوں کو ایک بہت ہی اہم بات معلوم ہوئی ہے جس کے بارے میں وہ اس سے گفتگو کرنا چاہ رہی تھیں اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں وہ پولیس کے پاس جانے کے لیے سوچ رہی ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں پہلے جوڈی سے بات کر لینا بہتر ہوگا۔ ”کیونکہ تم اور تمہاری پڑوسن کیرول سیڈون اس سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً قتل کی تحقیقات میں شامل رہی ہیں۔“

جوڈی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کرنے سے پہلے جتنی جلد ممکن ہو سکے، اس کے پاس آجائیں اور اب وہ دونوں بہنیں اسے اس لاش کے بارے میں بتا رہی تھیں جو انہوں نے کتابوں کی دکان میں دیکھی تھی۔

”تم جانتی ہو۔“ ویلری نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ شب ہم چرچل اور منٹگمری کو ٹہلانے کے لیے نکلے۔“ جوڈی جانتی تھی کہ چرچل اور منٹگمری ان کے چھوٹے پالتو کتوں کے نام ہیں۔

”ہم ہمیشہ ساڑھے نو بجے کے قریب ہی نکلتے ہیں۔“ رینی نے کہا۔

”اور ہمیشہ دکانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کیونکہ ہمارے گھر سے وہاں تک سڑک پر کافی روشنی ہوتی ہے، البتہ دکانوں کی روشنیاں بند ہوتی ہیں، سوائے اسٹیٹ ایجنٹ کے۔ وہ رات بھر کھلا رہتا ہے۔“

”اور یہ میرے لیے بڑی عجیب بات ہے۔“ رینی نے کہا۔

”تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔“ ویلری نے کہا۔ ”میں تم سے متفق ہوں۔“

”کیا تم سمجھتی ہو کہ رات کے تین بجے کوئی اس کے پاس مکانوں کے بارے میں معلوم کرنے آئے گا؟“

ویلری کے لبوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ رینی نے بھی اس کا ساتھ دیا جیسے یہ ان کے درمیان آپس کا مذاق ہو پھر رینی بولی۔ ”بہرحال ہم کتابوں کی دکان کے پاس سے گزر رہے تھے...... تم جانتی ہو کہ یہ دکان کہاں ہے؟“

”ہاں، جانتی ہوں۔“ جوڈی نے کہا۔ ”وہ بک اینڈ کینڈل کے نام سے مشہور ہے۔“

”ہاں اور اسے وہ سرخ بالوں والی عورت چلاتی ہے۔“ ویلری نے کہا۔

”اس کا نام لورنا فلفوٹ ہے۔“ جوڈی نے تصحیح کی۔

ویلری نے جوڈی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اسے جانتی ہو؟“

”ہاں، میں چند مرتبہ اس کی دکان میں جا چکی ہوں۔ اس کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔

جوڈی نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ لورنا اس کی بھی گاہک تھی جو کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ بظاہر اس کے شوہر نے اس پر اپنا ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن وہ محسوس کرتی ہے کہ اس نے اسے مایوس کیا ہے۔ جوڈی کے علاج سے اسے اس مشکل وقت کو گزارنے میں مدد ملی۔

”عام طور سے اس وقت بک اینڈ کینڈل کی روشنیاں گل ہوتی ہیں جب ہم چرچل اور منٹگمری کو ٹہلانے کے لیے لے جاتے ہیں۔“ رینی نے ایک مختصر وقفے کے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن گزشتہ شب وہاں روشنی ہو رہی تھی۔“ ویلری نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔ ”البتہ پردے گرے

ہوئے تھے۔ سو ہم نے سوچا کہ وہ عورت دیر تک کام کر رہی ہو گی جیسا کہ بعض اوقات اسٹاک کی چیکنگ کے لیے رکنا پڑتا ہے۔''

''بہرحال پردے کے کناروں اور کھڑکی کے فریم کے درمیان تھوڑی سی جگہ تھی۔'' رینی بولی۔ ''میں نے اس میں سے جھانک کر دیکھا تو مجھے فرش پر ایک لاش نظر آئی۔''

''پھر میں نے بھی دیکھا۔ وہاں واقعی ایک عورت کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ میں ایک خنجر باہر کی طرف نکلا ہوا تھا اور وہاں چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔''

☆☆☆

''کیا واقعی؟'' کیرول نے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تم نے ان دونوں کی کہی ہوئی بات کو سنجیدگی سے لیا۔ وہ مکمل طور پر سٹھیا چکی ہیں۔''

''میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ ان کی تمام حسیات صحیح طور پر کام کر رہی ہیں۔''

وہ دونوں کیرول سیڈن کے صاف ستھرے کچن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں کتے دروازے کے پاس بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

''مجھے تو وہ ہمیشہ سٹھیائی ہوئی لگیں۔'' کیرول نے قطعی لہجے میں کہا۔ ہوم آفس میں طویل عرصہ ملازمت کرنے کے بعد وہ کسی کی ظاہری شکل صورت کے بجائے اس کے عملی فوائد پر نظر رکھتی تھی۔

''ایک عورت کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کی پیٹھ میں خنجر پھنسا ہوا تھا۔ یہ تو بالکل اگاتھا کرسٹی کے کسی ناول کا سین لگتا ہے۔''

''تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے ان کی بات پر یقین ہے۔'' جوڈی نے کہا۔

''اگر انہوں نے کوئی لاش دیکھی ہے تو پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟''

''شاید وہ ڈرتی ہیں کہ عدالت کے باہر ان کا مذاق اڑایا جائے گا۔''

''پھر بھی وہ یہ دعویٰ کر رہی ہیں کہ انہوں نے گزشتہ شب یہ لرزہ خیز منظر دیکھا؟''

''ہاں۔''

''پھر تو پہلی بات میرے ذہن میں یہی آتی ہے کہ انہیں آج صبح دوبارہ ''بک اینڈ کینڈل'' جانا چاہیے تھا۔ یہ دیکھنے کہ وہ لاش یا اس کے نشانات وہاں موجود ہیں یا نہیں۔''

''وہ مجھے فون کرنے سے پہلے وہاں گئی تھیں لیکن وہاں انہیں کوئی انہونی بات نظر نہیں آئی۔ دکان کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔'' جوڈی بولی۔ ''اسی لیے انہوں نے یہ کہا کہ وہ پولیس کے پاس جانے سے گھبرا رہی ہیں۔''

''میں انہیں الزام نہیں دوں گی۔'' کیرول بولی۔ ''انہوں نے بہت سمجھداری سے کام لیا۔ پولیس ایسے لوگوں کی بات پر توجہ نہیں دیتی جو دیکھنے میں شوقیہ جاسوس لگتے ہیں۔''

''لیکن وہ اب بھی اپنی بات پر قائم ہیں جو کچھ انہوں نے دیکھا۔'' جوڈی نے اصرار کیا۔

''جوڈی! اس ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو وثوق سے کہتے ہیں کہ انہوں نے زمین پر خلائی جہاز اترتے اور اس میں سے سبز خلائی مخلوق کو باہر آتے دیکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جوڈی اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ''میں اب بھی اس کی تفتیش کی جانب جھکاؤ محسوس کرتی ہوں تاکہ حقیقت سامنے آجائے۔''

''تمہیں اس کی پوری آزادی ہے۔'' کیرول نے کہا۔ ''جب تک تم یہ توقع نہ کرو کہ میں کسی سطح پر اس میں شامل ہو سکتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، میں اکیلے بھی یہ کام کر سکتی ہوں۔'' جوڈی نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''یہی طریقہ مناسب رہے گا کیونکہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔''

''یہ افسوس ناک بات ہو گی۔'' جوڈی نے کہا۔ ''دونوں بہنوں کی خواہش ہے کہ تمہیں اس تحقیقات میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہاری تجزیاتی اور قیاسی مہارت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔''

''کیا واقعی انہوں نے ایسا کہا؟'' کیرول کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی۔

☆☆☆

جوڈی اتفاقات پر یقین رکھتی تھی۔ لہٰذا اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی جب اسے لورنا فلفوٹ کا فون موصول ہوا۔ وہ جلد از جلد اس سے تھراپی کے لیے وقت لینا چاہ رہی تھی۔ جوڈی نے ڈائری دیکھ کر کہا کہ وہ تین بجے اس کے پاس وڈ سائڈ کاٹیج آسکتی ہے۔ جب لورنا میز پر لیٹ گئی تو جوڈی کے ہاتھ اس کے جسم پر حرکت کرنے لگے۔ وہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ کون سے حصے دباؤ یا کھنچاؤ کی وجہ سے زیادہ سخت ہیں۔

''تمہارے کندھے اور کمر کا کچھ حصہ سخت لگ رہا ہے۔'' جوڈی نے کہا۔ ''جیسا کہ پچھلی بار تھا۔''

''ہاں۔ کیا تم پہلے کی طرح اسے بہتر بنا سکتی ہو؟''

''امید تو ہے۔'' جوڈی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں مساج سے ابتدا کروں گی پھر دیکھتے ہیں کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

جوڈی نے ہمیشہ اپنے کام اور سراغ رسانی کے شوق کو الگ رکھا۔ وہ کبھی اپنے کسی گاہک سے براہِ راست کسی معاملے کے بارے میں نہیں پوچھتی تھی اور اگر اسے علاج کے دوران کچھ معلوم ہو بھی جاتا تو وہ کسی اور کو نہیں بتاتی تھی۔ یہاں تک کہ کیرول کو بھی نہیں جبکہ دوسری جانب وہ میز پر لیٹے ہوئے مریضوں سے عام گفتگو کے دوران بہت سی کارآمد معلومات حاصل کر لیتی تھی۔

جب اس کے ہاتھ لورنا کے کندھوں تک پہنچے تو وہ بولی۔ ''جہاں تک میرا اندازہ ہے اس مرتبہ تمہارے آنے کی وجہ وہ نہیں جو پچھلی بار تھی؟''

''نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ وہ وجہ ختم ہو گئی۔ بچوں سے محرومی کا دکھ کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے محسوس نہیں کیا جوڈی؟''

''میں پوری سچائی سے کہہ سکتی ہوں کہ نہیں۔'' گو کہ جوڈی نے دو شادیاں کیں اور اس کے کئی چاہنے والے تھے لیکن اسے کبھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس سے وہ خاندان بڑھانے کا وعدہ کرتی۔ ''لیکن میں تمہارے احساسات کو سمجھتی ہوں۔'' جوڈی نے اس کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری دکان کیسی چل رہی ہے؟'' جوڈی نے اس کی ہنسلی کی ہڈی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

لورنا نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''بہت برا حال ہے۔ لوگ آتے ہیں اور اپنی پسند کی کتابیں دیکھ کر چلے جاتے ہیں پھر وہی کتابیں ایمیزن سے سستے داموں خرید لیتے ہیں۔ اسی یک کی وجہ سے بھی ہمارا کاروبار متاثر ہو رہا ہے۔''

''لیکن تم قائم تو ہو؟''

''برائے نام۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کے لیے بہترین کوششیں کیں، تقریبات کا انعقاد کیا۔ ان میں مطالعہ، معلوماتِ عامہ، کرائم ایوننگ یہاں تک کہ کتابوں کی تعارفی تقریبات بھی شامل تھیں۔ ان میں سے ایک تقریب ستمبر میں ٹلی وائٹ کے لیے منعقد کی تھی۔ وہ مقامی مصنفہ ہے اور اس کی ایک کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس سے ہمیں کافی پبلسٹی ملی۔ بس میں ایسی ہی کوشش کرتی رہتی ہوں لیکن اس میں بہت جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔''

''جب گزشتہ بار ہماری ملاقات ہوئی تو تم نے کہا تھا کہ اگر دکان پر برا وقت آیا تو مائیک اس بحران سے نکلنے میں تمہاری مدد کرے گا؟''

''ہاں لیکن میں کبھی اس کی مدد لینا نہیں چاہوں گی۔'' لورنا نے جواب دیا۔ ''چاہے یہ اس کی خواہش ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے یہی چاہتا ہے کہ یہ دکان بند ہو جائے۔ اسے یہ احساس نہیں کہ میں اس کاروبار کے بارے میں کتنی سنجیدہ ہوں۔ یہ دکان میری اولاد کی طرح ہے لیکن وہ نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی اطمینان کی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ مجھے اس دکان سے بے دخل کر دے۔''

جوڈی کو یاد آ گیا کہ لورنا سے ہونے والی گفتگو سے اسے یہ تاثر ملا تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور صرف لورنا کی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ہی اس کی واحد خامی نہیں تھی بلکہ اور بھی بہت سے معاملات میں ان کے درمیان ہم آہنگی نہیں تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد اس بحران سے نکل آؤ گی۔'' جوڈی نے کہا۔

''یہ کوئی عارضی وقفہ نہیں ہے۔'' لورنا نے کہا۔ ''بلکہ لوگوں کی پڑھنے کی عادت میں تبدیلی آ گئی ہے۔''

''تم صرف کتابیں ہی نہیں فروخت کرتیں بلکہ تم نے موم بتیاں بھی رکھی ہوئی ہیں۔''

''دکان کے نام کی مناسبت سے رکھنا پڑتی ہیں ورنہ میں نے کبھی بہت زیادہ موم بتیاں فروخت نہیں کیں اور اب تو اردگرد کئی چھوٹی اور دیدہ زیب دکانیں کھل گئی ہیں۔''

جوڈی نے مساج جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی اس کشیدگی کی ایک وجہ ہے اور تم اسی لیے میرے پاس آئی ہو کیونکہ تمہیں اپنی دکان کی مالی حالت کی طرف سے پریشانی ہے۔''

''ہاں، یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یقیناً مجھے اس کاروبار سے آمدنی بڑھانے کا کوئی طریقہ تلاش کرنا ہوگا۔''

''ایسا طریقہ جس میں تمہیں مائیک کی مدد نہ لینا پڑے؟''

لورنا اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''سچ تو یہ ہے جوڈی کہ اس کی ملازمت ختم ہو گئی ہے۔''

''اوہ، یہ سن کر افسوس ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی

بینک میں کام کرتا تھا۔''

''اگر تم سمجھتی ہو کہ وہاں اب بھی ملازمت کا تحفظ ہے تو یہ پرانے دور کی بات ہے۔''

''کہیں وہ کسی بڑے اسکینڈل میں تو ملوث نہیں تھا؟''

''بخدا نہیں۔ مائیک تعلیم مکمل کرنے کے بعد سے ہی اس بینک میں کام کر رہا تھا اور گزشتہ چند برسوں سے مارکیٹنگ کے شعبے میں تھا۔ اس کی تنخواہ معقول تھی اور بیرونِ ملک سفر کرنے کا بھی موقع ملتا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ بینک کی پالیسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔''

''اس کے پاس اچھا خاصا تجربہ ہے۔ اسے یقیناً کوئی دوسری ملازمت مل سکتی ہے۔''

''یہ تم سوچ رہی ہو۔'' لورنا نے کہا۔ ''مشکل یہ ہے کہ اس اصول پسندی کی وجہ سے حال ہی میں بہت سے لوگ بے روزگار ہوئے ہیں اور ان میں سے کئی ایک مائیک کے مقابلے میں کم عمر ہیں۔ میرے خیال میں پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کے لیے بہت کم مواقع ہیں۔''

''اسے کچھ معاوضہ تو ملا ہوگا؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ بمشکل ایک سال کی تنخواہ سے تھوڑا سا زیادہ۔ جب تک اس کی پنشن شروع نہیں ہوتی، آمدنی میں یہ وقفہ موجود رہے گا۔ لہٰذا مائیک ان دنوں وہ سب کچھ کر رہا ہے جو کسی بھی بے روزگار شخص کی مصروفیت ہو سکتی ہے۔ یعنی اخبارات میں ملازمت کے اشتہارات دیکھنا، بینکنگ سے وابستہ دوستوں سے رابطے بڑھانا اور مختلف جگہوں پر درخواستیں دینا لیکن زیادہ تر لوگ جواب ہی نہیں دیتے۔ وہ بہت مایوس ہو چکا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر اسے دوسری ملازمت مل گئی، تب بھی اس کے لیے اپنے آپ کو ایک نامانوس ماحول میں ڈھالنا مشکل ہوگا۔''

''میں تمہاری پریشانی کی وجہ سمجھ رہی ہوں۔'' جوڈی نے کہا۔ ''ویسے تو تم دونوں کے بیچ سب کچھ ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں۔ ہمیشہ کی طرح۔'' جوڈی نے اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کیا لیکن اس کی ازدواجی زندگی کے بارے میں سوالات کرنے کا یہ مناسب وقت نہیں تھا۔

لورنا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم دونوں کے لیے دکان کے اوپر واقع فلیٹ میں رہنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ تم اب بھی شورلینڈ اسٹیٹ والے بڑے مکان میں رہ رہی ہو؟''

''وہ کرائے کا تھا۔'' لورنا نے کہا۔ ''ان حالات میں اس کا کرایہ دینا مشکل ہو گیا تھا۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ امید ہے کہ حالات جلد بہتر ہو جائیں گے۔'' جوڈی نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ گزشتہ شب تمہاری دکان پر کوئی عجیب واقعہ بھی پیش آیا تھا؟''

''مجھ سے اس بارے میں مت پوچھو۔'' لورنا نے جواب دیا۔ ''میں گزشتہ شب وہاں نہیں تھی بلکہ اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی اور وہیں رات گزاری۔ البتہ مائیک دکان پر موجود تھا۔''

☆☆☆

کیرول اور جوڈی نے شام میں مے نوشی کے لیے علاقے کے واحد پب کراؤن اینڈ اینکر میں ملنے پر اتفاق کیا جہاں ان کا استقبال پب کے مالک ٹیڈ کرسپ نے کیا۔ اس نے مشروب پیش کرنے کے بعد حسبِ عادت لطیفے سنانا شروع کر دیے۔ کیرول اور جوڈی نے کچھ دیر تو اسے برداشت کیا پھر اٹھ کر ایک کیبن میں چلی گئیں۔ جوڈی نے کیرول کو بتایا کہ گزشتہ شب مائیک دکان میں اکیلا تھا۔

''یعنی وہ دکان یا فلیٹ میں ایک عورت کے ساتھ تھا۔'' کیرول نے فوراً جواب دیا۔

''کون سی عورت؟''

''ظاہر ہے وہی جس کو چاقو مارا گیا۔''

''میرا خیال ہے تمہیں یقین نہیں آیا کہ ان دونوں بہنوں نے وہاں ایک لاش دیکھی تھی۔''

''میں نے اس بارے میں بہت سوچا لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ انہیں یہ کہانی گھڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''اس کے علاوہ تم کیا سوچ رہی ہو؟''

''جب ایک مرد کسی غیر عورت کے ساتھ اپنے گھر میں تنہا ہو تو کیا سوچا جا سکتا ہے؟''

''لیکن جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں، اس میں قتل تو شامل نہیں۔''

''نہیں۔'' کیرول نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ممکن ہے کہ جنسی تعلق کے دوران کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو۔''

''لگتا ہے کہ ان دنوں تم ڈیلی میل زیادہ پڑھ رہی ہو۔''

کیرول بولی۔ ''میں ڈیلی میل نہیں پڑھتی، تمہیں معلوم ہے کہ میں ٹائمز کی قاری ہوں۔''

جوڈی نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ''میں ایک اور بات سوچ رہی ہوں۔'' کیرول بولی۔ ''اس رات لورنا دکان پر کیوں نہیں تھی؟''

''وہ اپنی بہن کے پاس گئی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس ماحول سے دور رہ کر کچھ وقت گزارنا چاہ رہی تھی۔''

''کیا اس کی بہن کہیں گئی ہوئی ہے؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتی...... کیوں؟''

''جب آپ اپنے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہے ہوں تو پھر کسی سے ملنے نہیں جاتے۔''

''لورنا کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مائیک سے دور رہ کر کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔''

''اوہ۔ کیا اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے؟''

''مجھے تفصیل تو معلوم نہیں لیکن میں نے اس کی باتوں سے یہ تاثر قائم کیا کہ لورنا اس چھوٹے سے فلیٹ میں مائیک کی مستقل موجودگی کی وجہ سے کچھ گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کی عادی نہیں ہے کیونکہ مائیک زیادہ تر سفر میں رہتا تھا۔''

یہ سن کر کیرول کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ بولی۔ ''اس طرح تو اسے دوسری عورتوں سے ملنے کے بہت مواقع ملتے ہوں گے۔''

''مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''اور تم نے لورنا کو وہ نہیں بتایا جو کچھ ان دونوں بہنوں نے دیکھا؟''

''یہ مناسب نہ ہوتا کیونکہ وہ میرے پاس علاج کے لیے آئی تھی۔''

''اچھا۔'' کیرول کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''اب ہمیں صرف مائیک ہی بتا سکتا ہے کہ گزشتہ شب اس کی دکان میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

''ایک ایسے شخص سے کھل کر بات کرنا تھوڑا مشکل ہوگا جس سے ہم کبھی نہ ملے ہوں۔''

''اوہ۔ میرا خیال تھا کہ تم اس سے مل چکی ہو۔''

جوڈی نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''یہ کچھ عجیب سی بات ہوگی کہ میں اس سے پوچھوں...... کیا تم نے گزشتہ شب اپنی بیوی کی دکان میں کسی عورت کو قتل کیا ہے؟''

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص ایسا نہیں جس سے ہم کچھ پوچھ سکیں۔ کوئی بھی اس جوڑے کو اچھی طرح نہیں جانتا جو ان کے تعلقات کے بارے میں کچھ بتا سکے۔''

''نہیں۔ ایسا کوئی بھی نہیں ہے لیکن ایک منٹ......''

جوڈی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''ہاں، ایک ایسا فرد ہے جس سے ہم کچھ پوچھ سکیں۔''

''کون؟''

''میں تمہیں بتاؤں گی۔'' جوڈی نے میز پر سے مینیو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے یہ تو دیکھ لو کہ کھانے میں کیا منگوانا ہے۔''

☆☆☆

ٹلی وائٹ نے اس وقت جوڈی کا انٹرویو کیا تھا جب وہ ویسٹ سسیکس میں متبادل معالجوں پر مضمون لکھ رہی تھی۔ اس طرح ان دونوں عورتوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ ٹلی کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ ہر موضوع پر لکھ سکتی تھی۔ ایک سال تک مقامی اخبار میں رپورٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنے کے بعد اس نے فری لانس کے طور پر کام شروع کر دیا اور اپنی تحریریں مقامی کے ساتھ ساتھ قومی اخبارات کو بھی دینے لگی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب مدیران نے اپنے عملے سے لکھوانا شروع کر دیا اور فری لانس مضامین کی مانگ کم ہونے لگی تو اس نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں پھر وہ فکشن کی طرف چلی گئی۔ اس کے کچھ ناول کامیاب بھی ہوئے پھر اس نے جاسوسی ناول لکھنا شروع کر دیے اور ان کے لیے اس نے وہ مواد استعمال کیا جو صحافت کے دنوں میں ریسرچ کے دوران اس کے ہاتھ لگا تھا۔

ٹلی اپنی ذاتی زندگی میں کبھی جذباتی نہیں ہوئی۔ وہ مردوں سے تعلقات قائم کرتی اور جب دل بھر جاتا تو علیحدگی اختیار کر لیتی۔ وہ کبھی کسی مرد کے ساتھ تعطیلات گزارنے نہیں گئی۔ اپنے خرچ پر سفر کرتی اور مہنگے ہوٹلوں میں قیام کرتی۔ اگر وہاں کوئی مرد مل جاتا تو اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لیتی، ورنہ اپنی ذات میں مگن رہتی۔ وہ فیس بک، لنکڈ اور ٹوئیٹر پر بھی موجود رہتی تھی۔ اس طرح اس کا دوستوں سے مسلسل رابطہ رہتا تھا چنانچہ جب جوڈی نے اسے فون کیا تو وہ اگلی صبح اس سے ملنے کے لیے کاپر کیٹل آنے پر تیار ہوگئی۔

''میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے اپنی نئی کتاب پر کام کرنا ہے۔''

''تم نے ایک دن میں کتنے لفظ لکھنے کا پروگرام بنایا ہے؟''

''کم از کم دو ہزار الفاظ۔''

''یہ تو مجھے بہت زیادہ لگ رہے ہیں۔''

''یہ تعداد اس سے کم ہے جب میں مضامین لکھا کرتی تھی۔'' ٹلی نے کہا۔ ''بہرحال مطلب کی بات کرو۔ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہی تھیں؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم لورنا اور مائیک فلفوٹ کو جانتی ہوگی؟''

''ہاں بالکل۔ میں نے اس کی دکان پر دو مرتبہ تشہیری مہم چلائی ہے اور میں آئندہ دو ہفتوں میں اس کے ساتھ کرائم ایوننگ بھی کر رہی ہوں۔''

''اس میں کیا ہوتا ہے؟''

''لورنا دو کرائم لکھنے والوں کو بلاتی ہے جو عام طور پر مقامی ہوتے ہیں۔ ہم ان سے مختصر گفتگو کرتے ہیں اور پھر اس کے مستقل گاہک ان مصنفین سے سوالات کرتے ہیں۔''

''لیکن میں نے اس تقریب کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔''

''نہیں۔ یہ لورنا کا اپنا طریقہ ہے۔ وہ لوگوں کے منہ سے کہی ہوئی باتوں پر انحصار کرتی ہے۔ اس کے حمایتیوں کا ایک گروپ ہے جن میں زیادہ تر عورتیں ہیں جو اس کی ہر تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس صورت حال سے پوری طرح مطمئن ہے۔''

''تم نے بتایا کہ ایسی ایک شام عنقریب منعقد ہونے والی ہے؟''

''ہاں، پندرہ دن میں ایک بار۔ وہ عام طور پر جمعرات کو یہ تقریب کرتی ہے۔''

''ہوں۔'' جوڈی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم مائیک اور لورنا کے تعلقات کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ میں لورنا کو جانتی ہوں لیکن مائیک سے صرف دو مرتبہ ہی ملی ہوں۔''

''کیا تمہیں یہ تاثر ملا کہ ان کی ازدواجی زندگی میں سب ٹھیک ہے؟''

ٹلی وائٹ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہاری جگہ کوئی اور یہ سوال کرتا تو میں اسے ٹال دیتی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے کسی خاص وجہ سے یہ سوال کیا ہے۔''

''شکریہ۔ ہاں یہی بات ہے۔''

ٹلی نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میں نے جو تاثر قائم کیا، وہ یہ کہ اب پہلے والی بات نہیں ہے۔ لورنا کو اولاد نہ ہونے کا صدمہ ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مائیک نے اس کا کتنا اثر لیا۔ بہرحال ان کے درمیان نیم علیحدگی جیسی صورت تھی۔ مائیک اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے بہت زیادہ سفر بھی کرنا ہوتا تھا اس لیے انہیں ایک ساتھ وقت گزارنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لورنا کی اپنی علیحدہ زندگی تھی جو زیادہ تر بک اینڈ کینڈل کے گرد ہی گھومتی تھی۔ تاہم اس کے باوجود وہ دونوں مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔''

ٹلی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''پھر یہ ہوا کہ مائیک کی ملازمت ختم ہوگئی۔''

''میں نے بھی سنا ہے۔'' جوڈی نے کہا۔ ''اور اسی وجہ سے وہ بہت پریشان ہے۔''

''بہت زیادہ۔ اسے ایک بڑے مکان سے چھوٹے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑ گیا۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ شاید ہی ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔''

''ٹلی! کیا تم سمجھتی ہو کہ مائیک کا کبھی کسی دوسری عورت سے تعلق رہا ہو؟''

ٹلی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوسکتیں جوڈی۔ کیا تم مائیک سے ملی ہو؟''

''نہیں۔''

"اگر اس سے ملی ہوتیں تو جان جاتیں کہ وہ ایسا شخص نہیں ہے۔ وہ بے حد شرمیلا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اس نے لورنا کو بھی کیسے پروپوز کیا ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ......" جوڈی کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر بولی۔ "اگر وہ اتنا ہی شرمیلا ہے تو مارکیٹنگ کے شعبے میں کیسے کام کرتا رہا۔ اس میں تو بہت زیادہ تیزی اور طراری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ٹلی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بظاہر وہ ایک اچھا، قابلِ بھروسا اور تربیت یافتہ اکاؤنٹنٹ ہے اور اسی بنیاد پر اسے ترقی ملتی گئی۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس نے اتنا عرصہ یہ ملازمت کرلی۔" ٹلی نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ صبح سے اب تک صرف ایک سو ستر الفاظ لکھے ہیں جبکہ مجھے گیارہ بجے تک پانچ سو الفاظ لکھنے چاہیے تھے۔"

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بولی۔ "کوئی اور ایسی بات ہے، جو تم پوچھنا چاہ رہی ہو؟"

جوڈی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے لحاظ سے یہ ملاقات مایوس کن تھی جس سے اس کی تحقیقات کے آگے بڑھنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔

کیرول سیڈون نے یقیناً وہ ٹیکسی دیکھ لی ہوگی جس سے جوڈی واپس آئی تھی کیونکہ اس کے ایک منٹ بعد ہی وہ جوڈی کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں فیڈرنگ آبزرور کا تازہ شمارہ تھا۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ "رینی اور ویلری نے ہی صرف یہ بات نہیں کہی۔ اسے بھی پڑھ لو۔"

جوڈی نے اس کے کہنے پر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا۔ "منگل کے روز فیڈرنگ پولیس اسٹیشن کو ایک گمنام فون کال موصول ہوئی جس میں کتابوں کی مشہور دکان بک اینڈ کینڈل میں ایک لاش کے نظر آنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ تاہم پولیس کو وہاں کوئی مشتبہ چیز نظر نہیں آئی۔ دکان کے مالک مائیک فلفوٹ کا کہنا ہے کہ یہ کسی حریف دکان دار کی شرارت ہے یا پھر یہ کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو تیئس فروری کو ہونے والی کرائم ایوننگ کے بارے میں بہت پُرجوش ہے اور اس نے تصور کی آنکھ سے یہ منظر دیکھا ہے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ رینی اور ویلری نے یہ فون کیا ہوگا؟"

"اگر ایسا ہے تو انہیں گمنام رہنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ یہ بھی کہہ چکی ہیں کہ انہوں نے پولیس کے پاس جانے کے بجائے مجھ سے بات کرنا مناسب سمجھا۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انہوں نے تم سے بات کرنے کے بعد پولیس کو فون کیا ہو۔"

"ایسا لگتا تو نہیں کیرول لیکن میں انہیں فون کرکے پوچھ لوں گی۔"

رینی نے فون اٹھایا اور تصدیق کردی کہ انہوں نے پولیس سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ "لیکن اب ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے جو کچھ ہم نے دیکھا تھا۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ "کیونکہ اخبار میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔"

جوڈی نے کیرول کو ٹلی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس دوران اسے لگا کہ کیرول کچھ بے چین ہورہی ہے اور جیسے ہی جوڈی نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولی۔ "بہرحال میں نے اس تحقیقات کو تھوڑا سا آگے بڑھانے کا بندوبست کرلیا ہے۔"

"اوہ...... وہ کیسے؟" جوڈی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے مائیک فلفوٹ سے رابطہ کیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" جوڈی کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

"اسی لیے تو میں اس وقت ڈرنک نہیں لے رہی کیونکہ شام میں اس کے ساتھ کراؤن اینڈ اینکر میں ملنے کا پروگرام ہے۔"

"اچھا۔ تم نے ملاقات کے لیے کیا بہانہ بنایا؟"

"میں نے اس سے کہا کہ اخبار میں کرائم ایوننگ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے اور اس بارے میں مزید جاننا چاہتی ہوں۔"

"اور وہ تم سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہوگیا؟"

"ہاں۔" کیرول نے کہا۔ "اس ملاقات میں صرف وہ اور میں ہوں گے۔"

اسی روز سہ پہر میں کیرول نے ہوم آفس میں اپنے پرانے دوست رچرڈ فرینک کو فون کیا۔ وہ اس کے ان چند ساتھیوں میں سے تھا جن کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق رہ چکا تھا۔ وہ عمر میں اس سے چھوٹا تھا لیکن کیرول کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سول سروس چھوڑ دی اور اپنا کاروبار شروع کردیا جو اب تیزی سے ترقی کررہا تھا۔

رچرڈ اس کا فون سن کر خوش ہوگیا۔ پہلے وہ سمجھا کہ یہ ایک پیشہ ورانہ کال ہوگی لیکن جب کیرول نے اس سے رابطہ

کرنے کی وجہ بتائی تو اس نے اس کی بات توجہ سے سنی۔
گو کہ کیرول خوش تھی کہ وہ اپنے طور پر اس تحقیقات کو آگے بڑھا رہی ہے لیکن چھ بجنے سے پہلے اس کے دل میں یہ خواہش شدت سے ابھری کہ وہ آنے والے تصادم میں جوڈی کو بھی اپنے ساتھ رکھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی پڑوسن کو بات اگلوانے میں مہارت حاصل ہے تاہم وہ اپنی بات پر قائم رہی اور اکیلے ہی مائیک سے ملنے کے لیے روانہ ہوگئی۔

وہ وقت سے پہلے ہی کراؤن اینڈ اینکر پہنچ گئی اور مائیک کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اپنے ساتھ ٹائمز کے علاوہ فیدرنگ آبزرور کا وہ شمارہ بھی لائی تھی جس میں لاش کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی، اس نے وہ صفحہ کھول کر مائیک کو پکڑا دیا۔ اس نے مائیک کو اس بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا تاکہ وہ اسے پہچان سکے۔

وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے سبز شرٹ اور براؤن رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ مائیک نے دیر سے آنے کی معذرت کی اور کہا کہ وہ اس کے لیے ڈرنک نہیں خرید سکا لیکن جب وہ بار سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھی۔

''تم نے فون پر کہا تھا کہ کرائم اوننگ کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟''

کیرول کے لیے یہ ایک ہلکا سا جھٹکا تھا۔ وہ تقریباً بھول چکی تھی کہ اس نے اس ملاقات کے لیے کیا عذر تراشا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور اخبار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تشہیر کا ایک کارگر طریقہ ہے۔''

مائیک نے جھک کر اخبار دیکھا اور بولا۔ ''کیا تمہیں اچھا نہیں لگا؟''

''نہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ تم نے اس میں اپنے آپ کو بک اینڈ کینڈل کا مالک ظاہر کیا ہے جبکہ میرا خیال تھا کہ اسے تمہاری بیوی چلا رہی ہے۔''

''میرے مقابلے میں وہ زیادہ وقت دیتی ہے لیکن یہ ہمیشہ سے ہی ہمارا مشترکہ کاروبار ہے۔''

''اوہ......''

''میرا مطلب ہے کہ یہ جگہ میرے پیسے سے خریدی گئی تھی لیکن میں کئی سالوں سے اس سے دور رہا کیونکہ ملازمت کی وجہ سے اس کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ البتہ اب میں اس میں پوری طرح شامل ہوگیا ہوں۔ میں

نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی ہے لہٰذا اب دکان کو زیادہ وقت دے سکتا ہوں۔''

''اوہ اچھا، اب میں سمجھی۔'' کیرول نے کہا اور دل میں سوچنے لگی۔ تو یہ کہانی تھی جو وہ لوگوں کو بتانا چاہ رہا تھا۔

مائیک نے اخبار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی وجہ سے تم بھی کرائم ایوننگ میں دلچسپی لینے لگیں۔''

''ہاں۔''

وہ ایک بار پھر اخبار پر جھکتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ زیادہ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں؟''

''میرا یہ خیال تھا کہ بک اینڈ کینڈل کی تقریبات مخصوص نوعیت کی ہوتی ہیں اور اس میں تقریباً ایک ہی گروپ کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔''

''ماضی میں یہی ہوتا تھا۔'' مائیک نے کہا۔ ''لیکن اب حالات بدل رہے ہیں اور میں اس میں پوری طرح شامل ہو گیا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا شعبہ مارکیٹنگ ہے۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ تم کاروبار کو مزید اوپر لے جا سکتے ہو؟''

''بالکل'' دا باڈی شاپ'' بھی ایک ہی دکان سے شروع ہوئی تھی۔''

ایک بار پھر کیرول نے اخبار پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑی ہوشیاری دکھائی کہ دکان میں ایک لاش رکھ دی۔''

اس کی جانب سے کوئی تردید نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک بار پھر جھک کر اخبار دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''بعض اوقات کامیابی حاصل کرنے کے لیے غیر روایتی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا ہی کام ہے اور تم جانتے تھے کہ کوئی بھی فرد تمہارا ترتیب دیا ہوا ڈراما دیکھ لے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات پورے گاؤں میں پھیل جائے گی۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں لگا کہ کسی نے یہ منظر دیکھا ہو۔ میں نے رات نو بجے کے قریب دکان میں رکھی ہوئی ایک ڈمی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ میں نے تین بجے کے قریب سب کچھ صاف کر دیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ البتہ پوری رات پولیس کے انتظار میں جاگتا رہا لیکن جب پولیس نہیں آئی تو میں یہی سمجھا کہ کسی نے وہ منظر نہیں دیکھا۔''

کیرول اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ اس کا کارنامہ دو بہنوں رینی اور ویلری نے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے لیے یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''تم نے اس علاقے میں زیادہ وقت نہیں گزارا۔ یہاں بہت کم لوگ اندھیرا پھیلنے کے بعد باہر نکلتے ہیں۔''

''بلکہ میں تو جھنجلا گیا تھا۔'' مائیک نے کہا۔ ''بالآخر مجھے خود ہی پولیس کو گمنام فون کرنا پڑا۔''

''اور یہ ظاہر کیا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس نے دکان میں لاش دیکھی تھی؟''

''بالکل......'' اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''اس کے بعد پولیس آئی اور مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ وہ کوئی اصلی لاش نہیں تھی اور میں محض کرائم ایوننگ میں نمائش کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں بات آ گئی اور ہم نے یہاں کے لوگوں کی سادہ لوحی پر قہقہہ لگایا کہ وہ کتنی جلدی اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔''

''اور تم نے ہی فیدرنگ آبزرور کو فون کیا تاکہ وہ یہ کہانی شائع کر دیں؟''

''ہاں۔ وہ بھی گمنام فون تھا لیکن وہ یہ خبر حاصل کر کے بہت خوش لگ رہے تھے۔''

کیرول نے دل میں سوچا۔ ''انہیں تو ہر خبر کے ملنے پر خوشی ہوتی ہے۔''

مائیک کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مارکیٹنگ کی دنیا میں آپ کو غیر روایتی طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا کاروباری بھی اصولوں کے مطابق نہیں چلتا۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو کیرول زوردار قہقہہ لگاتی۔ جس شخص نے ساری زندگی روایتوں پر عمل کیا ہو، اب وہ اپنا موازنہ دنیا کے سب سے بڑے تاجروں سے کر رہا تھا۔

''بہرحال مبارک ہو۔'' کیرول نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ کرائم ایوننگ بہت کامیاب رہے گی۔''

''ہاں۔'' مائیک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس تشہیر کے اور بھی کئی طریقے ہیں جنہیں مناسب وقت پہ آزماؤں گا۔''

کیرول نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بتایا کہ تم اکاؤنٹنٹ تھے؟''

''ہاں۔''

''بہت خوب! آج میں ایک دوست سے باتیں کر

رہی تھی جو اسی شعبے سے منسلک ہے......''

یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ مزید تفصیل بتانا مناسب نہیں تھا جب تک رچرڈ کی طرف سے کوئی جواب نہ آجاتا۔

دو ہفتے بعد جب وہ اپنے گھر میں بیٹھی ٹائمز کا مطالعہ کر رہی تھی تو رچرڈ نے اسے فون پر بتایا۔

''وہ ہمارے کام کے لیے مناسب رہے گا۔''

''واقعی رچرڈ! مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''میں جب بھی کوئی نیا دفتر کھولتا ہوں تو مجھے نئے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور میرے پاس درخواستوں کا انبار لگ جاتا ہے لیکن کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے جو کام کی نگرانی کر سکے۔ ایسا شخص جو پختہ عمر کا ہو، سنجیدگی سے کام کرے۔ بہت زیادہ آرزومند نہ ہو ہر وقت دوسری کمپنیوں میں بہتر ملازمت کی تلاش میں نہ رہے۔ ایک ایسا شخص جو......''

''محنت مشقت کرنے والا ہو۔'' کیرول نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''ہاں۔ مائیک فلفوٹ میرے معیار پر پورا اترتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ فون تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے کیا ہے کہ تم نے اس کا نام تجویز کیا۔ اس نے یہ پیشکش قبول کر لی ہے۔ گو کہ تنخواہ اس سے کم ہے جو وہ بینک سے لے رہا تھا لیکن وہ اس بارے میں فکر مند نہیں ہے۔ جس دفتر کی سربراہی اسے دی جا رہی ہے، وہ بھی ورتھنگ میں ہے لہٰذا اسے گھر بھی نہیں بدلنا پڑے گا۔''

ایک ہفتے بعد لورنا نے جوڈی کو فون کر کے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ تھراپی کے لیے نہیں آسکے گی اور وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ اب اسے مزید علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر جوڈی کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پونے سات بجے کیرول اپنی پڑوسن جوڈی کے پاس گئی۔ انہیں لورنا کی کرائم ایوننگ میں جانا تھا۔ جوڈی ویسے بھی ٹلی وائٹ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے کیرول کو مشروب پیش کیا اور بولی۔ ''بہت اچھا نتیجہ آیا ہے۔''

''ہاں۔ میں تم سے متفق ہوں جوڈی۔ کیا تم نے ان دونوں بہنوں کے بارے میں کچھ اور سنا ہے؟''

''آج رات ان سے ملاقات ہوگی۔''

''انہوں نے بھی خوب تماشا کیا جبکہ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ کوئی جرم نہیں ہوا، نہ ہی کسی کو قتل کیا گیا۔''

''نہیں۔'' جوڈی متفق ہوتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ ایک موت ٹل گئی۔''

''کس کی موت؟''

''ازدواجی زندگی کی موت!'' جوڈی نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یوں سمجھو کہ لورنا اور مائیک کے رشتے کو نئی زندگی مل گئی۔''

شیش محل

اسماء قادری

قسط:20

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا۔ بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدر آباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر معلومات حاصل کرتا ہے وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کی ذمے دار بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ جولیٹ حویلی والوں پر انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آمد تک موقوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو کر دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ فاروق کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے فاروق پر بملا کو قتل کرنے کا الزام لگ جاتا تھا۔ ربن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ فاروق کی خواہش پر انوپم اگروال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ ربن فاروق کو دیکھنے بندرگاہ جاتا ہے۔ واپسی میں ڈی ایس پی اور مجو کے گرگے اسے گھیر کر شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ ادھر فاروق کو پتا چلتا ہے کہ آغا لندن میں نہیں بلکہ کراچی میں ہے تو وہ جہاز سے اتر کر ایک ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہیں سے وہ کیتھی سے ملنے جاتا ہے جہاں ربن کو بستر مرگ پر پڑا دیکھتا ہے۔ فاروق اپنے دل میں تہیہ کرتا ہے کہ وہ دشمنوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر بلوائی حملہ کر دیتے ہیں جس میں حویلی کے تمام افراد مارے جاتے ہیں۔ صرف اسد اللہ، صفی اللہ اور آپا بیگم بچتے ہیں۔ اسد اللہ فاروق کو ڈھونڈنے بمبئی گئے ہوتے ہیں، ادھر جولیٹ پہلے ہی حویلی سے نکل چکی ہوتی ہے تاکہ آغا کو اس کے انجام تک پہنچا سکے مگر اس کی کوٹھی پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ آغا کراچی جا چکا ہے۔ جولیٹ جانی کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوئی تو ہندو بلوائیوں نے ٹرین پر ہلا بول دیا۔ جانی بھی اس حملے میں مارا گیا تاہم جولیٹ اتفاقی طور پر محفوظ رہی۔ نواب اسد اللہ بھی ہجرت کر کے لاہور آ جاتے ہیں۔ ادھر فاروق ربن کے قاتلوں کو چن چن کر مارتا ہے۔ اس نے رمیش، بھابیہ، مجو اور رفیکے کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ مجو اور رفیکے کو مارنے کے بعد وہ نکل رہے تھے کہ انہیں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے، وہ چوکنا ہو گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' جولیٹ کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے بستر کے قریب ایک مہربان صورت خاتون کو بیٹھے دیکھا جو نرم لہجے میں اس سے اس کا حال دریافت کر رہی تھیں۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ان کی شکل دیکھتی رہی۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں اور کیوں ہے۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' خاتون نے اس سے اپنے پہلے سوال کے جواب کا اصرار کیے بغیر دوسرا سوال کیا اور اس بار بھی جواب کا انتظار کرنے کے بجائے اپنے قریب دھری پلاسٹک کی باسکٹ سے ایک سیب نکال کر اسے چھری کی مدد سے کاٹنے لگیں۔ جولیٹ کی نظریں ان کے ہاتھ میں پکڑی چھری پر جم گئیں اور ذہن پر چھائی دھند چھٹنے لگی۔ چھریاں، چاقو، لاٹھی، بلم، کرپانیں، نیزے...... یکدم ہی اس کے ذہن میں سارے خونیں ہتھیاروں کی تصویریں لہرانے لگیں۔ ان تصویروں کے ساتھ ہی درد میں ڈوبی دردناک ودہشت ناک چیخیں بھی تھیں۔ ان چیخوں نے اس کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری کر دیا پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے منہ اور جسم پر کوئی گرم، چپچپا سا سیال گر رہا ہو۔ اس نے اگلے ہی لمحے اس سیال کو بھی شناخت کر لیا۔ وہ انسانی خون تھا۔ ہر طرف بہتا، صحت مند اور زندہ جسموں سے اچھل کر نکلتا انسانی خون جس میں وہ رفتہ رفتہ نہاتی جا رہی تھی۔ اپنے کپڑوں اور جسم پر انسانی خون کو محسوس کر کے اسے زور کی ابکائی آئی اور اس نے بے ساختہ ہی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''کیا بات ہے بیٹی، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔'' خاتون نے سیب کاٹنے کا عمل ترک کیا اور لپک کر اس کے قریب آئیں۔ جولیٹ انہیں کوئی جواب دینے کے بجائے سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دینے لگیں۔ دہشت اور خوف میں ڈوبی جولیٹ کو ان کا دم غنیمت محسوس ہوا۔ اب اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا اور اسے سب کچھ اچھی طرح یاد آ گیا تھا۔ ظلم و بربریت کا جو تماشا دیکھنے اور سہنے کے بعد وہ یہاں تک پہنچی تھی، اس نے اس کے حواس کو مختل کر دیا تھا۔ وہ تو اب تک دلدار آغا کے خود پر کیے ہوئے ظلم کو ہی ظلم کی انتہا سمجھتی رہی تھی لیکن جو کچھ رات کی تاریکی میں اس کے ہم سفروں پر بیتا تھا، وہ ایسی درندگی تھی کہ درندے بھی اس پر شرما جائیں۔ اس درندگی نے اس سے جانی کو بھی چھین لیا تھا اور ایک بار پھر وہ اس بے رحم دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی قسمت کی ستم ظریفی کہ اسے کبھی زیادہ دیر کسی سایۂ عافیت میں پناہ نہیں مل پائی تھی۔ محبت کرنے والے پُرخلوص لوگوں سے بچھڑتے رہنا جیسے اس کا مقدر ہو گیا تھا۔

''صبر اور ہمت سے کام لو بیٹی۔ اس وقت ہماری پوری قوم کو ان ہی دو جذبوں کی ضرورت ہے۔ ہم سب ہی کے دل زخم زخم ہیں لیکن نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنے کے لیے ہمارے پاس صبر اور ہمت سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' خاتون بھیگے ہوئے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔ جولیٹ نے آہستہ آہستہ خود کو سنبھال لیا تو وہ اسے خود سے الگ کر کے دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھیں اور سیب کی ایک قاش اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے خلوص کے پیش نظر وہ قاش تھام لی اور ان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آپ کون ہیں اور میں آپ تک کیسے پہنچی؟'' اپنے اردگرد کا جائزہ لے کر وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ ایک آسودہ حال گھر میں موجود ہے۔ وہ جس کمرے میں موجود تھی، اس کا فرنیچر اور دیگر اشیا مکینوں کی آسودگی کی گواہی دے رہی تھیں۔

''مجھے بیگم آصفہ علی کہا جاتا ہے۔ میرے شوہر عنایت علی پولیس میں ملازمت کرتے ہیں۔ ان ہی کی زبانی میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ دہلی سے آنے والی ایک ٹرین اٹا اٹ لاشوں سے بھر کر آئی ہے۔ اس ٹرین میں لاشوں کے علاوہ کچھ زخمی بھی تھے جنہیں فوری طور پر اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ تم مرنے والوں کے جسموں کے نیچے خون میں نہائی ہوئی ملی تھیں اور پہلی نظر میں تمہیں مرا ہوا ہی سمجھا گیا تھا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ تم زندہ ہو اور زخمی نہ ہونے کے باوجود یقیناً صدمے کی زیادتی کے باعث بے ہوش ہو گئی ہو۔ تمہیں خواتین کے لیے بنائے گئے کیمپ میں بھجوایا گیا۔ میں دن میں چند گھنٹے رضاکارانہ طور پر اس کیمپ میں کام کرتی ہوں۔ میں نے تجویز دی کہ تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے سے پہلے خون آلود لباس سے نجات دلانی چاہیے تاکہ ہوش میں آنے کے بعد تمہاری حالت خون کو دیکھ کر دوبارہ نہ بگڑ جائے۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا لباس تبدیل کیا اور اسفنج کی مدد سے تمہارے جسم کے خون آلود حصوں کو بھی صاف کیا۔ اس کارروائی کے دوران تمہیں ہوش آ گیا تھا اور تم ہسٹریا کی سی کیفیت کا شکار ہو رہی تھیں اس لیے تمہیں ایک سکون آور

انجکشن لگا دیا گیا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں کیمپ سے اپنے گھر لے آؤں، سو اب تم میرے گھر میں موجود ہو۔''

انہوں نے اپنے نرم لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے اشارہ کیا کہ وہ سیب کی قاش کو ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھے رہنے کے بجائے اسے کھالے۔ جولیٹ آہستہ آہستہ اس قاش کو کترنے لگی۔ اسی وقت اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا اور اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہاں جوزفین کا سونے کی زنجیر میں پرویا ہوا قیمتی لاکٹ موجود نہیں تھا جس کی اہمیت اس کے نزدیک اس کی قیمت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ اس کے لیے اس کے والدین کی آخری نشانی کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ مرتے دم تک اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں وہ وہیں ٹرین میں گر گیا تھا یا کسی نے اس کے گلے سے اتار لیا تھا۔ گلے سے اتارے جانے کے خیال پر اس کی نظر فوراً بیگم آصفہ علی کی طرف گئی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے ہی اس کا لباس تبدیل کروایا تھا اور اگر اس کا لاکٹ ٹرین میں نہیں گرا تھا تو انہیں اس کے بارے میں علم ہونا چاہیے تھا۔ اس کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھتی بیگم آصفہ علی نے اس کی خود پر اٹھی نظروں کو بھی محسوس کرلیا اور سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اس کی طرف ایک چھوٹا سا لفافہ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''تمہیں یقیناً اس کی تلاش ہے۔'' جولیٹ نے ان کے ہاتھ سے وہ لفافہ لے کر کھولا اور اس میں لاکٹ کو مع زنجیر موجود پاکر سکون کا سانس لیا۔

''تمہارے گلے میں موجود اس لاکٹ سیٹ کے علاوہ اور کسی شے کے بارے میں، میں کچھ نہیں بتا سکتی کیونکہ تمہیں بغیر کسی ساز وسامان کے کیمپ میں لایا گیا تھا۔ ٹرین پر حملہ کرنے والے بلوائی اپنے ساتھ مسافروں کا زیادہ تر سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ بس کچھ تھوڑا بہت سامان ہی باقی بچا ہوگا جو انتظامیہ نے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے۔ تمہاری جو چیزیں غائب ہیں، ان کی لسٹ بنالو۔ ہم کوشش کریں گے کہ بچ جانے والے سامان میں اگر وہ اشیا شامل ہوں تو تمہیں واپس مل سکیں۔'' وہ سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھیں۔

''نہیں، میرے پاس اس لاکٹ کے علاوہ دوسری ایسی کوئی قیمتی شے موجود نہیں تھی جس کے لیے میں کلیم کروں۔ کچھ کپڑوں کے جوڑے اور تھوڑی بہت رقم ہی تھی اور ظاہر ہے وہ اب مجھے نہیں مل سکتے۔ ہاں، میں اپنے برادر جانی کے بارے میں ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ اس کی ڈیڈ باڈی کا کیا ہوا۔'' جانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے اپنے حلق میں نمکین پانی کا گولا سا پھنستا محسوس کیا۔

''ٹرین میں ملنے والی جن لاشوں کے ورثا پہنچ گئے تھے، انہیں ورثاء کے حوالے کردیا گیا تھا جبکہ لاوارث اور ناقابلِ شناخت لاشوں کو امانتاً دفن کردیا گیا ہے۔ یقیناً تمہارے برادر کی لاش بھی ان ہی میں شامل ہوگی۔'' انہوں نے اسے جواب دیا اور سیب کی ایک اور قاش اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''ہمارے درمیان اتنی گفتگو ہوگئی لیکن مجھے تم سے تمہارا تعارف حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ۔''

''میرا نام جولیٹ ہے۔ بمبئی کی رہنے والی ہوں۔ وہاں ایک نیوز پیپر میں کام کرتی تھی اور اپنے برادر جانی کے ساتھ پاکستان آرہی تھی۔ لاہور پہنچنے کے بعد ہمارا ارادہ کراچی جانے کا تھا لیکن راستے میں وہ حادثہ پیش آگیا اور میں آپ تک پہنچ گئی۔'' اس نے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''اوہ! تم اخباری رپورٹر ہو۔ یقیناً تم اپنے اخبار کے لیے خبریں جمع کرنے کے لیے اس ٹرین میں سوار ہوئی ہوگی۔ تم نوجوان پتا نہیں کیوں اتنے بڑے بڑے خطرے مول لیتے ہو۔ تمہیں اپنے تجربات کے شوق میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ پیچھے تمہارے ماں باپ پر کیا گزرے گی۔ یہاں لاہور میں تو پھر بھی اتنا برا حال نہیں ہے لیکن کراچی میں تو سنا ہے روزانہ لٹے پٹے قافلے خون میں ڈوبے ہوئے پہنچ رہے ہیں۔ تم اخبار میں کام کرتی ہو، تم سے زیادہ حالات کی کسے خبر ہوگی۔ اس کے باوجود تم مہاجرین کو لانے والی ٹرین میں بیٹھ گئیں اور اس پر سے اپنے گلے میں اتنا قیمتی لاکٹ سیٹ بھی پہن لیا۔ وہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم لاشوں کے نیچے دب کر محفوظ رہ گئیں ورنہ ظالم بلوائی تمہاری گردن کاٹ کر یہ قیمتی لاکٹ اتار کر لے جاتے۔'' وہ ایسی خفگی کا اظہار کرنے لگیں جس میں اپنائیت تھی۔ جولیٹ خاموشی اور تابعداری سے سر جھکائے ان کی ڈانٹ سنتی رہی اور بیگم آصفہ علی کے کسی اندازے کی تردید نہیں کی۔ انہوں نے ایک عیسائی لڑکی کی دہلی سے مسلمانوں کو لانے والی ٹرین میں موجودگی کا جو جواز ڈھونڈ لیا تھا، اس کے لیے وہی ٹھیک تھا اور وہ جھوٹ گھڑنے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔

''میرے لیے تم بالکل میری بیٹی جیسی ہو اس لیے میں نے یہ سب کہا ہے۔ امید ہے تم نے برا نہیں مانا ہوگا۔'' اس پر خفگی کا اظہار کرنے کے بعد وہ خود ہی وضاحت کرنے لگیں۔

"برا ماننے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ آپ نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی ہے۔" جولیٹ نے کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

"جیتی رہو۔ یقیناً تمہارے والدین نے تمہاری بہت اچھی تربیت کی ہے۔ اگر تمہارے گھر فون ہے تو تم یہاں سے انہیں فون کر سکتی ہو۔ تمہیں اپنے برادر کی موت کی افسوسناک خبر انہیں دینی ہوگی۔" اسے دعائیں دیتے ہوئے انہیں دھیان آیا کہ اس کا بھائی اس حادثے میں مر گیا ہے اور یقیناً اسے اس کی اطلاع اپنے گھر پر دینی چاہیے۔

"میرے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور اب میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔" انہیں جواب دیتے ہوئے اس کا گلا خود بخود رندھ گیا۔ ایک طرف اسے جانی کی موت کا دکھ تھا جو اس سے اپنے منہ بولے رشتے کو نبھاتے نبھاتے اپنی جان کی قربانی دے گیا تھا تو دوسری طرف اسے اسد اللہ شدت سے یاد آئے تھے۔ اسد اللہ...... اس کے سگے باپ اس خطۂ ارض پر زندہ سلامت موجود تھے لیکن اس نے اپنی رضا سے انہیں چھوڑ دیا تھا اور اب اپنی محسنہ کو یہ بتا رہی تھی کہ اس کے والدین کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ جوزف کے حوالے سے اس کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی لیکن اسد اللہ...... اسد اللہ تو زندہ تھے اور وہ جیتے جی انہیں چھوڑ آئی تھی۔

"غم نہ کرو بیٹی اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ سگے والدین کا کوئی نعم البدل نہیں لیکن میں اور میرے شوہر تمہیں اپنی بیٹی ہی کی طرح عزیز رکھیں گے۔ ابھی تم صدمے کی حالت میں ہو، دونوں طرف کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں رہ کر مناسب وقت کا انتظار کرو اور بعد میں سوچ سمجھ کر اپنے لیے جو چاہے فیصلہ کر لو۔" وہ اس کے ساتھ بہت اپنایت کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور جولیٹ حیران تھی کہ ابھی دنیا میں ایسے اچھے لوگوں کا وجود باقی ہے۔

"تھینک یو سو مچ آنٹی! آپ کے اس خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اس نے ممنونیت سے ان کی طرف دیکھا۔

"شکریے کی کیا بات ہے بیٹی۔ ہم تو خود اپنے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے یہ سب کرتے پھر رہے ہیں۔" ان کے لبوں کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور آنکھوں سے گہری اداسی جھلکنے لگی۔

"آپ مجھ سے اپنا دکھ شیئر کریں تو یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔" جولیٹ نے فوراً ہی ان سے کہا کہ سنا تھا بانٹنے سے غم کی شدت کم ہو جاتی ہے اور اگر وہ اپنی محسنہ کا غم بانٹ لیتی تو یہ ان کے احسان کا بہت معمولی سا بدلہ ہوتا۔

"کیا کہوں بیٹی، تمہاری ہی جیسی میری بھی ایک بیٹی تھی۔ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن...... بہت پیاری، فرمانبردار اور ہر وقت ہنسنے مسکرانے والی۔ ہم نے اسے کم عمری میں ہی اس کی پھپھی کی خواہش پر ان کے بیٹے سے الٰہ آباد میں بیاہ دیا تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ وہ وہاں خوش رہ رہی ہے اور پھپھی نے ساس کے بجائے ماں بن کر اسے اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ سال میں دو بارہ وہ مہینا پندرہ دن کے لیے یہاں رہنے آ جاتی تھی تو جدائی کی ساری کسر نکل جاتی تھی۔ ہم خود بھی جب دل چاہتا تھا اس سے ملنے الٰہ آباد چلے جاتے تھے۔ اس کا دو سال کا ایک بیٹا بھی تھا اور جانو زندگی میں بس خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ان خوشیوں کو نہ جانے کس حاسد کی نظر کھا گئی۔ میرا داماد تحریک پاکستان کا بڑا سرگرم کارکن تھا اور ظاہر ہے مخالفین کی نظر میں بھی رہا ہوگا۔ جس روز تین جون کا اعلان ہوا اور تقسیم کا حتمی فیصلہ ہو گیا، اسی روز ظالموں نے اس کے گھر میں گھس کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔ دو سال کے معصوم بچے کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس سانحے کے بعد میرے تو حواس ہی چھن گئے تھے اور آٹھوں پہر روتے رہنے کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی تسلی، کوئی دلاسا دل کو سکون نہیں دیتا تھا، حالانکہ میرے شوہر مجھے سمجھاتے تھے کہ ہماری بیٹی کو شہادت کی موت نصیب ہوئی ہے اور شہید زندہ ہوتے ہیں۔ ہندوستان سے لٹے پٹے قافلے یہاں پہنچنا شروع ہوئے تو میرے شوہر اپنی ملازمت کی ذمے داریوں کی وجہ سے مصروف ہو گئے پھر وہی ایک دن مجھے ایک کیمپ میں لے گئے اور مجھ سے کہا کہ تم تو اپنی ایک بیٹی کے لیے آنسو بہا رہی ہو، یہاں موجود ان عورتوں کو دیکھو، ان سے ملو جنہوں نے اپنے پورے پورے خاندان کھو دیے ہیں۔ بس پھر اس دن کے بعد سے مجھ میں تبدیلی آ گئی۔ میں ان کا غم بانٹنے لگی جو مجھ سے کہیں زیادہ دکھی تھیں۔ میں نے اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ اس نے بیٹی لے لی ہے لیکن کم از کم میرے پاس میرے بیٹے تو زندگی کا سہارا ہیں۔ بیٹی کی یاد تو ظاہر ہے دل سے نہیں جا سکتی لیکن تم جیسی کسی بیٹی کو سہارا دے کر مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو بچا لیا ہے۔" وہ نم آنکھوں سے اپنا غم سنانے لگیں۔ جولیٹ نے ان کے لیے اپنے دل میں بڑا احترام محسوس کیا۔ اپنے غم کو سینے میں چھپا کر دوسروں کا غم بانٹنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوتا اور ایک دکھی ماں یہ سب کر رہی تھی۔

"بہن کی شہادت کے بعد میرے دونوں بیٹے جو کالج میں پڑھتے ہیں اور اپنی عمر کے حساب سے بہت جذباتی بھی

ہیں، سخت طیش میں تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ جیسے ان کی بہن کا گھر ختم ہوا ہے، وہ یہاں رہنے والے ہندوؤں کے گھر بھی جلا کر خاک کردیں لیکن میرے شوہر نے انہیں سمجھایا اور سنبھالا کہ انتقام کی راہ پر چل کر تم انسانیت کی تذلیل کے سوا کچھ نہ کر پاؤ گے۔ یہ سب کرنے سے تمہاری بہن کی روح کو سکون نہیں ملے گا۔ یہ سب کرنے سے بہتر ہے کہ تم مصیبت زدہ لوگوں کے کام آؤ اور بساط بھر ان کا غم بانٹو تو انسانیت کا حق بھی ادا ہوگا اور تمہاری بہن کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ شکر ہے انہیں یہ بات سمجھ آگئی اور وہ غصے میں قاتل اور لٹیرے بننے سے بچ کر لوگوں کے درد کا درماں بن گئے۔ صبح میں کالج جاتے ہیں اور وہیں سے پناہ گزینوں کے کیمپ جا کر کام کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا میں ٹفن میں ساتھ دے دیتی ہوں، بس یوں آج کل ہمارے خاندان کے شب و روز گزر رہے ہیں۔ میں نے پہلی نظر میں تمہارے لیے اپنے دل میں بڑی انسیت محسوس کی تھی اس لیے کیمپ سے تمہیں اپنے گھر لے آئی۔ اب یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ ہمارے ساتھ ہمارے خاندان کا حصہ بن کر رہو یا اپنے لیے جو چاہو فیصلہ کرو۔'' انہوں نے اسے اپنے خاندان کے بارے میں معلومات فراہم کر کے فیصلے کا کُل اختیار اسے دے دیا اور اس لمحے جولیٹ نے اپنے دل میں ایک ایسا فیصلہ کیا جسے کر کے وہ خود بھی واقعی پُرسکون ہوگئی۔

☆☆☆

''اپن کب تک ایسے اِدھر رہے گا فاروق بھائی؟ آپ ابھی تک بابا کو بھی ڈھونڈ کر نہیں لائے۔ اپن کو بابا کی بہت یاد آرہی ہے۔'' آج کا دن فاروق کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے سب کے درمیان بیٹھ کر خاصے اچھے موڈ میں ناشتا کیا تھا اور ناشتے کے بعد فوراً اپنے کمرے میں اٹھ کر جانے کے بجائے سب کے درمیان ہی بیٹھا ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ ربن کے قتل میں شامل دو بنیادی کرداروں کو ان کے عبرت ناک انجام تک پہنچانے کے بعد وہ خود کو خاصا پُرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجو وہ شخص تھا جس کی وجہ سے اڈے کے پُرسکون ماحول میں ہلچل مچی تھی۔ سب سے پہلا معاملہ ثریا بانو کا تھا۔ اس مظلوم نوجوان بیوہ سے مجو دھونس دھمکی کے ذریعے عقد کرنے کا خواہش مند تھا۔ ربن نے ثریا بانو کے سر پر ہاتھ رکھا اور مجو کو اس زبردستی کی شادی سے روکنے کی کوشش کی تو وہ بات سمجھنے کے بجائے دشمنی پر اتر آیا۔ اس دشمنی میں مزید اضافہ چاند بانو کی فاروق پر نظرِ التفات سے ہوا اور مجو کے گورے افسر دوست، ولیم نے تھانے میں فاروق پر ایسا تشدد کروایا کہ وہ عرصے تک صاحبِ فراش رہا۔ اس موقع پر مجو کو لگام ڈالنے کے لیے ربن نے اسے کھلا چیلنج کرنے کے بعد اڈے کی چوکی سے محروم کر دیا۔ مجو غیرت مند ہوتا تو ایک طرف ہو جاتا لیکن اس نے سازباز شروع کر دی۔ اسے فیکے جیسے ساتھیوں کا ساتھ بھی حاصل تھا اور اس نے پولیس سے بھی تعلقات گانٹھ لیے تھے۔ فیکے کے تعاون سے کرائے کے ٹٹوؤں کے ذریعے اس نے ثریا بانو کو رخصت ہو کر بمبئی سے کلکتہ جاتے ہوئے ریل میں اغوا کروانے کی کوشش کی۔ اس وقت حفاظت کے لیے ساتھ جانے والے وجے اور کمو نے مداخلت کی۔ ان کی مداخلت سے ثریا بانو اور اس کا سسرالی خاندان تو محفوظ رہا لیکن کمو اپنی جان کی بازی ہار گیا۔

اڈے کے لیے یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ ربن کے ساتھی انتقام کے جذبات سینے میں لیے مجو اور فیکے کو ڈھونڈتے رہے لیکن وہ لوگ پولیس کی آشیرباد کے سائے میں محفوظ رہے۔ ربن کو طرح طرح سے پھنسانے اور نیچا دکھانے کی کوششیں ہوتی رہیں اور وہ ہر بار دشمنوں کے جال کو توڑ کر اس سے نکلتا رہا لیکن آخرکار اس کی قسمت دغا دے گئی۔ بملا کی فاروق سے محبت نے عجب رنگ دکھایا۔ وہ محبت میں ناکامی پر خودکشی کر کے مر گئی لیکن فاروق پر اس کے قتل کا الزام آگیا اور اس الزام نے بھاٹیہ سیٹھ جیسے طاقتور آدمی کو ان کا دشمن بنا دیا۔ سارے دشمنوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کیا تو آخرکار ربن جیسے شخص کو گھیر کے مارنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ربن کی موت فاروق کے لیے ناقابلِ فراموش تھی۔ وہ انتقام کی راہ پر چلنے پر مجبور ہو گیا، سب سے پہلے مہیش کا نمبر آیا، پھر بھاٹیہ کا اور اب مجو اور فیکا بھی ٹھکانے لگ گئے۔ دشمنوں کی فہرست میں یہ دو افراد ہی سب سے زیادہ قابلِ نفرت تھے اسی لیے وہ ان دونوں کے خاتمے پر خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہا تھا اور اس سکون نے اس کے مزاج کو خوش گوار بنا دیا تھا۔

اسے جن لوگوں سے بدلہ لینا تھا ان میں سے اب صرف ڈی ایس پی راٹھور ہی باقی رہ گیا تھا اور ایک مشکل ٹارگٹ ہونے کے باوجود اسے یقین تھا کہ اس کا جذبۂ انتقام اسے اس آخری فرد کو بھی انجام تک پہنچانے میں کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی اچھی منصوبہ بندی کر کے جلد از جلد قدم اٹھانے کا خواہش مند تھا لیکن فی الحال تو اسے گولو کے سوال کا سامنا تھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ تھا جب ربن کے ساتھ اڈے پر آیا تھا اور ربن نے ہمیشہ اسے ایک باپ کا پیار دیا تھا۔ وہ سیدھا سادہ، ذہنی طور پر ذرا کم استعداد رکھنے والا لڑکا اڈے کے مخصوص ماحول میں مگن رہتا

بہار کے موسم سے لطف اندوز کرواتا مارچ 2017ء کا پرکشش شمارہ



ماہنامہ پاکیزہ کراچی

انجم انصار، رفعت سراج و شیریں حیدر کے خوب صورت ناول

سحر ساجد کا دل نشیں ناولٹ...... **من جانبازم**

سیما رضا ردا کی دل کش تحریر منی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** کی صورت

پاکیزہ کے خوب صورت مہمان کی بزم میں خوشگوار آمد

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے نیا سلسلہ **اللہ اور اس کا نور**

باتیں بہار و خزاں کی

کے سلسلے میں آپ بھی شامل ہوئیے

اختر شجاعت کی پر روح تحریر **تحمل و برداشت** کے موضوع پر

نگہت سیم، عقیلہ حق، پروین عذرا تشنہ کی خصوصی تحریر

اس کے علاوہ

مشاق قلم کاروں کے دل پذیر افسانے، ناولٹ جس میں **تحسین اختر، سارا احمد، سمیرا یونس ہارون** و دیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ، معلومات افروز سلسلے صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ کیسے وہ اپنی سوتیلی ماں کی سازش کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے خاندان سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کے لیے اب یہی اس کا خاندان تھا اور ربن اس کا باپ جسے وہ بابا کہہ کر پکارتا تھا اور اب اپنے بابا سے جدائی پر مضطرب و بے قرار تھا۔ ''یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے کیا؟ سجو کھانے اچھا بنا کر نہیں دیتا یا کوئی اور مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ؟'' فاروق نے اسے بچوں کی طرح بہلا کر خود کو مشکل سوال کا جواب دینے سے بچانے کی کوشش کی۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اپن کو ادھر اچھا نہیں لگتا۔ سب لوگ کا یاد آتا ہے۔ سب سے زیادہ بابا کو ملنے کا دل بولتا ہے۔ آپ نے کہا تھا اسے ڈھونڈ کر لاؤ گے لیکن اتنے دن ہو گئے، ابھی تک نہیں لائے۔'' گولو کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''کیوں پریشان کرتا ہے گولو فاروق بھائی کو...... کیا انہیں خود سے پروا نہیں ہو گی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں رہا کہ یہ اور وجے بھیا کیسے کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ رات وجے بھیا کتنے زخمی واپس آئے تھے تو نے نہیں دیکھا۔'' ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے سجو نے گولو کو ٹوکا۔ وہ بھی مزاجاً سیدھا سادہ لڑکا تھا لیکن گولو کی طرح کم ذہن نہیں تھا اس لیے بہت کچھ سمجھ اور محسوس کر رہا تھا۔ اس گھر میں چھپ کر رہنا اور راتوں کو بھیس بدل کر نکلنا اس سے مخفی نہیں تھا۔ وہ فاروق اور وجے کے درمیان ہونے والی خفیہ میٹنگوں سے بھی واقف تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا طوفان آچکا ہے اس لیے گولو کو ٹوک کر اس نے فاروق کی اخلاقی مدد کی تھی۔

''اپنے کو سب پتا ہے، پر بابا یاد آتا ہے نا۔'' نہایت معصومیت سے کہتے گولو کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکی تو مانو کسی نے فاروق کا دل مٹھی میں لے لیا۔ اس نے بے ساختہ ہی گولو کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگایا اور بے طرح بھینچ لیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر روئے اور گولو کو بتائے کہ اب دادا کا انتظار لاحاصل ہے۔ وہ جس دیس چلا گیا ہے وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن خود پر بے پناہ جبر کرتے ہوئے اس نے اپنے سارے آنسو اندر ہی اتار لیے اور دھیرے دھیرے گولو کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

''یہ کیا سین چل رہا ہے بھئی؟'' کیتھرائن وہاں آئی تو اس منظر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ صبح ہی یہاں آئی تھی۔ اسے فاروق کی رات والی مہم کے بارے میں علم تھا۔ اس کی نائٹ ڈیوٹی نہ ہوتی تو رات وہیں رک جاتی۔ اسے فاروق نے بھائی کا مان دیا تھا تو وہ بھی بالکل سگی بہن کی طرح ہی اسے چاہنے لگی تھی۔ وہ فاروق کے دکھ کو سمجھتی تھی اس لیے وہ جو کچھ کر رہا تھا، اسے اس سے تو نہیں روکتی تھی لیکن اس کی طرف سے سخت متفکر رہا کرتی تھی۔ اس لیے صبح ڈیوٹی آف ہوتے ہی ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے یہاں دوڑی چلی آئی تھی۔ یہاں آکر اس نے وجے کے زخم دیکھے تو اپنا آنا اور بھی درست محسوس ہوا۔ اس کے شانے اور گردن کی کھال اکھڑی ہوئی تھی۔ کیتھرائن نے فوری طبی امداد کا کچھ سامان ان لوگوں کو فراہم کر رکھا تھا اس لیے رات کو واپس آنے کے بعد فاروق نے وجے کے زخم صاف کر کے ان کی مرہم پٹی کر دی تھی لیکن کیتھرائن کی پیشہ ورانہ مہارت کی اپنی بات تھی، سو ناشتے کے بعد وہ وجے کے زخموں کی نئے سرے سے ڈریسنگ کرنے کے لیے اسے اندرونی کمرے میں لے گئی تھی۔ ڈریسنگ کے دوران اس نے وجے سے رات کی مہم کی تفصیلات بھی سن لی تھیں اور جان گئی تھی کہ اسے یہ زخم مجو کی وجہ سے آئے ہیں۔ وجے نے اسے بتایا کہ مجو اور فیکے کے خاتمے کے بعد انہوں نے پولیس کی گاڑی کا سائرن سنا تو ایک لمحے کے لیے انہیں لگا کہ وہ پکڑے جائیں گے۔ ان کے ہاتھ خون آلود تھے، جیبوں میں چاقو پڑے تھے اور لباس پر بھی خون کے چھینٹے آئے تھے جو لباس کی گہری رنگت کے باعث نمایاں تو نہیں تھے لیکن کوئی قریب سے دیکھتا تو اسے اندازہ ہو بھی سکتا تھا۔ انہوں نے صورتِ حال سے گھبرا کر سرپٹ دوڑ لگا دی تھی لیکن تعاقب نہ ہوا تو اندازہ لگایا کہ پولیس آتشزدگی کا شکار ہونے والی عمارت کا جائزہ لینے اور لوگوں سے واقعے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئی ہو گی۔ اس سے داستان سنتی کیتھرائن نے کئی بار یسوع مسیح کا نام لے کر شکر ادا کیا کہ وہ لوگ بہ حفاظت واپس آ گئے۔

واپسی میں انہوں نے کوئی سواری نہیں لی تھی اور زیادہ تر اندھیری گلیوں میں سے گزرتے ہوئے پیدل ہی اپنی رہائش گاہ واپس پہنچے تھے۔ اپنے خون آلود ہاتھوں کو تو انہوں نے پہلے مٹی سے رگڑ کر اور بعد میں جیبوں میں پڑے رومالوں سے پونچھ کر کافی حد تک صاف کر لیا تھا لیکن پھر بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور یا کوچوان ان کے حلیے میں کوئی مشکوک علامت دیکھ کر چونک جائے اور بعد میں پولیس کے سامنے ان کی رہائش گاہ کی نشاندہی کر دے۔ خطرہ مول لینے کے بجائے انہوں نے پیدل چلنے کی مشقت اٹھانا قبول کر لی تھی۔ بمبئی کی گلیاں ان کی دیکھی بھالی تھیں اور وہ رات کی تاریکی میں بہ حفاظت ان گلیوں سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ کیتھرائن نے وجے

کی مرہم پٹی کرتے ہوئے ساری تفصیل سنی اور پھر اسے ایک پین کلر دے کر آرام کا مشورہ دیتی باہر آ گئی۔ باہر اس نے فاروق کے سینے سے لگے گولو کو دیکھا تو سمجھ گئی کہ گولو نے کوئی ایسی بات چھیڑ دی ہو گی جس کا جواب فاروق کے پاس نہیں ہو گا اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں ان دونوں سے مخاطب ہوئی۔

''دادا کا لاڈلا دادا کے نہ ہونے سے اداس ہو رہا ہے تو میں اس کے لاڈ اٹھا کر اس کی اداسی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' فاروق نے بھی اپنی اندرونی کیفیت کے برعکس شوخ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''یہ کام تو میں بھی اچھی طرح کر سکتی ہوں۔ کیوں گولو برادر..... کیا میں تمہاری سسٹر نہیں ہوں اور تمہارے لاڈ نہیں اٹھاتی ہوں؟'' اس نے گولو کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تم تو اپن کا بہت پیارا سسٹر ہے۔ بس اپن کو ذرا بابا کی یاد آ گئی تھی۔'' گولو اب تھوڑا سا جھینپ رہا تھا۔ فاروق نے اسے اپنے سینے سے الگ کر دیا تھا لیکن اب بھی اس کی گردن میں بازو حمائل کر کے بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہیں پتا ہے نا کہ تمہارا بابا بھی تم سے بہت لو کرتا ہے۔ اس کا بھی تمہارے پاس آنے کا من کرتا ہو گا لیکن کبھی کبھی آدمی بڑا مجبور ہوتا ہے اور اپنی مرضی نہیں کر سکتا۔ تم بس اپنے بابا کے لیے ڈھیر ساری پرے (دعا) کیا کرو کہ وہ جس جگہ ہے، وہاں بہت اچھا رہے۔'' کیتھرائن پیار سے اسے سمجھانے لگی۔

''ٹھیک ہے سسٹر! جیسا تم بولو۔ اپن پرامس کرتا ہے کہ آج کے بعد دوبارہ فاروق بھائی کو بابا کا بول کر تنگ نہیں کرے گا اور بس اللہ میاں سے اس کے لیے دعا کرے گا۔'' گولو پر ہمیشہ کی طرح کیتھرائن کی باتوں کا خاصا اثر ہوا اور اس نے فوراً ہی اس سے وعدہ کر لیا۔

''گڈ بوائے۔ تم اتنا اوبیڈینٹ ہے اسی لیے تو زیادہ لولی لگتا ہے۔'' کیتھرائن نے ہولے سے اس کے رخسار پر چٹکی لی تو وہ شرما گیا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''اپن جا کر سجو کا ہاتھ بٹاتا ہے اور تمہارے لیے اس سے چائے بھی بنوا کر لاتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہو گا۔ چائے پینے سے میری نیند بھاگ جائے گی اور میں تھوڑی فریش بھی ہو جاؤں گی۔'' کیتھرائن نے اس کے عمل کو سراہا۔

''تھینک یو۔ تم نے بڑے نازک وقت میں میرا ساتھ دیا۔'' گولو چلا گیا تو فاروق نے کیتھرائن کا شکریہ ادا کیا۔

''تھینک یو کی کیا بات ہے۔ گولو اور آپ دونوں مجھے عزیز ہیں اور میں آپ دونوں کو ہی اداس نہیں دیکھ سکتی۔'' کیتھرائن نے اسے جواب دیتے ہوئے ہلکی سی جمائی لی۔

''تم تھکی ہوئی ہو، یہاں آنے سے پہلے تمہیں اپنی نیند پوری کر لینی چاہیے تھی۔'' فاروق نے اسے ٹوکا۔

''آپ لوگوں کی خیریت معلوم کیے بغیر مجھے نیند نہیں آتی اس لیے پہلے یہاں چلی آئی۔ اور اچھا ہی ہوا کہ آ گئی۔ اس طرح وجے کی پراپر ڈریسنگ بھی ہو گئی۔ اب واپس ہاسٹل جاؤں گی تو مزے سے لمبی نیند لے لوں گی۔ ویسے بھی آج میرا آف ڈے ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے فاروق کو جواب دیا۔

''چلو جیسی تمہاری خوشی لیکن یہ آج تم نیوز پیپر لے کر کیوں نہیں آئیں، ہو سکتا ہے کوئی خبر آئی ہو۔'' فاروق کا اشارہ کس خبر کی طرف تھا؟ وہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی رات والی کارروائی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔

''سوری۔ آنے کی جلدی میں میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا..... ویسے بھی اس وقت خبر نیوز پیپر میں آنا مشکل ہے۔ اتنی رات کی بات ہے۔ نیوز پہنچنے سے پہلے ہی نیوز پیپر کی کاپیاں پریس میں چلی گئی ہوں گی۔ ہاں ہو سکتا ہے ایوننگ پیپر میں ساری ڈیٹیل آ جائے۔'' اس نے فاروق سے اخبار نہ لا سکنے پر معذرت کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اسی وقت گولو چائے کی پیالیاں لیے وہاں چلا آیا۔ کیتھرائن نے ایک پیالی فاروق کو پکڑائی اور دوسری اپنے لیے اٹھانے ہی لگی تھی کہ دروازے پر زوردار دستک کی آواز ابھری۔ آواز سن کر گولو دروازے کی طرف جانے لگا۔

''تم رکو گولو! میں دیکھتی ہوں۔'' کیتھرائن نے اسے روک لیا۔ دستک کا انداز کچھ غیر معمولی سا تھا اس لیے اس نے خود دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے روکنے پر گولو رک گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے آواز قدموں سے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے ایک جھری سے باہر جھانکا اور بری طرح چونک گئی۔ باہر پولیس کی وردی میں ملبوس افراد کھڑے تھے۔ وہ بلی کی چال چلتی تیزی سے واپس اندر گئی۔ اس کے چہرے پر چھائی سراسیمگی نے فاروق کو بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

''باہر پولیس ہے۔ آپ لوگ احتیاطاً اوپر چھت پر چلے جائیں۔ میں دیکھتی ہوں وہ لوگ کیوں آئے ہیں۔ خطرہ ہوا تو میں اشارہ کر دوں گی۔ چھت پر سے آپ لوگوں کو فرار کا راستہ مل جائے گا۔'' کیتھی نے جلدی جلدی فاروق

سے کہا۔ اس دوران دروازے پر دوبارہ دستک دی جانے لگی تھی اور یہ پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ فاروق تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ وجے کو آواز دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ دستک کی زوردار آوازیں اسے خود ہی باہر لے آئی تھیں۔ اسی کی طرح سجو بھی باورچی خانے سے باہر نکل آیا تھا۔ فاروق نے ان سب کو اپنے ساتھ اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ کیتھرائن دروازے کی طرف جا چکی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے فوری طور پر چٹخنی کھولنے کے بجائے اندر سے ہی بلند آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟ اتنی بدتمیزی سے دروازہ کیوں بجا رہے ہو؟'' اسے یہ سوالات کرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ صرف فاروق اور اس کے ساتھیوں کو مہلت فراہم کر رہی تھی۔

''دروازہ کھولو بی بی! باہر پولیس ہے۔'' کرخت لہجے میں اسے حکم دیا گیا۔

''پولیس ...... پولیس کا یہاں کیا کام ہے؟'' کیتھرائن نے اپنی آواز میں حیرت پیدا کی۔

''تم دروازہ کھولو میڈم، سب بتاتے ہیں۔ اب اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو ہم اسے توڑ دیں گے۔'' پولیس والوں کے تیور خطرناک تھے۔ کیتھرائن نے دروازہ کھول دیا۔ تین چار پولیس والے فوراً ہی دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔

''واٹس دا پرابلم آفیسر؟'' کیتھرائن نے ان کی سربراہی کرنے والے شخص سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''مفرور مجرموں کو پناہ دے کر ہم سے پوچھتی ہو کہ پرابلم کیا ہے۔ کہاں ہے وہ خونی جو لوگوں کو قتل کرتا پھرتا رہا ہے۔'' ان الفاظ نے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ وہ لوگ فاروق کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کیتھرائن زور سے چیخی۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے۔ یہاں کوئی خونی یا قاتل موجود نہیں ہے۔ یہاں میں اکیلی ہوں۔'' بھاگ جانے کا اشارہ اس نے اوپر والوں کو دیا تھا لیکن بظاہر پولیس والوں سے مخاطب تھی۔ پولیس والے بھی اس کے شور مچانے کا اثر لیے بغیر اپنی کارروائی میں مصروف تھے اور مکان میں پھیل کر اس کے مختلف حصوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ صرف ان کی سربراہی کرنے والا کیتھرائن کے سر پر موجود تھا اور زہریلی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم تو ادھر رہتی ہی نہیں ہو میڈم۔ تم تو نرسنگ ہاسٹل میں رہتی ہو اور ادھر اپنے یار سے ملنے آتی ہو۔ ہم پکی خبر پر ہاسپٹل سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔''

''شٹ اپ......'' ''یار'' کا لفظ سن کر کیتھرائن کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر پولیس والے کو ڈپٹ دیا۔

''شٹ اپ کیسے ہوں۔ تمہیں داد تو دینی پڑے گی۔ اتنی سی لونڈیا نے پولیس کو چونا لگا دیا۔ مردہ خانے سے رین دادا کی ڈیڈ باڈی غائب کروا دی اور پھر ہمارے دوستوں کو قتل کرنے میں اس کے چیلوں کا ساتھ دیتی رہیں۔'' پولیس والے کے الفاظ نے کیتھرائن پر واضح کر دیا کہ وہ واقعی مکمل معلومات کے ساتھ یہاں پہنچے ہیں۔ صورتِ حال بالکل واضح تھی، ٹیکسی ڈرائیور، بھاٹیہ سیٹھ، مجو اور فیکے کی یکے بعد دیگرے ہونے والی اموات میں یہ بات مشترک تھی کہ ہر ایک کی انگلیاں کاٹی گئی تھیں۔ رین کی انگلیاں کاٹنے والوں کے لیے یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ رین کا انتقام لیا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے ٹیکسی ڈرائیور کی موت پر وہ زیادہ نہ چونکے ہوں لیکن بھاٹیہ سیٹھ کی لاش ملنے پر ان کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ رین کو ٹھکانے لگانے اور اس کے اڈوں کو تباہ کرنے کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جانے والوں کو بے چینی شروع ہو گئی اور سب سے پہلے انہوں نے کھوج لگائی ہوگی کہ رین کی لاش کدھر گئی۔ پولیس معلوم کرنے پر آئے تو سب معلوم کر لیتی ہے چنانچہ انہوں نے کیتھرائن کو درمیانی کڑی کے طور پر کھوج نکالا اور اس پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ نتیجے میں وہ اس کے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچ گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کل اس نے اس طرف کا رخ نہیں کیا ورنہ پولیس پہلے ہی پہنچ جاتی اور مجو اور فیکے کو انجام تک پہنچانے میں تاخیر ہو جاتی۔

''اندر کوئی نہیں ہے سر......بس کچھ مردانہ کپڑے اور جوتے وغیرہ ملے ہیں۔'' تلاشی کے لیے اندر کمروں میں جانے والوں نے آ کر اپنے سینئر کو اطلاع دی۔

''جب تو یہاں اکیلی ہے تو مردانہ کپڑے، جوتے کہاں سے آئے؟ بتا کدھر بھگایا ہے اپنے یار کو؟'' اطلاع سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی کی نوک کیتھرائن کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس پر دباؤ ڈالا۔ تکلیف سے اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکاری نکلی لیکن اس نے ہمت نہیں چھوڑی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''یہ میری ایک مسلم فرینڈ کا گھر ہے۔ وہ اس گھر کو میری کسٹڈی میں دے کر اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان مائیگریٹ کر گئی ہے۔ مے بی یا سیبل کہ ملنے والے کپڑے یا جوتے اس کے فادر اور برادر کے ہوں۔ میں یہاں صرف تھوڑی دیر کے لیے لک آفٹر کرنے آتی ہوں۔ آفٹر سم ٹائم پونا سے اس کے انکل یہاں آنے والے ہیں۔ وہ ہی اس

مکان کو دیکھیں گے۔'' اس کی باتوں میں کافی کچھ بنی برحقیقت بھی تھا۔

''بکواس بند کر۔ ہمارے جس بندے نے تیرا پیچھا کر کے انفارمیشن دی ہے، اس نے آزو بازو سے بھی معلوم کیا ہے۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ مکان میں تین چار بندے رہ رہے ہیں اور تو ادھر آتی جاتی رہتی ہے۔'' اس بار اس نے غصے میں کیتھرائن کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

''سر! لگتا ہے اس نے بندوں کو فرار کروا دیا ہے۔'' اس کے ایک ماتحت نے خیال آرائی کی۔

''پر کیسے؟ جب سے یہ ادھر آئی ہے، باہر ہمارا بندہ نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے کسی کو مکان سے نکلتے نہیں دیکھا۔ اس مکان کا کوئی دوسرا دروازہ ہے کیا؟'' وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ وہ ڈی ایس پی راٹھور کا خاص چمچہ راہول تھا جو اس کی ہدایت پر یہ کام کر رہا تھا۔ کامیابی کی صورت میں اس کے حصے میں ترقی یا کوئی دوسرا انعام آتا اس لیے وہ ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''دروازہ تو نہیں ہے سر پر چھت پر چڑھ کر بندہ فرار ہو سکتا ہے۔ بس چھت پر جانے کے لیے کوئی سیڑھی ویڑھی نہیں ہے تو پہلے ادھر دھیان نہیں گیا۔'' ماتحت نے شرمندہ سے لہجے میں کہا تو وہ مزید جھنجلا گیا اور حلق کے بل دہاڑا۔

''دیکھو حرام خورو! چھت پر جا کر دیکھو۔ اب تک تو وہ حرام زادے نکل گئے ہوں گے۔ اس لونڈیا نے باتوں میں لگا کر اتنا سے برباد کر دیا۔''

سپاہی تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ ادھر فاروق ابھی تک اوپر چھت پر ہی موجود تھا۔ چھت پر چڑھنے کے لیے انہوں نے لکڑی کی ایک سیڑھی استعمال کی تھی۔ سیڑھی مکان میں موجود تھی جو یقیناً اہلِ خانہ کبھی کبھار ضرور تا چھت پر جانے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے، ورنہ چھت تک جانے کا کوئی مستقل انتظام موجود نہیں تھا۔ سب ساتھیوں کے اوپر چڑھ جانے کے بعد فاروق نے احتیاطاً وہ سیڑھی اوپر کھینچ لی تھی کہ فوری طور پر کسی کی توجہ چھت کی طرف مبذول نہ ہو اور یہاں سے نکلنے کی ضرورت پڑے تو تھوڑی سی مہلت مل جائے۔ انہیں کیتھرائن کے اشارے کا انتظار تھا اور اشارہ فوراً ہی مل گیا۔ اس نے ''بھاگ جاؤ'' کے الفاظ استعمال کیے تھے جس کا مطلب تھا کہ پولیس ان ہی لوگوں کی تلاش میں وہاں آئی ہے۔ سامنے کے رخ سے اترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دائیں بائیں کے مکانات کی چھتیں اس مکان سے ملی ہوئی تھیں لیکن وہ سنگل اسٹوری مکانات تھے جن کی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

چھتوں پر کوئی باؤنڈری وال موجود نہیں تھی اور وہ نظروں میں آسکتے تھے۔ ایسے میں فاروق نے عقب کے دومنزلہ مکان کا انتخاب کیا۔ ان کے پاس سیڑھی تھی۔ سیڑھی کو اس مکان کی دیوار کے ساتھ لگایا گیا تو وہ لمبائی میں کچھ کم تھی لیکن ہاتھوں پر زور دے کر تھوڑی سی کوشش سے اوپر چڑھا جاسکتا تھا۔ اس نے پہلے وجے اور سجو کو اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور حکم دیا کہ اوپر چڑھتے ہی وہ لوگ محفوظ مقام کی تلاش میں بھاگ نکلیں، رک کر انتظار نہ کریں۔ وجے اور سجو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور یکے بعد دیگرے اوپر چڑھنے کے بعد ہاتھ ہلاکر فاروق اور گولو کو الوداع کہتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلے۔

ان دونوں کے بعد فاروق نے گولو کو سیڑھی چڑھنے کو کہا۔ وہ بھاری بدن اور چھوٹے قد کا قدرے ست لڑکا تھا جس نے کبھی اس طرح کا کام نہیں کیا تھا لیکن فاروق کے حکم سے انکار بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے جی کڑا کر کے سیڑھی پر قدم رکھ دیے اور ایک ایک کر کے اوپر چڑھتا آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں سے اسے چھت کی منڈیر تک ہاتھ لے جا کر بازوؤں کے بل اوپر چڑھنا تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنے چھوٹے قد کے باوجود ہاتھ منڈیر تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد اسے اپنے بازوؤں پر زور دے کر اوپر اٹھنا تھا۔ اس نے کوشش کی لیکن اس کے بازوؤں نے اس کے گول مٹول بھاری بدن کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ مسئلہ وزن کے علاوہ تکنیک کا بھی تھا۔ گولو کو اس طرح کے کاموں کی ذرا بھی مشق نہیں تھی۔ اصل میں اس کے اندر یہ سب سیکھنے کی صلاحیت واستعداد ہی نہیں تھی اس لیے وہ دبن کے اڈے پر رہ کر بھی بالکل کورا ہی تھا اور آج یہ چھوٹا سا کام بھی اس کے لیے ناممکن بن گیا تھا۔ دو تین بار کی کوشش کے بعد اس نے ہمت ہار دی اور فاروق کی طرف دیکھ کر منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''اپن سے نہیں چڑھا جاتا فاروق بھائی۔'' فاروق خود بھی سارا تماشا دیکھ رہا تھا اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ گولو خود سے اوپر نہیں چڑھ سکے گا اور اسے چڑھنے میں مدد دینا ہوگی۔ اس کے لیے ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی سیڑھی پر چڑھ جاتا اور نیچے سے گولو کو سہارا دے کر اسے اوپر دھکیلنے کی کوشش کرتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گولو صحیح توازن قائم کر کے سیڑھی چڑھنا بھی نہیں جانتا تھا اور لکڑی کی عام سی سیڑھی کو الٹ کر گرنے سے بچانے کے لیے فاروق سیڑھی کو پکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ ایسے میں اگر وہ خود سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو سیڑھی گولو اور اس کے سمیت الٹ کر گر جاتی۔ مجبوراً اسے گولو کو واپس نیچے آنے کا اشارہ کرنا پڑا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ اگر پولیس والے چھت کی طرف متوجہ ہوگئے تو ان کے فرار کی راہیں مسدود ہوجائیں گی۔

''پہلے میں اوپر جاتا ہوں۔ میرے بعد تم سیڑھی چڑھنا اور پھر میں اوپر سے ہاتھ دے کر تمہیں کھینچ لوں گا۔'' اس نے دھیمی آواز میں گولو کو سمجھایا اور خود پھرتی سے سیڑھی چڑھنے کے بعد اچھل کر چھت پر پہنچ گیا۔ اس موقع پر گولو نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ فاروق بھائی اس کے ہیرو تھے اور وہ ان کی ہر ادا پر نثار رہتا تھا۔ ایسے نازک وقت میں بھی وہ یہ تقابل کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ وجے اور سجو کے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت تک جانے میں ایسی مہارت اور چستی نہیں تھی جس کا فاروق بھائی نے مظاہرہ کیا تھا۔

''اوپر آجاؤ گولو۔'' اوپر سے فاروق نے دبی ہوئی آواز میں اسے پکارا تو اس نے تذبذب کے عالم میں پہلے قدمچے پر پیر رکھا۔ سیڑھی اس کے وزن سے ہلکی سی لرزی تو اس کے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا۔ پہلے فاروق نے سیڑھی کو پکڑا ہوا تھا اس لیے وہ بہ آسانی اوپر پہنچ گیا تھا۔ اب اس کے دل میں اندیشہ تھا کہ سیڑھی اس سمیت الٹ کر گر سکتی ہے اس لیے خوف بھی بڑھتا جارہا تھا۔

''شاباش گولو...... ہمت کرو۔ تم اوپر آسکتے ہو۔ دیکھو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' فاروق نے اس کی ہمت بندھائی تو وہ ایک ایک قدم جماتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ اس کا چڑھنا ایسا تھا جیسے کوئی بچہ چلنا سیکھ رہا ہو اور اس کے والدین اور خود اسے ہر قدم پر یہ دھڑکا لگا ہو کہ وہ گر جائے گا۔ فاروق کا دم بھی حلق میں اٹکا ہوا تھا اور وہ مسلسل اپنے دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ گولو بہ خیریت آخری سیڑھی تک پہنچ جائے تو وہ ہاتھ پکڑ کر کسی نہ کسی طرح اسے اوپر کھینچ لے گا۔ اس لمحے وہ وجے اور سجو کو فوراً بھگا دینے پر بھی دل میں پچھتا رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی یہاں پر موجود ہوتا تو اسے مدد مل سکتی تھی۔ بہر حال اب تو اسے قسمت اور دعا پر ہی تکیہ کرنا تھا۔ اس کی ہمت افزائی کے نتیجے میں گولو بھی اپنی بساط سے زیادہ ہی کوشش کر رہا تھا اور سیڑھی چڑھتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنا توازن قائم رکھے ہوئے تھا۔ وہ آخری قدمچے سے پہلے والے قدمچے پر تھا کہ فضا میں ایک کڑکتی ہوئی آواز گونجی۔

''اوئے رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔'' یہ کوئی پولیس والا تھا جس نے چھت کا جائزہ لینے کے لیے سامنے

والے وہ دومنزلہ مکان کا انتخاب کیا تھا اور وہاں سے سیڑھی چڑھتا گولو اور اوپر موجود فاروق اس کی نظروں میں آ گئے تھے۔ یہ وہ دور نہیں تھا کہ ہر پولیس والے کے پاس اسلحہ ہوتا لیکن راہول کی ماتحتی میں آنے والی یہ پارٹی مبینہ خطرناک قاتل کو پکڑنے کے لیے نکلی تھی اس لیے ان کے پاس دو عدد رائفلیں موجود تھیں اور ایک رائفل بردار سامنے والے مکان کی کھڑکی میں کھڑا انہیں للکار رہا تھا۔ اس کی للکار نے مشکل سے سیڑھی پر اپنا توازن قائم رکھے گولو کو سہما دیا اور اس کے قدم بری طرح ڈگمگا گئے۔ اس کی ڈگمگاہٹ نے لمحوں میں توازن بگاڑ ڈالا اور سارا کھیل ہی توازن کا تھا۔ سیڑھی لہراتی ہوئی نیچے کی طرف آنے لگی اور گولو کی اس پر سے گرفت ختم ہوگئی۔ پہلے وہ زوردار آواز کے ساتھ چھت پر گرا اور پھر سیڑھی اس کے اوپر آن گری۔ اس منظر کو دیکھتے فاروق کے حلق سے بے ساختہ ایک زوردار چیخ نکلی۔ دن کا وقت ہونے کے باعث وہ اتنے فاصلے سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ گرنے سے گولو کا سر پھٹ گیا ہے اور پھٹے ہوئے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا ہے۔

''میں آ رہا ہوں گولو۔ تم پریشان مت ہونا۔'' وہ گولو کو زخمی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے واپس چھت پر اترنے کا فیصلہ کیا۔ درمیانی فاصلہ زیادہ تھا اور سیڑھی گر چکی تھی۔ اسے چھلانگ لگا کر اتنی بلندی سے کودنا پڑتا اور اندازے کی ذرا سی غلطی خود اس کے لیے وبال بن جاتی اس لیے وہ جانچ کے لیے لمحہ بھر کو رکا مگر اس پل گولو نے حیرت انگیز ہمت کا مظاہرہ کیا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنے اوپر گرنے والے سیڑھی کو ایک طرف ہٹایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی اس پھرتی نے فاروق کو بھی دنگ کر دیا۔ وہ تو عام حالات میں بھی اتنی پھرتی سے کام نہیں لے پاتا تھا اور اب اتنی شدید زخمی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''آپ کو اپن کی قسم فاروق بھائی...... ادھر سے بھاگ جاؤ۔ آپ پکڑے گئے تو میرے بابا کو کون ڈھونڈ کر لائے گا۔'' اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے کو رنگ رہا تھا اور اس عالم میں بھی اسے فکر تھی کہ ربن کی تلاش کا عمل نہ رکے۔ اس کی یہ ہمت شاید للکارنے والے پولیس والے کو پسند نہیں آئی اور اس نے ''تیری تو......'' کہتے ہوئے اس معصوم کے جسم پر ایک گولی داغ دی۔ گولی اس کی پشت پر لگی اور وہ ایک ثانیے میں نیچے گر گیا۔ نیچے اترنے کا خواہاں فاروق اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اسی وقت فضا میں ایک اور فائر کی آواز گونجی۔ گولی اس کے کان کے بالکل قریب سے گزری تو اس کا سکتہ ٹوٹا۔ نیچے گرے گولو کے چہرے پر ابدی سکون تھا اور وہ اس بے رحم دنیا کو چھوڑ کر اس دنیا میں چلا گیا تھا جہاں اس کے بابا اسے اپنی بانہوں میں لینے کے لیے موجود تھے۔ وہ بابا کا دیوانہ زیادہ دن بھلا بابا سے جدا کیسے رہ سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آج کے بعد وہ فاروق بھائی کو بابا کا بول کر تنگ نہیں کرے گا اور صرف اللہ سے بابا کے لیے دعا مانگے گا۔ اس کی دعا کتنی تیزی سے قبول ہوئی تھی کہ فوراً اس کے اپنے بابا سے ملنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

فرطِ غم اور غصے سے تڑپ جانے والے فاروق نے اس کے خون آلود مردہ چہرے پر آخری نظر ڈالی اور تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ گولو اس کی مدد سے بے نیاز ہو گیا تھا لیکن اس کا مشن ابھی ادھورا تھا۔ قاتلوں کو انجام تک پہنچائے بغیر پولیس کے ہاتھ آنا تو دور کی بات، وہ مرنا بھی قبول نہیں کر سکتا تھا چنانچہ تیسری گولی چلی تو ضرور لیکن وہ اس کی زد سے نکل چکا تھا۔ گنجان آبادی والے بمبئی کے مکانات کی اونچی نیچی چھتیں اس کے قدموں کے لیے اڑن کھٹولا بنی ہوئی تھیں اور اسے پولیس والوں کی پہنچ سے بہت دور لے جا رہی تھیں۔ اگرچہ پولیس والوں نے تعاقب کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن بمبئی آج بھی فاروق پر مہربان تھا۔ اس بمبئی میں برسوں پہلے بھی اسے پناہ ملی تھی اور آج بھی وہ اسے اپنی حفاظت میں لیے ہوئے تھا۔ اسے بالکل فکر نہیں تھی کہ اس پناہ گاہ کے چھن جانے کے بعد وہ کہاں رہے گا۔ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر اپنے پاس موجود رقم وہ ہمیشہ لباس کے نیچے پہنی صدری میں محفوظ رکھتا تھا۔ اس کا چاقو بھی اس کی جیب میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا اس لیے اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دکھ تھا تو صرف گولو کا۔ ربن کے بعد وہ اس کے لاڈلے کی حفاظت نہیں کر سکا تھا اور وہ اس کی نظروں کے سامنے اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ خود اسے بھی تو گولو سے کم پیار نہیں تھا۔ بھاگتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں مسلسل گولو کی تصویر تھی۔ اس پر پروانہ وار نثار ہوتا گولو، اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا گولو، ذرا سی بات پر ناراض ہو جانے اور پھر فوراً مان جانے والا گولو...... کتنے سارے روپ تھے اس معصوم و بے ضرر سے گولو کے جو ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے خود بخود ہی آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ ان بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ گلی کوچوں میں جاتا تو لوگوں کی نظر میں آ جاتا چنانچہ جن چھتوں پر کودتا پھاندتا پھر رہا تھا، ان

ہی میں سے کسی کے نیچے پناہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے بعد مناسب مکان کے انتخاب پر غور کرنے لگا تو فوراً ہی ایک چھوٹا سا ایک منزلہ مکان نظروں میں آ گیا۔

مکان میں خاموشی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اہلِ خانہ غیر موجود ہوں۔ اگر کوئی ایک آدھ فرد موجود بھی ہوتا تو وہ اپنے چاقو کے بل پر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر سکتا تھا چنانچہ ذرا سی دیر تک گن لینے کے بعد آہستہ سے مکان کے صحن میں کود گیا۔ کودنے پر بہت معمولی سی آواز ابھری تھی اور اسے یقین تھا کہ اگر کوئی اندر موجود بھی ہوا تو متوجہ نہیں ہوا ہوگا۔ اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس نے چوکنی نظروں سے مکان کا جائزہ لیا۔ مکان صاف ستھرا تھا اور سامنے باورچی خانے کے دروازے سے اندر ترتیب سے رکھے دھلے ہوئے برتن نظر آ رہے تھے اس لیے یہ تو نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ مکان غیر آباد ہے، بس یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ مکین کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے پیچھے بند دروازوں میں سے ایک پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔ کمرا بیٹھک کے انداز میں سجا ہوا تھا اور وہاں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ اس نے دوسرے کمرے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور واپس پلٹا۔ اسی لمحے اسے ہلکا سا کھٹکا محسوس ہوا اور وہ بدک کر آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ چاقو پہلے ہی اس کے ہاتھ میں موجود تھا لیکن وہاں اس کے سامنے ایک اور چاقو بھی موجود تھا جو یقیناً اسی کے اوپر تنا ہوا تھا۔

☆☆☆

جولیٹ کے دل و دماغ سے انتقام کا خیال نہیں نکلا تھا۔ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو جی ہی اسی لیے رہی تھی کہ اپنے مجرم کو اس کے انجام سے دوچار کر کے اس جیسے ظالموں کو سبق دے گی کہ عورت کو کمزور سمجھ کر اس کی عزت سے کھلواڑ کرنے والے جان لیں کہ عورت اتنی بھی کمزور نہیں ہے اور خود کو پامال کرنے والے کو اس کے کیے کی سزا دینے کی طاقت رکھتی ہے لیکن انتقام کی اس خواہش میں وہ تاریخ کی جس دردناک ہجرت کا حصہ بن گئی تھی، اس نے اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کسی طرح ان خونی مناظر کو فراموش نہیں کر سکتی تھی جو اس نے یہاں آتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر اپنے ہم سفروں کی شکلیں گھومتی تھیں۔ ان لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سارے چہرے اس کے لیے انجان اور ناآشنا تھے لیکن ایک رشتہ انسانیت کا بھی تو ہوتا ہے اور بہ حیثیت انسان وہ ان کے ساتھ ہونے والے ظلم پر تڑپ اٹھی تھی۔ وہ

بے چارے کسی کا کیا بگاڑ کر جا رہے تھے۔ وہ تو خود اپنے بسے بسائے گھر، مال و متاع، عزیز واقارب سب چھوڑ کر مختصر اثاثوں کے ساتھ ایک نئے جہان کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف تھا، آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جلتے تھے، دل ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر جس منزل کی تلاش میں جا رہے ہیں، وہاں اپنے خوابوں کی تعبیر ملے گی یا وہ منزل پر پہنچ کر بھی تہی داماں رہ جائیں گے اور ایسے مظلوموں کو اتنی سفاکی اور درندگی سے نشانہ بنایا گیا تھا کہ انسانیت بلبلا کر رہ گئی تھی۔ وہ انسان تھی اور انسانیت کی اس تذلیل پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس خونی رات وہ بھی قاتلوں کی زد پر آ سکتی تھی لیکن قدرت نے بڑی مشاقی سے اس کی زندگی کی حفاظت کی تھی اور اسے بیگم آصفہ علی جیسی مہربان خاتون کی پناہ میں پہنچا دیا تھا تو کیا اس کا فرض نہیں بنتا تھا کہ وہ قدرت کی اس مہربانی کا قرض اتارنے کی کوشش کرے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ صرف کوشش کر سکتی ہے ورنہ مخلوق کے بس میں ہی نہیں کہ خالق کا قرض اتار سکے۔

اس حادثے میں جانی کی موت کی صورت وہ خود بھی بڑے نقصان سے دوچار ہوئی تھی اور اس کے پاس بچنے والا واحد بنیادی سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا لیکن اس موقع پر اس کی ہمت نے اسے ایک بار پھر سہارا دیا تھا۔ وہ جو اتنے بہت سے نقصانات کے بعد بھی ہر بار اٹھ کھڑی ہوتی تھی اس نقصان پر بھی صبر کر کے نئے عزم و ہمت سے کھڑی ہوگئی تھی اور اس بار اس نے فیصلہ کیا تھا کہ زندگی یونہی برباد کر دینے کے بجائے اس کا کچھ حصہ کسی کے کام آنے، کسی کا سہارا بننے اور درد بانٹنے میں بھی خرچ کیا جائے۔ اس نے بیگم آصفہ علی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ اسے کراچی بھجوا دیا جائے۔ اس خواہش کی بڑی وجہ تو یہی تھی کہ یہاں کے مقابلے میں کراچی میں ستم رسیدہ افراد کے قافلے بہت بڑی تعداد میں پہنچ رہے تھے اور وہاں امدادی کارکنوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ دوسرے لاشعور میں کہیں یہ بات بھی موجود تھی کہ دلدار آغا کراچی میں ہے اور اسے کبھی نہ کبھی اس کے انجام سے دوچار کرنے کے لیے اسے کراچی ضرور جانا ہے۔ بیگم آصفہ علی اسے اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش مند ہونے کے باوجود اس کے فیصلے کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی تھیں اور اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ جلد اس کے کراچی جانے کا انتظام کروا دیں گی۔ اس انتظام کے ہونے تک اس نے یہیں ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے

اس سے کہا بھی کہ وہ اتنے بڑے صدمے سے گزرنے کے باعث نڈھال ہے، چاہے تو کچھ عرصہ آرام کر لے لیکن اسے معلوم تھا کہ آرام اور فراغت اس کے لیے ذہنی اذیت کا باعث ہوگا اس لیے فوری طور پر ان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ سنایا تھا اور اب باقاعدگی کے ساتھ امدادی کیمپ جارہی تھی۔ وہاں ہر روز اسے نئی نئی الم ناک داستانیں سننے کو ملتی تھیں۔ ان مظلوموں کا دکھ بانٹتے ہوئے اسے اپنا دکھ کم لگنے لگتا تھا اور ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو یونہی برباد نہیں کررہی بلکہ انسانیت کا حق ادا کرتے ہوئے اپنی زندگی کو بامقصد بنارہی ہے۔ بیگم آصفہ علی نے تو اسے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ اگر وہ واپس بمبئی جانا چاہے تو وہ اس کا انتظام بھی کرسکتی ہیں لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ بمبئی میں اب اس کا کوئی خونی رشتہ موجود نہیں ہے اس لیے اسے وہاں واپس جانے کی بے چینی بھی نہیں ہے۔ اسے تو بس دکھی انسانیت کی خدمت ہی کرنی تھی تو انسان وہاں بھی تھے اور یہاں بھی..... تو یہیں رہنا بہتر تھا۔ یوں بھی اس کے اندازے کے مطابق یہاں مظلوموں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہجرت کا عمل بے شک دوطرفہ تھا لیکن جتنی بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کرکے پاکستان پہنچ رہے تھے، اس کے مقابلے میں یہاں سے جانے والے ہندوؤں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سو جولیٹ اسد اللہ اب لاہور میں تھی اور اس کی بیگم آصفہ علی کے دونوں بیٹوں سے بھی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں لڑکے کم عمر لیکن بہت..... پُرجوش اور متحرک تھے۔ بڑا عاکف تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا اور عمر انیس، بیس سال سے زیادہ نہیں تھی جبکہ چھوٹا عاقب فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور عمر لگ بھگ سترہ سال تھی۔ دونوں سے عموماً اس کی مغرب کے بعد ہی ملاقات ہوتی تھی کہ وہ سب تقریباً اسی وقت گھر واپس لوٹتے تھے۔ صبح سے نکل کر شام ڈھلے گھر آنے والے دونوں بھائی گھر آکر اپنی تھکاوٹ کا اظہار کرنے کے بجائے چھوٹے موٹے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ جولیٹ خود بھی بیگم آصفہ علی کی مدد کررہی ہوتی تھی، یوں ان کے درمیان گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

یہ آسودہ حال گھرانا تھا۔ گھر میں ملازمہ بھی موجود تھی لیکن شام کو اسے چھٹی دے دی جاتی تھی، یوں بھی بیگم آصفہ علی ملازمہ سے کھانا پکوانے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو اپنے خاندان کے افراد کے لیے ہمیشہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا چاہیے، اس سے ان کے درمیان محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ خیال ان کے اپنے گھر کی حد تک تو درست ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرنے والے لوگ تھے اور اس محبت کو دوسروں کے ساتھ بانٹنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ جولیٹ کو انہوں نے فوراً ہی اپنے خاندان کا حصہ بنالیا تھا اور اس سے یوں پیش آتے تھے جیسے وہ ہمیشہ سے ان کے ساتھ ہی رہتی آرہی ہو۔ گھر کے سربراہ یعنی بیگم آصفہ علی کے شوہر بھی ایک سنجیدہ، بردبار اور انسان دوست انسان تھے۔ اپنی ملازمت کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ بہت تاخیر سے گھر واپس آتے تھے اور کبھی کبھی نہیں بھی آتے تھے اس لیے جولیٹ سے ان کی بہت کم ہی ملاقات ہوپاتی تھی لیکن چند ملاقاتوں میں ہی اس نے انہیں بہت اچھا انسان پایا تھا اور محسوس کیا تھا کہ اس گھر کا جو ماحول ہے، اس میں بیگم آصفہ علی کے علاوہ سربراہ خانہ کا بھی خاصا دخل ہے بلکہ حقیقتاً ان کی ہدایات کی روشنی میں ہی گھر کا پورا انتظام چل رہا ہے۔ اس نفیس عادت و اطوار والے خاندان کا ساتھ مل جانے سے اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں بہت مدد ملی تھی اور اسے ان کے درمیان رہنا اچھا لگنے لگا تھا۔ آج بھی وہ بیگم آصفہ علی کے ساتھ واپس گھر آنے کے بعد حسب معمول باورچی خانے میں ان کا ہاتھ بٹارہی تھی۔ وہ آج بکرے کے گوشت کا پلاؤ بنارہی تھیں جو ان کے مطابق ان کے بیٹوں کا پسندیدہ کھانا تھا۔ دونوں لڑکے اچھا کھانے پینے کے شوقین تھے لیکن موجودہ مصروفیات کے باعث ماں کو بچوں کے پسندیدہ کھانے پکانے کا وقت نہیں مل پارہا تھا۔ انہوں نے شکوہ بھی نہیں کیا تھا لیکن ان کی ماں کو احساس تھا اسی لیے تھکی ہوئی ہونے کے باوجود آج انہوں نے ہمت کرلی اور پلاؤ بنانے کھڑی ہوگئیں۔ جولیٹ کو پلاؤ بنانا نہیں آتا تھا اس لیے اس نے میٹھا بنانے کی ذمے داری لے لی اور لوکی کا حلوا بنانے لگی، یہ حلوا وہ باقاعدہ طور پر پہلی بار بنارہی تھی۔ بچپن سے اس نے جوزفین کو یہ حلوا بناتے ہوئے دیکھا تھا اور کبھی کبھی اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بھی بٹادیتی تھی اس لیے بنانے کا آئیڈیا بہرحال تھا۔

عاکف اور عاقب نے بڑے شوق سے اسے لوکی کش کرکے دی اور اشتیاق سے اس اجنبی سویٹ ڈش کے تیار ہونے کا انتظار کرتے ہوئے باتوں باتوں میں سلاد اور رائتا تیار کرڈالا۔ خوشگوار ماحول میں تیار ہونے والا کھانا بہت شوق سے تناول کیا گیا۔ خصوصاً جولیٹ کی کاوش کو بے

حد سراہا گیا۔ ان کی بے شمار تعریفوں پر جولیٹ تھوڑا سا کھسیا بھی گئی کہ اس کا اندازہ تھا اس نے حلوا اتنے مزے کا نہیں بنایا ہے، جتنے مزے کا حلوا جوزفین بناتی تھی۔ بہرحال اس دن کا اختتام اس کے لیے خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ یادوں کی یلغار لے کر بھی آیا تھا۔ اسے جوزفین اور جوزف کے ساتھ چھوٹے سے گھر میں بیتا بچپن ولڑکپن بے طرح یاد آنے کے علاوہ اسد اللہ کی شفقت کے سائے میں گزارے چند دن بھی شدت سے یاد آتے چلے گئے اور مزاج کی خوشگواریت پر یاسیت کے رنگ چھانے لگے۔ خود کو اس کیفیت سے نکالنے کے لیے وہ اپنے مخصوص کمرے سے نکل کر چھوٹے سے لان میں پہنچ گئی۔ آج چاند کی بارھویں تھی، سو چاند خوب روشن تھا اور لان کی روشنیاں گل ہونے کے باوجود منظر اتنا غیر واضح نہیں تھا۔ اس نے بھی دیکھ لیا کہ دونوں بھائی ایک گوشے میں بیٹھے ایک دوسرے سے راز و نیاز میں مصروف ہیں۔ اسے اس وقت ان کی یہاں موجودگی پر تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کیونکہ اسے علم تھا کہ رات کے کھانے کے بعد کا وقت وہ اپنی پڑھائی کو دیتے ہیں اور مصروفیات کے باوجود تعلیمی میدان میں نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حیرت کے ساتھ ہی اسے تھوڑی سی شرارت بھی سوجھی اور وہ چپکے سے انہیں ڈرانے کے ارادے سے دبے قدموں ان کی طرف بڑھی۔ وہ جہاں بیٹھے تھے، وہاں قریب ہی چوڑے تنے والا ایک آم کا پیڑ تھا۔ جولیٹ اس پیڑ کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ ارادہ تھا کہ یکدم ہی پیچھے سے نکل کر انہیں ڈرائے گی لیکن عاقب کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ دونوں بھائیوں کی عمروں میں دو ڈھائی سال کا ہی فرق تھا اس لیے وہ آپس میں بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔ اس وقت بھی عاقب بے تکلفی سے عاکف سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا۔

''تم جس چکر میں پڑ گئے ہو وہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے بڑے بھائی! آخر اتنی بڑی بات کب تک چھپ پائے گی۔ وہ لڑکی ہے کوئی بے جان گڑیا نہیں کہ تم اسے کسی صندوقچی میں بند کر کے رکھ دو گے اور کسی کو اس کے بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ جس دن بھی بھانڈا پھوٹ گیا، تم برے پھنسو گے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن کیا کروں یار...... میرا اپنے دل پر اختیار ختم ہوگیا ہے۔ میں اسے کسی طرح کھونا نہیں چاہتا۔'' عاکف کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''لیکن یہ تو اس بے چاری کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اپنے پورے خاندان سے کٹ کر وہ یہاں اکیلی کیسے رہے گی۔ وہ اپنے لوگوں میں جانا چاہتی ہوگی۔'' عاقب چھوٹا ہونے کے باوجود بڑے بھائی کو بردباری سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ اس کے گھر کے افراد ختم ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی بچا بھی ہے تو اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ایسے میں وہ جانا بھی چاہے گی تو کہاں جائے گی۔''

''کوئی تو ہوگا اس کا۔ ننھیال ددھیال میں سے کوئی قریبی عزیز؟'' عاقب نے جرح کی۔

''ننھیال کا بتا رہی تھی کہ بھوپال میں ہے لیکن اسے صحیح اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ بہت بچپن میں کبھی وہاں گئی تھی بعد میں جانا نہیں ہوا۔ اب تم بتاؤ ایسے میں، میں اکیلی لڑکی کو کہاں اور کیسے بھجواؤں۔'' عاکف شدید جذباتی کشمکش کا شکار معلوم ہوتا تھا۔

''کسی ریلیف کیمپ تک پہنچا دو، وہ لوگ خود ہی اس کا کوئی انتظام کر دیں گے۔'' عاقب نے مشورہ دیا۔

''نہیں یار! وہاں کا کچھ معلوم نہیں ہے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ کئی کالی بھیڑیں بھی گھسی ہوئی ہیں۔ کسی غلط بندے کے ہاتھ لگ گئی تو بے چاری کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔'' عاکف نے فوراً انکار کر دیا۔

''تو امی کو بتا دو۔ امی، ابو سے کہہ کر اس کا کوئی اچھا انتظام کر دیں گی۔'' اب عاقب کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن میں کیا کروں گا؟ وہ چلی گئی تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جائے گی۔'' عاکف کا انداز کھویا کھویا سا تھا اور گفتگو شاید دوبارہ اسی مقام پر آ گئی تھی جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ جولیٹ نے اب مزید چھپے رہنا مناسب نہ سمجھا اور تنے کے پیچھے سے نکل کر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''آپ...... آپ کب آئیں یہاں؟'' اسے سامنے پا کر دونوں بھائی بوکھلا گئے۔

''میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے کیا؟'' جولیٹ نے بھویں اچکا کر دونوں کے ہونق چہروں کی طرف دیکھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس آپ کو بالکل اچانک سامنے پا کر ہمیں تھوڑا سا جھٹکا لگا۔'' چھوٹے عاقب نے سنبھل کر بات بنائی۔

''جھٹکا لگانے کے ارادے سے ہی میں چپکے سے یہاں آئی تھی لیکن خود مجھے اچھا خاصا جھٹکا لگا ہے اور احساس ہورہا ہے کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ چل رہی ہے اس لیے اچھا ہوگا کہ تم دونوں اچھے بچوں کی طرح مجھے ساری بات تفصیل سے بتادو تاکہ میں تمہیں کوئی بہتر مشورہ دے سکوں۔'' وہ خود بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور روئے سخن عاکف کی طرف کرلیا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا پھر گویا جولیٹ کو سب کچھ بتادینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنا سراوپر اٹھایا اور بولا۔

''امی جان آپ کو اپنی بیٹی بنا کر اس گھر میں لائی ہیں اور ہم بھائیوں کو بھی آپ کی شکل میں اپنی شہید بہن کی شکل دکھائی دیتی ہے اس لیے میں آپ کو اپنا مسئلہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ بات کچھ یوں ہے کہ......'' اس نے لحاتی توقف کیا اور پھر روانی سے بتانے لگا۔

''میرا ایک کالج فیلو جو کسی دیہات کا رہنے والا ہے اور اس کے ابا اپنے گاؤں کے پٹواری ہیں، یہاں ایک ہندو تاجر کی کوٹھی میں بطور کرائے دار رہ رہا تھا۔ کرائے دار بھی کیا سمجھیں، مفت میں ہی رہ رہا تھا۔ اصل میں اس ہندو تاجر کی اس کے گاؤں کے چودھری سے گہری دوستی تھی اور چودھری صاحب نے ہی سفارش کی تھی کہ پٹواری کا لڑکا پڑھنے کے لیے لاہور آرہا ہے، اسے رہنے کا مسئلہ ہوگا تم اسے اپنی کوٹھی کی انیکسی میں ایک کمرا دے دو۔ بدلے میں لڑکا تمہارا حساب کتاب وغیرہ دیکھ لے گا۔ تاجر کا بنیا تھا لیکن چودھری صاحب کو بہ وجہ دوستی انکار نہیں کرسکتا تھا لیکن میرے دوست کے مطابق اس بنیے کو اپنی انیکسی کے کمرے کا کرایہ کھرا کرنے کے سو طریقے آتے تھے۔ وہ حساب کتاب کا کام تو اس سے جو لیتا تھا، سو لیتا تھا اس کے علاوہ بھی ڈھیروں ذمے داریاں اس کے سر ڈال رکھی تھیں۔ سودا سلف لانے، بجلی، گیس اور ٹیلیفون کے بل جمع کروانے اور لان کی گھاس کاٹنے جیسے کئی کام اس نے میرے دوست کے ذمے لگا رکھے تھے اور مجبوراً وہ یہ سب کررہا تھا۔ تقسیم کا فیصلہ ہوا تو ہندو تاجر نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کرکے یہاں موجود اپنے سارے اثاثے بیچنا شروع کردیے اور بڑی کامیابی سے اپنی ساری دولت منتقل کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ بس اس نے اپنی رہائشی کوٹھی نہیں بیچی تھی کہ جانے سے پہلے عین وقت پر سودا کرے گا لیکن جب حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو اس کی بیوی گھبرا گئی اور بولی کہ آگ میں ڈالو کوٹھی کو... اگر میرے بچوں کو کچھ ہوگیا تو تم ساری دولت خرچ کرکے بھی اس نقصان کو پورا نہیں کرپاؤ گے۔ تاجر کی سمجھ میں بیوی کی بات آگئی اور اس نے رخت سفر باندھ لیا لیکن بھری ہوئی کوٹھی کو ایسے چھوڑ کر جاتے ہوئے بھی اس کا دل دکھ رہا تھا چنانچہ روانگی سے قبل اس نے میرے کالج فیلو کو اپنے پاس بلا کر اس سے کہا کہ فی الحال تو میں حالات کی خرابی کی وجہ سے یہاں سے جارہا ہوں لیکن جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے، واپس یہاں آؤں گا اور کوٹھی کا سودا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس عرصے میں تم یہیں رہتے رہو۔ تمہاری رہائش کا مسئلہ بھی نہیں ہوگا اور میری کوٹھی کی دیکھ بھال بھی ہوجائے گی۔ میرے دوست نے اسے تسلی دی کہ آپ بے فکر ہوکر جائیں، میں اس کوٹھی کو اپنی کوٹھی سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کروں گا اور تاجر کے جانے کے بعد اس نے کوٹھی کو سچ مچ اپنا سمجھنا شروع کردیا پھر اسے خیال آیا کہ صرف سمجھ لینے سے کام نہیں چلے گا قانونی طور پر بھی کوٹھی کو اپنے نام لکھوانا پڑے گا تاکہ کل کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اس کے خیال میں اس کے ابا جو گاؤں کے پٹواری تھے، اس مسئلے کو زیادہ بہتر طریقے سے حل کرسکتے تھے چنانچہ وہ ابا سے مشورہ لینے اور ان کو یہاں لاکر کارروائی شروع کروانے کے ارادے سے گاؤں روانہ ہوگیا اور مجھے دوستوں میں سب سے قابل بھروسا جان کر میرے ذمے یہ کام لگا گیا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں روزانہ کوٹھی کا چکر لگالیا کروں۔ دوستی اور مروت میں، میں نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی۔ میرا وہاں پر دوسرا ہی چکر تھا کہ میں وہاں لان میں ایک لڑکی کو بے ہوش پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سولہ سترہ سال کی وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی لیکن اس کی حالت خاصی خراب ہورہی تھی۔ کپڑے ایک دو جگہ سے پھٹ گئے تھے اور پیر زخمی تھے۔ میں اسے اٹھا کر اپنے دوست کے کمرے میں لے گیا اور پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لایا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے چیخنا شروع کردیا۔ وہ مجھے کوئی دشمن سمجھ رہی تھی جسے مارنا بھی چاہتی تھی اور جس سے ڈر بھی رہی تھی۔ سمجھیں ہسٹریا کی سی کیفیت کا شکار تھی۔ میں بڑی مشکل سے اسے قابو میں لانے میں کامیاب ہوسکا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کوٹھی کے ساتھ والی کوٹھی بھی خالی پڑی تھی اس لیے اس کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر کوئی متوجہ نہیں ہوا۔ اس نے چیخنا بند کیا تو بہت دیر تک روتی رہی پھر میرا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر خود پر بیتی سنانے کو تیار ہوگئی۔

''اس نے بتایا کہ وہ اپنے پتا، ماتا اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ ہندوؤں کے ایک محلے میں رہتی تھی۔ وہ غریب

آبادی تھی اور بہت کم ہی گھرانے ایسے تھے جنہوں نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے ماتا پتا بھی تین لڑکیوں کو لے کر کہیں جانے کے حق میں نہیں تھے اور انہیں لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں زیادہ محفوظ ہیں لیکن آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہاں سرحد کے پار مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم وستم ہو رہے ہیں، اس کا ردِعمل یہاں بھی دیکھنے میں آ رہا ہے۔ خصوصاً جن کے قریبی رشتے دار نشانہ بنے ہیں، وہ تو بہت ہی غصے میں ہیں۔ ہمیں بھی جب اپنی بہن اور بہنوئی کی پورے خاندان سمیت شہادت کی اطلاع ملی تھی تو ہم بھی طیش میں آ گئے تھے اور ہمارا بھی دل یہی چاہتا تھا کہ یہاں موجود ہندوؤں کو اسی طرح مار ڈالیں جیسے وہاں ہمارے پیاروں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ غم وغصے کی اس کیفیت میں اگر ابا اور امی جان ہمیں قابو میں نہ رکھتے اور ہمیں مثبت طرزِعمل اپنانے کی نصیحت نہ کرتے تو ہم بھی انتقامی ردِعمل کا مظاہرہ کرتے۔ اس لڑکی انجلی کا خاندان بھی ایسے ہی دل جلے کی زد میں آ گیا۔ رات گئے ان کے محلے پر حملہ کیا گیا اور گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ انجلی اس آگ میں سے پتا نہیں کیسے بچ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی اور وحشت کے عالم میں بے سمت بھاگتی ہوئی اس کوٹھی تک پہنچ گئی۔ خوف اور جان بچانے کی جبلی خواہش نے اسے لوہے کے جنگلے والا گیٹ پھلانگ کر کوٹھی کے لان میں پہنچا دیا اور وہ جو شاید بہت تھک گئی تھی خود کو محفوظ پا کر ساری ہمت کھو بیٹھی اور بے ہوش ہوگئی۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ گھبرائے نہیں، میں خود اس کے گھر والوں کا پتا کروں گا۔ امی نے اس روز مجھے جو لنچ باندھ کر دیا تھا، وہ میں نے زبردستی اسے تھوڑا سا کھانے پر راضی کیا اور اس سے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر کے اسے ڈھیروں تسلیاں دے کر ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے پہنچ گیا لیکن وہاں تو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ پورے محلے میں تباہی و بربادی کی داستانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن کی جلی ہوئی لاشیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ دوسری بہن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ ناقابلِ شناخت لاشوں میں شامل ہے یا اسی کی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ میں یہ ساری معلومات جمع کر کے واپس اس کے پاس پہنچا تو وہ آنکھوں میں ڈھیروں امیدیں لیے میری منتظر بیٹھی تھی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ اسے حقیقت بتا سکوں۔ میں نے اس سے یہی کہا کہ اس کے ماں باپ اور بہنیں بھی اسی کی طرح آگ سے بچ کر بھاگ

نکلے تھے لیکن فی الحال ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں۔ چار دن سے میں اسے ایسے ہی بہلا رہا ہوں۔ روزانہ کالج جانے سے پہلے اس کے پاس جاتا ہوں۔ اپنا لنچ زبردستی اسے کھلاتا ہوں۔ ڈبل روٹی اور پھل فروٹ بھی اس کے پاس پہنچا رکھے ہیں کہ جس وقت اسے بھوک لگے، وہ کھا لے لیکن وہ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی ہیں۔ بس یہی کہتی ہے کہ اپنے گھر والوں کے پاس جانا ہے اور میں اسے سچ نہیں بتا پاتا۔ پرسوں میرا دوست اپنے والد کو لے کر گاؤں سے واپس آ جائے گا اس لیے میرے سامنے یہ مسئلہ بھی ہے کہ کل کے بعد میں اسے کہاں رکھوں گا۔ عاقب کا خیال ہے کہ مجھے اسے کسی ریلیف کیمپ بھجوا دینا چاہیے لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ اتنی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کے لیے ہر جگہ ہی بہت خطرہ ہوتا ہے اور میرا دل اسے کسی خطرے میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔'' اس نے ایک سانس میں جولیٹ کو پورا قصہ سنایا اور پھر خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔

''خطرے میں تو وہ اب بھی ہے مائی برادر! تم اسے ایک خالی کوٹھی میں بالکل تنہا چھوڑ کر کس طرح محفوظ سمجھ رہے ہو؟ جس طرح کے حالات ہیں اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی کوٹھی کو خالی جان کر اس پر قبضہ کرنے آ سکتا ہے۔ کسی کو وہاں لڑکی کی موجودگی کی بھنک پڑ گئی تو معاملہ اور بھی سیریس ہو جائے گا یا فرض کرو کہ تمہارا دوست ہی وقت سے پہلے واپس آ گیا تو کیا ہوگا۔ جو آدمی کسی کی کوٹھی پر چالاکی سے قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کے کریکٹر کو تو ویسے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔'' جولیٹ نے نرم لہجے میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، بس مجھ سے جذبات میں غلطی ہوگئی۔ وہ پہلے ہی دن مجھے اتنی اچھی لگی کہ میرا دل اسے کہیں بھیجنے کو راضی نہیں ہوا۔'' عاکف نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

''حالانکہ تمہیں چاہیے تھا کہ فوری طور پر آصفہ آنٹی کو اس بارے میں انفارم کرتے۔''

''ہاں۔ بس مجھے لگا کہ امی اسے کسی ریلیف کیمپ بھجوا دیں گی یا کسی طرح بھوپال، اس کے ننھیال بھجوانے کی کوشش کریں گی اس لیے میں نے ان سے بھی کچھ نہیں کہا۔'' اس کا سر کسی مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا۔ جولیٹ کو اس پر کسی چھوٹے سے بچے کا گمان ہوا اور دل میں محبت کا دھارا سا

پھوٹا۔ اصل میں وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا تھا جو بہت عجیب سے حالات میں بالکل اچانک محبت جیسے جذبے میں مبتلا ہو گیا تھا اور جیسے کوئی بچہ اپنا من پسند کھلونا چھن جانے سے ڈرتا ہے، وہ بھی اس لڑکی انجلی کے خود سے دور چلے جانے کے خیال سے خوف زدہ تھا۔ حالانکہ اس کے پاس اسے رکھنے کے لیے کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ ابھی اس نے انجلی کو دوست کی قیام گاہ پر چھپا رکھا تھا اور اس مسئلے کی وجہ سے بھی پریشان تھا کہ کل دوست واپس آ گیا تو اسے کہاں لے جائے گا۔ ایک انیس بیس سال کا لڑکا جو ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور خود اپنی ذات کے لیے ماں باپ پر انحصار کرتا تھا کسی نوجوان لڑکی کی ذمے داری اٹھانے کا متحمل کس طرح ہو سکتا تھا۔ یقیناً خود اسے بھی ان سب باتوں کا ادراک تھا لیکن قلبی جذبات کی وجہ سے کوئی مناسب فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا۔

''میری بات مانو عاکف..... آصفہ آنٹی کو اس لڑکی کے بارے میں بتا دو۔ تمہاری امی بہت معاملہ فہم اور ہمدرد خاتون ہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے کہ انہوں نے کس طرح مجھے اپنے گھر میں جگہ دے رکھی ہے۔ وہ انجلی کے لیے بھی گنجائش نکال لیں گی۔ وہ یہاں سب لوگوں کے درمیان رہے گی تو اسے خود کو سنبھالنے میں مدد ملے گی اور اس وقت اسے اس کے گھر والوں کے بارے میں حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ تم اسے ساری زندگی جھوٹ سے نہیں بہلا سکتے۔ اسے ایک بار سچ کو جھیل لینے دو اور پھر وہ صدمے سے نکل آئے تو اسے اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کی آزادی دو۔ وہ بھوپال اپنے ننھیال جانے کی خواہش کرے تو تمہیں اسے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری بات کو غور سے سنو مائی برادر! محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ یہ بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے اور جو محبت کرتے ہیں انہیں سب سے پہلے اپنا ظرف بڑا کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی خود سے زیادہ انجلی کا سوچنا چاہیے۔ تم یہ مت سوچو کہ وہ چلی گئی تو اس کی جدائی تمہیں تکلیف دے گی بلکہ یہ سوچو کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے اور تم اس کی تکلیف کم کرنے میں کیا رول ادا کر سکتے ہو۔'' جولیٹ بہت نرمی سے سمجھا رہی تھی اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس کی باتوں سے قائل ہو رہا ہے۔

''اب تم بتاؤ کہ کیا میں آصفہ آنٹی سے بات کر لوں؟ ان کی اجازت سے کل تم اسے اپنے ساتھ گھر لے آنا بلکہ میں خود تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ٹھیک ہے؟'' عاکف کو قائل دیکھ کر اس نے اس سے پوچھا۔

''او کے آپی! جو آپ کو صحیح لگے آپ وہ کریں۔'' اس نے جولیٹ کو کلی اختیار دے دیا۔

''بس تو پھر ہم کل صبح اسے لینے چلیں گے۔ میں اس کے لیے کپڑے وغیرہ بھی ساتھ لے لوں گی۔ چار دن میں تو اس بے چاری کا حال خراب ہو گیا ہوگا۔''

''کپڑے ہیں اس کے پاس آپی! میں نے باجی کے دو سوٹ اسے لے کر جا کر دیے تھے۔'' عاکف نے مرحومہ بہن کے حوالے سے اپنی کارگزاری بیان کی تو جولیٹ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔ موصوف اپنی عقل سمجھ کے مطابق انجلی کا پورا خیال رکھ رہے تھے اور اپنے طور پر اس کی مکمل ذمے داری اٹھا رکھی تھی۔

''اچھی بات ہے۔ بس پھر کل ہم اسے یہاں لے کر آ جائیں گے۔ اب تم دونوں جا کر اپنے کمرے میں سو جاؤ۔ اگر آنٹی نے اس وقت تم لوگوں کو یہاں دیکھ لیا تو پریشان ہو جائیں گی۔'' اس نے ان دونوں کو ہدایت کی اور خود بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''تھینک یو آپی! تھینک یو سوچ کہ آپ نے عاکف کو کنوینس کر لیا ورنہ میری تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کرے گا۔'' پوری گفتگو کے دوران خاموش رہنے والے عاقب نے بہت خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تھینک یو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں چھوٹو لیکن اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ اپنے بڑوں سے کچھ بھی نہ چھپاؤ، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، الٹا نقصان ہوتا ہے اور انسان اس مفید مشورے سے محروم ہو جاتا ہے جو وہ اپنے تجربے کی روشنی میں دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے زیادہ اچھے اور درست نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔'' اس نے بہت خلوص سے مشورہ دیا اور پھر تینوں ایک دوسرے کو گڈ نائٹ کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔ اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف جاتی ہوئی جولیٹ کی ذہنی کیفیت بالکل بدل چکی تھی اور اب اس یاسیت کا کہیں نام و نشان نہیں تھا جس سے گھبرا کر اس نے لان کا رخ کیا تھا۔ اس وقت وہ صرف عاکف کے مسئلے پر سوچ رہی تھی اور اپنے ذہن میں وہ الفاظ مرتب کر رہی تھی جن کا صبح اسے بیگم آصفہ علی کو قائل کرنے کے لیے استعمال کرنا تھا۔ فیملی لائف گزارنے میں یہی ہوتا ہے۔ انسان خود کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ پاتا بلکہ اپنے اردگرد والوں کے بارے میں بھی سوچتا ہے اور صرف اپنی ذات سے ہٹ کر

کسی اور کے اچھے بُرے کے بارے میں فکر کرنا اپنی جگہ خود ایک ایسا مثبت طرزِ عمل ہے جو انسان کو اندرونی سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔ جولیٹ بھی اسی سکون اور طمانیت کو محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

کھلے چاقو آمنے سامنے تھے اور دونوں ہی فریق وار کرنے کے لیے بالکل تیار بھی تھے لیکن دونوں میں سے ایک بھی اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دے سکا اور آنکھوں میں حیرت لیے دونوں ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔ حیرت کے فوری جھٹکے سے سنبھلے تو تڑپ کر ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ کسی اپنے کا قرب پا کر فاروق کا دل رقیق مادہ بن گیا اور آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ ربن کے جانے کا دکھ ہی کیا کم تھا کہ اسے گولو کی جدائی بھی سہنی پڑی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اپنے پیچھے اس کی خون میں رنگی لاش چھوڑ کر آیا تھا پھر رامو کے گلے لگنے کے بعد خود کو قابو میں کیسے رکھ پاتا۔ ہاں، وہ رامو ہی تھا۔ ربن کا دست راست جو ربن کے سب سے زیادہ قریب تھا، جس پر ربن سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا اور جس کی صلاحیتوں پر اسے اتنا اعتماد تھا کہ مجو والا اڈا اپنے نام کر لینے کے بعد اس نے اس اڈے کی چوکی عملاً رامو کے حوالے کر رکھی تھی۔ رامو اس اڈے کے معاملات کو بڑے اچھے طریقے سے دیکھ رہا تھا لیکن اس دن پولیس نے بیک وقت دونوں اڈوں پر اتنی اچانک ریڈ کیا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ بہت سے گرفتار ہو گئے اور جن کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا، وہ کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ رہے۔ رامو کی اس چھوٹے سے گھر میں موجودگی کا مطلب تھا کہ اسے بھی بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا تھا اور وہ یہاں چھپا بیٹھا تھا۔ فاروق کو سامنے پا کر اس نے اسے بہت جوش و جذبات میں گلے لگایا تھا اور اس کے دل میں بھی اپنے پیارے کو سامنے پا کر گداز پیدا ہوا تھا جو آنکھوں میں ہلکی سی نمی لے آیا تھا لیکن فاروق کی تو حالت ہی جدا تھی۔ وہ ایسے رو رہا تھا جیسے کسی بہت عظیم نقصان سے دوچار ہو گیا ہو۔ رامو پہلے تو اس کی پیٹھ کو تسلی آمیز انداز میں تھپکتا رہا پھر چونک گیا اور اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے شہزادے! تو ایسے کیوں روتا ہے؟ اپن اتنے برسوں سے تیرے کو جانتا ہے، تو کسی مشکل یا پریشانی میں پہلے کبھی تو ایسے بھبک کر نہیں رویا۔'' فاروق جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اس سے چمٹ گیا اور پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگا۔ رویا وہ پہلے بھی تھا، غم گسار اسے پہلے بھی ملے تھے لیکن رامو کی بات جدا تھی۔ کیتھرائن اور وجے کے سامنے اپنا غم مناتے اسے کہیں نہ کہیں یہ خیال تھا کہ ربن کے بعد وہ ان کی سرپرستی کا ذمے دار ہے اور اسے ان کے سامنے ٹوٹ کر بکھرنا نہیں چاہیے لیکن رامو کی تو اپنی حیثیت سرپرست کی تھی۔ وہ ربن کا دستِ راست اور رمز شناس تھا تو فاروق بھی ربن کے بعد اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ ربن کے بعد وہی تھا جو اس کے لیے سرپرست اور بزرگ کی حیثیت رکھتا تھا اور چھوٹے اپنے بڑوں کے سامنے ہی تو اپنے دکھ، درد اور غم کا اظہار کرتے ہیں، سو وہ بھی کھل کر رو رہا تھا۔

''کیا کرتا ہے فاروق استاد۔ تو ایسے روتا رہا تو اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اپنے کو بتا کہ تجھ پر کیا بیتی۔ اپن تیرے کو دکھ دینے والوں کو بھی چین سے نہیں رہنے دے گا۔'' اس بار اس نے فاروق کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس کے جھنجوڑنے پر فاروق کو تھوڑا سا ہوش آیا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رامو نے اسے تھام کر اسی بیٹھک نما کمرے میں رکھے ریگزین چڑھے اسپرنگ والے صوفے پر بٹھایا اور خود پلٹ کر باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سلور کا نقشین گلاس تھا۔ اس نے گلاس فاروق کے ہونٹوں سے لگا کر اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ فاروق صرف ایک گھونٹ پانی ہی پی سکا لیکن اس ایک گھونٹ نے ہی اثر دکھایا اور اندر سے امڈ کر آتے آنسوؤں کے سمندر کو قابو میں رکھنے میں اس کا مددگار ثابت ہوا۔

''اب بتا کہ کیا ہوا؟ تو تو لندن جاتا تھا نا۔ دادا نے تیرے جانے کا سارا انتجام (انتظام) بھی کر دیا تھا پھر تو ادھر بمبئی میں کدھر گھومتا پھرتا ہے۔'' رامو گلاس ایک تپائی پر رکھ کر خود بھی صوفے پر اس کے برابر میں آ بیٹھا اور نرمی سے پوچھنے لگا۔

''کیا بتاؤں کہ کیا ہوا ہے؟ ایک تیر سا ہے جو سینے میں گڑا ہے یا پھر نشتر ہے جو روح پر چلتا ہے اور میں درد سے تڑپتا سوچے جاتا ہوں کہ میں کیسے زندہ ہوں۔ زندہ ہوں بھی یا نہیں؟'' فاروق نے اپنا چہرہ اپنے ہی بازوؤں میں چھپا لیا۔

''ادھر تو سب ٹھیک ہے۔ اپن کا مطلب ہے جولی ...... جولیٹ تو ٹھیک ہے نا؟'' رامو کے ذہن میں یہی آیا کہ فاروق کی یہ حالت جولیٹ کے کسی مسئلے کی وجہ سے ہے اس

لیے ذرا جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اس کی بات نہیں ہے استاد۔ ساری گڑبڑ تو اپنی طرف ہی ہے۔'' فاروق کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔

''تو کیا ہوا؟ ایسی اونچ نیچ تو اپنے دھندے میں ہوتی رہتی ہے۔ ایسے چھاپوں اور گرفتاریوں سے پولیس اپن کا کیا اکھاڑ لے گی۔ تھوڑے سے دن کی پریشانی ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رامو نے اسے تسلی دی۔

''سب کیسے ٹھیک ہوگا...... ٹھیک کرنے والا ہی نہیں رہا تو کون ٹھیک کرے گا؟'' فاروق کی آواز سینے میں گھٹنے لگی اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا۔

''کیا مطلب...... کیا بولتا ہے فاروق استاد۔'' رامو بے طرح چونکا اور ایک بار پھر فاروق کو جھنجوڑ ڈالا۔ فاروق کے جملے کا جو مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تھا، وہ اسے سمجھنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھا۔

''دادا نہیں رہا استاد! اپنا ربن دادا اس دنیا میں نہیں رہا۔'' فاروق سچ بتانے پر مجبور تھا جس کے ردِعمل میں رامو کو ایک زوردار جھٹکا سا لگا اور وہ کرنٹ کھائے ہوئے شخص کی طرح اچھل کر پیچھے ہٹا۔ فاروق کے لیے اس کا یہ ردِعمل متوقع تھا چنانچہ سر جھکائے سب کچھ رامو کے گوش گزار کرتا چلا گیا۔ وہ بے یقینی سے سب سنتا رہا۔ فاروق نے داستان ربن کے مرنے سے آگے بھی جاری رکھی۔ اپنی انتقامی کارروائیوں سے لے کر اپنے ٹھکانے پر پولیس کی ریڈ تک وہ ہر بات روانی سے بتاتا چلا گیا لیکن جب داستان گولو کی موت تک پہنچی تو وہ ایک بار پھر تڑپ کر رونے لگا۔ رامو ساری داستان سنتا کسی سکتہ زدہ آدمی کی طرح بیٹھا تھا اور یوں فاروق کی شکل دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ یہ بھی بھلا یقین کرنے کی بات تھی کہ ربن اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ٹھیک ہے کہ موت سے کسی بشر کو چھٹکارا نہیں ہے اور جو اس دنیا میں آیا ہے اسے واپس بھی جانا ہے لیکن ربن...... ربن کیسے یوں چپ چپاتے دنیا سے جاسکتا تھا۔ یہ کیا عجب تماشا تھا کہ گیدڑوں نے شیر کو گھیر کر چالاکی سے اس کا شکار کر لیا تھا۔ نہیں، یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ فاروق استاد کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ ہر بات سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کچھ بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور بری طرف ماؤف ہو گیا تھا۔ گولو کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے فاروق رویا تو وہ اس کیفیت سے باہر آیا اور خود بھی اس کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ چند دن میں عجب ہی ماجرا ہو گیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے ساری بساط الٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ تو یہاں اپنی پناہ گاہ میں دبکا منتظر تھا کہ ربن کسی روز اپنی روپوشی ختم کر کے خود اس سے رابطہ کرے گا لیکن ربن تو ایک ایسی دنیا میں چلا گیا تھا جہاں سے کسی کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ عجب تماشا تھا کہ وہ جوان سب کے دلوں کی دھڑکن تھا، چلا گیا تھا اور پھر بھی وہ سانس لیتے تھے۔ کیا سچ مچ لیتے تھے؟ دکھ کی انتہا پر پہنچا رامو سوچ رہا تھا اور سینہ پیٹتا جا رہا تھا۔ فاروق نے بھی آج اپنے آنسوؤں پر بند باندھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور رامو کے ساتھ مل کر خوب آنسو بہا رہا تھا۔ آنسوؤں اور آہوں کا یہ سلسلہ پتا نہیں کب تک جاری رہتا کہ دروازہ کھلا اور ایک نسوانی وجود کمرے میں داخل ہوا۔ آنے والی نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں اس منظر کو دیکھا اور بے اختیار ہی پکار بیٹھی۔

''رام داس...... رام داس، کیا ہوا ہے؟'' پکارنے کے ساتھ ہی اس نے رامو کے قریب آ کر اس کا بازو بھی جھنجوڑا تھا۔

''مالا...... تم آ گئیں مالا۔'' رامو کسی بھیڑ میں کھوئے بچے کی طرح اس سے لپٹ گیا اور بڑے درد بھرے لہجے میں بولا۔ ''اپن اناتھ ہو گیا مالا! اپن کا باپو مر گیا۔''

''یہ کیا بولتے ہو رام داس، تمہارا باپو......'' عورت کے لہجے میں حیرت وتشویش تھی۔

''ہاں اپن کا باپو...... اپنا ربن دادا چلا گیا۔'' رامو اب بھی دھاڑیں مار رہا تھا لیکن فاروق پر اس عورت کی آمد کا بالکل مختلف ردِعمل ہوا تھا۔ اس نے اپنے آنسو سمیٹ لیے تھے اور دکھ کو ایک بار پھر سینے میں بند کر کے عورت کو حیرت اور تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رامو سے چند سال چھوٹی، گندمی رنگت اور اچھے نقوش کی عورت تھی جس نے آنکھوں میں کاجل کی دھار لگانے کے علاوہ کوئی دوسرا سنگار نہیں کیا تھا پھر بھی سیاہ بارڈر والی سبز سوتی ساڑی میں اپنے متناسب جسم کے ساتھ خاصی قابلِ توجہ تھی اور یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ چند سال پیچھے دیکھنے والوں میں سے کئیوں کے دل اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتے ہوں گے۔ وہ بالکل سادہ سی گھریلو عورت کے روپ میں سامنے کھڑی رامو کو دلاسا دے رہی تھی لیکن جانے کیوں ایک عام گھریلو عورت سے بہت مختلف لگتی تھی۔ رامو سے اس کی اس درجے قربت ان کے درمیان کسی قریبی رشتے کا اظہار کر رہی تھی اور فاروق حیران تھا کہ اسے رامو کی ایسی کسی قرابت داری کا علم نہیں تھا۔ وہ تو آج تک اسے کوئی تنہا آدمی ہی تصور کرتا تھا جس کا اگر کوئی رشتہ تھا بھی تو وہ اسے چھوڑ کر اڈے کی دنیا کا باسی بن گیا تھا

لیکن آج اس کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہورہا تھا۔

فاروق کے دیکھتے دیکھتے ہی اس عورت نے جسے رامو نے مالا کہہ کر پکارا تھا، رامو کو بڑے احسن طریقے سے سنبھال لیا۔ چپکے چپکے اس کے کان میں سرگوشیاں کرتی وہ جانے اسے کیا کچھ سمجھاتی رہی کہ آخرکار اس کی ہچکیاں سسکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ مالا نے اسے پانی لاکر پلایا تو سسکیوں کا سلسلہ بھی دم توڑ گیا اور وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر یوں ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گیا جیسے اس کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ اسے قدرے پُرسکون پاکر مالا فاروق کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کی طرف بھی پانی کا گلاس بڑھایا جسے فاروق نے تھام لیا۔ خود پر قابو پالینے کے باوجود فاروق کو پانی کی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اندر سینے میں جو آنسوؤں کا ایک گولا سا اٹکا ہوا ہے، اسے تحلیل کرسکے۔ آدھے گلاس کے قریب پانی پی کر فاروق نے گلاس مالا کو واپس تھما دیا تو وہ مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور دو منٹ بعد ہی واپس آکر فاروق کے مقابل بیٹھ گئی۔

''میں مالا ہوں، رام داس کی پتنی اور ایک جیون ساتھی کی حیثیت سے ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی زندگی میں اڈے اور ربن دادا کی کیا حیثیت ہے اور اس وقت یہ کتنے گہرے صدمے سے گزر رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان تک یہ دکھی خبر آپ نے ہی پہنچائی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، آپ فاروق استاد ہیں۔'' اس نے تائید چاہنے والی نظروں سے فاروق کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''رام داس اڈے کے جن چند لوگوں کا بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں، ان میں ربن دادا کے بعد آپ ہی کا نمبر آتا ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ اس وقت آپ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے اور آپ کو سکون کی ضرورت ہے اس لیے ابھی آپ پر کچھ بھی بتانے کے لیے زور نہیں دوں گی۔ آپ یہاں اس کمرے میں آرام کریں، میں رام داس کو دوسرے کمرے میں لے جاتی ہوں۔ دو تین گھنٹوں میں آپ دونوں ہی کو سنبھلنے کا موقع مل جائے گا پھر ہم سکون سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' اس نے فاروق سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونے کے بعد رامو کے قریب جاکر اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ رامو اس نازک سی عورت کے سہارے کمرے سے باہر جاتا اگرچہ اب بھی نڈھال ہی دکھائی دیتا تھا لیکن سہارا دینے والی کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسے سنبھال لے گی۔ فاروق کو اس لمحے بے اختیار وہ یاد آئی جو دل کے بہت قریب ہوکر بھی ہمیشہ اس سے بہت دور رہی تھی اور شاید یہ دوری ہی اس کا مقدر تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر گھر کے تمام افراد موجود تھے اور دن کا آغاز معمول کے مطابق ہی ہوا تھا لیکن سوائے صاحب خانہ کے کوئی بھی خود کو اندر سے نارمل محسوس نہیں کررہا تھا۔ جولیٹ نے صبح ہی بیگم آصفہ علی سے انجلی والا قصہ بیان کرکے بہ صد اصرار اسے یہاں لانے کی اجازت لے لی تھی۔ وہ کھلے دل سے اجازت دے دینے کے باوجود معاملے کی گمبھیرتا کی وجہ سے مضطرب اور پریشان تھیں۔ ان کی مدد کرتی جولیٹ ان کے احساسات کو سمجھتی خود بھی خاصی سنجیدہ تھی اور مسلسل عاکف اور عاقب کی اپنی طرف اٹھی سوالیہ نظروں کو نظرانداز کررہی تھی۔ وہ دونوں حسب معمول باورچی خانے سے کھانے کے کمرے تک ناشتے کا سامان منتقل کرتے ہوئے بار بار کھوجنے والی نگاہوں سے ماں اور جولیٹ کے چہروں کو دیکھ رہے تھے لیکن دونوں ہی نے ایسا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا جس سے وہ دونوں کوئی اندازہ قائم کرسکیں، چنانچہ وہ مایوس ہوکر اپنی مخصوص نشستوں کو سنبھال کر بیٹھ گئے۔ جولیٹ نے بھی اپنی جگہ سنبھال لی۔ سب سے آخر میں بیگم آصفہ علی آئیں اور آہستہ سے کرسی کھینچ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے، آج آپ لوگ بہت خاموش دکھائی دے رہے ہیں؟'' ناشتے کے انتظار میں اخبار کا جائزہ لیتے صاحب خانہ جناب عنایت علی نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا اور سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ابو، بس ہم آپ کے خیال سے خاموش ہیں کہ آپ اتنی رات کو گھر واپس آئے تھے یقیناً تھکے ہوں گے اور ہمارا شور شرابا آپ کے مزاج پر گراں گزرے گا۔'' عاقب چھوٹا تھا لیکن بڑے بھائی کی نسبت زیادہ تیز اور معاملہ فہم تھا، اس لیے اب بھی بہت خوبی سے بات بنا گیا۔

''اس طرح نہ سوچا کرو یار، تم لوگوں کی وجہ سے تو اس گھر میں رونق ہے۔ تمہارا ہنسنا بولنا مجھے ڈسٹرب نہیں کرتا بلکہ فریش کردیتا ہے۔'' عنایت نے نہایت شفقت و محبت سے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی بیگم کی طرف متوجہ ہوکر بولے۔

''سن رہی ہیں آپ اپنے راج دلاروں کی باتیں۔ ماشاء اللہ سے کافی سمجھدار ہوگئے ہیں۔'' بیگم آصفہ علی جو

اپنے خیالات میں گم تھیں، ان کے مخاطب کرنے پر ماحول میں واپس آئیں لیکن ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس سے قبل وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھیں اور انہوں نے اپنے شوہر کی بات نہیں سنی تھی۔

''آپ کہاں کھوئی ہوئی ہیں بھئی؟'' انہوں نے شگفتگی سے بیگم کو ٹوکا۔

''کہیں نہیں۔ آپ ناشتا شروع کریں نا، خوامخواہ سب کچھ رکھا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' انہوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور آملیٹ کی پلیٹ تیزی سے ان کی طرف بڑھائی اور پھر حسب معمول ایک ایک کو ناشتے کے لوازم پیش کرتی رہیں۔ عاقب نے بھی سمجھداری کا مظاہرہ کیا اور عادت کے مطابق چھوٹے چھوٹے چٹکلے سنا کر سب کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی اس کوشش سے ماحول میں خاصی تبدیلی آگئی اور ناشتا خوش گوار ماحول میں کیا جانے لگا۔ ناشتے کے دوران عنایت علی دونوں بیٹوں سے ان کی پڑھائی اور ریلیف کے کاموں کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتے رہے۔ جولیٹ نے اپنے مختصر قیام کے عرصے میں دیکھا تھا کہ وہ بیٹوں کے ہر کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ والدین کی عمدہ تربیت اور مستقل توجہ کے اثرات دونوں بھائیوں میں واضح طور پر نظر آتے تھے اور وہ بہت مہذب اور نفیس نوجوان تھے جو باپ کی پولیس کی نوکری کے زعم میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتے نظر نہیں آتے تھے۔

''جولی بیٹا! ایسا کرو کہ آج آپ دونوں بھائیوں کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے گھر پر تھوڑا کام ہے اس لیے آج میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' ناشتا اپنے اختتامی مراحل میں تھا جب بیگم آصفہ علی نے جولیٹ کو مخاطب کرکے اس سے کہا۔

''او کے آنٹی۔'' جولیٹ نے بھی تابعداری کا مظاہرہ کیا۔ وہ آج عاکف اور عاقب کے ہمراہ جائے گی، یہ بات ان کے درمیان پہلے ہی طے ہو چکی تھی لیکن اس وقت شاید انہوں نے شوہر اور بچوں کو مطلع کرنے کے لیے اسے مخاطب کیا تھا۔

''خیریت! آج آپ کو گھر پر ایسا کیا کام ہے؟'' عنایت علی زیرک آدمی تھے اور پہلے ہی ماحول کا غیر معمولی پن بھانپ چکے تھے، اب بیوی کی بات سنی تو مزید چونک گئے اور پوچھنے لگے۔

''آپ سے کچھ اہم گفتگو کرنی ہے۔ امید ہے آپ کو اپنے دفتر پہنچنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوگی۔''

''آپ کی بات سنے بغیر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چاہے سرکار ہمیں نوکری سے ہی نکال دے۔ سرکار سے زیادہ ہوم منسٹر کا آرڈر ماننا ضروری ہے۔'' انہوں نے شگفتگی سے جواب دیا تو ماحول میں محسوس ہونے والا تناؤ کچھ کم محسوس ہونے لگا اور سب کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آگئی۔ ان مسکراہٹوں میں بیگم آصفہ علی کی شرمیلی سی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے تاکہ یہاں کابینہ کا اجلاس شروع ہو سکے اور اس عرصے میں ہم عوام بھی اپنے کچھ کام نمٹا لیں۔'' چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے عاقب نے کہا تو سب ایک بار پھر مسکرانے لگے۔ عاکف جو ویسے ہی خود کو مشکل سے باندھ کر بیٹھا ہوا تھا، فوراً ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جولیٹ اور عاقب نے بھی سستی نہیں دکھائی اور تینوں ایک ساتھ روانہ ہو گئے۔ عام دنوں میں دونوں بھائی اپنی اپنی سائیکلوں پر کالج جایا کرتے تھے لیکن آج جولیٹ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ٹیکسی کا انتظام کر لیا اور ٹیکسی والے سے طے کر لیا کہ وہ انہیں ان کے مطلوبہ مقام پر پہنچا کر ان کی واپسی تک وہیں رکا رہے گا اور جب وہ چاہیں گے، انہیں واپس یہاں لے آئے گا۔ ٹیکسی والا اپنے مطلوبہ کرائے کی ادائیگی کی یقین دہانی پر راضی ہو گیا اور وہ تینوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ عاکف تھوڑا سا نروس محسوس ہو رہا تھا۔ صبح سے اس نے کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کی تھی۔ اب بھی کسی نے اسے نہیں چھیڑا اور جولیٹ اور عاقب ہی راستے میں ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں پہنچی تو جولیٹ دلچسپی سے وہاں موجود عمارتوں کو دیکھنے لگی۔ وہاں زیادہ تر بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور طرز تعمیر کے اعتبار سے کئی کوٹھیاں ایسی تھیں جنہیں دیکھتے ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کی کوٹھیوں کے مکین ہندو رہے ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ قبل از تقسیم ہندو اکثریت والا علاقہ تھا جہاں اب مسلمان آبسے تھے اور ان کوٹھیوں کے ہندو مکین اپنی کوٹھیاں فروخت کر کے یا پھر ایسے ہی چھوڑ کر سرحد کی دوسری طرف جا چکے تھے۔ عاکف کی راہنمائی میں وہ جس کوٹھی تک پہنچے، اس کے لوہے کی جالی والے گیٹ کے ایک ستون پر بھی کسی دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ عاکف نے اپنے پاس موجود چابیوں کا گچھا نکال کر گیٹ پر پڑا تالا کھولا اور پھر وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ ٹیکسی مرکزی عمارت سے ذرا ہٹ کر

بنی ہوئی تھی اور انہیں وہیں جانا تھا۔ وہاں پہنچ کر عاکف نے ایک کمرے کے دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔ ردِعمل میں کسی کی دلنشین لیکن خوف میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کک...... کون؟“ وہ جانتی تھی کہ یہاں عاکف کے سوا کوئی اور نہیں آتا پھر بھی پوچھ کر اپنے دل کی تسلی کر رہی تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی کے ایک کمرے میں تنہا رات دن رہنا ایک نوعمر لڑکی کے لیے یقیناً ایک خوفناک تجربہ تھا اور اسی وجہ سے وہ محتاط بھی تھی۔

”دروازہ کھولو انجلی، میں ہوں عاکف!“ عاکف نے نرمی سے اسے پکارا تو اس نے تیزی سے دروازہ کھول دیا اور یکدم ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس اچانک افتاد پر عاکف بوکھلا گیا۔ اکیلا ہوتا تو شاید اتنی بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہوتا لیکن جولیٹ اور عاقب کی موجودگی کی وجہ سے وہ اچھی خاصی خفت محسوس کر رہا تھا۔ جولیٹ نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور خود آگے بڑھ کر انجلی کو سنبھال لیا۔ وہ جواب تک عاکف کے ساتھ کسی اور کی موجودگی سے بے خبر تھی، اس بار خود بوکھلا گئی۔

”یہ میری آپی ہیں انجلی اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں نے ان لوگوں کو تمہارے بارے میں بتایا تو یہ میرے ساتھ تم سے ملنے کے لیے چلے آئے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“ عاکف نے اس سے ان دونوں کا تعارف کروایا تو وہ دلچسپی سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی چشمِ آہو میں ابھی تک آنسو اٹکے ہوئے تھے اور سورج کی کرنیں اس کے صبیح چہرے پر پڑتی وہاں قوسِ قزح کے رنگ پھیلا رہی تھیں۔ جولیٹ نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ وہ زہد شکن حسن کی مالک ہے اور عاکف اس کا اسیر ہو گیا ہے تو یہ کوئی انہونی نہیں ہے۔

”آپ اندر آجائیں۔“ جولیٹ کی نظروں کو خود پر ٹکا محسوس کر کے وہ تھوڑا سا جھینپی اور ان لوگوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

”تم کیوں رو رہی تھیں...... کیا ڈر لگ رہا تھا؟“ جولیٹ اس کے قریب ہی سنگل بیڈ پر ٹک گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر اس سے پیار سے دریافت کیا۔ عاکف اور عاقب نے بھی وہاں رکھے ایک ٹو سیٹر صوفے پر جگہ سنبھال لی تھی۔ جولیٹ کے سوال کے جواب میں انجلی نے زور و شور سے سر کو اثبات میں حرکت دی اور کمرے کی شمالی دیوار کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”رات سے ایک چھپکلی آکر وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں بھگانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن بھاگتی ہی نہیں۔“ اس کے اس معصومانہ انداز پر جولیٹ کو ہنسی بھی آئی اور دل میں ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہوئے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جو ایک معمولی چھپکلی سے ڈرتی تھی، اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی جہاں بڑے بڑے مگرمچھ ہر دم اس جیسی نوخیز کلیوں کو ہڑپ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔

”اصل میں چھپکلی کو پتا چل گیا تھا کہ یہ کمرا خالی ہونے والا ہے اس لیے وہ پہلے سے یہاں آکر بیٹھ گئی ہے۔ تم اس چھپکلی کو یہیں چھوڑو اور خود ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔“ انجلی کے لیے محسوس ہونے والے خدشات کو پسِ پشت ڈال کر اس نے شگفتگی سے اس سے کہا تو وہ حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی پھر سوالیہ نظروں سے عاکف کی طرف دیکھا۔

”آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں انجلی! آج ہم تمہیں یہاں سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کل رات آپی کو تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ میں نے تمہیں تنہا اس خالی کوٹھی میں کیوں چھوڑا ہوا ہے اور صبح ہوتے ہی یہ تمہیں لینے کے لیے میرے ساتھ یہاں آگئی ہیں۔“ عاکف نے جولیٹ کی بات کی وضاحت کی۔

”پرنتو مجھے اپنے پریوار کے پاس اپنے گھر جانا ہے۔“ وہ عاکف کی بات سن کر منمنائی۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ تمہارا گھر جل چکا ہے اور تمہارے پریوار کی کوئی خبر نہیں ہے۔ جب تک ان لوگوں کا پتا نہیں مل جاتا، تم کو کہیں نہ کہیں تو رہنا ہے اس لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“ عاکف نے اس سے نظریں چراتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”عاکف ٹھیک کہہ رہا ہے انجلی! تمہارا اکیلے یہاں رہنا ویسے بھی مناسب نہیں ہے اور اب تو عاکف کا وہ دوست بھی واپس آنے والا ہے جو اس کے ذمے اس کوٹھی کی دیکھ بھال کا کام دے کر گیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد تم یہاں کیسے رہو گی؟ اس لیے بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ چلو ہم تمہاری پرابلم سولو کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔“ جولیٹ نے بھی عاکف کا ساتھ دیتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ چار و ناچار راضی ہو گئی۔ اس کے پاس سامان تو کوئی تھا نہیں جسے سمیٹنا ہو۔ بس عاکف کی مرحومہ بہن کا ایک اضافی جوڑا اور کچھ پھل اور ڈبل روٹی وغیرہ ہی رکھے تھے جنہیں ساتھ لے لیا گیا۔ کمرے سے نکلنے سے قبل عاقب نے ایک بار پورے کمرے پر اچھی طرح نظر دوڑا کر دیکھ لیا کہ کہیں

کوئی ایسی علامت موجود نہ ہو جو بعد میں کسی کو یہاں کسی لڑکی کی موجودگی کا پتا دے سکے۔ ایسی کوئی نشانی رہ جاتی تو عاکف کا دوست اس کی طرف سے مشکوک ہو سکتا تھا کہ نہ جانے اس کی غیر موجودگی میں عاکف کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ وہ خوامخواہ دوسرے دوستوں کے سامنے اس کے کردار پر انگلی بھی اٹھا سکتا تھا اس لیے احتیاط ہی مناسب تھی۔ اسی احتیاط کے پیشِ نظر اس نے ڈسٹ بن میں موجود کچرا بھی ایک جگہ رکھ کر جلا ڈالا۔ کچرے میں انجلی کا پھٹا ہوا لباس بھی موجود تھا جو کسی کی نظر میں آجاتا تو واقعی عاکف کے لیے پریشانی کھڑی ہو سکتی تھی۔

اس ساری کارروائی سے فارغ ہو کر وہ لوگ انجلی کے ساتھ باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ باہر نکلنے سے پہلے ہی جولیٹ نے انجلی کو منہ دھو کر بال سنوارنے کی ہدایت کر دی تھی تاکہ ٹیکسی ڈرائیور کو کسی غیر معمولی پن کا احساس نہ ہو۔ اس کے سمجھانے پر انجلی نے حتی الامکان اپنے چہرے کے تاثرات بھی نارمل کر لیے تھے اور خاموشی سے ان کے ساتھ ٹیکسی میں آن بیٹھی تھی۔ ان سب کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا اور دھیرے سے ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔ رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس نے رفتار بہت کم رکھی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی جولیٹ جو باہر کا جائزہ لے رہی تھی، ایک کوٹھی کے سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

وہاں ایک سفید رنگ کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی جس کے باوردی ڈرائیور نے پچھلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھول رکھا تھا اور اس کھلے دروازے سے گزر کر اسد اللہ اندر بیٹھ رہے تھے۔ ان کی توجہ قریب کھڑے ایک شخص کی طرف تھی اس لیے انہوں نے قریب سے گزرتی ان کی ٹیکسی کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی لیکن جولیٹ کا دل اپنی جگہ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا اور رگوں میں موجود خون جوش مارنے لگا۔ اپنی اتنی عزیز ہستی کو خود سے اتنا نزدیک دیکھ کر بھی خاموشی سے بنا اسے پکارے آگے بڑھ جانا آسان نہیں تھا۔ وہ چند سیکنڈ اس کے لیے قیامت بن گئے اور بے انتہا ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے جنہیں اس نے بہت خاموشی سے اپنی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹا اور رخ موڑ کر اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھنے لگی۔ جو پیچھے رہ گیا تھا اس کی طرف پلٹنے کی کوئی گنجائش ہی موجود نہیں تھی۔

☆☆☆

''اب سے بارہ برس پہلے دادا خود مالا کے ساتھ اپنے پھیرے لگوایا تھا۔ یہ ادھر بازار میں چھمیا بائی کے کوٹھے پر گانا بجانا کرتی تھی۔ اس کی ماں نے ایک زمین دار کے ساتھ بیاہ رچا کر اسے جنم دیا تھا۔ باپ تو بیاہ کے چار ماہ بعد ہی کسی پرانی دشمنی میں مارا گیا لیکن چھمیا کی آنکھوں کو عجت (عزت) کے جیون کا سپنا دان کر گیا۔ وہ خود اپنے لیے تو اس سپنے کو پورا نہ کر سکی اور اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالنے کے لیے دھندا کرنے لگی لیکن سوچ لیا کہ بیٹی کو گانے بجانے سے آگے کچھ نہیں کروائے گی اور جیسے ہی کوئی اس کا سچا چاہنے والا ملا اس کے ساتھ بیاہ دے گی۔ مالا کو گانے بجانے کے لیے بھی اس نے اسی لیے محفل میں بٹھانا شروع کیا تھا کہ شمع کی طرف لپکتے پروانوں میں سے کسی من کے اجلے بندے کو چن کر بیٹی کا ہاتھ اسے تھما دے گی۔ مالا نے محفل میں گانا شروع کیا تو اس کی مدھر آواز کی جو شہرت مچی سو مچی، لوگ شکل صورت کے بھی دیوانے ہو گئے اور چھمیا بائی کے پاس بڑے بڑے ساہوکاروں کے مالا کی نتھ اترائی کے لیے پیام آنے لگے۔ چھمیا بائی نے ہر ایک پر واضح کر دیا کہ وہ بیٹی کا ہاتھ صرف اس کے ہاتھ میں دے گی جو چار لوگوں کے بیچ اسے عجت سے بیاہ کر لے جائے گا۔ پھیروں کے ساتھ اس کی اور بھی دوسری شرطیں تھیں جنہیں کوئی دولت والا ہی پوری کر سکتا تھا۔ شرطیں چھمیا نے اس لیے رکھی تھیں کہ کل کو کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو مالا کو کوئی آسرا تو ہو لیکن لوگ ان شرطوں کو طوائف کا لالچ ہی کہا کرتے تھے۔ اب حال یہ تھا کہ ہلکی جیبوں والے پھیرے لگوانے کو تیار تھے لیکن شرطیں پوری کرنے کا دم نہیں تھا اور جن کی جیبیں بھری تھیں، وہ بولتے تھے اپنی مانگ سے بڑھ کر مال لے لو لیکن پھیروں کی بات نہ کرو۔ چھمیا بائی دونوں صورتوں میں راضی نہیں تھی۔ یوں مالا کو محفل میں بیٹھ کر گاتے سے بیت گیا تھا۔ اس کے بکاؤ مال نہ ہونے کی کشش نے بہتوں کے من اس میں اٹکائے ہوئے تھے۔

''اپن کو بھی وہ اچھی لگتی تھی اور آواز اور شکل سے زیادہ اس کی آنکھیں جھکا کر بیٹھنے کی ادا من کو بھاتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی شرافت دیکھ کر اپن قسم کھا سکتا تھا کہ وہ کئی شریف زادیوں سے بڑھ کر شریف ہے پر اپن بھی اس کو پانے کی چاہ نہیں کر سکتا تھا۔ اپن میں چھمیا کی شرطیں پوری کرنے کا تیز ہی نہیں تھا پر کہتے ہیں نا کہ جدھر چاہ ادھر راہ۔ بھگوان نے بھی اپنے من کی سن لی۔ ایک روز ایک امیر زادہ سر محفل ضد کر بیٹھا کہ مالا کو اس کے حوالے کیا جائے۔ چھمیا کی پھیروں والی شرط کے سوا وہ سب ماننے کو تیار تھا لیکن چھمیا نہیں مانی۔ جواب میں اس امیر زادے نے مال و زر کے

انبار لگا دینے کا لالچ دیا بلکہ اسی سے نوٹوں کی گڈیوں سے بھری جیبیں الٹ دینے کے علاوہ ہاتھوں میں پہنی ہیرے جڑی انگشتریاں اور ہیرے ہی کے نگوں والی کلائی کی گھڑی بھی اتار کر سامنے رکھ دی کہ اس سب کو اپنی شرائط پوری ہونے کا بیعانہ سمجھو۔ امیرزادے کے اس مغرورانہ انداز پر چھمیا بالکل ہی اینٹھ گئی اور اسے صاف جواب پکڑا دیا۔ نوجوان بھی ضد میں آ گیا اور اعلان کیا کہ چھمیا راضی ہو یا نہ ہو وہ مالا کو اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا۔ تو تو، میں میں، میں بات اتنی بڑھی کہ امیرزادے نے قمیص کے نیچے کمر سے بندھا پستول باہر نکال لیا۔ پستول دیکھ کر سب کی سٹی گم ہوگئی۔ بیچ بچاؤ کروانے والے بھی ایک طرف ہٹ گئے کہ کہیں پستول چل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ایک واحد چھمیا بائی تھی جو بیٹی سے لپٹی چیخ رہی تھی کہ اس کی بیٹی بکاؤ مال نہیں ہے اور کوئی اسے ایسے لوٹ کے مال کی طرح بھی یہاں سے نہیں لے جاسکتا۔ ایک کمزور عورت کی چیخ و پکار کا امیرزادے پر کیا اثر ہوتا۔ اس کے پستول کو دیکھ کر تو کنٹی کے وہ چند مرد جو کوٹھے پر مختلف امور انجام دیتے تھے، چپکے ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ اپن سے دادا گیری برداشت نہیں ہوئی اور اپن مدد کے لیے بیچ میں کود پڑا۔ امیرزادے نے بڑا دھمکایا کہ گولی ماردوں گا اپن بولا دم ہے تو گولی چلا اپن تو اب مالا کا ہاتھ تجھ سے چھڑوائے بغیر پیچھے نہیں ہٹنے کا ہے، وہ سالا پستول دکھا کر ڈرانا تو جانتا تھا لیکن نشانے کا کچا تھا۔ غصے میں گولی چلا دیا جو اپن کے بجائے پیچھے کھڑے طبلچی کو جا لگی۔ غصے سے اندھا ہوا وہ اور بھی گولیاں چلاتا اس سے پہلے ہی اپن نے اسے چھاپ لیا۔ اس کا پستول والا ہاتھ مروڑ کر اس کے ہاتھ سے پستول گرادیا اور گردن پر چاقو رکھ کر بولا کہ مالا کا ہاتھ چھوڑ دے ورنہ ابھی تیرا کام تمام کردوں گا۔ ...... (گالی) اتنا جی دار نہیں تھا کہ جان کی بازی لگا دیتا۔ سارا نشہ اور جنون اڑن چھو ہو گیا اور فٹ سے مالا کا ہاتھ چھوڑ ڈالا۔ وہ فوراً بھاگ کر اندر چلی گئی پر جاتے جاتے نظروں سے اپن کو دھنیواد ضرور بولی۔ بندے کو گولی لگی تھی اس لیے ادھر بڑا شور مچا ہوا تھا۔ گولی کی آواز سن کر کسی نے بھاگ کر تھانے میں بھی خبر کردی تھی۔ پولیس آ گئی۔ درجنوں گواہ تھے جنہوں نے اس امیرزادے کو گولی چلاتے دیکھا تھا اس لیے پولیس کو اسے گرفتار کرنا پڑا۔ وہ گرفتار ہوا اور بہت دنوں تک سلاخوں کے پیچھے پڑا رہا۔ چھمیا کے کوٹھے کی محفلیں ہر رات سجتی رہیں اور مالا اپنی مدھر آواز میں گیت گاتی رہی، فرق پڑا تو صرف اتنا کہ وہ مالا جو ہمیشہ نظروں کو جھکا کر رکھتی تھی کبھی کبھی نظر اٹھا کر اپن کو دیکھنے لگی۔ اپن کے لیے اس کا نظر اٹھا کر دیکھنا بھی بہت تھا پھر ایک دن چھمیا بائی نے اپن کو روک لیا اور بتایا کہ وہ امیرزادہ جیل سے بھی دھمکیاں بھجوا رہا ہے کہ مالا اس کی نہیں ہوئی تو وہ اسے کسی اور کے قابل بھی نہیں چھوڑے گا۔ ادھر اپن بھی کیس کا خاص گواہ ہونے کی وجہ سے سب کی نظروں میں تھا۔ اس امیرزادے کے وکیل نے اپن کو اپنے دفتر بلا کر باتوں باتوں میں سمجھایا تھا کہ گواہی سے پیچھے ہٹ جاؤ تو فائدے میں رہو گے ورنہ یہ کیس الٹا تمہارے گلے میں بھی پڑ سکتا ہے۔ ان دنوں عمر اتنی نہیں تھی اور غصہ بہت آتا تھا اس لیے اپن اس کے وکیل کو بات ماننے سے صاف منع کر کے آ گیا تھا۔ اب جو مالا کے لیے دھمکیوں کا سنا تو اور بھی غصہ آ گیا اور اعلان کر دیا کہ اپن خود مالا کا پہرا دے گا اور دیکھے گا کہ کون مائی کا لال اس کا بال بھی بانکا کرتا ہے۔ اپن کی اس بات سے مالا بہت خوش ہوئی اور مسکرا کر اپن کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کیا ہونا تھا اپن آٹھوں پہر اس کے کوٹھے کا پہرا دینے لگا۔ دادا کو سارے لفڑے کا پتا تھا اب جو اپن کوٹھے کا ہی ہو کے رہ گیا تو وہ چپ نہیں رہ سکا اور اپن کو سمجھایا کہ مالا سے ایسا ہی عشق ہے تو اس سے بیاہ کر لے اور امیرزادے سے پھڈا بھی ختم کر۔ پھر اسی نے آگے بڑھ کر چھمیا سے بات کی۔ چھمیا کچھ تو دھمکیوں سے ڈری ہوئی تھی اور کچھ مالا کے من کی سمجھتی تھی اس لیے ساری شرطیں چھوڑ کر ہمارے بیاہ پر تیار ہو گئی۔ ادھر دادا نے امیرزادے کے وکیل اور باپ سے مل کر معاملہ طے کر لیا کہ راموگواہی دینے سے پیچھے ہٹ جائے گا لیکن ایک تو تم لونڈے سے بولو کہ مالا کو بھول جائے، دوسرے جس طبلچی کو گولی لگی ہے اس کے بچھلوں کو اتنا دو کہ وہ سکھ کی گزار سکیں۔ باپ لونڈے کی حرکتوں سے پہلے ہی پریشان تھا۔ بولا کہ کیس ختم ہو گیا تو وہ اپنے لڑکے کو پردیس بھجوا دے گا، رہی طبلچی کے گھر والوں کی بات تو ان کے راشن پانی کا خرچہ بھی وہ اپنے ذمے لینے کو تیار ہو گیا بس ایسے مالا اپن کی پتنی بن گئی اور اپن اسے یہ چھوٹا سا گھر لے کر دے دیا۔

”بیاہ سے پہلے ہی اپن مالا کو بتا دیا تھا کہ اپن اڈے کا آدمی ہے اس لیے یہ مت سوچنا کہ دوسرے مردوں کی طرح اپن روزانہ صبح کام پر جا کر شام کو واپس گھر آ جائے گا۔ اپن اپنے حساب کتاب سے ہی آنا جانا کرے گا، ہاں خرچہ پانی برابر پہنچاتا رہے گا۔ وہ اس پر بھی راضی ہو گئی اور اتنے برسوں میں ایک بار بھی زبان پر شکایت نہیں لائی حالانکہ اکثر تو اپن

ہفتوں بھی ادھر کا چکر نہیں لگا پاتا۔ دو برس پہلے چھمیا کا دیہانت ہوگیا۔ وہ زندہ تھی تو بیٹی کو کبھی کبھی میرے خلاف اکساتی تھی پر اس اللہ کی بندی نے کبھی ماں کی باتوں میں آ کر بھی اپن سے جھگڑا نہیں کیا۔ دادا کبھی کبھار مالا سے ملنے آتا تھا اور ہر بار اپن سے بولتا تھا کہ رامو ایسی عورت نصیب والوں کو ملتی ہے تو اس کی قدر کرنا۔ اپن اور کچھ کر سکا یا نہیں لیکن مالا سے پریم بہت کیا۔ بھگوان نے اپن کو بچہ نہیں دیا، یہ اس کی مرضی پر اگر ایک بچہ ہو جاتا تو مالا کا اکیلا پن دور ہو جاتا۔ اب بھی وہ بیچاری اپنا من بہلانے کو کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ اس نے کہیں سے روئی اور کپڑوں سے کھلونے بنانے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ گھر کے کام کاج نمٹا کے اسی کام میں لگی رہتی ہے۔ اس کے بنائے کھلونے اتنے سندر ہوتے ہیں کہ کھلونوں کی دکان پر ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ مالا کو پیسے سے مطلب نہیں، بس مصروفیت چاہیے۔ پیسے تو وہ سب کسی نہ کسی غریب محتاج کو دے دیتی ہے۔ بیاہ کے بارہ برسوں میں دو تین بار ہی ایسا ہوا کہ اپن اکٹھے اتنے دنوں کے لیے اس کے ساتھ رکا ہو۔ اس رات پولیس والوں کے تیور دیکھ کر اپن اڈے سے نکل کر بھاگا تو سیدھا ادھر آ گیا۔ اس جگہ کا دادا کے سوا کسی کو نہیں پتا۔ اپن یہاں بیٹھا مالا کو خوش ہوتا دیکھتا رہتا ہے۔ یہی اپن کو باہر کی خبریں لا دیتی ہے۔ اپن کو سب پتا ہے کہ ادھر اڈے پر بھی ریڈ پڑا تھا اور دادا سمیت سب غائب ہیں۔ مالا نے اپنی سوگند دے کر گھر کے اندر بٹھا رکھا تھا اور کہتی تھی کہ حالات بہتر ہونے سے پہلے کسی صورت نہیں جانے دے گی۔ اپن کو کیا پتا تھا کہ دادا......"

رامو اپنی بات پوری نہیں کر سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مالا نے دو تین گھنٹے کے وقفے کے بعد دوبارہ ملاقات کا عندیہ دیا تھا لیکن رامو بہ مشکل سوا گھنٹا اپنے کمرے میں گزار کر واپس فاروق کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے اپنی زندگی کے اس گوشے سے متعارف کروایا تھا جس سے رین کے سوا اڈے کا کوئی دوسرا شخص واقف ہی نہیں تھا۔ اتنے برسوں سے وہ اپنی دونوں زندگیوں کو الگ الگ رکھ کر اتنی کامیابی سے چل رہا تھا کہ کبھی کسی کو گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کا بھی کوئی گھر ہوگا جہاں ایک خوبصورت و جان چھڑکنے والی بیوی ہر پل اس کا انتظار کرتی ہوگی۔ وہ خود بھی اپنی پتنی کو چاہتا تھا لیکن اس کی پہلی ترجیح اڈا ہی تھا اور وہ رین کے قدموں سے چپٹے رہنے پر ہی خوش رہتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی اس سے چھن چکی ہے۔ اب پتا چلا تھا تو شدتِ غم سے بلبلا اٹھا تھا۔ فاروق جس نے تنہا اس غم کو جھیلا تھا، رامو کے سامنے ایک بار بکھرنے کے بعد دوبارہ خود کو سمیٹنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب رامو کا غم بانٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رامو خود اپنی جگہ ایک جی دار اور حوصلہ مند آدمی تھا اس لیے اپنے سے چھوٹے کے سامنے مزید آنسو بہانے کے بجائے خود کو سمیٹنے میں کامیاب ہو گیا اور آنسو پونچھ ڈالے۔

"مالا بھابی کہاں گئی ہیں؟ میں نے انہیں باہر جاتے دیکھا تھا۔" ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے فاروق نے اس سے سوال کیا۔

"کچھ دیر میں آتی ہوگی۔" اس کے سوال کا مختصر جواب دے کر رامو نے چپ سادھ لی تو وہ بھی مزید کچھ نہیں پوچھ سکا۔ فضول کھوج میں لگے رہنے کی اسے بھی عادت نہیں تھی۔

"تم نے بتایا تھا کہ وبے اور سجو بھی مکان سے تمہارے آگے ہی بھاگے تھے۔ ان کا کچھ پتا ہے کہ وہ دونوں کدھر ہیں؟" رامو نے کچھ پل کی خاموشی کے بعد اس سے دریافت کیا۔ اس نے نفی میں گردن کو جنبش دی اور بولا۔

"ہمیں اتنی اچانک وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کہ ہم کچھ طے ہی نہیں کر سکے اور جسے جدھر سمجھ آیا ادھر بھاگ نکلا۔"

"یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ دونوں پولیس کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے۔" رامو نے تشویش کا اظہار کیا۔ خود فاروق کو اس بات کا اندیشہ تھا بلکہ اسے تو گولو کی بھی فکر تھی کہ اس کی لاش نہ جانے کس حال میں ہوگی اور پولیس والوں نے اسے کہاں رکھا ہوگا۔ دوسری فکر اسے کیتھرائن کی تھی۔ پولیس اسے اعانتِ جرم کے الزام میں لازماً گرفتار کرتی اور پھر تفتیش کے نام پر جانے اسے کس سلوک کا نشانہ بنایا جاتا۔ گولو دیرینہ ساتھی اور اپنی بے لوث محبت کے نتیجے میں اس کے لیے سگے بھائی جیسا تھا تو کیتھرائن نے بھی مختصر عرصے میں اپنے خلوص سے اس کے لیے چھوٹی بہن کی حیثیت ہی حاصل کر رکھی تھی۔ اصل میں وہ سب حقیقی رشتوں سے محروم دنیا میں تنہا زندگی گزارنے والے یکجا ہو کر ایک دوسرے کی محرومی کا مداوا بن گئے تھے اور ہر ایک ہی دوسرے پر جان لٹاتا تھا۔ فاروق بھی اپنے پیاروں کے لیے بے چین تھا۔ اسے گولو کی قبر کو مٹی دینی تھی اور کیتھرائن کو پولیس کے چنگل سے نکالنا تھا اور ان دونوں ہی کاموں کے لیے ضروری تھا کہ اپنے غم کو اپنے اندر سمو کر حواس کو پوری طرح قابو میں رکھا جائے۔ ان چند دنوں میں اس نے اپنے بکھرے وجود کو آپ سمیٹ لینے کا ہنر خوب سیکھا تھا۔ رین تھا تو وہ اسے بکھرنے نہیں دیتا تھا۔

اس کے بعد اسے یہ کام خود کرنا آ گیا تھا۔ زندگی اپنی راہ اسی طرح نکالا کرتی ہے ورنہ آدمی غم سے مر ہی نہ جائے۔ وہ شدید تکلیف میں تھا لیکن مرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ اسے ابھی زندہ رہ کر بہت سے کام کرنے تھے اور ان کاموں کی فکر نے دکھوں پر رونے کی فرصت چھین لی تھی۔ اب بھی وہ رامو سے اسی سلسلے میں گفتگو کرنے لگا۔

''مالا کھوج لگانے گئی ہے۔ تم نے جس محلے کا پتا بولا تھا، ادھر نزدیک میں اس کی ایک جاننے والی رہتی ہے۔ کچھ نہ کچھ پتا لگ ہی جائے گا۔ اب سے آ گیا ہے کہ اپن ادھر سے نکل کر معاملات کو دیکھے۔ پہلے تو اس لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا تھا کہ دادا کے آنے کی آس اور اس کے حکم کا انتظار تھا۔ اب اپن ایسے عورتوں کی طرح چھپ کر بیٹھ کر دادا کا نام تھوڑی ڈبوئے گا۔ اب ایسی بھی اندھی نہیں مچی ہوئی کہ پولیس کسی بھی ایرے غیرے کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دے۔ اپن وکیل صاحب سے بات کرے گا۔ وہ ایک دن میں کورٹ سے اپنی ضمانت کا کاغذ نکلوا لے گا۔'' رامو کا دماغ بھی اب کام کرنے لگا تھا۔

''تمہاری بات اور ہے استاد پر میری تو قبل از گرفتاری ضمانت بھی نہیں ہوسکتی۔ مجھ پر بملا کے قتل کا الزام ہے۔ سب سے پہلے تو پولیس مجھے اسی الزام میں گرفتار کرے گی پھر سب اگلا پچھلا بھی اگلوانے کی کوشش ہوگی۔'' فاروق کو اپنی پوزیشن کا احساس تھا۔

''تو تو یہاں شانتی سے رہ نا۔ اپن دیکھ لے گا سب کچھ دادا تیرے کو ادھر سے باہر نکالنے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اپن بھی یہی کرے گا۔'' رامو نے اسے سمجھایا۔

''نہیں، مجھے اب لندن نہیں جانا۔ ولدار آغا کراچی میں ہے تو میں بھی وہیں جاؤں گا لیکن اس سے پہلے مجھے دادا کے قاتلوں سے حساب لینا ہے۔ یہاں کے سارے کام نمٹائے بغیر میں کہیں نہیں جانے والا۔'' فاروق نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''اپنے پر بھروسا نہیں ہے تیرے کو؟'' رامو نے شکوہ کیا۔

''بات بھروسے کی نہیں، دل کے سکون کی ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے یہ سب کچھ کیے بغیر سکون نہیں پاؤں گا۔''

''پر باہر تیرے لیے خطرہ ہے نا۔ پولیس ہاتھ دھو کر تیرے پیچھے پڑی ہے۔'' رامو نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اب تک بھی تو پولیس کو جل دیتا ہی رہا ہوں نا۔ حلیہ بدل کر نکلنے پر آج تک کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میرا وہ حلیہ بدلنے کا سامان، میں نہیں لاسکا، تم بس اس کا انتظام کردینا۔'' فاروق اپنے فیصلے میں اٹل تھا۔

''چل ٹھیک ہے۔ جیسا تو بولے گا سب ہوجائے گا، پر اپن کو یہ تو بتا کہ تیرے مگج (مغز) میں کیا ہے۔'' رامو نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

''پہلے تم جا کر وکیل اشوک بچن سے ملو اور اپنے ساتھ گرفتار ساتھیوں کی ضمانت کا انتظام کرو۔ گولو کی لاش یقیناً پولیس کسٹڈی میں ہوگی، اس کی حوالگی کے لیے بھی دعویٰ کرنا۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نکل گیا تو ٹھیک ورنہ مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے شہزادے! مالا آجائے تو اپن جاتا ہے وکیل سے ملنے۔ تیرا یہ حلیہ بدلنے والا آئیڈیا اچھا ہے۔ اپن بھی کوئی پنڈت شنڈت بن کر نکل جائے گا۔ اس کے لیے تو مالا کے صندوقوں میں سے ہی کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔'' رامو بھی پُرجوش ہوگیا۔ اسی وقت مالا گھر واپس لوٹ آئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں سنجیدگی تھی۔

''کیوں مالا، کیا معلوم ہوا؟'' رامو نے فوراً اس سے پوچھا۔

''وہاں تو بڑا خوف وہراس پھیلا ہوا ہے اور ہر طرف یہی خبر گرم ہے کہ اس مکان میں خونی اور لٹیرے چھپے ہوئے تھے جن کے لیے پولیس نے چھاپا مارا۔ لٹیروں کی ساتھی لڑکی گرفتار ہوگئی اور ایک ساتھی مارا گیا جبکہ باقی بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ محلے والوں نے پولیس کی کہانی کو سچ جانا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی مشکوک تھے کہ یہ کیسا خاندان ہے جس میں ایک لڑکی کے سوا سارے مرد ہیں اور مرد کسی کام کاج کے لیے گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے، بس لڑکی ہی آتی جاتی دکھائی دیتی ہے۔ پولیس کا چھاپا نہیں پڑتا تو محلے دار خود دو چار دن میں پولیس کو ان کے بارے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔'' مالا نے اپنی حاصل کردہ معلومات ان کے سامنے بیان کیں۔

''لاش کا کیا ہوا؟'' رامو نے دل پر جبر کر کے دریافت کیا۔ گولو کے لیے لاش کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اسے بھی شدید دکھ ہو رہا تھا۔ سیدھا سادہ، بے ضرر سا گولو جس سے وہ کبھی کبھی دل لگی کے لیے چھیڑ چھاڑ بھی کرلیتا تھا، ایسے اچانک دنیا سے چلا جائے گا کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

''لاش تو پولیس والوں کی کسٹڈی میں ہی ہے۔'' مالا نے بتایا۔

''اب وکیل بابو سے ملنے کے لیے جانا ہی ہوگا۔ اپن

تیاری کرتا ہے۔''

''آپ کہاں جانے والے ہیں؟ باہر تو پولیس کا خطرہ ہے نا آپ کو؟'' مالا اس کی بات سن کر گھبرا گئی۔

''فکر نہ کر اور دیکھتی جا کہ اپن کیسے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ ویسے بھی ابھی پولیس والوں کو جاذتی فرصت نہیں ہے۔ بلووں ہنگاموں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اکیلے اپن کی کھوج کا کام نہیں ہے انہیں۔'' رامو نے اسے تسلی دی اور پھر اس سے کچھ چیزوں کے بارے میں دریافت کر کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ ہی وکیل سے ملنے چلتا ہوں۔ یہاں فارغ بیٹھ کر کیا فائدہ ہوگا۔'' فاروق نے بالکل اچانک اپنا فیصلہ سنایا جسے سن کر رامو کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے لیکن پھر وہ نارمل ہو گیا اور فاروق کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آدھ گھنٹے سے کچھ اوپر کا وقت لگا کر وہ دوبارہ مالا کے سامنے آئے تو وہ انہیں دیکھ کر چونک گئی۔ دونوں نے سفید دھوتیاں باندھ کر اوپر سے کرتے چڑھا رکھے تھے اور شانوں پر چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ دھوتی اور کرتہ ایسا لباس تھا جس میں سائز کا زیادہ مسئلہ نہیں تھا اس لیے جسامت میں فرق کے باوجود فاروق نے آرام سے رامو کا دھوتی کرتہ پہن لیا تھا۔ چادریں مالا کی تھیں۔ ماتھے پر تلک اور آنکھوں میں سرمے کی موٹی موٹی لکیریں پھیرنے کے لیے بھی انہوں نے مالا کے میک اپ کے سامان پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ بالوں کو خوب تیل چپڑ کر بیچ کی مانگ نکالنے کے بعد دونوں جانب ان کی پٹیاں سی جمائی گئی تھیں۔ رامو کے کرتے کا رنگ زرد تھا جبکہ فاروق نے سفید کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے جسم پر قدرے ڈھیلا تھا لیکن زیادہ برا نہیں لگ رہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دونوں اس حلیے میں اتنے مختلف لگ رہے تھے کہ سرسری نظر میں انہیں پہچاننا آسان نہیں تھا۔

''یہ آپ دونوں نے اپنا کیا حال بنا لیا؟'' مالا نے انہیں دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''تیری چنتا دور کرنے کا انتظام کیا ہے۔ بول پولیس اب بھی ہمیں پہچان سکتی ہے کیا؟'' رامو نے اس سے کارکردگی کی داد چاہی۔

''بالکل نہیں۔'' مالا نے جواب دیا اور ان دونوں کو رکنے کا اشارہ کر کے تیزی سے باورچی خانے کی طرف دوڑی پھر اس نے جھٹ پٹ دسترخوان بچھا دیا۔ ان دونوں کا ہی کھانا کھانے کا موڈ نہیں تھا لیکن مالا کے اصرار اور خلوص نے مجبور کر دیا اور وہ دل پر جبر کر کے چند لقمے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ ابھی مشکل سے چند گھنٹے ہی تو گزرے تھے گولو کی موت کو۔ خود کو لاکھ سنبھال لینے کے باوجود اس دکھ سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ مالا خود بھی اس بات کو سمجھتی تھی اس لیے ایک حد سے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اشوک بچن کا دفتر یہاں سے دور ہونے کی وجہ سے انہوں نے سواری کے لیے ٹیکسی کا انتخاب کیا تھا۔ ٹیکسی نے انہیں مطلوبہ مقام پر اتار دیا۔ اشوک بچن کی اسسٹنٹ نے ان کی خواہش پر اشوک سے اجازت لے کر انہیں اس کے دفتر میں بھیج دیا۔ وہ کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر انہیں بیٹھنے کو کہا اور ایک آدھ منٹ فائل میں مصروف رہنے کے بعد اسے بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''فرمائیے! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟''

''وہی جو اب تک کرتے رہے ہیں۔'' فاروق نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا تو وہ چونک کر ان دونوں کی شکلیں دیکھنے لگا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''اچھا تو یہ آپ لوگ ہیں۔ میں اتنے دنوں سے ویٹ کر رہا تھا کہ کب آپ میں سے کوئی کونٹیکٹ کرتا ہے۔ جو کچھ اوپر ہوا اس کی مجھے خبر مل گئی تھی لیکن کسی کارروائی

غلام

کانٹوں پر رہتے ہوئے بھی ہوا کے گیلے جھونکے کو محسوس کر کے پھول کی طرح مسکرایا کرو۔ شک وشبہ کو اپنے دماغ میں کسی صورت بھی پیدا نہ ہونے دو۔ زندگی کا ہر لمحہ، ہر پل محبت کا ہے۔ اس لیے وقتی خوشی کو دائمی مسرت جانا کرو۔ سب سے پیار کرو، سب کو اچھا سمجھو لیکن کسی سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ بھی تم سے پیار کرے اور اچھا سمجھے۔

تم دن کے آفتاب کے سامنے بھی آزاد ہو، تم رات کے چاند ستاروں کے سامنے بھی آزاد ہو۔ تم وہاں بھی آزاد ہو، جہاں نہ سورج ہے، نہ چاند ہے، نہ تارے ہیں بلکہ کائنات کی طرف آنکھیں بند رکھنے کے بعد بھی آزاد ہو لیکن تم غلام ہو تو اس چیز کے سامنے، جس سے تم محبت کرتے ہو۔

مرسلہ: ہمیرا سعید...... سکھر

کے لیے مدعی کا ہونا لازم ہوتا ہے۔ اپنے طور پر میں نے یہ ضرور معلوم کروالیا تھا کہ گرفتار افراد میں کون کون شامل ہے۔ دادا، رام داس اور آپ کے نام گرفتار ہونے والوں میں شامل نہیں تھے اسی لیے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی جلد کونٹیکٹ کرے گا۔'' اب وہ براہِ راست فاروق سے مخاطب تھا۔

''حالات ہی ایسے ہوگئے تھے کہ ہمیں انڈرگراؤنڈ ہونا پڑا۔ ایک دوسرے سے الگ ہوکر دماغ بھی ڈھنگ سے کام نہیں کررہا تھا۔ دوسرے پے درپے صدموں نے بھی نڈھال کررکھا ہے اسی لیے اب چھپ چھپا کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ کوئی اچھا مشورہ دے دیں۔ ہماری خواہش ہے کہ معاملات قانونی طور پر حل ہوجائیں تو اچھا ہے، باقی پھر ہم وقت کی ضرورت کے حساب سے دیکھ لیں گے۔''

''آپ مجھے کھل کر سب بتائیں، تب ہی میں آپ کو بہتر مشورہ دے سکوں گا۔'' اشوک بچن ہمہ تن گوش ہوگیا۔ فاروق نے بملا کی خودکشی سے سارا قصہ سنانا شروع کیا کہ کیسے اس خودکشی کو قتل کا رنگ دے کر پولیس والوں نے اسے پھنسانے کی کوشش کی اور پھر دادا کو بھی سازشوں کے گھیرے میں لینا چاہا۔ دادا اس چال میں نہیں پھنسا تو انہوں نے بھیڑیوں کی سی چالاکی اور سفاکی کے ساتھ اسے تنہا گھیر کر ماردیا۔ وہ رین کے قتل سے لے کر اپنے فرار اور گولو کی موت تک سب کچھ سناتا چلا گیا، البتہ اپنی انتقامی کارروائیوں کا ذکر نہیں کیا۔ اشوک بچن وکیل تھا اور دن میں دسیوں عجیب و غریب کہانیاں سنتا تھا لیکن رین کی موت نے اسے بھی صدمے سے دوچار کردیا اور کچھ دیر سرپکڑ کر بیٹھے رہنے کے بعد وہ بے یقینی کے عالم میں بولا۔

''آئی ڈونٹ بلیواٹ کہ دادا جیسا شاندار آدمی اس سنسار سے چلا گیا ہے۔ وہ اتنا فل آف لائف پرسن تھا کہ اس کے لیے مرے ہوئے کا سوچنا بھی عجیب لگتا ہے۔''

''یقین تو ہمیں بھی نہیں آتا لیکن حالات کی کڑی دھوپ میں اپنے سروں پر کوئی سایہ نہیں پاتے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ واقعی دادا اس دنیا میں نہیں ہے، ورنہ اس کے ہوتے ہوئے ہم اتنے خوار کیوں ہوتے۔'' فاروق نے بجھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ڈونٹ وری۔ مجھ سے جتنا ہوسکا، آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، مجھے فوری طور پر چار کام کرنے ہوں گے۔ نمبر ایک مسٹر رام داس کی بیل بی فور اریسٹ، نمبر دو تھانے میں بند اڈے کے لوگوں کی ضمانت پر رہائی، نمبر تین گولو کی لاش کی وصولی اور نمبر چار کیتھرائن کو پولیس کے چنگل سے نکالنا۔ پہلا اور دوسرا کام اتنا مشکل نہیں۔ گولو کی لاش کی حوالگی پر پولیس تھوڑی سخرات کرے گی لیکن اس کا ایک حل یہ ہے کہ ہم کسی ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ بنوا لیتے ہیں کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ لڑکا تھا جس کے کسی جرم میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر وہ مجرموں کے ساتھ پایا بھی گیا تھا تو اس میں اس کی عقل سمجھ کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ وہ اڈے پر ریڈ کے بعد وہاں سے نکل بھاگنے کے بعد ان کے چنگل میں پھنس گیا ہوگا۔ موت کے بعد یوں بھی پولیس لاش ورثا کے حوالے کرنے کی پابند ہوتی ہے، چاہے مرنے والا کتنا ہی بڑا مجرم ہو۔ گولو کے وارث اڈے والے ہیں اور اڈے والوں کو اس کی لاش وصول کرنے کا حق ہے۔ کیتھرائن والا معاملہ البتہ میں اس کے پولیس کو دیے گئے بیان کو معلوم کرنے کے بعد دیکھوں گا۔ اس کی ضمانت کروانے کے لیے اس کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔'' اشوک بچن جوان آدمی تھا لیکن اس کی ذہانت اس کے تجربے سے زیادہ اس کی مددگار تھی۔ وہ بہت تیزی سے مسائل کا حل سوچتا تھا اور پھر عملی اقدامات اٹھانے کے لیے کمربستہ ہوجاتا تھا۔ اس سے ملاقات رامو اور فاروق کے لیے حسبِ توقع سودمند ثابت ہوئی اور وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔

''آپ اپنے شہزادے کے لیے تو کوئی رائے نہیں دیے وکیل بابو! اس کا بھی تو کچھ کرونا۔'' رامو نے اشوک بچن سے مطالبہ کیا۔

''اسے ابھی انڈرگراؤنڈ ہی رہنے دو اور ہر پوچھنے والے کو یہی بتاؤ کہ یہ لندن چلا گیا ہے۔ دادا کی موت سے واقف ہونے کا اعلان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہی ظاہر کرو کہ تم لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اور ماضی کی طرح وہ تم لوگوں کو کچھ بھی بتائے بغیر غائب ہوگیا ہے۔'' اشوک بچن نے مشورہ دیا جس پر فاروق تائیدی انداز میں سرہلاتا رہا۔ اس گفتگو کے بعد اشوک بچن نے ضروری کاغذی کارروائی پوری کروائی پھر ان لوگوں کو وہاں سے جانے کی اجازت دی۔ وہ لوگ روانہ ہونے لگے تو اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پہلے رامو سے مصافحہ کیا پھر فاروق کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ہلکے سے دباتے ہوئے بولا۔

''اوکے مسٹر فاروق! گڈ لک اینڈ کیری آن۔''

فاروق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھید بھری مسکراہٹ تھی۔ فاروق سمجھ گیا کہ جو کچھ اس

نے بیان نہیں کیا، وہ بھی اشوک بچن سمجھ چکا ہے۔ وہ وکیل تھا، اخبارات کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی ہونے والے واقعات کی خبریں اس تک پہنچ جاتی تھیں۔ بھائیہ سیٹھ، ٹیکسی ڈرائیور مہیش، مجو دادا اور فیکے کی اموات کی خبریں اس تک بھی پہنچی ہوں گی۔ ممکن ہے ان خبروں کے ساتھ فاروق کا نام بھی کانوں تک پہنچا ہو اور اب رین کی موت سے واقف ہونے کے بعد وہ ''محرک'' بھی جان چکا تھا تو اس نے یونہی فاروق کو ''کیری آن'' کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ فاروق نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اس سے نظریں ملائیں اور نظروں ہی میں پیغام دیا کہ اب وہ پیچھے ہٹنے والا ہے بھی نہیں۔ جو کام شروع کیا ہے، اسے ہر حال میں پورا کر کے چھوڑے گا۔ اشوک بچن نے اس پیغام کو پڑھ لیا اور ایک بار پھر اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دوستانہ انداز میں دبا کر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

اسد اللہ کی طبیعت بہت مضمحل تھی۔ صدمات نے جو متاثر کیا سو کیا تھا، ایک بوجھ اپنے عزیز دوست کے بیٹے آصف خان کے مارے جانے کا بھی تھا۔ دوست نے تو اپنے بیٹے کو اس لیے حیدر آباد بھجوایا تھا کہ وہ اسے خاندانی دشمنی کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ ماں باپ نے اپنے جوان بیٹے کی دوری پر یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ وہ ان سے دور سہی پر جیتا تو رہے گا لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ موت نے وہاں بھی اس کو گھیر لیا تھا۔ موت ہے ہی ایسی چیز کہ جب کسی روح کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے آگے ہر تدبیر بے کار چلی جاتی ہے۔ آصف خان کے باپ کی تدبیر بھی کام نہیں کر سکی تھی اور اس کا لختِ جگر بلوائیوں کی نفرت و لالچ کا نشانہ بن کر ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گیا تھا۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ اسد اللہ، آصف خان کے باپ کو وقت پر اطلاع دے پاتے۔ وہ تو خود اس وقت حیدر آباد پہنچے تھے جب مرنے والوں کی تدفین کی جا چکی تھی۔ ایسے میں ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنے دوست کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دے سکیں۔ وہ بے چارے ماں باپ تو یقیناً اس بات کے منتظر ہوں گے کہ کب اسد اللہ کی طرف سے جولیٹ اور آصف خان کے رشتے کی منظوری دی جاتی ہے اور منگنی کی تاریخ طے ہوتی ہے۔ وہ بے چارے تو بیٹے کی خوشیاں دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے، انہیں اس کی موت کی خبر دینا کیسا کارِ دشوار تھا لیکن یہ فریضہ تو انجام دینا ہی تھا اس لیے پاکستان پہنچنے کے بعد چند بہت ہی اہم امور کی انجام دہی سے جیسے ہی فرصت ملی انہوں نے رختِ سفر باندھا اور دوست سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔

ان کے تکلیم کے کاغذات جمع ہو گئے تھے اور شجاعت نے انہیں یقین دلایا تھا کہ بہت جلد کراچی میں ان کے لیے رہائش گاہ کا انتظام ہو جائے گا۔ ثروت بیگ بھی کافی مطمئن دکھائی دے رہے تھے اور اسد اللہ کے ساتھ اس بات پر متفق تھے کہ قدرت نے دستِ غیب سے ان کی مدد کی تھی جو اتنے اچھے خاندان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ ان دونوں خاندانوں کے افراد کی رہائش و طعام کی مکمل ذمے داری ان کے میزبانوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ صاحب فراش ندرت جہاں کی بھی زنان خانے میں تسلی بخش دیکھ بھال ہو رہی تھی اور مایوسی اور دکھ میں مبتلا صفی اللہ کو بھی شجاعت اور صداقت کے والد وقتاً فوقتاً حوصلہ دیتے رہتے تھے۔ اس طرف سے مطمئن اسد اللہ نے دوست سے ملاقات کے لیے سامان باندھا اور اس کے گھر جا پہنچے۔ دوست انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور بہت خوش بھی۔ خوشی کی ایک وجہ تو طویل عرصے بعد اچھے دوست سے ملنا تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسد اللہ نے آصف خان کا رشتہ منظور کر لیا ہے اور اس سلسلے میں ضروری بات چیت کے لیے اس کے پاس آئے ہیں۔ بیٹے کے سر پر سہرا سجنے کے خیال سے وہ بہت خوش تھا۔ اس کے خاندان میں کسی دوسرے خاندان میں رشتہ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ جو ایسا کرتا تھا اس کا دوسرے خاندان والے بائیکاٹ کر دیتے تھے اور دوسرے بچوں کے لیے بھی رشتے نہیں ملتے تھے لیکن آصف خان کی زندگی اور خوشی کے لیے اس کے باپ نے یہ بھی منظور کر لیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ آصف خان نے کسی ایسی ویسی لڑکی کے بجائے اسد اللہ کی بیٹی کا انتخاب کیا ہے، چنانچہ اس نے صرف ایک دوست ہی نہیں، ہونے والے سمدھی کا بھی بانہیں کھول کر استقبال کیا تھا۔ ان کی آمد کی اطلاع پاتے ہی اس کے گھر میں خوشی کی ایک لہر پھیل گئی تھی۔ فوراً ہی معزز مہمان کی عمدہ خاطر مدارات کے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ ان رویوں کو دیکھ کر اسد اللہ فوری طور پر کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکے اور خاموشی اختیار کر لی۔ دوست نے ان کی خاموشی کو محسوس تو کیا لیکن خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ اسد اللہ طویل سفر سے تھکے ہوئے ہیں، دوسرے وہ بیٹی کے باپ ہیں اس لیے کھل کر خوشی کا اظہار کرنا انہیں معیوب لگتا ہوگا۔ اس نے مہمان خانہ کھلوا کر اسد اللہ کے نہانے دھونے اور آرام کا انتظام کروایا۔ اسد اللہ دوبارہ اس کے روبرو ہوئے تو اس نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے ان سے

ان کی مرضی دریافت کی۔

"ابھی نہیں خان! پہلے ہمیں وہ بات کرنے دو جسے کرنے کے لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔" اسد اللہ نے اسے کھانا لگوانے سے روک دیا۔

"بات کیا کرنی ہے یار! بیٹی بھی تمہاری ہے اور بیٹا بھی تمہارا۔ تم جو مناسب سمجھو کرو۔ مجھے تمہاری کسی شرط پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اسے گمان ہوا تھا کہ اسد اللہ رشتہ طے کرتے ہوئے کوئی کڑی شرط عائد کرنا چاہتے ہیں اسی لیے خود اتنا طویل سفر طے کرکے یہاں آئے ہیں اور اس قدر سنجیدہ ہیں۔

"ہمیں معاف کردو خان! ہم تمہارے بھروسے اور اعتبار پر پورے نہیں اتر سکے۔ ہم سے تمہاری قیمتی امانت کی حفاظت نہیں ہوسکی۔" انہوں نے دوست کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی اور سر جھکا کر آزردگی سے بولے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو اسد اللہ! میں کچھ سمجھ نہیں پارہا۔" اس بار وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔

"ہم آصف خان کو اپنا داماد نہیں بنا سکتے۔ قسمت نے ہم سے بڑا بھیانک مذاق کیا ہے۔ ہم اپنی بیٹی اور تمہارے بیٹے دونوں کو کھو چکے ہیں۔"

"کھل کر بات کرو اسد اللہ! آخر کیا ہوا ہے؟" اس بار خدشات سے اس کی آواز لرز گئی۔ جواب میں اسد اللہ نے حویلی پر ٹوٹنے والی قیامت کی پوری تفصیل سنا ڈالی۔ اس خونچکاں داستان کو سننے والا اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ شکوہ کرتا بھی تو کس سے۔ جو اس کے بیٹے کی موت کی خبر دے رہا تھا، اس کا اپنا پورا خاندان اس الم ناک حادثے کی زد میں آگیا تھا اور یہ کسی ایک خاندان کی تو داستان نہیں تھی۔ کتنے ہی ہنستے بستے خاندان اس درندگی کا شکار ہوگئے تھے۔ اخبارات جتنی خبریں دیتے تھے، اصل حساب کتاب اس سے کہیں اوپر تھا۔ بہت سی خبروں کو تو منظر پر آنے ہی نہیں دیا جارہا تھا اور نہ اسد اللہ کا خاندان اتنا معمولی نہ تھا کہ اس پر بیتنے والے سانحے کی خبر کسی کو نہ ہو پاتی۔

اسد اللہ نے سکتہ زدہ دوست کو اپنے طور پر تسلی دلاسا دیا اور فوراً ہی واپسی کا فیصلہ بھی سنا دیا۔ دوست کا غم بانٹنے کی خواہش کے باوجود ان میں حوصلہ نہیں تھا کہ کچھ اور غم گزیدہ لوگوں کے آنسوؤں کو اپنے دل پر سہہ سکیں۔ وہ خود غم سے چور پتا نہیں کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھے، کسی اور کا دکھ کیسے بانٹتے..... اس لیے فوراً ہی وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ وہ دوست کے گھر سے نکل رہے تھے تو ان کے کانوں نے اس گریہ وزاری کی آوازیں سنی تھیں جو اس..... گھر کے جوان بیٹے کی موت کی اطلاع سن کر زنان خانے سے بلند ہوئی تھیں۔ غم سے نڈھال، اپنی روایات کی سخت پابند پردہ دار بیبیوں کو اس وقت ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ یہ درک سکیں کہ اس خاندان کی عورتوں کی آواز بھی غیر مردوں کے کانوں میں جانا گوارا نہیں کیا جاتا۔ اسد اللہ وہاں سے لوٹ آئے تھے لیکن طبیعت کا اضمحلال کسی طرح کم نہیں ہورہا تھا۔ شجاعت نے انہیں کلیم کے سلسلے میں ضروری کارروائی کے لیے کراچی جانے کا کہا تو بھی وہ بہت بجھے دل سے جانے کے لیے راضی ہوئے۔ طے پایا کہ فی الحال صرف وہ اور ثروت بیگ ہی کراچی جائیں گے اور باقی اہل خانہ لاہور ہی میں رکے رہیں گے۔ شجاعت نے ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں ان کی کراچی جانے کی بکنگ کروائی تھی۔ وہ خود ان دونوں کو ریلوے اسٹیشن چھوڑنے کے لیے آیا تھا اور انہیں ان کی نشستوں پر بٹھا کر وہاں سے گیا تھا۔

ریل کی روانگی میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ شجاعت نے معذرت کی تھی کہ اسے ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے اس لیے وہ ریل روانہ ہونے تک وہاں نہیں رک سکتا۔ انہوں نے اور ثروت بیگ نے اس کی مجبوری کو سمجھا تھا اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کیا تھا کہ وہ جتنا کچھ ان کے لیے کررہا تھا، وہی بہت تھا۔ شجاعت چلا گیا تو ثروت بیگ ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول ہوگئے اور اسد اللہ اپنی کیفیت کے زیراثر یونہی سر نیہوڑا کے بیٹھ گئے۔ ڈبے میں کچھ اور لوگوں کی آمد ہوئی تو بھی انہوں نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بس آوازوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ کسی کو رخصت کرنے آئے ہیں اور طرح طرح کی سفری ہدایات جاری کی جارہی ہیں۔

"بس کرو بھئی، یہ کوئی میرا پہلا سفر نہیں ہے جو تم لوگ اتنی ہدایات دے رہے ہو۔" مسافر نے ان ہدایتوں پر ہنس کر کہا تو بہت ہی شناسا لب و لہجے پر اسد اللہ نے تیزی سے چہرے پر دھرا بازو ہٹایا اور آواز کی سمت دیکھا۔ ان کی نظروں نے فوراً ہی ایک ایسے چہرے کو اپنی گرفت میں لیا جس کو یہاں دیکھنے کا انہیں کوئی گمان ہی نہیں تھا۔ وہ یک ٹک پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتے رہے اور پکارنے کی خواہش میں ان کے ہونٹ لرز اٹھے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کرشمہ

سلیم انور

دنیا میں جس طرح عقلمند ایک سے بڑھ کر ایک پیدا کیے گئے ہیں... اسی طرح بے وقوفوں کی بھی کمی نہیں ہے... جسے اپنی ذات پر بھروسا اور خدا پر یقین نہ ہو... تو وہ ایسے ہی اپنی ان چالوں میں الجھ الجھ کر گرتا ہے جو وہ دوسروں کے لیے چلنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کرشمہ یہاں بھی سب کی توجہ کا منتظر تھا۔

ایسی خواہش کا احوال جو ایک دیوی کے روپ میں پوری ہونے والی تھی

چارلی گریوز کو فٹز ولیم میوزیم میں کام کرتے ہوئے بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ عجائب گھر کے نوادرات کے شعبے کا نگراں تھا۔ اس کی کارکردگی ہمیشہ سے صاف ستھری اور بے عیب رہی تھی۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا اور وہ اس پر ناز کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ حسب معمول صبح سویرے میوزیم پہنچ گیا تا کہ نادر قدیم مصری نیکلس پر گہری نظر ڈال سکے۔ ساٹھ سالہ کیوریٹر کو اس نادر نیکلس کو دیکھے بغیر سکون



نہیں ملتا تھا اور اس تمام عرصے میں اس نیکلس سے اس کی الفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ نیکلس صلیب کی شکل میں تھا اور اس کے عمودی بازو میں ایک ڈوری لٹکی ہوئی تھی۔ اس نیکلس میں زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ یہ نیکلس میوزیم کی نچلی گیلری میں موجود تمام قیمتی نوادرات میں سے ایک تھا۔

چارلی گریوز شیشے میں رکھے ہوئے قدیم مصری نادر نیکلس کا حسب عادت بڑے چاؤ سے جائزہ لے رہا تھا۔ اسے ایک قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا اور تب اس کی نگاہ اچانک شیشے کے باکس میں اپنے عکس پر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عکس کا نرخرہ دبا رہا ہے۔ یہ عکس اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ اب جوان آدمی نہیں رہا اور بڑھاپا اس کے جسم پر حملہ آور ہو چکا ہے...... آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، چہرے پر جھریاں اور سر کے تیزی سے جھڑتے ہوئے بال اور جو رہے سہے بال تھے' ان میں بھی سفیدی آ چکی تھی۔

ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد اسے یہ اطمینان ہونا چاہیے تھا کہ وہ ابھی مزید پانچ سال تک عجائب گھر میں خدمات سرانجام دے سکتا ہے لیکن حالات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ میوزیم میں اس کی ملازمت کے دن کم رہ گئے ہیں۔ میوزیم کی کینٹین میں ہونے والی گفتگو اس پر بری طرح اثر انداز ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے قدیم یونانی تلواروں میں سے کوئی ایک اس کے دل میں گہرائی تک گھونپ دی گئی ہو۔

''میں نے سنا ہے کہ بوڑھے چارلی کو ہٹایا جا رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟'' کوئی کہہ رہا تھا۔

''اپنے وقت سے پانچ سال قبل۔ بڑا خوش قسمت کمینہ ہے...... البتہ وہ اپنی محنت کا صلہ پا چکا ہے۔''

مگر...... اس افواہ کی وضاحت اس حقیقت سے ظاہر ہو گئی جب نوعمر...... بین کو اس سے متعارف کرایا گیا جسے ایمپلائمنٹ ایکس چینج نے بھیجا تھا۔

ساتھ ہی حکم یہ تھا۔ ''اسے طور طریقے سکھاؤ، چارلی۔ یہ پانچ سال میں اس حد تک تیار ہو جائے گا کہ جب تم ریٹائر ہو گے تو یہ تمہاری جگہ سنبھال سکے۔''

''یہ لوگ جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہے ہیں۔'' چارلی نے دل ہی دل میں کہا۔ ''ان کا قطعی یہ ارادہ نہیں ہے کہ میں میوزیم میں اپنی ملازمت کی مدت پوری کر لوں۔''

''گڈ مارننگ، مسٹر گریوز!''

برہم بوڑھے چارلی نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے لیے باعثِ آزار نوجوان بین کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ''آہ بین...... گڈ مارننگ! تم جلدی نہیں آ گئے؟'' چارلی نے نوجوان کی سرخ رنگ کی...... تربیتی وردی کے کوٹ کا اوپری بٹن لگاتے ہوئے کہا۔

''ویل، تم ہی نے تو کہا تھا کہ پابندی وقت ایک اہم اثاثہ ہے جو ہر ایک کے پاس ہونا چاہیے مسٹر گریوز!''

چارلی کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ عود کر آئی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے زیر تربیت بین پر ڈالی۔ اس کے گھنے سیاہ بال اور صاف شفاف نیلی آنکھوں کی چمک اس کی نوجوانی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

''یہ نیکلس مسٹر گریوز! آپ اس کے بے حد گرویدہ ہیں۔ ہے نا؟'' بین نے معصومیت سے پوچھا۔

چارلی نے پلٹ کر اپنی شیشے جیسی شفاف آنکھیں اس نادر نیکلس پر مرکوز کر دیں۔ ''بلاشبہ میں اس پر شیفتہ ہوں، بین...... یہ نیکلس ہمیشہ یہاں موجود رہے گا۔ کیا تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ یہ نیکلس ایک قدیم مصری شہزادی کے جسم کی زینت رہا ہے؟''

''یہ نیکلس کیا ہے، مسٹر گریوز؟''

''بوائے، الفاظ اس کی کرامات کی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ تم نے پوچھا ہے یہ کیا ہے؟ یہ نیکلس حمل کی دیوی آئرز سے منسوب ہے اور اس کی نذر کیا گیا تھا...... سو روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ جو کوئی بھی اس نیکلس کو پہنے گا، اسے بچوں کی دولت عطا ہو جاتی ہے۔''

اس بات پر چارلی نے بین کا چہرہ سرخ اور تاثرات بدلتے ہوئے دیکھے۔ ''کیا کچھ گڑبڑ ہے، بین؟''

''نہیں مسٹر گریوز! نو بجنے ہی والے ہیں...... میوزیم کے کھلنے کا وقت ہو گیا ہے۔'' بین نے جواب دیا۔

دو گھنٹے بعد وہ دونوں میوزیم کی کینٹین میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بین کی غیر معمولی خاموشی کو بوڑھے چارلی نے فوراً ہی بھانپ لیا۔ گو بین نے بلاشبہ قبل از وقت اس کی جگہ لینے کے لیے اپنی دھار تیز کی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود چارلی اس لڑکے کو چاہنے لگا تھا۔

زمانہ شناس چارلی نے کینٹین میں چاروں طرف دیکھا۔ مذاق اڑانے والوں کی آنکھوں کی چبھن اسے تیر کے مانند محسوس ہو رہی تھی لیکن اسے ان میں سے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اسے میوزیم میں گزرنے والا اپنا وقت ہی عزیز تھا۔

’’تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے، بین؟‘‘ چارلی نے پوچھا۔ ’’تم بلا تکلف اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ سکتے ہو۔‘‘

بین نے اپنی کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور کسٹرڈ کریم کا ایک چمچہ اپنے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد بولا۔ ’’معاملہ میری بیوی ٹریسیا کا ہے۔‘‘ وہ چارلی سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ’’بلکہ حقیقت میں ہم دونوں کا ہے۔‘‘

’’تم شادی شدہ ہو؟‘‘

’’ہاں۔ دو سال ہو چکے ہیں۔‘‘

’’گڈ گریف!‘‘ چارلی کے منہ سے بے ساختہ حیرت کا کلمہ نکل گیا۔ ’’لگتا تو یوں ہے جیسے تم ابھی حال ہی میں اسکول سے فارغ ہوئے ہو، بیٹے!‘‘

’’میری عمر بیس برس ہے مسٹر گریوز!‘‘

’’پلیز، مجھے چارلی کہہ کر پکارو...... سو تمہارا اور تمہاری بیوی کا کیا معاملہ ہے بین؟‘‘

’’ہم دو برس سے اولاد کے لیے کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ آثار پیدا نہیں ہوئے۔ ہم کلینک میں اپنے ٹیسٹ بھی کرا چکے ہیں' نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ ٹریسیا اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

’’اوہ، آئی ایم سوری بین۔‘‘

بین نے بالآخر نظریں اٹھا کر چارلی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’کیا تمہارے بچے ہیں، مسٹر...... چارلی؟‘‘

’’نہیں...... میں نے کبھی شادی ہی نہیں کی...... میری خواہش ہی نہیں تھی۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ یہ میوزیم ہی میری بیوی اور میری فیملی ہے۔‘‘ چارلی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

’’تمہیں اپنے کام سے واقعی عشق ہے۔ ہے نا؟‘‘

’’ہاں، بین! میں اس سے والہانہ عشق کرتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے یہاں میرا وقت پورا ہو رہا ہے۔‘‘

’’ممکن ہی نہیں چارلی! تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟‘‘

’’اوہ، بس افواہیں ہیں...... میں نے سنا ہے کہ تم نے میری جگہ لینی ہے۔‘‘

’’میں نے؟ تم نے بالکل غلط سنا ہے، چارلی...... مسٹر موبرے نے مجھے بتایا ہے کہ میں تمہاری جگہ لینے کے لیے زیر تربیت ہوں...... لیکن اس میں پانچ سال کا عرصہ لگے گا۔‘‘

’’واقعی؟‘‘

’’ہاں...... میں تنخواہ میں اضافے کا کہنے کے لیے ان کے پاس گیا تھا۔ چونکہ میں ابھی جاب کری ایشن اسکیم میں ہوں اس لیے میری تنخواہ نہ ہونے کے برابر ہے...... انہوں نے مجھے مستقل کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ یہ وعدہ ضرور کیا ہے کہ پانچ سال بعد جب تم ریٹائر ہو جاؤ گے تو وہ تمہارا عہدہ مجھے دیں گے۔‘‘

چارلی زیر تربیت بین کے معصوم چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ وہ یہ وضاحت چاہ رہا تھا کہ کہیں بین جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔ ’’تم ایک عمدہ کیوریٹر ثابت ہو گے، بین۔‘‘

’’تھینک یو...... مجھے افسوس ہے کہ آج میں قدرے کھویا کھویا رہا ہوں لیکن اس کی وجہ وہ کچھ ہے جو تم نے مجھے حمل کی دیوی سے منسوب اس نیکلس کے بارے میں بتائی ہے۔‘‘

’’اوہ مائی گاڈ، آئی ایم سوری بین...... مجھے معلوم نہیں تھا......‘‘

’’میں جانتا ہوں کہ تمہیں معلوم نہیں تھا، چارلی۔ اس بات کو بھول جاؤ۔ اب کام پر واپس جانے کا وقت ہو گیا ہے۔‘‘ بین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اس رات چارلی اپنے بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا بوجھل ضمیر بین کے لیے اس کی چاہت اور اس کے ذاتی مستقبل کے درمیان تقسیم ہو رہا تھا۔

وہ اپنے بستر سے نکلا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کی پالتو ایرانی بلی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے پیروں سے اپنے جسم کو رگڑنے لگی۔ ’’کم آن آئسز، اولڈ گرل۔ دودھ کی پرچ چاہیے، ایں؟‘‘

چارلی نے اپنے لاؤنج کی لائٹ آن کر دی اور اس نادر مصری نیکلس کی متعدد تصاویر اور تراشوں پر نظریں جما دیں جو آتش دان کے اوپر پوری دیوار پر چسپاں تھیں۔ اس نے جھک کر اپنی پالتو بلی کو تھپتھپایا۔ اس کے ذہن میں کئی شیطانی خیالات ابھر رہے تھے۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس قدیم نیکلس کے ایک گلوسی فوٹوگراف پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اس اصلی نیکلس کو چھونے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔

وہ اپنے محبوب خزانے سے اتنا قریب تر ہونے کے باوجود اسے چھو نہیں سکتا تھا، اس خیال سے اس کی انتڑیوں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ یہ کرب اس کے لیے اتنی اذیت کا باعث تھا کہ اس کی عقل مندی کو متاثر کر رہا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی پیاسی بلی کی طرف دیکھا جو ٹھنڈے دودھ کی پیالی کی جانب لپک گئی تھی۔ ’’کل

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ایڈ فری لنکس
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



آئس، کل۔"

☆☆☆

اگلا دن روشن اور چمک دار تھا۔

چارلی نے بین پر زور دیا کہ وہ اس کے ہمراہ لنچ کرنے کے لیے قریبی پارک میں چلے تاکہ وہ دھوپ سے لطف اندوز ہوسکیں۔ حقیقت میں بوڑھے چارلی کے اس فیصلے کا تعلق خوش گوار موسم سے بالکل بھی نہیں تھا۔ پارک کا وسیع و عریض رقبہ اور کھلی فضا ان کی خلوت کی ضمانت تھا جہاں میوزیم کا کن سوئیاں لینے والا اسٹاف ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

چارلی نے بین کی رضامندی کے پیش نظر سینڈوچز کا ڈبل راشن ساتھ لے لیا تھا۔ انہوں نے جھیل کے قریب ایک الگ تھلگ مقام کا انتخاب کیا اور ایک خالی بینچ پر جا بیٹھے۔

"مجھے امید ہے کہ تم سامن مچھلی اور کھیرے کو پسند کرتے ہو گے بین؟"

"یہ عمدہ رہیں گے، چارلی۔"

چارلی کی حریصانہ نظروں کو محسوس کرتے ہوئے نوعمر بین بے چین سا ہو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چارلی کوئی نہ کوئی انوکھی بات کہنے والا ہے لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اس کے جواب میں کس ردعمل کا اظہار کرے گا۔ گو اس کے پاس بوڑھے چارلی کی پٹائی کرنے کا آپشن موجود تھا لیکن وہ اس سے محظوظ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"بین! تم مجھے گستاخ تو محسوس کرو گے لہٰذا کسی بھی وقت جب تم ضروری سمجھو، مجھے ٹوک دینا!"

"مسٹر گریوز! میں ایک پُرمسرت شادی شدہ شخص ہوں۔" بین نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا؟ خدارا ایسا نہیں ہے...... یہ دنیا کدھر جا رہی ہے؟" چارلی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تمہارے ذہن کے اطمینان کے لیے بین، میں واضح کر دوں کہ میں ایک ساٹھ سالہ کنوارا بوڑھا ہوں اور میری کسی قسم کی کوئی خواہش نہیں ہے اور مجھے آئندہ بھی اسی طرح رہنے کی خواہش ہے۔"

چارلی کے اس اعتراف کے بعد بین نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور سینڈوچ کا ایک لقمہ لیتے ہوئے ان بطخوں کی جانب دیکھنے لگا جو جھیل میں تیرتی ہوئی ان ہی کی جانب آرہی تھیں۔ "سو تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" اس نے چارلی سے پوچھا۔

چارلی نے آگے کھسک کر اپنا باقی ماندہ سینڈوچ بھوکی بطخوں کی جانب اچھال دیا۔ "جو بات تم نے اپنی بیوی اور اپنے بارے میں بتائی تھی، اس سے متعلق بات کرنی ہے۔"

"اپنی بیوی کے بارے میں؟"

"ہاں، تم نے ہی تو کہا تھا...... کہ وہ بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔"

"پلیز مسٹر...... چارلی، میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہوں گا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں لیکن پلیز، پہلے میری بات تو سن لو...... اگر وہ حمل کی دیوی کا مصری نیکلس تمہارے لیے مہیا کر دیا جائے تو... کیسا رہے گا؟"

بین سٹپٹا سا گیا اور اس کے سینڈوچ کے کئی ریزے پھوار کی شکل میں اس کے منہ سے نکل پڑے۔ "کیا تم سنجیدہ ہو؟" اس نے اپنی بے ربط سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں نے تم سے کبھی مذاق کیا ہے؟"

"چارلی! اگر میں اس نیکلس کے پُرفریب جنتر منتر کے بارے میں یقین بھی کر لوں تو لگتا ہے کہ تم ایک چھوٹا سا نکتہ بھول رہے ہو۔" بین نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"الارم سسٹم جو نیکلس کی حفاظت کے لیے لگا ہوا ہے۔"

"جیسا کہ تم جانتے ہو، میوزیم میں آرائش و زیبائش کا کام بڑے پیمانے پر جاری ہے اور اس کے لیے الارم کو اکثر بند کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے الارم سسٹم کی چابیاں مجھے سونپ دی گئی ہیں۔ سو تم سمجھ سکتے ہو کہ اپنی غائب دماغی کی وجہ سے میں الارم کو ایک یا دو گھنٹے کے بعد آن کرنا بھول جاتا ہوں۔" چارلی نے بتایا۔

"الارم سسٹم کی چابیاں تمہیں سونپی گئی ہیں؟" بین نے قدرے حیرانی کا اظہار کیا۔

"یقیناً...... لیکن صرف نچلی گیلری کی چابیاں...... اور تمہارے لیے یہ لازم ہوگا کہ تم اس بارے میں یقیناً کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے۔"

بین نے اپنے بکھرے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں درست کیا اور قدرے سوچنے کے بعد بولا۔ "تم نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا ہے نا؟"

"تم مجھ پر یہ احسان کرو گے، بین۔"

"میں؟ وہ کس طرح؟"

"جیسا کہ تمہارے علم میں ہے، میں اس نادر

قدیم مصری نیکلس کی پوجا کرتا ہوں اور اس کو حقیقت میں استعمال میں لانے سے میرا دل خوشی سے نہال ہوجائے گا۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... اگر ہم پکڑے گئے تو پھر؟'' بین نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میری بات توجہ سے سنو، بین۔ میں تمہیں میوزیم کی فالتو چابی دے دوں گا۔ تم کل صبح خاص طور پر جلدی آجانا۔ سویرے سات بجے کیسا رہے گا؟ میں الارم سسٹم کو غیر فعال کردوں گا اور تمہارے پاس اتنا وقت ہوگا کہ تم اپنے گھر کھسک جاؤ اور وہ کام کرلو جو تمہیں لازمی کرنا ہوگا!'' چارلی نے کہا۔

''تم وہاں موجود نہیں ہوگے؟''

''نہیں، بین۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرا کمزور دل خوشی کی اس ولولہ انگیزی کو برداشت کر پائے گا۔ تمہاری آمد سے کچھ دیر قبل میں میوزیم پہنچ جاؤں گا اور گھر واپسی سے پہلے الارم کو آف کردوں گا۔''

''مجھے حقیقت میں کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہاری شادی کو دو سال ہوچکے ہیں اور تمہیں معلوم نہیں؟''

''نہیں...... میرا مطلب ہے کہ مجھے نیکلس کا کیا کرنا ہوگا؟''

''ملاپ سے پہلے نیکلس کو اپنی بیوی کی گردن میں پہنا دینا...... سمجھ رہے ہونا؟''

''اور تمہیں مجھ پر اعتبار ہے کہ میں نیکلس لوٹا دوں گا؟''

''یقیناً...... سو تم کیا کہتے ہو، بین۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تمہارے یہاں اگلے موسمِ بہار میں بچوں کی بہار کا آغاز ہوجائے گا۔''

''مجھے اس بارے میں غور کرنا پڑے گا، چارلی...... مجھے اس بارے میں اپنی بیوی سے بھی بات کرنا پڑے گی۔''

چارلی بینچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور متشکک بین کی جانب گھوم گیا۔ ''یہ دانش مندی نہیں ہوگی، بین...... اس بات سے قطع نظر کہ تمہارا فیصلہ کیا ہوگا، میں صبح الارم سسٹم کو آف کردوں گا۔ میں چپکے سے غائب ہوجاؤں گا لہٰذا تم مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا...... آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر نیکلس مجھے لوٹا دینا اور میں اسے واپس اس کے شیشے کے کیس میں رکھ دوں گا۔ اس طرح کسی کو بھی اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''جیسا کہ میں نے کہا چارلی، مجھے اس بارے میں اپنی بیوی سے بات کرنا پڑے گی۔'' بین نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہوسکتا...... میں تمہارے لیے اتنا بڑا رسک لے رہا ہوں بین...... جتنے کم لوگوں کو ہمارے اس منصوبے کا علم ہو اتنا ہی بہتر ہوگا۔''

''کلوز سرکٹ کیمروں کے بارے میں کیا ہوگا؟'' بین نے پوچھا۔

چارلی نے اپنی انگلیوں میں دبی چابیاں لہرادیں اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر کی میرے پاس ہے، بین...... آؤ اب چلیں۔ ہم لیٹ ہورہے ہیں۔''

☆☆☆

چارلی کے معمول سے زیادہ پسینا آنے کا سبب ہوا کا بند ہونا یا سورج کی تپش نہیں تھا۔ اس نے میوزیم جانے کے لیے اس روز صبح پارک کے اندر کا لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے اپنی جیبی گھڑی چیک کی۔ اس وقت آٹھ بج کر پچاس منٹ ہورہے تھے۔

چارلی اس توقع کے ساتھ میوزیم پہنچا کہ وہاں پولیس کی گاڑیاں موجود ہوں گی لیکن وہاں تو سب کچھ معمول کے مطابق دکھائی دے رہا تھا۔

کیا پولیس نے ممکنہ طور پر اتنی پھرتی دکھائی ہے؟ بین اب یقینی طور پر پولیس کی حراست میں ہوگا اور یہ طور منتظم عجائب گھر اس کی ملازمت کو مزید پانچ سال کے لیے تحفظ حاصل ہوجائے گا۔

چارلی نے سیڑھیاں چڑھنے سے قبل اپنے رومال سے اپنی چمکتی پیشانی سے پسینے کو صاف کیا اور پھر جوں ہی وہ اوپر پہنچا، اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

''تم لیٹ ہوگئے، چارلی۔''

چارلی یہ سن کر حیرانی سے پلٹ گیا۔

اس کے سامنے بین کھڑا مسکرا رہا تھا۔ چارلی آہستہ قدموں سے اس طرح پیچھے ہٹ گیا جیسے بین اسے گھونسا رسید کرنے والا ہے۔

''کیا بات ہے، چارلی؟ تم ہیبت زدہ کیوں ہو؟''

''وہ...... وہ...... وہ نیکلس؟''

''اوہ، وہ میں نے لوٹا دیا ہے...... جب تم طے شدہ وقت کے باوجود نہیں آئے تو میں نے سوچا بہتر ہے کہ اسے میں خود واپس رکھ دوں...... یہ رہی چابی!'' بین نے چابی بڑھاتے ہوئے کہا۔

سارا منصوبہ الٹا اس کے سر پر لوٹ پڑا تھا لیکن کیسے؟ اس احمق لڑکے نے الارم کو آف کرنا تھا اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑلیا جانا تھا۔ میوزیم کی چابیاں چوری ہونے کی رپورٹ ہوجاتی تھی۔

چارلی کو تالا کھولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور اس کی انگلیاں اِدھر اُدھر ٹٹول رہی تھیں۔ بین نے تالا کھولنے میں اس کی مدد کی۔

''چارلی! تم نروس کیوں ہو؟...... فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے نیکلس بالکل ٹھیک اسی جگہ رکھ دیا ہے جہاں سے اسے اٹھایا تھا۔''

☆☆☆

وہ تمام دن چارلی بے حد پریشان رہا۔ اس کا ابتر ذہن اور اس کا مجرمانہ ضمیر ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔

وہ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ الارم کو آف کیے بغیر بین نیکلس کو اس کے شیشے کے باکس میں سے نکالنے میں کیسے کامیاب رہا؟ یا کلوز سرکٹ کیمروں نے اسے اپنی زد میں کیوں نہیں لیا اور اس کا سراغ کیوں نہیں لگایا؟ لگتا ہے کہ اس لڑکے نے اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا ہے، ایسا ہی ہوا ہوگا۔ وہ شیشے کے کیس میں سے وہ مصری نیکلس کسی طور پر نہیں نکال سکتا تھا۔

چارلی نے اپنا سینڈوچ اٹھایا لیکن اس کی بھوک غائب تھی۔ اس نے بے دلی سے اپنا سینڈوچ کترنا شروع کیا تو اس کے کانوں میں کسی کی آواز آئی۔

''ہیلو چارلی!''

''ارے مسٹر موبرے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

دراز قامت دبلے پتلے موبرے نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''میں یہاں منیجر ہوں چارلی اور گاہے بگاہے یہاں اس کینٹین میں آتا رہتا ہوں۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے لیکن......''

''کیا کوئی پریشانی ہے، چارلی؟''

''پریشانی؟ نہیں...... کیا ہونی چاہیے تھی؟''

''تم کچھ ٹینشن میں لگ رہے ہو...... میرے خیال سے تمہاری تعطیلات بھی واجب ہوگئی ہیں۔ شاید چھٹیوں پر جانے سے تمہاری ٹینشن کم ہوجائے۔'' موبرے نے مشورہ دیا۔

''نہیں!'' چارلی نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں مسٹر موبرے! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں اپنی تعطیلات سے دست کش ہونے پر رضامند ہوں۔''

''تمہارا یہ فیصلہ عجیب سا ہے لیکن میرے خیال میں تمہیں اس بات کا استحقاق ہے...... یہ بتاؤ کہ وہ نوجوان بین اپنا کام کس طرح سرانجام دے رہا ہے؟''

''بین؟ اوہ، وہ قدرے سست ہے لیکن وہ اپنی سی کوشش کر رہا ہے...... درحقیقت میں......''

''جب تم ریٹائر ہوجاؤ گے تو اس وقت تک وہ تمہاری جگہ لینے کے قابل ہوجائے گا۔ کیوں چارلی؟''

''اور یہ وقت کب آئے گا مسٹر موبرے؟''

منیجر نے تجسس سے پریشان بوڑھے چارلی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''پانچ سال کے عرصے میں، اور کب؟...... تمہاری جو پوزیشن ہے اس میں بیشتر افراد اپنی ریٹائرمنٹ کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں لیکن کسی حد تک میرا یہ خیال نہیں کہ تمہارے ساتھ ایسا کچھ معاملہ ہے، چارلی!''

''کیا ایسا ممکن ہوگا کہ جب میں ریٹائر ہوجاؤں تو مجھے پارٹ ٹائم پر رکھ لیا جائے مسٹر موبرے؟''

منیجر نے اپنی نظریں چارلی کے چہرے پر سے ہٹادیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں تم سے بعد میں ملوں گا، چارلی۔''

''رک جاؤ!''

موبرے ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ ''یہ بتاؤ کہ پرابلم کیا ہے، چارلی؟''

''مسٹر موبرے...... مجھے الارم سسٹم کے بارے میں تشویش ہے۔''

''الارم سسٹم؟'' موبرے نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں مسٹر موبرے...... ہمارے یہاں اتنی نادر، نایاب اور قیمتی اشیا ڈھیلے پڑی ہیں تو میرے خیال میں ہمیں اپنے الارم سسٹم کو چیک کرلینا چاہیے!''

''چارلی، چارلی...... یہ بات تم بھی بہ خوبی جانتے ہو کہ سسٹم کو ہر تین ماہ کے بعد چیک کیا جاتا ہے اور اگر کوئی خرابی ہوتی بھی ہے تو وہ دور کردی جاتی ہے...... تمہارے اس اچانک استفسار کی وجہ کیا ہے؟''

''بس مجھے یوں ہی خیال آ گیا تھا کہ سسٹم کو چیک کرلینا چاہیے مسٹر موبرے۔''

''سسٹم ضرور چیک کیا جائے گا مائی ڈیئر...... لیکن اگست کے مہینے میں...... اس میں فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں، چارلی۔''

''الارم کو کبھی آف تو نہیں کیا گیا؟''

''مائی ورڈ! یقیناً کبھی آف نہیں کیا گیا۔''

''اس دوران بھی کبھی نہیں جس دوران بڑے پیمانے پر آرائش وزیبائش کا کام ہو رہا ہے؟''

''یقیناً نہیں۔ بھلا ہم اسے آف کیوں کریں گے؟ اب مجھے جلدی سے جانا ہوگا۔ تم سے پھر ملوں گا، چارلی۔''

چارلی کی نظریں اسٹاف کے ان دو ممبروں پر مرکوز ہوگئیں جو بلند آواز سے ہنس رہے تھے۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ لوگ اس کا ہی مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ سب کے سب مل کر اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ مسٹر موبرے بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہیں۔

چارلی کو یقین تھا کہ اپنے دل و جان سے عزیز اس قدیم مصری نیکلس کے بغیر زندہ رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔

اگلے تین ہفتوں تک چارلی خراب الارم سسٹم کی کوتاہی پر سخت ذہنی اذیت میں مبتلا رہا۔ دوسروں کی طرف سے نااعتباری اور شبے کا رجحان، اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کا ایک بڑا سبب تھا۔ وہ جس طرف بھی دیکھتا، اسے یوں لگتا تھا جیسے میوزیم کا اسٹاف اس کے مخمصے پر آپس میں سرگوشیاں کررہا ہے اور اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب بھی مسٹر موبرے اطراف میں کہیں نمودار ہوتا تھا تو چارلی ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مسٹر موبرے اس کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی بری خبر دینے کے لیے تو نہیں آرہا ہے۔

چارلی نیکلس کے شیشے کے بنے ہوئے کیس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس بیش قیمت نیکلس کو ہاتھ میں لینے کی شدید خواہش اس پر غلبہ پا رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا جھریوں والا ہاتھ اس خزانے سے اس حد تک قریب ہونے کے باوجود اب بھی بہت فاصلے پر تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار تھا۔ اس کی غیر یقینی کیفیت نے اس کے دلی جذبات کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔

''چارلی، تو تم یہاں ہو!''

بوڑھے چارلی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں اس بے جا دخل اندازی پر کوسنے لگا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ آواز کی سمت گھما دیا۔

اس کے سامنے بین کھڑا تھا۔ ''کیا بات ہے، بین؟''

نوجوان بین نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سمت اشارہ کیا اور بولا۔ ''لنچ کا ٹائم ہوگیا ہے اور اس مرتبہ تمھیں ٹریٹ دینے کی باری میری ہے۔''

''کیا؟''

''آؤ چلیں۔ میرے پاس تمھارے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

چارلی قدرے تذبذب کے بعد میوزیم سے نکل کھڑا ہوا اور بین کے ہمراہ پارک کی سمت روانہ ہوگیا۔ باہر کی خوش گوار فضا اور پارک میں کھیل کود میں مگن بے فکرے بچوں کی موجودگی نے بھی اس کی دلی کیفیت کو متاثر نہیں کیا اور بین کے برعکس وہ قطعی طور پر اس ماحول سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔

بین چارلی کو ساتھ لیے پارک کی اس مخصوص بینچ تک لے گیا جہاں وہ ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں اس بینچ پر سنہری زلفوں والی ایک نازک اندام لڑکی پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آغوش میں ایک پکنک باسکٹ بھی تھی۔

''چارلی! میں تمھیں اپنی بیوی ٹریسیا سے ملانا چاہتا ہوں...... ٹریسیا! یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں، میں نے تمھیں بتایا تھا...... چارلی گریوز!''

وہ دلکش لڑکی بے ساختہ مسکرا دی۔ اس کے دانت بالکل پرفیکٹ تھے۔ وہ بینچ پر ایک جانب کھسک گئی تاکہ وہ دونوں بھی بینچ پر اس کے برابر میں بیٹھ جائیں۔

''مسٹر گریوز! آپ نے ہمارے لیے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لیے آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔'' اس لڑکی نے کہا۔

''میں نے کچھ کیا ہے؟ میں سمجھا نہیں کہ میں نے حقیقت میں تم لوگوں کے لیے کیا، کیا ہے؟'' چارلی نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''چارلی! یہ حاملہ ہوگئی ہے...... اسے حمل ٹھہر گیا ہے!''

''گڈ گاڈ!'' چارلی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ سنگِ مرمر کے مانند سفید ہوگیا۔ اس کے اندر غیظ و غضب کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی اسکیم پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر ہی پلٹ آئی تھی۔ ان بے اعتقاد لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ اس کے مقدس نیکلس کی بے حرمتی کریں۔

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا!'' چارلی بڑبڑایا۔

ٹریسیا نے آنکھیں گھماتے ہوئے چارلی کو احسان مندی کی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''یہ سچ ہے مسٹر گریوز۔ میں نے حمل کے مجوزہ گھریلو ٹیسٹ میں سے ایک ٹیسٹ کیا تھا جو کہ مثبت آگیا تھا۔ پھر میری ڈاکٹر نے بھی اس کی

تصدیق کردی ہے۔"

یہ سنتے ہی چارلی بینچ پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں، الارم کو لازمی بج جانا چاہیے تھا۔"

بین نے اپنا ہاتھ دلاسا دینے کے انداز میں چارلی کے شانے پر رکھ دیا۔ "چارلی! تمہیں خود نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے الارم اور کیمرے خود ہی تو آف کر دیے تھے۔ کیا تمہیں یاد نہیں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، چارلی؟"

"پلیز، کہہ دو کہ یہ سچ نہیں ہے؟ پلیز، مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے اس مقدس نیکلس کو رسوا نہیں کیا ہے!"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے، چارلی...... ٹریسیا نے نیکلس پہن لیا تھا اور اب وہ حاملہ ہے...... کیا تم یہ نہیں چاہتے تھے؟"

"نہیں...... ایں...... ایں......"

چارلی نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور پلٹ کر پارک کی سبز گھاس پر دوڑ لگا دی۔ وہ اس بات سے بے پروا کہ پارک میں کھیلنے والے بچے اس سے ٹکرا کر گر پڑ رہے تھے، میوزیم کی جانب دوڑے جا رہا تھا۔

میوزیم پہنچ کر وہ ایک ساتھ دو دو قدمچے پھلانگنے لگا۔ اس کی ناتواں ٹانگوں میں نہ جانے یہ طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور دورانِ خون نے اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری کر دی تھی۔

میوزیم میں آنے والے سیاح اور اسٹاف کے لوگ تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے لیکن وہ ان سب سے بے پروا اور ان کی متجسس نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میوزیم کے اینٹیک چیمبر میں داخل ہو گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کے سینے سے سیٹی کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اپنا سینہ تھام رکھا تھا۔ اس کی ذہنی اثر زدگی اس کی تکلیف پر حاوی ہو گئی تھی۔

سیکیورٹی گارڈ کی نظریں چارلی پر مرکوز تھیں جو اس قدیم نایاب مصری نیکلس کا دیدار کرنے والے تماش بینوں کو چیرتا ہوا نیکلس کے باکس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اپنے مقدس اور بیش قیمت نیکلس کی جانب!

اس نے باکس کے گرد احاطے کی رسی پھلانگی اور رونا شروع کر دیا۔ اس کے ہونٹ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس ہیجانی کیفیت میں اس کا مثانہ بھی بھاری ہو رہا تھا۔

"چارلی!" مسٹر موبرے کے چیخنے کی آواز سنائی دی جنہیں سیکیورٹی گارڈ نے صورتِ حال سے باخبر کر دیا تھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟"

چارلی نے شاید اپنے مینیجر کی بات یا تو سنی نہیں یا اسے نظر انداز کر دیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے اور نیکلس کے باکس کا شیشے کا بھاری کور اوپر اٹھا دیا۔

عین اسی لمحے الارم کی کان پھاڑ دینے والی آواز گونجنے لگی۔

چارلی نے الارم کی پروا کیے بغیر ایک ہاتھ اندر ڈالا اور عنابی کشن پر رکھا ہوا وہ مصری نایاب نیکلس اٹھا لیا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے بدستور اپنا سینہ دبو چا ہوا تھا۔

پھر وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گر پڑا۔ اس نے نیکلس کو اپنے کپکپاتے ہونٹوں سے لگا لیا اور پاگلوں کے مانند اسے چومنے لگا۔

سیکیورٹی گارڈ نے آگے بڑھنا چاہا لیکن مسٹر موبرے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

چارلی فرش پر سینے کے بل لوٹیں لگا رہا تھا۔ اس کی نظریں اس نیکلس پر جمی ہوئی تھیں جو اس نے اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دبو چا ہوا تھا۔ اس دوران اس کا پیشاب بھی خطا ہو چکا تھا۔

اس کی دم توڑتی نگاہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی زندگی کے محبوب ترین نیکلس سے نہیں ہٹی تھیں۔

"کوئی جلدی سے ایمبولینس کو فون کر دے!" مسٹر موبرے نے الارم کی چنگھاڑ سے زیادہ بلند آواز سے چیختے ہوئے کہا۔ پھر وہ چارلی کے بے جان جسم کے پاس گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس کی نبض چیک کرنے لگا۔

☆☆☆

مجمع کے عقب میں میوزیم کے محافظ کی سرخ یونیفارم میں ملبوس ایک نوجوان پنجوں کے بل کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ اپنے روشن مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے پارک میں جس لڑکی کو بہ طور اپنی بیوی ٹریسیا، چارلی سے ملوایا تھا، وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ ایک اداکارہ تھی جس کی خدمات اس نے کرائے پر حاصل کی تھیں۔ اس نے میوزیم کے کیوریٹر کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما کھیلا تھا کیونکہ اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی!



شاہکار

مہتاب خان

غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ اگر اداسی اور کسک کو کسی چہرے میں ڈھال کر بھیجا جاتا تو شاید وہ جھریوں زدہ بے بس انسان کا چہرہ ہوتا... جس کی ویران آنکھیں دنیا جہان کا درد سمیٹے آتے جاتے خوش باش لوگوں کو بڑی حسرت سے تکا کرتیں... یہ اداسی، کسک اور چبھن دل کو جتنا اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں... انسان اتنا ہی اسے اپنی ذات کے لیے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر... وہ جو بہت بڑا فنکار تھا، اس کی گہری نگاہوں نے اس کی نظر کا انداز ہی بدل ڈالا تھا جب ایک ایسا ہی چہرہ اس کے سامنے اس کا شاہکار بن کر آگیا تو...

دردو اذیت کے تاثرات ابھارنے والے ایک سنگدل مصور کا ماجرا

آزر جمال اس شہر کا نامور مصور تھا...... زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہوئے رنگ اور برش اس کے ہاتھوں میں آکر گویا باتیں کرتے تھے اور جب یہ شاہکار منظرِ عام پر آتے تو فن شناس جوق در جوق انہیں دیکھنے آتے اور اس کے فن کو سراہتے تھے۔ وہ اپنے فن میں منفرد انداز کا حامل تھا۔ ملک میں اور ملک سے باہر بھی کئی بار اس کی تصویروں کی کامیاب نمائش ہو چکی تھی۔

ایک پوش علاقے میں اس کا وسیع و عریض بنگلا تھا۔

اسی سے ملحق اس کا اسٹوڈیو تھا جس کی تزئین و آرائش آزر نے خود کی تھی۔ یہ ایک مصور کی نازک خیالی کا بہترین عکاس تھا۔ اس کے ملکی اور غیر ملکی دوست جب کبھی یہاں آتے تو اس کی سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔

اس بار آرٹسٹوں کی ایک انجمن نے تصاویر کی نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ملک کے بڑے بڑے مصوروں کو اس مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی۔ آزر عموماً اس قسم کے مقابلوں سے گریز ہی کرتا تھا مگر اس بار جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اس مقابلے میں حصہ لے لیا۔ فنِ مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب اس کی فنکارانہ صلاحیتوں سے واقف تھے۔ وہ ایسا ہی باکمال مصور تھا جو زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر رنگ اور برش سے کسی بھی خیال کو زندۂ جاوید کر دیتا تھا۔

ان دنوں وہ کسی اچھوتے خیال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کی قیمتی کار سڑکوں، بازاروں اور ویرانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس مقابلے کے لیے وہ کس خیال کو موضوع بنائے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسا خیال ہو جو ہلچل مچا دے اور پھر اسے اس کا تصور مل گیا۔

اس کی توجہ کا مرکز سٹی کورٹ کے گیٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لاٹھی کا سہارا لیے ہوئے ایک بوڑھا اور لاغر شخص تھا..... اس وقت آزر کی کار سٹی کورٹ کے سامنے ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اس بوڑھے شخص پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ اس کی فنکارانہ نظریں اس شخص کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔

اپنے حلیے اور وضع قطع سے وہ کوئی دیہاتی لگتا تھا۔ بوسیدہ میلا کچیلا لباس، مٹی سے اٹے ہوئے بال دبلا پتلا لاغر بدن، جھریوں بھرا چہرہ، ٹیالا رنگ جسے زمانے کی سختیوں نے ماند کر دیا تھا۔ وہ بار بار امید بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا تھا اور پھر مایوس ہو کر سر جھکا لیتا۔ درحقیقت اس کی آنکھوں کی ویرانی اور بے بسی نے اسے اپنی جانب گویا کھینچ لیا تھا۔ اس نے اشارے سے اس شخص کو اپنے پاس بلایا لیکن شاید اس نے اس کا اشارہ نہیں سمجھا۔ وہ تیزی سے گاڑی سے اترا اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ حیران نظروں سے آزر کو دیکھ رہا تھا۔ آزر نے اس کی سوالیہ نظروں کو پڑھا پھر جلدی سے بولا۔

''بابا! آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں شبہات ابھر آئے۔

''فکر نہ کریں، میں کچھ دیر بعد آپ کو واپس ادھر ہی چھوڑ دوں گا۔''

''کیا بات کرنی ہے بیٹا؟'' بابا نے اس بہترین سوٹ پہنے ہوئے وجیہہ، اسمارٹ اور متمول نظر آنے والے شخص کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور پانچ سو کا نوٹ بوڑھے کی طرف بڑھا دیا۔

''میں بھکاری نہیں ہوں۔'' اس نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا۔

''مجھے پتا ہے کہ آپ بھکاری نہیں ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں تو...... اس کے علاوہ بھی میں آپ کو بہت کچھ دے سکتا ہوں۔'' اس نے اپنے اردگرد کھڑے لوگوں پر نظر دوڑائی جو دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ''آپ یہاں کورٹ کے پاس بیٹھے ہیں تو یقیناً کسی مسئلے میں گرفتار ہوں گے۔ میں آپ کے تمام مسائل حل کر سکتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آئیں تو سہی۔''

وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئیں میرے ساتھ...... وہ سامنے میری گاڑی ہے۔ اس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' اس دوران ٹریفک کچھ رواں ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اس کے نزدیک روکی۔ بوڑھا اب بھی جھجک رہا تھا۔

'بے وقوف کہیں کا۔' آزر نے دل میں سوچا۔ اس کی جھجک پر آزر کو جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ جب اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تو آزر کو قدرے سکون ہوا۔

''چلو......'' اس نے ڈرائیور سے کہا۔

گاڑی آگے بڑھی تو بوڑھا شخص کچھ گھبرا سا گیا۔

''آپ اطمینان سے بیٹھیں میں کچھ دیر بعد آپ کو واپس یہیں چھوڑ دوں گا۔ آپ کا نام کیا ہے بابا؟'' آزر نے دریافت کیا۔

''اللہ وسایا۔''

''یہاں کورٹ میں کس سلسلے میں آئے تھے؟''

''بس صاحب جی، کیا بتاؤں ایک افتاد پڑگئی ہے ہم پر۔ میرا بیٹا دین محمد صدر میں ایک ہوٹل پر بیرے کا کام کرتا تھا۔ اس واقعے کو تقریباً دو مہینے ہوگئے ہیں۔ اس دن کچھ لڑکے دکانیں بند کروا رہے تھے کہ اچانک پولیس آگئی اور اس نے آتے ہی پکڑ دھکڑ شروع کردی۔ میرا بیٹا بھی وہیں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے بھی دھرلیا اور پولیس اسٹیشن لے گئے۔ وہ لڑکے تو رشوت دے دلا کے چھوٹ گئے، پر میرے بیٹے کو جیل ہوگئی۔ مجھے تو جی ایک مہینے بعد گاؤں میں اس کی خبر ملی تو دوڑا چلا آیا۔ بڑی مشکل سے قرض ادھار کر کے ایک وکیل کا بندوبست کیا تھا۔ اس نے صبح دس بجے مجھے کورٹ کے گیٹ پر ملنے کے لیے کہا تھا۔ اسی کا انتظار کررہا تھا مگر ایک بج گیا، وہ اب تک نہیں آیا۔'' وہ مایوس لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''فکر نہ کریں بابا! آپ کے بیٹے کی ضمانت کا بندوبست ہوجائے گا۔''

اس کے مایوس چہرے پر امید کی کرن لہرائی۔ ''آپ سچ کہہ رہے صاحب؟''

''جی بالکل سچ......''

''لیکن آپ یہ مہربانی کیوں کریں گے؟ میں تو آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ بہت غریب آدمی ہوں۔ گاؤں سے آیا ہوں۔ دین محمد ہمارا واحد سہارا ہے۔ سال بھر ہی تو ہوا ہے اسے کراچی آئے ہوئے۔ بڑی مشکل سے اسے یہ نوکری ملی تھی۔''

''بابا جی! مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں مصور ہوں۔ آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں! تصویر سمجھتے ہیں نا آپ؟''

''ہاں صاحب!''

''میں آپ کی تصویر بناؤں گا۔ روزانہ دو تین گھنٹے کے لیے آپ کو میرے گھر آنا ہوگا۔ جہاں آپ رہتے ہو وہاں سے میرا ڈرائیور آپ کو لے آیا کرے گا اور واپس چھوڑ آئے گا۔ کم از کم ایک دو ہفتے کا کام ہوگا۔ میں آپ کو پانچ سو روپے روز دوں گا۔ اس کے علاوہ آپ کے بیٹے کی ضمانت بھی کروادوں گا۔ بولیے منظور ہے؟''

''میرا بیٹا آزاد ہوجائے گا؟'' انہوں نے بے یقینی سے آزر کو دیکھا۔

''بالکل ہوجائے گا۔ میں آپ سے وعدہ کررہا ہوں، مجھ پر بھروسا کریں۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بیٹا بھی چھوٹ جائے گا اور پیسے اس کے علاوہ ملیں گے۔''

وہ کچھ سوچنے لگا۔ آزر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ ''کس سوچ میں پڑ گئے باباجی؟''

''میرا بیٹا چھوٹ تو جائے گا نا؟''

''ایک بار کہہ تو دیا ہاں...... میرا یقین کریں۔'' وہ کسی قدر جھنجلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے، کہاں ہے تمہارا گھر؟''

''بس پہنچنے ہی والے ہیں۔''

پھر پورے راستے اس نے کوئی بات نہیں کی اور آزر بھی خاموش رہا۔ ڈرائیور نے اس کے اسٹوڈیو کے سامنے کار روکی۔ وہ نیچے اتر گیا۔ بوڑھا شخص بھی جھجکتا ہوا نیچے اتر آیا۔

''آ جائیں......'' اس نے بوڑھے شخص کی طرف مڑ کر کہا۔ آزر کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور اس طلسم کدے میں داخل ہوگیا جہاں بڑے بڑے لوگ قدم رکھنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں اور آرٹ کے بہترین نمونے سجے ہوئے تھے۔ ہر شے قابلِ دید تھی۔ بوڑھا شخص حیرت زدہ سا چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ طلسم کدہ اسے حیران کیے دے رہا تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ سا بھی نظر آ رہا تھا۔

''آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں پوری فیملی ہے لیکن وہ عمارت کے دوسرے حصے میں رہتے ہیں۔ یہ میرا اسٹوڈیو ہے جہاں میں کام کرتا ہوں۔ آپ ادھر بیٹھیں۔'' اس نے ایک جانب صوفے پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بوڑھا شخص سہمے سہمے سے انداز میں وہاں بیٹھ گیا۔ آزر تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ وہ مصور تھا اور اس کی نظریں اپنے شاہکار پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گہری نظروں سے اس شخص کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ اس کی نظروں میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پھر آزر نے کیمرا سنبھالا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں اتارنے لگا۔

اس نے بوڑھے کی درجنوں تصویریں اتاریں۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ آج کا کام بس اتنا ہی تھا۔ ان تصویروں میں سے اس نے کوئی ایک پوز منتخب کرنا تھا اور اسی اینگل سے تصویر بنانی تھی۔

''یہ لیں بابا! آج کا بس اتنا ہی کام تھا۔'' اس نے پانچ سو کا نوٹ بابا کی طرف بڑھایا۔ ''یہ رکھ لیں، کل سے آپ کو یہاں اسی وقت آنا ہوگا اور اتنے ہی روپے روزانہ ملیں گے۔''

''روزانہ......'' بابا کی آواز بھنچ گئی۔ ''اور میرا بیٹا؟''

''ہاں، ایک منٹ...... میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔'' وہ موبائل پر تیزی سے نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولا۔

کچھ دیر وہ وکیل سے بات کرتا رہا پھر فون بند کر کے اس نے کاغذ پر وکیل کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ لکھ کر بوڑھے شخص کی طرف بڑھایا اور کہا۔

''آپ کل صبح اس ایڈریس پر چلے جائیں اور وکیل صاحب سے مل لیں۔ انہیں میں نے سمجھا دیا ہے۔ آپ کا بیٹا چھوٹ جائے گا۔ ابھی آپ کو میرا ڈرائیور آپ کے ٹھکانے پر چھوڑ آئے گا اور کل اسی وقت آپ کو لینے آئے گا۔''

آزر نے ڈرائیور کو بلا کر اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ بابا کو اس کے گھر چھوڑ آئے اور اچھی طرح اطمینان کر کے اس کا ٹھکانا دیکھ آئے کیونکہ اسے اس شخص کی اشد ضرورت تھی۔ جب تک اس کی پینٹنگ مکمل نہیں ہو جاتی۔ اس سلسلے میں وہ کوئی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے تصاویر کے پرنٹس بنائے اور ان میں سے سب سے عمدہ پوز کا انتخاب کرنے لگا۔ ہر تصویر لاجواب تھی۔ بہرحال اس نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک تصویر منتخب کر لی اور اس پر کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر ڈرائیور باباجی کو لے کر آ گیا۔ آج وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''السلام علیکم باباجی! کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام! بہت خوش ہوں بیٹا...... صبح آپ کے وکیل نے دین محمد کی ضمانت کروا دی تھی۔ وہ گھر آ گیا ہے، آپ کا بڑا احسان ہے۔ میں پورے ایک مہینے سے خوار پھر رہا تھا۔ جو کام میں مہینے بھر میں نہ کر سکا، وہ آپ کے ایک فون نے کر دیا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے باباجی...... چلیں اپنا کام شروع کرتے ہیں۔''

باباجی کی باتیں اس کے لیے قابلِ توجہ نہیں تھیں۔ اس نے انہیں سامنے اسی پوز میں بٹھایا جو وہ پہلے منتخب کر چکا تھا اور کام شروع کر دیا۔

وہ بے خودی کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نظریں باباجی کے جھریوں زدہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان

نگاہوں میں پیار تھا، ستائش تھی...... وہ ایک فنکار کی نظریں تھیں۔ وہ ان کے چہرے کو اپنی آنکھوں میں اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ اسے کینوس پر منتقل کر رہے تھے۔

کچھ دیر ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھا کہ بابا کچھ بے چین سا ہوا۔

''کیا ہوا بابا؟''

''تھک گیا ہوں بیٹا۔''

''چلیں تھوڑی دیر آرام کرلیں پھر کام شروع کریں گے۔''

بابا آرام وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ آزر نے ملازم سے چائے منگوائی۔ وہ دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب بابا نے کہا۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ آپ کو میرے اس جھریوں بھرے بوڑھے چہرے میں کیا نظر آیا تھا؟''

''ارے بابا جی! ایک فنکار کی نظریں ہی ان لکیروں کو پڑھ سکتی ہیں جو آپ کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ ان میں ایک داستان لکھی ہوئی ہے۔''

''بیٹا!'' تیسرے دن بابا نے اسے مخاطب کیا تھا جب وہ انتہائی انہماک سے تصویر بنا رہا تھا۔

''ہوں......''

''ایک ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔'' وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن آزر کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سپاٹ انداز میں کہا۔

''کام ختم کرلیں پھر آپ کی بات سنوں گا۔'' وہ کچھ مایوس سا نظر آیا، اس کے کندھے جھک گئے۔

''اب کیا ہوا؟'' آزر جھلا کر بولا۔

''تھک گیا ہوں بیٹا...... بڑھاپے میں اتنی دیر بیٹھا نہیں جاتا۔''

آزر نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے، چند منٹ آرام کرلیں۔'' اس نے پنسل رکھ دی اور خود اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

''جی، کیا ضروری بات کرنی تھی آپ کو؟''

''میرے بیٹے کو وہ ہوٹل والا دوبارہ نوکری پر نہیں رکھ رہا۔ کہتا ہے تجھے جیل ہو چکی ہے، اب تیرا اعتبار نہیں ہے۔''

''تو پھر......؟'' آزر کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔

''آپ کے تو بہت سارے جاننے والے ہوں گے۔ اسے کہیں ملازمت دلوا دیں۔ پوری دس جماعت پاس ہے۔'' بابا فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔

''دین محمد میرا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اسی نے جی گھر سنبھالا ہوا ہے۔ گاؤں میں تھوڑی سی زمین ہے۔ اس سے گزارہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ یہاں آ گیا تھا۔ اچھا خاصا کام کر رہا تھا، ہمارے بھی دن بدلنے لگے تھے کہ یہ افتاد پڑ گئی۔'' بابا مسلسل بولے جا رہا تھا اور آزر اسے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟'' کچھ دیر بعد آزر نے پوچھا۔

''پانچ ہیں...... تین بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ میں بیمار رہتا ہوں۔ پہلے کھیتی باڑی کر لیتا تھا مگر اب بیماری کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ گھر کا پورا بوجھ دین محمد نے اٹھایا ہوا ہے اور اب وہ بھی بے روزگار ہو گیا ہے۔''

''اپنا علاج کیوں نہیں کراتے بابا جی۔'' آزر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں؟''

''میں جو پیسے دیتا ہوں آپ کو، ان سے علاج کروائیں۔''

''دوا سے زیادہ روٹی ضروری ہے صاحب۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بیوی بچوں کو یہاں لے آؤں گا مگر دین محمد کی نوکری چلی گئی۔ اس کا کچھ انتظام ہو جائے تو......'' وہ امید بھری نظروں سے آزر کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کچھ بولے گا مگر آزر ایک برش اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

''اچھا کچھ کرتے ہیں۔'' وہ کافی دیر بعد بولا۔

''چلیں اب کام شروع کریں۔''

وہ خاموشی سے اسی پوزیشن میں آ کر بیٹھ گیا جیسا کہ آزر چاہتا تھا۔ ایک گھنٹا ہو گیا اسے بیٹھے بیٹھے، تب وہ اچانک بول پڑا۔ ''جیسے ہی دین محمد کا کام لگے گا میں بیوی بچوں کو شہر لے آؤں گا پھر ہم یہیں رہ بس جائیں گے۔''

''ایں......'' آزر اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا تھا۔ ''چلیں جی آج کے لیے اتنا ہی...... باقی کام کل مکمل کریں گے۔''

دوسرے دن بابا آیا تو آزر اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکا۔ آج اس نے بلیو رنگ کا صاف ستھرا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ کچھ خوش بھی نظر آ رہا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر آزر پریشان ہو گیا۔

''یہ کیا حلیہ بنا کر آئے ہیں آپ؟'' وہ جھنجلائے

ہوئے انداز میں بولا۔

"کیوں، کیا ہوا؟ نہا کر کپڑے بدلے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔

آزر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "یہ کیا کیا آپ نے...... اپنا حلیہ ہی بگاڑ لیا۔ آج کام نہیں ہوسکتا۔"

"میرا حلیہ بگڑ گیا ہے صاحب...... مگر کیسے۔" وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، تصویر کیسے بنے گی، اس حلیے میں، جائیں وہی کپڑے پہن کر آئیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں، جلدی کریں۔"

اس کے چہرے کی چمک ماند پڑگئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر واپس لوٹ گیا۔ اس دن کا کام کافی دیر سے شروع ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو بہت اداس تھا اور یہی اداسی آزر کو چاہیے تھی۔ وہ پورا وقت اداس اور خاموش بیٹھا رہا اور رات گئے پیسے لے کر چلا گیا۔

"دین محمد کہہ رہا تھا کہ اسے کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں گاؤں لوٹ جاؤں۔" دوسرے دن کام کے دوران اس نے اطلاع دی۔

"ہوں......" آزر نے ہنکارا بھرا۔

"سوچ رہا ہوں چلا جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔ وہ حیران نظروں سے آزر کو دیکھنے لگا پھر خاموش ہوگیا۔

"چلے جایئے گا مگر کام مکمل ہونے کے بعد...... جب میں اجازت دوں اس وقت۔"

دوسرے اور تیسرے دن بھی مکمل خاموشی میں کام ہوتا رہا اور اس نے کچھ نہ کہا لیکن اب اس کے چہرے پر مایوسی، اداسی اور ویرانی تھی۔

آزر نے اس کے چہرے کے سارے تاثرات تصویر میں سمو دیے تھے۔ تصویر مکمل ہوگئی تھی۔

"بس بابا جی! آپ کا کام ختم۔" اس کی نظریں اس خاکے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بس اب رنگ بھرنا باقی تھا۔

"میں جاؤں۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہ پیسے رکھ لیں۔" اس نے پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا پھر کچھ سوچ کر اپنے بٹوے سے کچھ اور نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ بھی رکھیں۔"

"اور صاحب میرے بیٹے کے کام کا کیا ہوگا؟"

"آپ گاؤں سے ہو کر آجائیں پھر دیکھتے ہیں۔" وہ تصویر کے خاکے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیوی بچوں کو بھی لے آؤں نا؟" وہ امید بھری آواز میں بولا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہاں۔" وہ خاکے کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے دھیانی میں بولا۔

وہ پیسے لے کر چلا گیا۔ تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ حسرت و یاس کی تصویر۔ اس تصویر میں آزر نے انسان کی بے بسی پیش کی تھی۔ دل میں چھپے ارمانوں کو اس نے تصویر میں سمو دیا تھا۔

تصویر نمائش میں رکھتے ہی لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دلوں پر پہلے ہی دن اوس پڑگئی۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ آزر جمال نے ایک بار پھر شاہکار تخلیق کر دیا تھا۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اس کے فن پر تبصرے ہو رہے تھے۔ اس کے انٹرویوز ہو رہے تھے۔ کسی نے لکھا، فن کار معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ آزر ایک عظیم فن کار ہے۔ دولت کی چمک نے اسے اندھا نہیں کیا جس کا ثبوت یہ تصویر ہے۔ دولت مند ہونے کے باوجود اس کا دل انسانیت کے دکھوں سے لبریز ہے۔ وہ لوگوں کے درد، ان کی مایوسیوں اور حسرتوں کو دل سے محسوس کرتا ہے۔ آزر نے اس درد کو محسوس کیا اور خونِ دل سے اس شاہکار کو تخلیق کیا اور اپنے فن کا لوہا منوالیا۔

فیصلہ ہوگیا تھا۔ اس تصویر کو اول قرار دیا گیا تھا۔ آزر کو چاروں طرف سے الٹرا ماڈرن لڑکیوں، فنِ مصوری سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں، ٹی وی اور اخباری رپورٹروں نے گھیرا ہوا تھا۔ لڑکیاں اس کے ساتھ تصویریں بنوا رہی تھیں۔ اسی وقت ایک ٹی وی رپورٹر اس کے قریب آیا اور کہا۔

"پلیز مسٹر آزر! مجھے اپنے چینل کے لیے آپ سے کچھ سوال کرنے ہیں۔"

"جی فرمایئے!" وہ پُروقار لہجے میں بولا۔

"آپ کو یہ خیال کہاں سے آیا؟ میرا مطلب ہے یہ تصویر خیالی ہے یا حقیقت؟"

"یہ ایک حقیقت ہے۔"

"یعنی آپ نے کسی کو ماڈل بنایا تھا؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کون ہے یہ اور اب کہاں ہے؟"

"بھائی ہمارے وطن کا ہر شہر اور گاؤں ایسے ماڈلز

سے بھرا پڑا ہے۔ اسے غربت و افلاس نے یہ روپ بخشا تھا۔ آپ اسے تلاش کریں، کسی سڑک یا گلی میں ضرور مل جائے گا۔''

''آپ نے صرف ان بابا جی کی تصویر ہی بنائی ہے یا ان کی غربت بھی دور کی ہے۔ آپ خاصے دولت مند بھی ہیں؟''

رپورٹر نے ایک تند و تیز سوال کیا۔

''ایکسکیوزمی...... آزر صاحب! آپ اس تصویر کو فروخت کریں گے؟ سیٹھ رزاق باٹلی والا اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ میں ان کا منیجر ہوں۔''

اسی وقت ایک وجیہہ نوجوان نے اسے اس نازک سوال سے بچالیا تھا۔

''جی نہیں، میرا اسے فروخت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' اس نے ایک شان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

نمائش ختم ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ اس تصویر کی بڑی بڑی آفرز ٹھکرا چکا تھا۔ ان میں سیٹھ رزاق باٹلی والا کی شاندار آفر بھی شامل تھی لیکن سیٹھ صاحب نے ہار نہیں مانی تھی۔ وہ تو اس کے سر ہی ہوگئے تھے اور آج بھی وہ اسی سلسلے میں اس کے گھر آئے تھے اور اس وقت اس کے سامنے اس کے اسٹوڈیو میں بیٹھے تھے کہ اسی دوران ملازم اندر آیا اور کہا۔

''صاحب! وہ بابا آیا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو تین بار آچکا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ صبح سے گیٹ پر بیٹھا ہے۔''

''میں نے انہیں بتا تو دیا تھا کہ اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا کام ختم ہوگیا ہے۔ جاؤ ان سے کہہ دو کہ اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد ملازم پھر واپس آگیا اور بولا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں اپنے جس بیٹے کی نوکری کی بات کرنی تھی کل رات اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اس کے علاج کے لیے...... انہوں نے آپ کو گاڑی میں آتے دیکھ لیا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے بضد ہیں، ایک بار مل لیں۔''

وہ ملازم کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ ''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''نہیں سرکار!'' ملازم گھبرا گیا۔

''میں نے کسی کا ٹھیکا نہیں لیا تمام عمر کے لیے دوبارہ مجھے ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملنی چاہیے۔'' اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

سیٹھ رزاق اپنی شاندار گاڑی کے پاس مایوس کھڑے منیجر سے کہہ رہے تھے۔

''کسی طرح اسے تیار کرو یعقوب...... مجھے ہر صورت میں یہ تصویر چاہیے۔ کم بخت نے کیا چیز بنائی ہے کہ لوگ دیوانے ہوئے جارہے ہیں۔ مجھے تو خیر آرٹ کی کوئی سمجھ نہیں مگر اپنے اسٹیٹس کے لیے یہ چاہیے۔''

''وہ تصویر بیچنے کے لیے تیار نہیں ہے سر! آپ نے بھی بات کرکے دیکھ لی۔''

''ارے بابا اسی لیے تو تمہیں کہہ رہا ہوں، کوئی چکر چلاؤ، اسے راضی کرو کچھ بھی کرکے...... یہ تصویر مجھے چاہیے بس۔ یہ ڈرائیور کہاں مرگیا؟''

''ابھی دیکھتا ہوں سر۔'' یعقوب آگے بڑھ گیا۔

ڈرائیور گیٹ کے پاس کھڑا تھا جہاں ملازم بابا جی سے بات کررہا تھا۔

یعقوب نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کھڑے ہو اور سیٹھ صاحب اتنی دیر سے گاڑی کے قریب کھڑے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔''

اسی وقت اچانک اس کی نظر بابا پر پڑی اور وہ سکتے میں رہ گیا۔

''ارے! یہ تو وہی ہے تصویر والا بابا...... بالکل وہی ہے۔'' یعقوب، بابا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ڈرائیور جاچکا تھا۔ یعقوب بھی دوڑتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔ ''سر! وہی ہے...... وہی تصویر والا بابا ادھر گیٹ پر۔ آج تو اس کے چہرے پر تصویر سے زیادہ حزن و ملال ہے...... جانے کیا دکھ پالا ہے اس نے......''

وہ سیٹھ صاحب کے قریب پہنچ کر بولا پھر ان کی گھورتی ہوئی نظروں کو دیکھ کر سنبھل گیا۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھولا سیٹھ رزاق گاڑی میں بیٹھ گئے اور یعقوب کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''تم نرے گاؤدی ہو۔ مجھے تصویر چاہیے تصویر والا بابا نہیں۔ اس بابا کو تو دیوار پر نہیں لٹکا سکتا نا۔ گدھا کہیں کا۔ چلو ڈرائیور۔''

سیٹھ صاحب کی سیاہ مرسڈیز تیزی سے بوڑھے شخص کے سامنے سے گزر گئی اور وہ شاہکار...... جس نے ایک تصویر کو زندگی دی، آج گویا خود بے جان سی شے بن چکا تھا۔

صلح جُو

ملک صفدر حیات

سمندر کی تہ میں اترنے والے غوطہ خور خود کو چاہے کتنا ہی ماہر تیراک سمجھ لیں مگر جب دلدل میں اترتے ہیں تو ساری مہارت دھری کی دھری رہ جاتی ہے جیسے کہ وہ لوگ خود کو عقلِ کل سمجھ کر جرائم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے مگر جب قانون کی عقابی نگاہوں میں آئے تو لاکھ پردہ پوشی کے باوجود ملک صفدر حیات کی تفتیش نے سارے نقابوں کو اس طرح نوچ ڈالا کہ... چہروں پر پڑی خراشیں کتنے ہی جرائم کا پردہ چاک کر گئیں۔کسی مجرم کے پہلے جرم کی وجہ اگر تلاشی جائے تو اس کے ماحول کو کھنگالنا ہوگا... کیونکہ وجہ بھی وہیں کہیں چھپی بیٹھی ہوتی ہے۔وہ جو ہمدرد کے روپ میں سائے کے مانند ساتھ ساتھ رہا۔ بالآخر اندھیرا ہوتے ہی سائے کے مانند ساتھ چھوڑ بھی گیا... مگر قانون کی گرفت... اندھیرا ہو یا اجالا... ڈھیلی نہیں پڑتی...

ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور چونکاتی واردات کا احوال

وہ ایک یخ بستہ صبح تھی۔جنوری کا مہینا قریب اختتام تھا تاہم ابھی تک ماحول اور فضا میں سردی نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ دن تو ٹھنڈا ٹھار ہوتا ہی تھا، رات کو برفیلی ہوائیں رگوں میں خون منجمد کرنے کا فریضہ نہایت ہی ذمے داری کے ساتھ نبھا رہی تھیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ جنوری کے آغاز سے شروع ہونے والا بارشوں کا سلسلہ بھی گنڈے دار جاری تھا جس کے باعث زندگی جیسے ایک جگہ رک سی گئی تھی۔

اس روز میں تھانے پہنچا تو بوندا باندی جاری تھی۔ وقفے وقفے سے تھوڑی دیر کے لیے بارش تیز بھی ہو جاتی تھی اور تیز ہوا جسم کو مفلوج کرنے لگتی۔ان دنوں میری رہائش تھانے کے عقبی حصے میں واقع سرکاری کوارٹر میں تھی لیکن اپنے کمرے تک رسائی حاصل کرنے کے دوران میں، میں بری طرح بھیگ چکا تھا۔

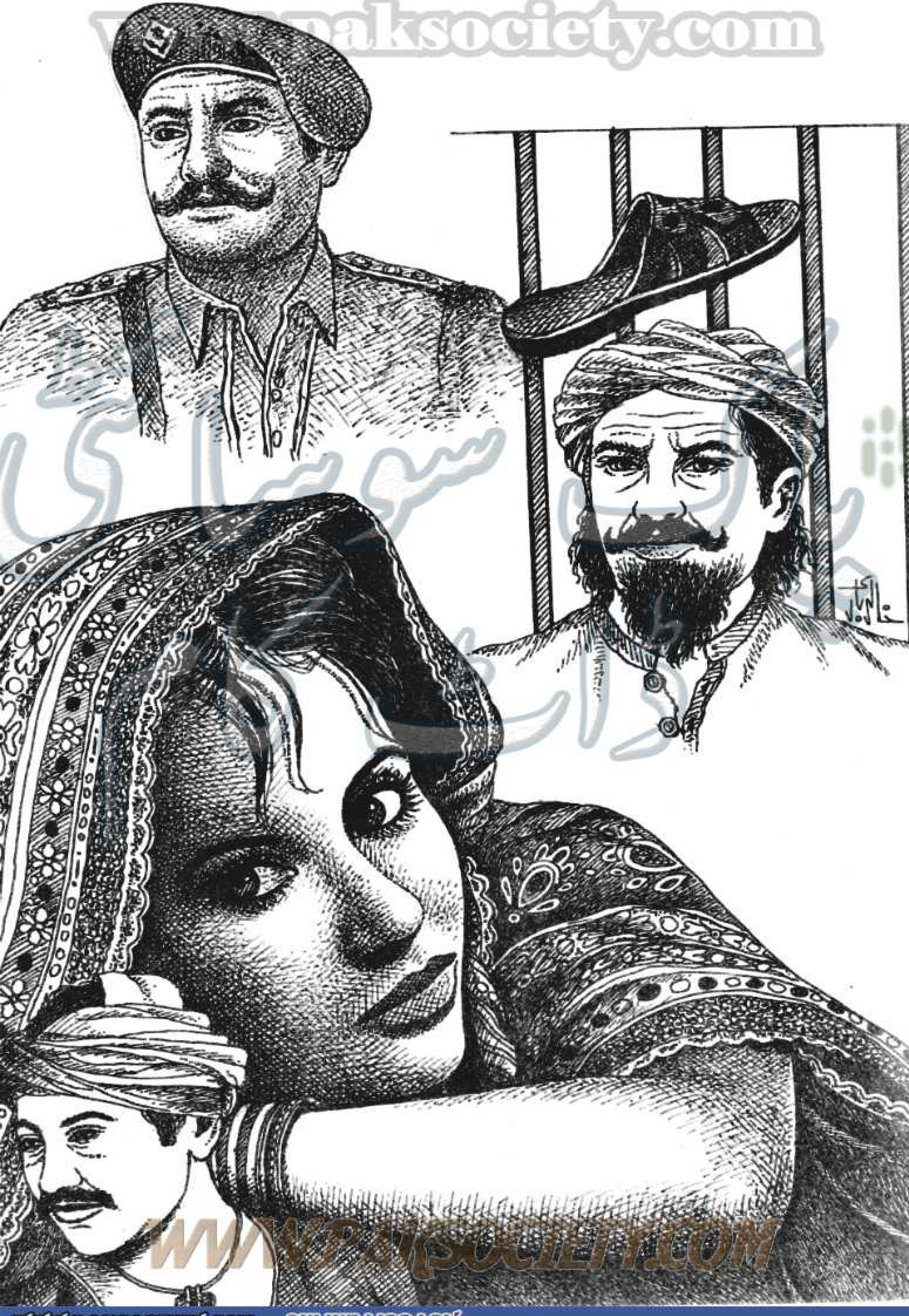
میں جیسے ہی اپنی کرسی پر براجمان ہوا، ایک مستعد کانسٹیبل نے کمرے میں آ کر مجھے سیلوٹ کیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! چھوٹے خان صاحب کافی دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“

جب میں تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں چند افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ان میں ایک عورت اور باقی مرد تھے۔ میں ان پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ آیا تھا۔کانسٹیبل یقیناً انہی افراد کا ذکر کر رہا تھا۔ میں چونکہ ان سے واقف نہیں تھا اس لیے پوچھ لیا۔

”کون چھوٹے خان صاحب؟“

”بڑے خان صاحب جناب غلام مصطفیٰ کے بیٹے غلام مرتضیٰ۔“ کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”یہ لوگ صبح ہی صبح، برستی بارش میں کس کام سے آ گئے ہیں؟“ میں نے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔ ”گاؤں میں ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟“



''کسی لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہے ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

''انہیں دس پندرہ منٹ ابھی باہر ہی بٹھاؤ۔'' میں نے اپنے بھیگے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر کے بعد انہیں خود ہی بلالوں گا۔''

''اوکے سر......'' کانسٹیبل نے فوراً میرے مقصد کو بھانپ لیا تھا۔

کانسٹیبل کمرے سے نکلا تو میں نے دروازہ بند کر کے اپنا یونیفارم تبدیل کرلیا۔ ایسے ہی ایمرجنسی حالات کے لیے میں نے اپنا ایک یونیفارم تھانے ہی میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت کام آسکے۔ ساون بھادوں میں اکثر ایسے حالات پیش آجایا کرتے تھے مگر آج کل تو جنوری چل رہا تھا۔

میں خشک یونیفارم زیب تن کرنے کے بعد اپنی کرسی پر جا بیٹھا پھر برآمدے میں محوِ انتظار لوگوں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ کُل پانچ افراد تھے جس میں غلام مرتضٰی خان سب سے نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس کا پہناوا بھی باقی چار افراد کی... بہ نسبت شان دار اور قیمتی تھا۔ چھوٹا خان خاصی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ باقی چاروں اس کے رعب میں لگتے تھے، خاص طور پر ان میں شامل ایک ادھیڑ عمر شخص کی حالت کچھ زیادہ ہی تشویش ناک دکھائی دیتی تھی۔

وہ پانچوں جب کمرے میں آکر میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل کی زبانی میں اتنا تو جان چکا تھا کہ وہ لوگ کسی لڑکی کے اغوا کا معاملہ لے کر تھانے پہنچے تھے لیکن یہ معلومات ناکافی تھیں۔ میں آنے والوں کی زبانی ان کا مسئلہ سننا چاہتا تھا۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کو تیز نگاہ سے ٹٹولا اور پوچھا۔ ''ہاں بھئی......کیا معاملہ ہے؟''

''تھانے دار صاحب!'' چھوٹے خان نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے قدرے برہمی سے کہا۔ ''ملکوں کے پتر نے کرم دین کی کڑی کو اغوا کرلیا ہے۔ ہم اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''میں کرم دین ہوں جی۔'' پریشان صورت، ادھیڑ عمر شخص چھوٹے خان کی تائید کرتے ہوئے فریادی لہجے میں بولا۔ ''میری سوہنی دھی اغوا ہوگئی ہے سرکار۔''

اب سمجھ میں آیا کہ اس بندے کی حالت ایسی غیر کیوں ہورہی تھی۔ میں نے مسکین صورت کرم دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''کرم دین! کیا نام ہے تمہاری لڑکی کا؟''

''خالدہ۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''گاؤں میں سب اسے ''خالو خالو'' کہتے ہیں۔''

''خالدہ کب سے غائب ہے؟'' میں نے مغموم باپ سے سوال کیا۔

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''وہ کل شام سے گم ہے مائی باپ۔''

''میں نے تو رو رو کر اپنی آنکھیں اندھی کرلی ہیں تھانے دار صاحب۔'' ان کے ساتھ آنے والی فربہ اندام عورت نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''جتنی جلدی ہوسکے آپ میری خالو کو ڈھونڈ نکالیں جی، ورنہ میں تو روتے روتے اپنی جان ہی دے دوں گی۔''

اس صحت مند عورت کا نام ذکیہ بی بی معلوم ہوا۔ پتا چلا کہ وہ گم شدہ خالدہ کی ماں تھی۔ بات ختم کرتے ہی ذکیہ نے دھواں دھار انداز میں باقاعدہ رونا شروع کردیا تھا۔ اس صورت حال نے مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا اور میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ذکیہ بی بی! حوصلہ رکھو۔ رونے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے، میں جلد از جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرلوں گا۔''

''جناب! ہم لوگ جیتے جی مٹی میں اتر گئے ہیں۔'' کرم دین نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''میری جوان دھی غائب ہوگئی ہے۔ میری تو ناک کٹ گئی نا تھانے دار صاحب!''

''لڑکی غائب ہوئی ہے اور نہ ہی گم ہوئی ہے۔'' چھوٹے خان نے برہمی سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ تو سیدھا سیدھا اغوا کا معاملہ ہے۔ خالدہ کو ملکوں کے لڑکے فرید نے اغوا کیا ہے۔ آپ فرید کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کر کے کارروائی کا آغاز کریں اور جناب......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مجرم ہر صورت میں مجرم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنا چاہیے۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ چھوٹا خان کس فریکوئنسی پر بول رہا تھا۔ اس کا انداز مجھے ناگوار گزرا اور میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کڑے لہجے میں سوال کیا۔

''خان جی! آپ کی بات کا مطلب کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے، آپ مطلب تک تو پہنچ ہی گئے ہوں گے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''آپ ایک سمجھ دار اور تجربہ کار تھانے دار ہیں۔''

''میں تو آپ کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن لگتا ہے، آپ کو میرے حوالے سے کوئی بدگمانی ہوئی ہے......!''

میرے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہ جزبز ہو کر رہ گیا۔ تاہم کچھ بولا نہیں۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خان جی! جب میں اس کرسی پر آ کر بیٹھتا ہوں نا...... تو ذات پات اور برادری اور رشتے داری جیسے سارے تعلق ناتے میرے دل و دماغ میں موجود نہیں ہوتے۔ میں کسی مجرم کو کوئی خاص رعایت دینے یا کسی بے گناہ کے ساتھ... خوامخواہ کی دشمنی کرنے کا قائل نہیں ہوں لہٰذا اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیں کہ اگر کوئی مجرم ملک برادری سے تعلق رکھتا ہے تو میں اس کے ساتھ کسی قسم کی نرمی کا برتاؤ کروں گا اور اگر وہ کوئی خان بہادر ہے تو میں اس کے ساتھ سختی اپناؤں گا۔ امید ہے، میری بات بہت اچھی طرح آپ کی سمجھ میں بیٹھ گئی ہوگی!''

میرا آخری جملہ طنز میں بجھا ہوا تھا۔ وہ بہ مشکل تمام برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بس تھانے دار صاحب! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔''

''انشاء اللہ......'' میں نے پُرشوق انداز... میں کہا۔ ''جہاں تک میرا اختیار اور دسترس ہے، انصاف ہی ہوگا۔ اللہ کے حکم سے میں بہت جلد کرم دین کی بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اغوا کرنے والے شخص کو عبرت ناک سزا دلوانے کے بعد ہی سکون کی سانس لوں گا۔''

''میں تو فرید کے ٹوٹے کر کے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' ان میں موجود ایک نوجوان نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائے، اس کی وہ حالت کروں گا کہ سوتے جاگتے اس کی زبان پر ایک ہی نام ہوگا...... اچھو جٹ...... اچھو جٹ!''

میں نے اس جوشیلے نوجوان کی دھمکی آمیز باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''برخوردار! اچھو جٹ تم ہی ہو؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے فخریہ انداز میں بولا۔ ''میرا نام اسلم عرف اچھو جٹ ہے۔ لوگ تو میرا نام سن کر ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اس چوہے کم ذات فرید کی ہمت کیسے ہوئی میری بہن کو میلی نظر سے دیکھنے کی، میں تو اس کی دونوں آنکھیں نکال کر ہاتھ میں رکھ دوں گا۔''

اچھو کی گفتگو سے مجھے اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ گم شدہ لڑکی خالدہ کا بھائی تھا۔ اگرچہ اس کی بات چیت کا انداز خاصا بدمعاشانہ اور غنڈا گردانہ تھا اور میں اگر چاہتا تو ایک دبکا مار کر اسے چپ کرا سکتا تھا لیکن کسی قسم کا جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

''اچھو جٹ! اگر تمہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کا اتنا شوق ہے تو پھر میرے پاس کیوں آئے ہو۔ جاؤ، خود ہی اپنی بہن کو تلاش کر لو۔''

''پر کچھ پتا تو چلے نا جی......'' وہ غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ بولا۔ ''کہ وہ شیطان کا بچہ فرید گیا کہاں ہے۔''

''اوئے اچھو!'' مرتضیٰ خان نے ہاتھ اٹھا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو چپ کر کے ایک طرف بیٹھ جا اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھ۔ میں ساتھ آیا ہوں تو تھانے دار سے مجھے ہی بات کرنے دے۔''

''اچھو پتر! خان صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ذکیہ بی بی نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ جب بات کر رہے ہیں تو تمہیں بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو صبر کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

مغوی یا گم شدہ خالدہ کی ماں کی حمایت پا کر مرتضیٰ خان کچھ اور چوڑا ہو گیا۔ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ فرید کے خلاف پرچہ کاٹیں۔'' اس کا لہجہ خاصا کھرا تھا۔ ''یہ دن دہاڑے کیسی اندھیر مچی ہوئی ہے۔ اب تو غریب آدمی کا عزت سے زندہ رہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔''

چھوٹے خان کی گفتگو مجھے حد سے زیادہ ناگوار گزر رہی تھی۔ اپنی خفگی اور غصے کو دباتے ہوئے میں نے کہا۔

''خان صاحب! آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں جا کر بیٹھیں۔ میں ذرا تنہائی میں لڑکی کے ماں باپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' پھر میں نے کانسٹیبل کو کہا۔

''نور شاہ! چھوٹے خان صاحب کو عزت سے برآمدے میں بٹھا دو اور ان کا خاص خیال رکھنا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ملنا چاہیے۔'' پھر میں دوبارہ مرتضیٰ کی جانب متوجہ ہوا اور کہا۔

''خان صاحب! آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے

گا۔ میں دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو جاتا ہوں پھر آپ سے بات ہوگی۔''

اگرچہ مرتضیٰ خان وہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا تاہم وہ میرے تیور دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے اڑی نہیں کی اور معنی خیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے باقی افراد میں سے کرم دین اور ذکیہ بی بی کو روک کر دیگر کو باہر بھیج دیا پھر میں کرم دین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''اب بتاؤ مجھے، تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ملکوں کے لڑکے فرید ہی نے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ثبوت تو کوئی نہیں سرکار۔'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔

''پورا علاقہ جانتا ہے تھانے دار صاحب۔'' ذکیہ اپنے شوہر کی مدد کرتے ہوئے بولی۔ ''فرید نے ہماری زندگی خراب کر رکھی تھی اور اس نے خالو کے اغوا کی دھمکی بھی دی تھی۔''

''اس دھمکی کی وجہ......'' میں نے ذکیہ سے استفسار کیا۔ ''کیا فرید کی تم لوگوں کے ساتھ کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟''

''نہیں جناب! دشمنی تو کوئی نہیں تھی۔'' کرم دین نے بتایا۔

''کسی دشمنی کے بغیر کوئی کسی کو دھمکی نہیں دیتا۔'' میں نے گھور کر کرم دین کی طرف دیکھا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''میں بتاتی ہوں جی۔'' ذکیہ جلدی سے بولی۔ ''دراصل فرید، خالو سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے اس رشتے سے انکار کر دیا تو وہ ہمارا دشمن ہو گیا۔''

''جبکہ ہم خالو کا رشتہ اپنے رشتے داروں میں کرنا چاہتے تھے اور اس کے ماموں زاد سے اس کی منگنی بھی کر دی تھی۔'' کرم دین نے بتایا۔ ''اب آپ خود سوچ لیں کہ ہم کس طرح فرید کا رشتہ قبول کر لیتے؟''

''اور جب ہم نے فرید کے رشتے سے انکار کیا تو وہ ہمارا دشمن ہو گیا۔'' ذکیہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے اس کا رشتہ منظور نہ کیا تو وہ خالو کو اٹھا لے جائے گا۔''

''جی...... اس نے خالو کے اغوا کی دھمکی دی تھی اور پھر اپنی دھمکی کو پورا بھی کر دکھایا۔'' کرم دین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''کرم دین! لڑکی تمہاری غائب ہوئی ہے لیکن اس معاملے میں چھوٹا خان بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے...... آخر کیوں؟''

''وہ جناب...... خان جی ہمارے علاقے کے بڑے چوہدری ہیں۔'' کرم دین کے جواب دینے سے پہلے ذکیہ بی بی بول اٹھی۔ ''خان جی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ کرم دین کی بہ نسبت اس کی بیوی خاصی ہوشیار تھی۔ جب میرا اس سے سامنا ہوا تھا تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر آنسو بہا رہی تھی حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے پہلی فرصت میں اس کی بیٹی کو نہ ڈھونڈ نکالا تو وہ رو رو کر اپنی جان دے دے گی لیکن اب وہ کافی سنبھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ اطمینان رکھو۔ میں بہت جلد خالدہ عرف خالو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ بس اس کام کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''کیسا تعاون تھانے دار صاحب؟'' ذکیہ نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

''ان تمام لڑکیوں کے نام مجھے نوٹ کرا دو جن کے ساتھ خالو کا زیادہ میل جول تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان سے بھی پوچھ تاچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''مائی باپ! خالو کی تو بس ایک ہی سہیلی ہے۔'' کرم دین نے بتایا۔ ''اسحاق ترکھان کی بیٹی کلثوم...... خالو کا زیادہ ملنا جلنا اسی کلثوم کے ساتھ ہی تھا۔''

''کلثوم، خالو کی گمشدگی کے بارے میں کیا کہتی ہے؟'' میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ بھی کچھ نہیں جانتی۔'' کرم دین نے بتایا۔

میں مزید دس پندرہ منٹ تک ان سے سوال، جواب کرتا رہا پھر اس تسلی کے ساتھ انہیں تھانے سے رخصت کر دیا کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی کو بازیاب کر لوں گا۔

☆☆☆

چھوٹے خان غلام مرتضیٰ کے رویے سے مجھے کافی کوفت ہوئی تھی اور میرا ذہن اس کی ذات کے حوالے سے شکوک و شبہات کا شکار ہو گیا تھا۔ کرم دین ایک عام سا آدمی تھا اور خان بہ نفسِ نفیس اس کی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے تھانے آیا تھا۔ نہ صرف وہ ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا بلکہ بار بار اس نے اس امر پر بھی زور دیا تھا کہ میں ملکوں کے لڑکے فرید کے خلاف اغوا کا پرچہ کاٹوں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، چھوٹے خان کی آمد کا سبب دو... میں

سے کوئی ایک ہوسکتا تھا۔
اول یہ کہ اس کا کوئی مفاد کرم دین کی فیملی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ دوم یہ کہ ملکوں سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی تھی۔ بہرحال، دال میں کچھ کالا ضرور تھا!

میں نے ایک کانسٹیبل کو اسحاق ترکھان کی جانب روانہ کردیا اور کہا کہ وہ اسحاق اور اس کی بیٹی کلثوم کو تھانے لے آئے تاکہ خالو کی تلاش کا آغاز کیا جاسکے۔ اس کام سے نمٹ کر میں بیٹھا ہی تھا کہ کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا کہ دو افراد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلالیا اور کانسٹیبل سے پوچھا۔

''کیا چھوٹا خان ابھی تک باہر ہی بیٹھا ہوا ہے؟''

''نہیں ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ تو کافی دیر پہلے چلے گئے تھے۔''

''میں نے تو اسے باہر بیٹھنے کو کہا تھا۔'' میرے لہجے میں الجھن در آئی۔ ''کہاں چلا گیا وہ؟''

''یہ پتا نہیں ملک صاحب لیکن وہ آپ سے خاصے خفا نظر آرہے تھے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''کہہ رہے تھے، یہ تھانے دار خود کو سمجھتا کیا ہے۔ ابھی اسے پتا نہیں کہ میری پہنچ کہاں تک ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وہ تو کرم دین کے جانے سے پہلے ہی پاؤں پٹختا ہوا تھانے سے نکل گیا تھا۔''

یہ ٹھیک ہے کہ میں مرتضیٰ خان اور اس علاقے کے دیگر افراد کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ باقی جہاں تک چھوٹے خان کی پہنچ کا تعلق تھا تو...... یہ تو ہاتھوں میں ہاتھ پڑنے کے بعد ہی پتا چل سکتا تھا اور...... چھوٹے خان نے اس پنجہ آزمائی کا آغاز کردیا تھا۔

جن دو افراد کی آمد کا ذکر کانسٹیبل نے کیا تھا، ان میں ایک مرد اور دوسری عورت تھی۔ وہ چہروں سے کافی پریشان دکھائی دیتے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا کہیں گم ہوگیا ہے اور وہ اس کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔

''تھانے دار صاحب!'' کرامت علی نے فریادی لہجے میں بتایا۔ ''کل رات سے میرے بیٹے کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''تمہارے بیٹے کا کیا نام ہے؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''فرید نام ہے میرے بچے کا۔'' کرامت علی کی بیوی دل شاد نے جواب دیا۔ ''اور میرا شک ذکیہ پر ہے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر پوچھا۔ ''تم خالو کی ماں ذکیہ کی بات کررہی ہونا؟''

''جی جی وہی......'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرا بیٹا اسی عورت نے غائب کروایا ہے۔ آپ اس کے خلاف رپورٹ درج کریں جناب۔''

''تھوڑی دیر پہلے ذکیہ، کرم دین، اچھو اور مرتضیٰ خان یہاں سے گئے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ تمہارے بیٹے نے خالو کو اغوا کرلیا ہے۔ وہ بھی تمہارے بیٹے کے خلاف خالو کے اغوا کی رپورٹ لکھوانے آئے تھے۔''

''یہ سراسر جھوٹ ہے تھانے دار صاحب۔'' کرامت علی نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''فرید اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔ اغوا تو بہت بڑا جرم ہے۔ وہ اتنے سنگین کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''ہر ماں باپ کا یہی خیال ہوتا ہے کہ اس کی اولاد کسی فرشتے سے کم نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''بہرحال، یہ بتاؤ۔ تمہارا بیٹا کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ جی مرتبان اور پیالیوں کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کارخانے کا نام؟'' میں نے پوچھا۔

''حجاز پاٹری۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''وہ پاٹری میں کرتا کیا ہے؟''

''وہ بیام بناتا ہے جی۔'' دل شاد نے جواب دیا۔ ''وہ چک (چاک) کا بہت اچھا کاریگر ہے۔''

''حجاز پاٹری'' اور ''افضل پاٹری'' پہلو بہ پہلو جی ٹی روڈ پر واقع تھیں۔ یہ مٹی کے برتن بنانے کے کارخانے تھے اور میری معلومات کے مطابق، یہاں پر کپ پرچ، پیالیاں مگ اور بیام (مرتبان) تیار کیے جاتے تھے اور یہ سارا کام ہاتھ سے چلائے جانے والے چاک پر ہی کیا جاتا تھا۔

''وہ فیکٹری سے گھر کب آتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ سے چار بجے تک ہوتی ہے۔'' کرامت علی نے بتایا۔ ''دس پندرہ منٹ میں وہ گھر پہنچ جاتا تھا۔''

''مطلب یہ کہ وہ سوا چار بجے گھر آجاتا تھا۔'' میں نے کرامت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ روز

بھی کیا وہ اسی وقت گھر پہنچا تھا؟"

"وہ گھر نہیں پہنچا جی۔" دل شاد نے روہانسی آواز میں کہا۔"وہ کل صبح کا گیا ابھی تک نہیں آیا۔"

"کل جب وہ حسبِ معمول گھر نہیں آیا تو تم لوگوں کو کوئی تشویش نہیں ہوئی؟" میں نے قدرے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"ہم اوور ٹائم کے چکر میں رہ گئے۔" کرامت نے کہا۔

"اوور ٹائم...... کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"فرید کبھی کبھی فیکٹری میں زیادہ کام ہونے کی وجہ سے اوور ٹائم بھی لگاتا تھا۔" اس نے بتایا۔"کبھی دو گھنٹے، کبھی چار اور کبھی چھ گھنٹے۔ ہم یہی سمجھے کہ وہ شاید اوور ٹائم کی وجہ سے لیٹ ہوگیا تھا لیکن وہ واپس نہیں آیا......" اس کی آواز سے گہرے کرب کا اظہار ہوتا تھا۔"رات جیسے تیسے ہم نے گزاری اور اب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔"

"میرے سامنے بیٹھے ہیں اور......" میں نے دل شاد بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"اور تمہیں شک ہے کہ فرید کو ذکیہ بی بی نے کہیں غائب کروا دیا ہے...... ہیں نا؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"ذکیہ بی بی پر شک کا کوئی سبب؟"

"سارا قصور اسی عورت کا ہے تھانے دار صاحب۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔"آپ کو پتا نہیں کہ ذکیہ کتنی چالباز عورت ہے۔"

"ہاں...... مجھے بالکل پتا نہیں اور میں اپنی معلومات میں اضافے کے لیے تم سے جاننا چاہوں گا کہ ذکیہ کیسی عورت ہے......"

"تھانے دار صاحب! ذکیہ کا بیٹا اچھو کئی بار فرید کو دھمکی دے چکا تھا کہ وہ اس کا برا حشر کرے گا۔" دل شاد بی بی نے بتایا۔"اور چھوٹے خان صاحب بھی انہی گھٹیا لوگوں کی حمایت کرتے ہیں۔"

"اچھو نے تمہارے بیٹے کو دھمکی کیوں دی تھی؟" میں نے کریدنے والے... انداز میں پوچھا۔

"جٹ...... اونہہ!" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔"یہ لوگ جٹ نہیں، کمی کمین ہیں تھانے دار صاحب۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کرم دین اصلاً نسلاً موچی ہے سرکار۔" کرامت علی نے بتایا۔"اگر ان لوگوں نے چمڑے اور جوتے کا کام چھوڑ دیا ہے تو اس سے ذات تھوڑی تبدیل ہوجائے گی۔ یہ لوگ اپنے اوپر "جٹ" کا لیبل لگا کر خود کو معزز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میری بات غور سے سنو کرامت علی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"کوئی بھی ذات اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ ہاں، اس ذات سے تعلق رکھنے والے لوگ اچھے برے ہوسکتے ہیں لہٰذا کبھی کسی انسان کی کمتری اور برتری کو ذات برادری کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیے۔ اصل چیز انسان کا کردار اور عمل ہے......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک آپ لوگوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اچھو جٹ نے فرید کو دھمکی کیوں دی تھی۔ اس کی فرید سے کیا دشمنی تھی۔ اگر آپ مجھ سے کچھ چھپائیں گے تو میں آپ کے بیٹے کی تلاش کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

کرم دین اور ذکیہ کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ فرید خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ خالدہ کی اپنے ماموں زاد منظور حسین سے منگنی ہوئی تھی لہٰذا انہوں نے اس رشتے سے انکار کردیا تھا اور ان کے بہ قول، اسی انکار کی وجہ سے فرید ان کا دشمن ہوگیا تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے یہ میاں بیوی خالدہ کی ماں ذکیہ اور بھائی اچھو پر سارا ملبا ڈال رہے تھے کہ انہی لوگوں نے ان کے بیٹے کو غائب کیا ہے لیکن ابھی تک انہوں نے فرید کے رشتے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔"ساری گڑبڑ رشتہ مانگنے کی وجہ سے ہوئی ہے تھانے دار صاحب۔" کرامت علی نے اصل بات بتاتے ہوئے کہا۔"نہ ہم فرید کا رشتہ بھیجتے اور نہ وہ لوگ ہمارے دشمن ہوتے۔"

میں نے کہا۔"کسی کے گھر رشتہ بھیجنا کوئی ایسا جرم نہیں کہ جواب میں سامنے والا دشمنی پر اتر آئے۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے......"

میں نے ہوا میں ایک اندھا تیر چلایا تھا لیکن یہ تیر نشانے پر جا کر لگا۔ ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر دل شاد اضطراری لہجے میں بولی۔

"میں آپ کو بتاتی ہوں تھانے دار جی کہ...... یہ چکر ہے کیا۔" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"سارے فساد کی جڑ چھوٹے خان صاحب ہیں جناب۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔"چھوٹے خان کا اس معاملے سے کیا

تعلق......!''

مجھے امید ہو چلی تھی کہ اب میرے حسبِ منشا جواب آنے والا ہے۔ میں شروع ہی سے خان بہادر کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

دل شاد بی بی نے آواز دبا کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''چھوٹے خان صاحب کا ذکیہ کے گھر آنا جانا ہے۔ ذکیہ بہت اونچے خواب دیکھ رہی ہے۔ اس نے خان صاحب کو پھانس رکھا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے پلکیں جھپکائیں۔ ''ذکیہ نے کس مقصد کے لیے خان بہادر کو پھانس رکھا ہے؟ اس کا شوہر کرم دین ابھی حیات ہے اور خالدہ کی منگنی بھی ہو چکی ہے۔ میری معلومات کے مطابق، اس گھر میں ان دونوں کے سوا اور کوئی عورت موجود ہی نہیں ہے۔''

''خالو کی منگنی وگنی والی ساری کہانی جھوٹی اور من گھڑت ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''تاکہ نہ تو کوئی خالو کا رشتہ مانگے اور نہ ہی کسی کو ان کے کرتوتوں کا پتا چلے۔ ذکیہ چھوٹے خان سے خالو کی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''اچھا......!'' میں نے ایسے ہی ظاہر کیا جیسے اس کے انکشاف سے مجھے جھٹکا لگا ہو۔ ''تو کرم دین کے گھر میں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔''

''یہ ذکیہ کی بھول ہے کہ چھوٹے خان صاحب اس کی بیٹی سے شادی کرلیں گے۔'' کرامت علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اصل کھیل تو چھوٹا خان کھیل رہا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور بچوں والا ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ نیچ ذات کی ایک لڑکی کو اپنی بیوی بنالے۔ وہ وقت پاس کر رہا ہے اور تفریح بھی۔''

اب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ غلام مرتضیٰ بڑی شد و مد سے فرید کے خلاف خالدہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا۔ تازہ ترین صورتِ حال کے تناظر میں فرید، خان بہادر کا ''رقیب'' لگتا تھا۔ وہ اپنی راہ کا کانٹا ہٹادینا چاہتا تھا۔

کرم دین اینڈ ذکیہ بی بی نے خالدہ کی منگنی، منظور حسین سے کی تھی یا نہیں، اس بات کی فی الحال زیادہ اہمیت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے باری باری ان میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تم دو تین بار خالدہ کو نیچ ذات اور کمین کہہ چکے ہو۔ کیا مجھے بتاؤ گے کہ تم لوگوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ اس گھٹیا خاندان میں کیوں بھیجا تھا؟''

''ہم فرید کی وجہ سے مجبور ہوگئے تھے۔'' دل شاد نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''فرید، خالدہ پر ریجھ گیا تھا۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''تمہارے گھر میں کُل کتنے افراد ہیں؟''

''ہم دونوں میاں بیوی اور فرید۔'' کرامت علی نے بتایا۔ ''بس یہی تین افراد جناب۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ گھر جاؤ اور اطمینان رکھو کہ میں بہت جلد تمہارے بیٹے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اگر آپ اپنی تفتیش کا آغاز ذکیہ کے گھر سے کریں تو آپ کو جلد ہی کامیابی مل جائے گی۔'' دل شاد نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میرا شک بار بار اسی طرف جا رہا ہے۔''

میں نے تسلی تشفی کے بعد انہیں رخصت کردیا۔

دل شاد بی بی نے اپنے جس شک کا برملا اظہار کیا تھا، اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے چھوٹے خان کی، فرید کی گرفتاری کے سلسلے میں دلچسپی کو نوٹ کیا تھا اور اس کے انداز سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فرید سے شدید نفرت کرتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے حوالدار بہادر علی کو اپنے ساتھ لیا اور ہم لوگ سائیکلوں پر سوار ہو کر حجاز پاڑی کی جانب روانہ ہوگئے۔ زیادہ پڑھے لکھے افراد اسے بائی سائیکل یا بائیکل سمجھیں۔ ہمارے دور میں یہ ایک معروف سواری تھی جو آج کل ناپید ہو کر رہ گئی ہے۔

ہمارے زمانے میں آج کی طرح پولیس کے پاس بکتر بند گاڑیاں اور تیز رفتار پولیس موبائلز نہیں ہوا کرتی تھیں۔ تھانہ انچارج تک کے لیول کے افراد کو بھی کارِ سرکار کے لیے بائی سائیکل، گھوڑے اور تانگے وغیرہ کا سہارا لینا پڑتا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ تھانے دار تو بہت دور کی بات ہے، ایک عام کانسٹیبل کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی معمولی سی چھڑی بھی آج کی کلاشنکوف سے زیادہ موثر ثابت ہوتی تھی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے دور میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بہت ریسپیکٹ ہوا کرتی تھی۔

☆☆☆

حجاز پاڑی جی ٹی روڈ کے کنارے واقع تھی۔ یہ سارا کمرشل بلکہ انڈسٹریل ایریا تھا اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔ سڑک کی دونوں جانب میلوں کے فاصلے تک مختلف

مصنوعات تیار کرنے والی فیکٹریاں موجود ہیں جن میں سرامکس، پاٹری اور ٹیکسٹائل و سینیٹری فٹنگ سرفہرست ہیں۔

''حجاز پاٹری'' کے منشی نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم دونوں یونیفارم میں تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو منشی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور فدویانہ انداز میں بولا۔

''سرکار تشریف رکھیں۔''

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ چکے تو منشی نے کہا۔ ''ملک صاحب! چائے چلے گی یا ٹھنڈا منگوالوں؟ آج آپ پہلی بار ہمارے پاس آئے ہیں۔ خاطر تواضع بہت ضروری ہے۔''

اس طرح کے کارخانوں میں ''منشی'' ایک توپ قسم کی چیز ہوتا ہے۔ آپ اسے اکاؤنٹنٹ، کیشیر، جنرل منیجر اور مالک کا دستِ راست سمجھ لیں۔ مالک نے اسے سیاہ و سفید کا اختیار دے رکھا ہوتا ہے۔ مالک کی غیر موجودگی میں وہی... کارخانے کا مالک ہوتا ہے۔

''منشی جی! خاطر تواضع پھر کبھی سہی۔ آپ کوئی تکلف نہ کریں۔''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ہم ایک ضروری کام سے یہاں آئے ہیں اور جلدی میں بھی ہیں۔''

''جو آپ کا حکم ملک صاحب۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''آپ کے کارخانے میں فرید نام کا ایک بندہ کام کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔''

''جی...... فرید چک (چاک) پر کام کرتا ہے۔'' منشی نے بتایا۔ ''وہ بیام (مرتبان) بنانے کا بہت اچھا کاریگر ہے مگر آج وہ فیکٹری نہیں آیا۔ آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''وہ آج کام پر نہیں آیا، اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔'' میں نے منشی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ فرید کہاں غائب ہے؟''

''غائب......!'' اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیا فرید کہیں غائب ہوگیا ہے؟''

''جی منشی جی!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ کل فیکٹری سے گھر نہیں پہنچا۔ اس کے والدین نے آج اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے۔''

منشی کے چہرے پر پریشانی چمک اٹھی۔ ''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔''

''کل، اس نے فیکٹری سے نکلتے وقت کچھ بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب! وہ تو کل چھٹی سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔'' منشی نے جواب دیا۔ ''اس کی چھٹی چار بجے ہوتی ہے۔ کبھی کام زیادہ ہو تو وہ دو تین گھنٹے اوور ٹائم بھی کرلیتا ہے لیکن کل تو وہ لگ بھگ دو بجے یہاں سے چلا گیا تھا۔''

''اچھا......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''اس نے کل جلدی چھٹی کرنے کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی؟''

''نہیں جناب!'' منشی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا... ''اس نے جلدی جانے کو کہا اور میں نے اسے چھٹی دے دی۔ آج کل کام ذرا ٹھنڈا ہے لہٰذا میں نے اس سے زیادہ جرح نہیں کی اور اس نے بھی خود کچھ نہیں بتایا۔''

مجھے محسوس ہوگیا کہ منشی سے کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکے گی لہٰذا ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ ''ویسے یہ فرید کیسا بندہ ہے؟ اس کا رکھ رکھاؤ کیسا ہے؟''

''بہت سیدھا اور شریف لڑکا ہے تھانے دار صاحب۔'' منشی نے بتایا۔ ''ہم نے کبھی اس کی کوئی شکایت نہیں سنی۔''

''اس کی کسی کے ساتھ کبھی لڑائی وغیرہ بھی ہوئی؟''...... میں نے استفسار کیا۔ ''مثلاً کسی سے اس کی کوئی دشمنی تھی؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''آپ کے خیال میں وہ کہاں جاسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔''

''یہاں کام کرنے والوں میں کس کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی؟''

''وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا ہے'' منشی نے جواب دیا۔ ''لوگوں کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے کی اس کی عادت نہیں البتہ، انور اس کے زیادہ قریب ہے۔''

''کون انور!'' میں نے پوچھا۔ ''کیا انور اس وقت فیکٹری میں موجود ہے؟''

''جی وہ کام پر آیا ہوا ہے۔'' منشی نے جواب دیا۔ ''میں اسے بلاتا ہوں۔''

چند لمحات کے بعد انور نامی ایک نوجوان ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ منشی نے بتایا کہ انور بھی چاک کا کاریگر ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا، سانولی رنگت والا لڑکا تھا۔ پولیس کو کارخانے میں دیکھ کر وہ قدرے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ میں

چند لمحات تک بہ غور اس کا جائزہ لیتا رہا پھر پوچھا۔

''مجھے پتا چلا ہے، فرید کے ساتھ تمہاری بڑی گہری دوستی ہے۔ وہ اپنی ہر بات تمہیں بتاتا ہے؟''

''بس جی، ساتھ کام جو کرتے ہیں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ اسے دوستی سمجھ لیں۔''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے انور۔'' میں نے اس کے خوف کو زائل کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا۔ ''اصل میں فرید کل سے غائب ہے اور میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم اس بارے میں جو بھی جانتے ہو، سچ سچ مجھے بتادو۔''

''وہ...... وہ کہاں ...... غائب ہوگیا......'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

اس کا خوف کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم تو اس طرح ڈر رہے ہو جیسے فرید کو تم ہی نے غائب کیا ہے......!''

''نن...... نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اپنے حواس پر قابو رکھو اور جو میں پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔''

''جی ...... جی آپ پوچھیں۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔

''کل فرید چھٹی ٹائم سے دو گھنٹے پہلے فیکٹری سے چلا تھا۔''

میں نے اس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اس نے اپنے جلدی جانے کی وجہ بتائی تھی؟''

''جی! اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے جارہا ہے۔'' انور نے جواب دیا۔

''کون دوست؟'' میں نے پوچھا۔

''فرید کے دوست کا نام حنیف ہے۔'' انور نے بتایا۔ ''وہ ادھر واہنڈو میں رہتا ہے۔''

''واہنڈو'' ایمن آباد سے تھوڑے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میں نے انور سے پوچھا۔ ''کیا فرید نے کوئی ایسی بات کی تھی کہ وہ رات کو ادھر واہنڈو ہی میں ٹھہرے گا؟''

''جی نہیں، اس نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔'' انور نے کہا۔ ''واہنڈو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر وہ وہاں گیا بھی تھا تو میرا خیال ہے اسے رات تک واپس گھر آجانا چاہیے تھا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ ایمن آباد اور واہنڈو سے ہو کر آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ واہنڈو گیا ہی نہیں۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں غائب ہوگیا ہے۔'' وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

''اللہ تو بہتر جانتا ہی ہے لیکن دنیاوی معاملات سے نمٹنے کے لیے بہت سی چیزیں انسان کو بھی جاننا پڑتی ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے خیال میں وہ کہاں گیا ہوگا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا تھانے دار صاحب۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''کیا فرید نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے؟'' میں نے انور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ خالدہ نامی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن خالدہ کے گھر والوں نے اس رشتے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے بعد فرید خاصا چپ چپ رہنے لگا تھا۔''

''اور ...... وہ خالدہ بھی کل شام سے غائب ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''کیا......!'' انور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہ کہاں غائب ہوگئی؟''

''ہوسکتا ہے، خالدہ بھی وہیں غائب ہو جہاں فرید غائب ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں اپنی مرضی سے غائب ہوئے ہیں۔ کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں تھانے دار صاحب۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ واہنڈو جاکر فرید کے دوست حنیف سے بھی پوچھ گچھ کریں ملک صاحب۔'' منشی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، وہاں سے کوئی اہم اطلاع مل جائے۔''

''یہ میرے پروگرام میں شامل ہو چکا ہے کہ واہنڈو کو بھی چیک کرنا ہے۔'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''آپ لوگوں کو بھی فرید کے بارے میں اگر کسی قسم کی کوئی اطلاع یا سن گن ملے تو فوراً مجھے آگاہ کرنا۔''

''جی ضرور......'' منشی نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''آپ

بے فکر ہو جائیں مائی باپ۔''

منشی فیکٹری کے دروازے تک ہمیں چھوڑنے آیا اور بولا۔'' مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ آپ پہلی بار یہاں آئے اور بغیر کچھ کھائے پیے واپس چلے گئے۔''

'' آپ کی خاطر تواضع کی خواہش ادھار رہی۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔'' اللہ نے موقع دیا تو میں جلد ہی آپ کی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔''

واپسی کے سفر میں، میں نے بہادر علی سے پوچھا۔'' تمہارا کیا خیال ہے، خالدہ واقعی اغوا ہوئی ہے یا یہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے؟''

'' ملک صاحب! اب تک فرید کے بارے میں ہم جو معلومات حاصل کر چکے ہیں، ان کی روشنی میں مجھے تو نہیں لگتا کہ اس نے خالدہ کو اغوا کیا ہوگا۔'' حوالدار نے جواب دیا۔'' مجھے تو یہ کوئی دوسرا ہی چکر لگتا ہے۔''

'' تمہارا اشارہ چھوٹے خان کی طرف ہے......!'' میں نے استفسار کیا۔

'' جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' میری مانیں تو مرتضیٰ خان کو گرفتار کر کے تفتیش کی چکی میں پیس ڈالیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی خود ہی الگ ہو جائے گا۔''

'' مجھے خود بھی چھوٹے خان پر شک ہے کہ خالدہ کی گمشدگی میں ضرور اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔'' لیکن بغیر کسی ثبوت کے اس کی گرفتاری مناسب نہیں ہوگی، اگر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تو وہ محتاط ہو جائے گا پھر اس کی گردن ناپنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ اس کا معاملہ میرے ذہن میں ہے.... بہرحال، پہلے ہمیں واہنڈو جا کر فرید کے دوست حنیف کو چیک کرنا چاہیے پھر چھوٹے خان سے بھی نمٹ لیں گے اور یہ کام تم کرو گے۔''

'' جو آپ کا حکم ملک صاحب! میں واہنڈو جانے کے لیے تیار ہوں۔'' حوالدار بہادر علی نے کہا۔'' لیکن مجھے یقین ہے کہ مرتضیٰ خان، خالدہ کی گمشدگی میں ملوث ہے اور جہاں تک فرید کے غائب ہونے کا تعلق ہے تو ممکن ہے.... دل شاد بی بی کے خدشات کے مطابق، کہیں مرتضیٰ خان نے رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو کر فرید کو ٹھکانے ہی نہ لگا دیا ہو......!''

'' تمہاری بات میں وزن ہے بہادر علی!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔'' تم واہنڈو کی خبر گیری کر آؤ اور میں یہاں کے معاملات دیکھتا ہوں۔ انشاء اللہ، بہت جلد ان گمشدگان تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔''

'' انشاء اللہ......!'' حوالدار بھی پُر یقین لہجے میں بولا۔

میں نے لاری اڈے سے بہادر علی کو واہنڈو جانے والی بس پر سوار کیا اور خود تھانے آ گیا۔ لاری اڈا میرے تھانے سے چند گز کی دوری پر تھا۔

☆☆☆

میں نے تھانے پہنچ کر ایک ہوشیار قسم کے کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا پھر اسے چھوٹے خان کی خفیہ نگرانی کے حوالے سے ہدایات دینے لگا۔

مذکورہ کانسٹیبل کو سادہ لباس میں رہ کر مرتضیٰ کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنی تھی۔ اس کانسٹیبل کا نام آفتاب تھا۔ اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور سیلوٹ کر کے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد کرم دین مجھ سے ملنے تھانے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جن میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور دوسری نوجوان لڑکی تھی۔ کرم دین نے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

'' تھانے دار جی! یہ اسحاق ترکھان اور اس کی دھی کلثوم ہے جی۔ آپ نے کلثوم کو پوچھ تاچھ کے لیے تھانے بلایا تھا نا......تو میں بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔''

'' بہت اچھا کیا تم نے کرم دین۔'' میں نے کہا۔'' لیکن مجھے پوچھ گچھ صرف کلثوم سے کرنا ہے لہٰذا آپ دونوں باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔''

'' جی، بہت اچھا۔'' کرم دین جلدی سے بولا، پھر پوچھا۔'' میری خالو کا کچھ پتا چلا سرکار؟''

'' میں نے خالو کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے ہی یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔'' تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد اسے تلاش کر لوں گا۔''

جب کرم دین اور اسحاق ترکھان کمرے سے باہر نکل گئے تو میں کلثوم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سولہ سترہ سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی تاہم اس وقت وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ تھانے دار اور پولیس کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے اور وہ بھی اسی دہشت کا شکار نظر آتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

'' کلثوم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھانے میں صرف مجرموں کے ساتھ سخت سلوک کیا جاتا ہے۔ تم سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



صرف خالو کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی لہٰذا اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔''

میری تسلی سے اس پر مثبت اثرات مرتب ہوئے، وہ قدرے ریلیکس دکھائی دینے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ تم خالدہ کے بہت قریب تھیں بلکہ تم ہی اس کی اکلوتی سہیلی ہو؟''

''جی...... '' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں میں بڑی اچھی دوستی ہے۔''

''تمہاری سہیلی کل شام سے غائب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے، تمہیں اس کا بڑا دکھ ہوگا۔''

''جی بہت دکھ ہے مجھے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''پر میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''تم اپنی سہیلی کی بازیابی کے لیے بہت کچھ کرسکتی ہو کلثوم!'' میں نے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ میں جلد از جلد خالدہ کو تلاش کرلوں؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں خالدہ کے لیے بہت فکر مند ہوں۔''

''فکر مند ہونے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے کلثوم۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو میں آسانی سے تمہاری سہیلی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''جی ...... میں تعاون کروں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''ذکیہ بی بی اور کرم دین کا یہ خیال ہے کہ خالو کو فرید نے اغوا کرلیا ہے جبکہ فرید کے ماں باپ ذکیہ بی بی، اچھو اور مرتضیٰ خان پر اپنا شک ظاہر کررہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو؟''

''مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''اس لیے میں آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گی۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''میں بھی یہی توقع کرتا ہوں کہ تم صرف سچ بولو گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولو گی۔''

''جناب! یہ سچ ہے کہ فرید، خالو کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کی خواہش بھی رکھتا ہے۔'' کلثوم نے بولنا شروع کیا۔ ''اس نے اپنا رشتہ بھی بھیجا تھا لیکن خالو کے گھر والوں نے انکار کردیا۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ خالدہ کی اس کے ماموں زاد منظور حسین سے منگنی ہوچکی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''منظور حسین گکھڑ منڈی میں دریوں کی دکان چلاتا ہے لیکن فرید کی ماں کا دعویٰ ہے کہ خالدہ کی کوئی منگنی ونگنی نہیں ہوئی۔ ان کے رشتے کو ٹھکرانے کے لیے خالدہ کے ماں باپ نے منگنی کا بہانہ کیا ہے۔ تم تو اس حقیقت سے ضرور واقف ہوگی؟''

''یہ بات سچ ہے کہ خالو کی منظور حسین سے منگنی ہوچکی ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ شادی ہوسکے اور اب تو خالو ہی غائب ہے۔''

میں چونک اٹھا۔ ''کیا تم یہ بات صرف اس لیے کہہ رہی ہو کہ خالدہ گم ہوگئی ہے یا خالدہ اپنے منگیتر کو پسند نہیں کرتی؟''

''یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''پھر کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں وہ تیسری وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

اس نے سہمی ہوئی نظر سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''ڈرو نہیں۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔ تم بے فکر ہوکر مجھے حقائق سے آگاہ کرو۔''

''جی، میں سمجھتی ہوں کہ خالو چھوٹے خان صاحب کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔'' وہ دبی زبان سے بولی۔ ''مرتضیٰ خان اس کی شادی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔'' بات ختم کرکے وہ ایک مرتبہ پھر چوکنا انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تم چھوٹے خان کی وجہ سے کوئی خطرہ محسوس کررہی ہو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئے گی۔ ہمارے بیچ ہونے والی یہ بات چیت یہیں پر ختم ہوجائے گی۔ کسی تیسرے بندے کو پتا نہیں چلے گا کہ ہم نے آپس میں کیا گفت و شنید کی ہے۔''

اس کا اطمینان بحال ہوگیا۔ وہ پُر اعتماد لہجے میں بتانے لگی۔

''چھوٹے خان صاحب کا خالدہ کے گھر میں آجانا ہے۔ خالو کا ابا اسے پسند نہیں کرتا لیکن ذکیہ چاچی، خان جی کی حمایت کرتی ہے اور چاچا کرم دین بے بس ہے۔''

اسی قسم کی باتیں فرید کے ماں باپ نے بھی کی تھیں۔

میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کلثوم سے پوچھا۔
''کیا چاہتا ہے چھوٹا خان؟''
''بس جی، یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔'' وہ اذیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''مرتضیٰ خان بیوی بچوں والا ہے لیکن غضب خدا کا کہ وہ خالو پر اپنے دانت تیز کر رہا ہے۔''
''کیا وہ خالو سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''
''کہتا تو وہ یہی ہے اور خالو کی اماں کی بھی یہی نیت ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن خالو کا یہ خیال ہے کہ خان جی کے دل میں بے ایمانی ہے۔''
''ہوں...'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اگر چھوٹا خان واقعی اس سے شادی کے لیے سنجیدہ ہو تو کیا خالو بھی تیار ہو جائے گی؟''
''خالو، خان جی سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' کلثوم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں، اس جھمیلے کا کیا انجام ہوگا۔''
''اللہ پر بھروسا رکھو۔ انجام اچھا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ فرید، خالو کو پسند کرتا تھا۔ کیا خالو کی طرف سے بھی کوئی پسندیدگی تمہیں نظر آئی؟''
''جی، خالو بھی اسے پسند کرتی تھی مگر یہ پسندیدگی کوئی عشق اور محبت والی نہیں تھی۔'' کلثوم نے بتایا۔ ''وہ اپنے ماموں زاد سے منگنی ہونے کے بعد کسی اور مرد کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتی تھی۔ فرید کا رشتہ جب آیا، اس وقت تک خالو کی منظور حسین سے منگنی ہو چکی تھی اور چھوٹے خان کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی ان کے گھر میں شروع ہو چکا تھا۔''
''اوہ...... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالو اور اس کے باپ کرم دین کا خیال صرف منظور حسین کے لیے ہی تھا اور ذکیہ بی بی کی نیت مرتضیٰ خان پر لگی ہوئی تھی۔''
''جی...... ایسی ہی صورتِ حال ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔
''چھوٹا خان، خالو کی گم شدگی بلکہ اغوا کی رپورٹ درج کرانے کرم دین اور ذکیہ کے ساتھ تھانے آیا تھا اور اس کا زور اسی بات پر تھا کہ میں فرید کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرلوں۔'' میں نے کلثوم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے، خالو کو کہیں فرید نے اغوا تو نہیں کرلیا؟''
''مجھے ایسا نہیں لگتا جناب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''فرید اتنی جرأت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی خالو آسانی سے اس کے ساتھ جانے والی تھی۔''

''پھر چھوٹے خان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کہیں اسی نے فرید کو غائب تو نہیں کروایا؟''
''چھوٹا خان ایسی حرکت کرسکتا ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن فرید کے ساتھ خالو بھی غائب ہے۔ اگر مرتضیٰ خان نے اسے اٹھوایا ہوتا تو پھر یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ خالو کل سہ پہر تک میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں کھیتوں سے ایک ساتھ گھر کی طرف آئے تھے۔''
''تم نے آخری بار خالو کو کب دیکھا تھا؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''جب تم لوگ کھیتوں سے واپس آئے تو کیا وقت تھا؟''
''شام سے تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔ آپ عصر کا وقت سمجھ لیں۔''
کلثوم نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی تین ساڑھے تین کا وقت۔''
جنوری کے مہینے میں پنجاب کے گاؤں دیہات میں پانچ بجے کے آس پاس مغرب کی اذان ہو جاتی ہے لہٰذا ساڑھے تین بجے عصر کا وقت ہوسکتا ہے۔
''کیا تم نے اپنی آنکھوں سے خالو کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟'' میں نے کلثوم سے پوچھا۔ ''تم دونوں کے گھروں کا دروازہ تو ساتھ ساتھ ہی ہے نا؟''
''جی دروازے تو ساتھ ساتھ ہی ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہم پڑوسی ہیں لیکن خالو میرے سامنے اپنے گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں چونک اٹھا۔
''جب ہم اپنی گلی میں داخل ہونے والے تھے تو حشمت چاچی نے خالو کو آواز دے کر روک لیا تھا۔'' کلثوم نے بتایا۔ ''بس، میں اپنے گھر آگئی اور خالو، حشمت چاچی کی طرف بڑھ گئی۔''
''کیا حشمت بھی اسی گاؤں میں رہتی ہے؟''
''جی تھانے دار صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''اس کے بعد پھر خالو سے تمہاری ملاقات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، رات میں کسی وقت؟''
''جی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک بار جب گھر آگئی تو پھر باہر نہیں نکلی اور خالو بھی میری طرف نہیں آئی۔''
''گویا آخری بار تم نے خالدہ کو کل سہ پہر میں ساڑھے تین بجے دیکھا تھا؟''

''جی بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد کلثوم کو فارغ کر دیا اور کرم دین و اسحاق ترکھان کو اندر بلا لیا پھر اسحاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کلثوم سے اچھی طرح پوچھ گچھ کر لی ہے۔ یہ خالدہ کی گم شدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی لہٰذا آپ لوگ یہاں سے جا سکتے ہیں۔''

اسحاق ترکھان نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی بیٹی کلثوم کو لے کر جانے لگا تو میں نے دیکھا، کرم دین بھی وہاں سے رخصت ہونے کو بے تاب نظر آرہا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

''کرم دین! تم ابھی رکو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

وہ رک گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور اسحاق و کلثوم کو جانے کی اجازت دے دی پھر کرم دین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو صبح مجھے بتایا تھا کہ کلثوم، خالدہ کی بہت گہری سہیلی ہے مگر یہ کیسی دوستی ہے کہ کلثوم اس بارے میں کچھ خاص نہیں جانتی۔ میں نے اس کے ساتھ مغز ماری کر کے خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کیا ہے۔''

''بس جی کیا بتاؤں، خالو کی زندگی میں کچھ ہے ہی نہیں۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''کلثوم آپ کو کیا بتاتی۔''

''کرم دین! کیا تم اس بات کے لیے سنجیدہ ہو کہ میں تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تو یہی چاہتا ہوں تھانے دار صاحب۔''

''لیکن تمہارا عمل اس بیان سے لگا نہیں کھاتا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ خالو کے سلسلے میں تم سے زیادہ تو چھوٹا خان پریشان دکھائی دیتا ہے۔''

''خان صاحب کو ہمارا بڑا خیال ہے نا، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ خالو جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔''

''چھوٹے خان کو تم لوگوں کا خیال ہے یا صرف خالو کا......؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''انہیں ہم سب کا خیال ہے جی۔ ان کے ہم پر بہت احسان ہیں جناب۔ ابھی یہی دیکھیں نا۔ میرا اچھو کافی عرصے سے بے کار تھا، خان صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ اگلے ماہ وہ اسے گھوڑا تانگا بنا دیں گے تاکہ اچھو اپنی روزی خود کمانے لگے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ خالو کی شادی میں وہ اسے سونے کے زیورات بنوا کر دیں گے۔ وہ گاہے بگاہے ہماری مالی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔''

''لیکن ان مہربانیوں میں چھوٹے خان کا کیا فائدہ ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''کوئی کسی پر خواہ مخواہ تو اتنے احسانات نہیں کرتا۔''

''ان کی مرضی ہے سرکار۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''اگر تم کچھ نہیں کہہ سکتے تو پھر میں بھی تمہاری بیٹی کی تلاش کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔ ''اب تم یہاں سے جا سکتے ہو۔''

وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکنے لگا۔ ''آپ تو ناراض ہو گئے تھانے دار صاحب۔''

''اگر میں تم سے ناراض ہوتا تو ابھی تمہیں حوالات میں بند کروا دیتا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جب تمہیں اپنی بیٹی کی بازیابی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو پھر میں کیوں اپنے ذہن کو تھکاؤں؟''

میں نے بے رخی کا برتاؤ کیا تو کرم دین ٹوٹ گیا۔ ''تھانے دار صاحب! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر یہ بات چھوٹے خان صاحب کو پتا نہیں چلنا چاہیے......''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔'' لوہا گرم دیکھتے ہوئے میں نے چوٹ لگائی۔ ''مرتضیٰ خان کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہو گی۔ تم آج مجھے جو کچھ بھی بتاؤ گے وہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔''

''میں ...... چھوٹے خان جی کی وجہ سے ...... بہت تنگ ہوں۔'' وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ چھوٹے خان کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا اور اب ...... خیر، میں نے اسے ٹوکا نہیں اور اس کی جانب متوجہ رہا۔ وہ اپنی پتا کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ذکیہ کو خان جی نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ وہ میری ایک نہیں چلنے دیتی۔ میں نے کئی بار ذکیہ کو سمجھایا ہے کہ اللہ کی بندی، اپنے سے زیادہ بڑے لوگوں سے تعلقات نہیں بڑھانا چاہئیں مگر اس کی سمجھ میں میری بات بیٹھتی ہی نہیں۔ بڑے الٹے دماغ کی عورت ہے جناب۔''

وہ رکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''چھوٹا خان آخر چاہتا کیا ہے۔ وہ آپ لوگوں پر اپنا

وقت اور پیسا کیوں برباد کر رہا ہے؟''

کلثوم کی زبانی میں اس راز سے آگاہ تو ہو چکا تھا مگر کرم دین اگر اس کی تصدیق کر دیتا تو خالو کی تلاش کے سلسلے کو بہ آسانی آگے بڑھایا جا سکتا تھا اور ..... کرم دین کی حالت بتاتی تھی کہ وہ اپنا سینہ کھول کر مجھے دکھانے کے لیے تیار ہے۔

''خان صاحب کو ذرا سا بھی خوفِ خدا نہیں ہے۔'' وہ پھٹ پڑا۔ ''خان کے اپنے بیوی بچے ہیں لیکن وہ ہاتھ دھو کر میری خالو کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اور تم اس شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو؟''

''میں کیسے تیار ہو جاؤں تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خالو کی منگنی ہو چکی ہے مگر ڈکیہ پوری طرح خان جی کی حمایت میں ہے۔ وہ کہتی ہے، میں اپنے بھائی کو ناراض کر لوں گی اور خالو کی منظور حسین سے منگنی توڑ دوں گی۔ ڈکیہ پوری طرح خان جی سے، خالو کی شادی کے لیے تیار بیٹھی ہے۔''

میں ایک مجبور باپ اور ایک بے چارے شوہر کو ہمدردی بھری نگاہ سے دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں کرم دین مجھے بہت بے بس اور لاچار دکھائی دیا۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کرم دین۔ تم نے سچ بول کر میرا دل جیت لیا ہے۔ میں بہت جلد خالدہ کو ڈھونڈ لوں گا اور اسے مرتضیٰ خان سے محفوظ بھی کر دوں گا۔ تمہیں اب فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا بلکہ میں تو اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس تم اپنی زبان پر مہر لگا لو اور چھوٹے خان کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم نے مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''نہیں بتاؤں گا جی۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ''خان جی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''کیا تم کسی حشمت بی بی کو جانتے ہو؟'' میں نے کرم دین سے پوچھا۔

''آپ بھولا کی بیوی کی بات کر رہے ہیں نا؟''

''میں کسی بھولا کو تو نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''بس اتنا پتا ہے کہ حشمت بی بی اسی گاؤں میں رہتی ہے۔''

''اس گاؤں میں ایک ہی حشمت بی بی ہے جناب اور وہ ہے بھولا کی بیوی۔''

''یہ حشمت کیسی عورت ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ کوئی اچھی شہرت کی عورت نہیں۔'' کرم دین برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے گاؤں کے شرفاء کی رائے ان دونوں میاں بیوی کے بارے میں خراب ہے۔''

کرم دین کا یہ انکشاف میرے لیے بہت اہم تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بھولا کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ کوئی کام وام نہیں کرتا سرکار۔'' وہ ناپسندیدہ انداز میں بولا۔ ''بھولا ایک ڈنگر چور ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی چوری چکاری کی وارداتوں میں ملوث رہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک دو بار جیل بھی جا چکا ہے۔ ایک بار تو چھوٹے خان صاحب نے اس کی ضمانت بھی کرائی تھی۔''

''تو اس کا مطلب ہے، حشمت اور بھولا کے لیے چھوٹے خان کے دل میں بڑی ہمدردی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ کوئی خواہ مخواہ کسی کی ضمانت نہیں کراتا۔''

''جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان دونوں میاں بیوی کا خان جی سے ملنا جلنا تو ہے۔''

''ٹھیک ہے کرم دین!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں نے اس علاقے کے تھانے کا چارج سنبھالا ہے تو سب غنڈوں بدمعاشوں کو نکیل ڈال کر ہی دم لوں گا۔ یہ بھولا بھی اپنے عبرت ناک انجام کو ضرور پہنچے گا ایک دن۔''

پھر میں نے کرم دین کو جانے کی اجازت دے دی مگر میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ حشمت بی بی کے بارے میں، میں نے یہ ساری چھان بین کیوں کی ہے۔ کلثوم نے آخری بار کل سہ پہر کے وقت خالدہ کو حشمت بی بی کے ساتھ دیکھا تھا اور اب پتا چلا کہ حشمت کی شہرت اچھی نہیں تھی اور وہ چھوٹے خان کے ساتھ بھی رابطے میں تھی۔ لہٰذا اس زاویے پر سوچنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ خالدہ کی... گم شدگی میں مرتضیٰ خان کا ہاتھ ہو سکتا ہے!

☆☆☆

آج اٹھائیس جنوری کی تاریخ تھی اور آج کا پورا دن بے انتہا مصروف گزرا تھا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ دوپہر تک بارش کا سلسلہ تھم گیا تھا تاہم سردی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور اب شام کے سائے اپنے پر پھیلانے لگے تھے جن کی وجہ سے موسم کی سنگینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حوالدار بہادر علی واہنڈو سے واپس آ گیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا اور اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''ادھر کی کیا رپورٹ ہے بہادر علی؟''

''رپورٹ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''فرید کا کچھ پتا چلا؟''

''بہت کچھ پتا چلا ہے جناب مگر کوئی فائدہ نہیں ان معلومات کا۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''تفصیلات کیا ہیں؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

حوالدار نے بتایا۔ ''میں واہنڈو پہنچ کر سیدھا فرید کے دوست حنیف سے جا کر ملا تھا۔ واہنڈو میں حنیف کی حجام کی دکان ہے۔ اس نے بتایا کہ کل سہ پہر میں فرید اس کے پاس آیا تھا۔''

''اوہ......'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا فرید اکیلا ہی وہاں پہنچا تھا یا اس کے ساتھ خالدہ بھی تھی؟''

''حنیف کے بیان کے مطابق، فرید اکیلا ہی تھا۔'' بہادر علی نے بتایا۔ ''اس روز واہنڈو میں کبڈی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ فرید کو پہلوانی اور کبڈی کے مقابلے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ جب حنیف نے اسے واہنڈو والے کبڈی مقابلے کا بتایا تو وہ مچل گیا کہ وہ بھی یہ مقابلہ دیکھے گا چنانچہ حنیف نے اپنی دکان بند کی اور فرید کو لے کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ کبڈی کے یہ مقابلے ان کھیتوں میں ہو رہے تھے جہاں کچھ عرصہ پہلے تک چاول کی فصل کھڑی تھی۔ فصل کی کٹائی ہو گئی تھی اور مذکورہ کھیت نئی فصل کی تیاری کی راہ دیکھ رہے تھے۔''

''فصل کی بات بعد میں کریں گے بہادر علی۔'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''فی الحال مجھے بتاؤ کہ فرید کہاں گیا؟''

''فرید شام تک حنیف کے ساتھ ہی تھا۔'' بہادر علی نے کہا۔ ''اور مغرب کی اذان کے بعد وہ وہاں سے واپس آ گیا تھا۔''

''واپس آ گیا تھا تو پھر وہ گھر کیوں نہیں پہنچا؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''یہی بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی ملک صاحب!'' حوالدار نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''حنیف بھی پریشان ہے کہ فرید آخر گیا کہاں۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔''

''واہنڈو سے ادھر آنے کے لیے آخری بس شام سے پہلے ہی نکل آتی ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر فرید مغرب تک واہنڈو ہی میں تھا تو پھر وہ واپس کیسے آیا ہوگا؟''

''جیسے میں آیا ہوں ملک صاحب!'' حوالدار نے بتایا۔ ''حنیف نے اسے ایک ٹریکٹر ٹرالی پر بٹھایا تھا جس نے کنگنی والا تک آنا تھا۔ فرید نے کہا تھا کہ وہ کنگنی والا سے پیدل ہی گھر چلا جائے گا۔ ''حجازیاں'' کنگنی والا اور فرید کے گھر کے درمیان واقع ہے۔ وہ کنگنی والا سے بیس پچیس منٹ میں گھر پہنچ سکتا تھا۔''

''کیا تمہیں بھی ٹریکٹر ٹرالی نے کنگنی والا ہی میں اتارا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب! وہ کوئی اور ٹرالی تھی اور میں کسی دوسری ٹرالی میں یہاں پہنچا ہوں۔'' بہادر علی نے بتایا۔ ''میں جس ٹریکٹر ٹرالی میں آیا ہوں اسے شریف پورہ جانا تھا لہٰذا اس نے مجھے تھانے کے سامنے اتارا اور آگے بڑھ گئی۔''

''تم تو پہنچ گئے ہو مگر فرید کہاں گیا۔'' میری تشویش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ''تم نے اس ٹریکٹر ٹرالی کا کوئی کھوج لگایا جس پر فرید واہنڈو سے سوار ہوا تھا؟''

''اس ٹرالی کے مالک کا نام معراج دین ہے ملک صاحب۔'' بہادر علی نے بتایا۔ ''اور اس کا تعلق ایمن آباد سے ہے۔ کنگنی والا میں اس نے پیاز کی بوریاں اتارنا تھیں اور رات ہی کو واپس ایمن آباد چلے جانا تھا۔ اب صبح ایمن آباد جا کر ہی اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کل صبح تم ایمن آباد روانہ ہو جاؤ اور اس بندے سے جا کر ملو۔ ذرا پتا تو چلے کہ اس نے فرید کو کہاں اتارا تھا۔ اگر فرید واہنڈو سے کنگنی والا آیا تھا تو پھر وہ اپنے گھر کیوں نہیں پہنچا؟''

''جی ملک صاحب! آپ فکر نہ کریں۔'' حوالدار نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صبح معراج دین کا کھوج نکالنے جاتا ہوں، اب یہ مسئلہ بھی حل ہو ہی جائے گا۔''

''اس مسئلے کو جلد از جلد حل ہونا چاہیے بہادر علی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''واقعات و شواہد تو یہی بتاتے ہیں کہ فرید کا خالدہ کی گم شدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے یا پھر جب فرید سامنے آئے گا تو صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔''

ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک فرید اور خالدہ کے بارے میں بات ہوتی رہی پھر میں تھانے سے اٹھ کر اپنے

کوارٹر کی طرف آ گیا۔

آج دن بھر کی مصروفیت نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ میں نے رات کا کھانا کھایا اور عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد بستر میں گھس گیا۔ ایک تو تھکن، دوسرے گرم بستر، جسم کو حرارت بھرا آرام ملا تو میں گہری نیند میں چلا گیا۔ پھر اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلی۔

میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہو کر تھانے پہنچا تو تھوڑی ہی دیر کے بعد چھوٹا خان میرا دماغ کھانے آ گیا۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد مجھے سلام کیا اور پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے ابھی تک خالدہ کو تلاش نہیں کیا اور نہ ہی فرید کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ آخر آپ کر کیا رہے ہیں؟''

''خان صاحب! اس تھانے کے انچارج آپ ہیں یا میں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے تحمل سے دریافت کیا۔

''ظاہر ہے جی، آپ ہی یہاں کے تھانے دار ہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس تو پھر تھانے داری بھی مجھے ہی کرنے دیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں فرید اور خالدہ کی گمشدگی کے سلسلے میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، وہ میرے لیے تسلی بخش ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن آپ کی کارکردگی میرے لیے تسلی بخش نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں آپ کی تسلی کے لیے نہیں، پولیس ڈیپارٹمنٹ کے لیے کام کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ کون ہوتے ہیں خالدہ کے یا فرید کے...... جو میں آپ کی تسلی کرتا پھروں!''

''آپ حالات کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ فرید ہی نے خالدہ کو اغوا کیا ہے۔'' پھر وہ ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''اگر کوئی کمائی ومائی کا مسئلہ ہے تو مجھے بتا دیں۔ میں آپ کی توقع سے زیادہ ہی دوں گا۔''

وہ مجھے رشوت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ....

پیشکش نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں نے اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ فرید کے حوالے سے میرا کام کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

وفا

دودھ والے نے برتن میں دو کلو دودھ ڈالا اور بیچنے چل دیا۔ راہ میں ہر ایک سے چھپ کر اس نے ملاوٹ کر دی۔ پانی اور دودھ باہم شیر و شکر ہو گئے۔ ملک نے واٹر کو واٹر نہ رہنے دیا اور اپنا لباس اسے بھی پہنا دیا۔ ملک مین نے وہ دودھ ایک گھر میں بیچ دیا۔ چار کلو دودھ میں دو کلو پانی اور دو کلو دودھ۔ عورت نے دس ضرب چار کے حساب سے چالیس روپے ادا کیے اور دودھ پتیلے میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ دودھ پانی سے کہتا ہے۔

''دیکھا! ہم نے تمہاری قیمت بھی اپنے جتنی کر دی، یہ ہوتا ہے سنگت کا فائدہ۔ چنگے سنگ ترے بلند۔ بلند مقام پر پہنچ کر...... بلند کرنے والے کے احسان کو یاد رکھتے ہیں۔''

اتنے میں پتیلا گرم ہو چکا تھا۔ دودھ کی آہ نکلی۔ پانی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

دودھ نے کہا۔ ''آگ تیز ہو گئی ہے، میں جل جاؤں گا۔''

پانی نے کہا۔ ''جب تک میرا دم ہے، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

پتیلا گرم ہوتا گیا اور پانی جلتا گیا۔ حتیٰ کہ پانی ختم ہو گیا۔ دودھ نے جاں نثار کو مرتے دیکھا تو غصے سے بھڑک اٹھا، آگ سے کہنے لگا۔ ''تم نے میرے یار، میرے ساتھی کو جلایا ہے۔ میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' پتیلے سے ابل کر چولہے پر گرا اور آگ کو بجھا کر رکھ دیا۔ اب عورت کو پتا چل گیا ہے۔ وہ قریب بیٹھی ہے۔ جب دودھ کو غصہ آتا ہے، وہ تھوڑا سا پانی ڈال دیتی ہے۔ دودھ اپنے ساتھی کو دیکھ کر، مل کر نرم پڑ جاتا ہے یا پھر دودھ کو اس کے ساتھی کی ''آگ'' دور لے جاتی ہے۔

محمد مختار شاہ کی کتاب ''بات سے بات'' سے انتخاب

مرسلہ۔ محمد الیاس، لسبیلہ، بلوچستان

"خان صاحب! اس رقم کو سنبھال کر رکھیں۔ کورٹ کچہری میں کام آئے گی۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا کہ کورٹ کچہری کی نوبت آجائے۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

"یہ بھی آپ کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجھ پر کبھی برا وقت نہیں آئے گا تھانے دار صاحب۔" وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ "اب آپ اپنی خیر منائیں۔ آپ نے مجھ سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا۔"

میں کافی دیر سے اس کی الٹی سیدھی باتیں برداشت کر رہا تھا لیکن اب اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑنا بہت ضروری ہو گیا تھا لہٰذا میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خان جی! آپ بھی کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا۔ میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔ میں نے تمہارے جیسے کئی طوفانوں کے رخ موڑے ہیں۔ یہ دھمکیاں وکمیاں کسی اور کو جا کر دینا۔"

میں "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تو گویا میں نے اس کی پونچھ پر پاؤں رکھ دیا۔

وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ "ملک صاحب! ہم خاندانی خان ہیں۔ ہمارا خاندان عرصہ دراز سے اس علاقے پر حکمرانی کر رہا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہاں ہمارا ہی سکہ چلے گا۔ ہماری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ آپ جیسے کئی تھانے دار آئے اور چلے گئے۔"

"اوپر تک پہنچ کے گمان میں ایک دن تم بھی "اوپر" ہی پہنچ جاؤ گے مرتضیٰ۔" میں نے جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے کہا۔ "اللہ تکبر اور غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اسی لیے اس نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ بھیجا ہے۔ خدا کے قہر سے ڈرو خان جی۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔"

"میں یہاں آپ کی تقریر سننے نہیں آیا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"اگر میرے الفاظ برداشت نہیں ہو رہے ہو تو چلے جاؤ یہاں سے۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے نائی بھیج کر تو نہیں بلایا تمہیں۔"

وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

مرتضیٰ کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ خالدہ کی بازیابی اور فرید کی گرفتاری کے لیے مرا جا رہا تھا۔ یہ بات میں جان چکا تھا کہ خالدہ خان کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اپنے گھر میں اس کی آمد سے نالاں تھی۔

مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ خالدہ نے ایک دو بار ڈھکے چھپے الفاظ میں خان کی بے عزتی بھی کر دی تھی اور ایک مرتبہ اس نے خان کی دست درازی کی کوشش بھی ناکام بنا دی تھی۔

ان حالات کی روشنی میں... مرتضیٰ کی ذات گہرے شکوک و شبہات میں گھری دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنی ذلت اور ناکامی... کا بدلہ لینے کے لیے خالدہ کو اغوا بھی کروا سکتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر خالدہ کی برآمدگی کے لیے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

میں نے مرتضیٰ خان پر مضبوط ہاتھ ڈالنے کے لیے خصوصی انتظامات کے بارے میں سوچا اور کانسٹیبل نور شاہ کے ہمراہ حشمت بی بی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

گزشتہ روز میں نے خالدہ کی سہیلی سے حشمت بی بی کے گھر کی لوکیشن معلوم کر لی تھی تاہم کلثوم کو میں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں حشمت بی بی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

حشمت کا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ یہاں سے ایک راستہ سیدھا قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے بہت سے بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کا بیشتر حصہ گیلا تھا جو آج کل ہونے والی بارش کی کرشمہ کاری تھی۔ میدان کے زیادہ حصے پر پانی کھڑا تھا تاہم جتنا بھی حصہ کھیل کے قابل تھا، بچوں نے اسی پر قبضہ جما رکھا تھا۔

ہم نے ایک سات آٹھ سالہ بچے کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ میں اور نور شاہ پولیس کی وردی میں تھے۔ لہٰذا تمام بچے ہمیں وہاں دیکھ کر سہم گئے تھے۔ میرا مطلوبہ بچہ تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے۔"

"جیدا......" اس نے بتایا۔ "میں نے کوئی شیطانی نہیں کی جی۔"

"ڈرو نہیں جیدا۔" میں نے پیار سے کہا۔ "میں تمہیں پکڑنے نہیں آیا۔ تمہارا نام غالباً جاوید ہے۔"

"جی اصلی نام تو جاوید ہی ہے۔" اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن سب مجھے جیدا جیدا ہی کہتے ہیں۔"

"تم بہت اچھے بچے ہو۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "جن لوگوں نے تمہارا نام بگاڑا ہے میں انہیں تھانے بلا کر مرغا بنا دوں گا۔ ذرا بتاؤ کہ حشمت بی بی کا گھر کون سا ہے؟"

اس نے نزدیک ہی ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا پھر دز دیدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''تھانے دار جی ...... آپ میری ماں اور ابا کو تو مرغا نہیں بنائیں گے نا؟''

''اوہ......'' میں اس کی بات کی تہ میں پہنچ کر مسکرا دیا پھر پوچھا۔ ''وہ بھی تمہیں جیدا ہی کہتے ہیں؟''

''جی......وہ بھی......'' وہ معصومیت سے بولا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں مرغا نہیں بناؤں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس انہیں تھوڑی ڈانٹ لگاؤں گا تو وہ سمجھ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ خوش ہو گیا۔

وہ تالیاں بجاتے ہوئے ایک طرف چلا گیا تو میں حشمت کے دروازے کی جانب بڑھا پھر دستک دے کر ایک جانب کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد گھر کے اندرونی حصے میں کسی کے چلنے کی آواز ابھری پھر بند دروازے کی کنڈی گرنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے دروازے کا ایک پٹ کھل گیا تاہم کوئی سامنے نہیں آیا بلکہ دروازہ کھولنے والے نے بند پٹ کے عقب سے استفسار کیا۔

''کون ہے؟''

یہ ایک نسوانی آواز تھی تاہم اس آواز میں نسوانیت کم اور کرختگی زیادہ پائی جاتی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں حشمت بی بی سے ملنے آیا ہوں۔''

''حشمت سے کیا کام ہے اور تم ہو کون؟'' پھر کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''میں جو کوئی بھی ہوں اس کو چھوڑو۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ''بس سمجھ لو کہ مجھے حشمت سے بہت ضروری کام ہے اور یہ کام میں باہر گلی میں کھڑے ہو کر نہیں بتا سکتا۔ کیا تم حشمت بی بی ہی ہو؟''

''میں حشمت بی بی ہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اس وقت میرا خاوند گھر میں نہیں ہے۔ میں کسی اجنبی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم پھر کسی اور وقت آجانا یا باہر ہی سے بتا دو کہ مجھ سے کیا کام ہے؟''

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ میں تم سے خالدہ کے بارے میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

خالدہ کے ذکر پر دروازے کے پیچھے سناٹا چھا گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ جھٹ سے دروازہ بند کر دے گی۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے محسوسات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا چاہی تو میں نے اپنا پاؤں دونوں پٹوں کے بیچ پھنسا کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو شرم نہیں آتی۔ ایک عورت کو گھر میں اکیلے دیکھ کر پریشان کرنے چلے آئے ہیں۔''

''شکر کرو کہ میں خود چل کر تمہارے دروازے پر آ گیا ہوں۔'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں تمہیں تھانے بلواتا تو تمہاری پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔

''حشمت بی بی! مجھے زبردستی پر مجبور نہ کرو ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

''یہ دھمکی شمکی کسی اور کو جا کر دیں تھانے دار صاحب۔'' وہ بدستور بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا جو پولیس والوں سے ڈرتی پھروں۔''

''میں نے کب کہا کہ تم نے کوئی جرم کیا ہے۔'' میں نے اس کی برہمی پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک پوچھ تاچھ کا تعلق ہے تو وہ میں اس علاقے کے کسی بھی وسنیک سے کر سکتا ہوں۔ یہاں کے دو بندے غائب ہو گئے ہیں۔ فرید اور خالدہ......ان دونوں کو ڈھونڈ نکالنا میرے فرائض کا حصہ ہے۔''

''لیکن میرا خالو یا فرید کی گمشدگی سے کیا لینا دینا؟'' وہ چیخ کر بولی۔ ''آپ میرے دروازے پر کیوں آئے ہیں؟''

میں نے حشمت بی بی کی فضول گوئی بہت سن لی تھی لہٰذا خاصے تھانے دارانہ انداز میں کہا۔ ''فضول باتیں بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تم وہ عورت ہو جس کے ساتھ آخری بار خالدہ کو دیکھا گیا تھا۔ اگر تم تعاون کرو تو میں بہت جلد آسانی سے خالدہ تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''میں خالدہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم شرافت سے نہیں مانو گی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے تمہیں تھانے کچہری کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ ٹھیک ہے، تمہارا یہ شوق پورا کر دیتے ہیں۔ میں تمہیں گرفتار کر کے تھانے لے جا رہا ہوں۔ باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔''

''کیا آپ میری گرفتاری کا وارنٹ ساتھ لائے ہیں؟'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ''آپ وارنٹ کے بغیر مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ اتنا سا قانون تو میں بھی جانتی ہوں۔''

''قانون کیسے نہیں جانوگی۔''میں نے اس پر چوٹ کی۔''آخر بھولا ڈنگر چور کی بیوی ہو۔ سنا ہے' تمہارے خاوند نے آس پاس کے علاقوں میں بڑی تھرتھلی ڈال رکھی ہے اور ایک دو بار جیل کی سیر بھی کر آیا ہے لیکن فکر نہ کرو۔ اگر بھولا میرے ہتھے چڑھا تو ایسا فٹ کروں گا کہ باقی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔''

''جائیں' جو جی چاہے کرلیں۔''وہ بدتمیزی سے بولی۔''میں آپ کی دھمکیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ آپ پولیس والے ایسے ہی ناکارہ ہوتے ہیں۔ مجرموں سے لمبی لمبی رقمیں لے کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور ہم جیسے شریف لوگوں کو خوامخواہ تنگ کرنے آجاتے ہیں۔''

''یہ ایسے نہیں مانے گی ملک صاحب......''نور شاہ نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔''اگر آپ کا حکم ہو تو میں زبردستی دروازہ کھلواتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے نور شاہ......''میں نے آنکھ دبا کر کانسٹیبل کو ایک اشارہ کیا پھر بہ آوازِ بلند کہا۔''میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ تم جلدی سے حشمت کو گرفتار کرلینا۔ یہ بڑی ضدی عورت لگتی ہے۔ ادھر حوالات میں جا کر ہی زبان کھولے گی۔''

میری چال کامیاب رہی۔ حشمت پر میری دھمکی نے خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بڑی نرمی سے بولی۔

''اندر آجائیں تھانے دار صاحب۔ اس قسم کی باتیں دروازے پر کھڑے کھڑے نہیں کرنا چاہئیں۔''

مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی اور میرے ذہن میں گرگٹ کا تصور ابھر آیا۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ رابن ہڈ کی بیوی کا کردار ادا کررہی تھی اور اب موم کی طرح پگھل گئی تھی۔ ایک بات کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ ایک ٹیڑھی عورت تھی۔ اس کا یہ بدلا ہوا رویہ کوئی خطرناک چال بھی ہوسکتی تھی۔

میں نے نور شاہ کو کھلے ہوئے دروازے پر متعین کردیا اور خود حشمت کے ساتھ گھر کے صحن میں آگیا۔

حشمت کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہی ہوگی مگر اس نے خود کو بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور اس کے بدن میں ایک خاص قسم کی کشش بھی پائی جاتی تھی جو مردوں کو فوراً اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے آئی۔ جب ہم آمنے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے خالدہ کے بارے میں بات چیت شروع کی لیکن وہ بار بار موضوع سے ہٹ کر اپنے ناز و ادا سے مجھے رجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا انداز بالکل بازاری عورتوں جیسا تھا۔ میں بے حد محتاط ہوگیا۔ خیر محتاط تو میں حشمت کے تیور دیکھتے ہی ہوگیا تھا جبھی میں نے نور شاہ کو گھر کے داخلی دروازے پر متعین کردیا تھا اور حشمت کو بیٹھک کا دروازہ بھی بند نہیں کرنے دیا تھا۔

اللہ کا مجھ پر لاکھ لاکھ کرم ہے کہ اس نے ہمیشہ ایسے مراحل پر مجھے ثابت قدم رکھا تھا۔ مجھے اپنی قانونی ذمے داریاں پوری کرتے ہوئے بعض اوقات رنگین و سنگین حالات سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ خطا کا پتلا ہے۔ اگر اس ذات پاک کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو اس دنیا میں قدم قدم پر بہکنے کے مواقع موجود ہیں۔

حشمت بی بی کے ساتھ میں نے لگ بھگ ایک گھنٹا اس کی بیٹھک میں ''ملاقات'' کی۔ وہ کیسی ٹیڑھی عورت ہے اس کا اندازہ آپ کو بھی بہ خوبی ہوگیا ہوگا۔ اس کینڈے کی عورتوں کی زبان سے کچھ اگلوانا آسان کام نہیں ہوتا، تاہم میں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے یہ مشکل کام بھی کر ڈالا تھا۔ میرے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے بہت آئیں بائیں شائیں کی لیکن پھر بھی میں بہت سی اہم باتیں جاننے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

فریدی کی گم شدگی کے بارے میں حشمت کچھ نہیں جانتی تھی تاہم اس نے یہ قبول کرلیا کہ اٹھائیس جنوری کی سہ پہر خالدہ اس سے ملی تھی اور وہ خالدہ کو اپنے ساتھ گھمن شاہ کے آستانے پر لے گئی تھی۔ خالدہ کو کوئی خاص قسم کا تعویذ چاہیے تھا۔

گھمن شاہ کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میرے ایک مخبر کی رپورٹ کے مطابق گھمن شاہ ایک نقلی پیر تھا۔ اس نے اپنے شعبدوں کی مدد سے سادہ لوح لوگوں کو مرعوب کررکھا تھا۔ لوگ یہی سمجھتے تھے کہ گھمن شاہ کوئی بہت پہنچا ہوا اللہ کا نیک بندہ ہے۔ اس کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور وہ دور دور تک مشہور بھی تھا۔ ابھی تک مجھے اس کے خلاف کوئی ایسا ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا کہ میں اس پر ہاتھ ڈال سکتا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ بعض بااثر افراد بھی اس کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ گھمن شاہ کا آستانہ نہر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔

یہ ایک نیا کردار سامنے آیا تھا۔ اس قسم کے ڈبا پیروں کا مجھے وسیع تجربہ حاصل تھا۔ ایسے لوگوں پر کچا ہاتھ ڈالنے میں گڑبڑ ہوجاتی ہے لہٰذا مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' بہت سوچ

سمجھ کر کرنا تھا۔ اگر حشمت بی بی نے کسی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر گمسن شاہ کو چیک کرنا ضروری تھا۔

حشمت بی بی کے مطابق، خالدہ اس کے ساتھ تعویذ لینے گمسن شاہ کے آستانے پر پہنچی تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ ہی آستانے سے واپس آئی تھیں لیکن خالدہ گھر نہیں پہنچی تھی۔ یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ حشمت بی بی نے مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی تاہم میں نے وقتی طور پر اسے چھوڑ دیا تھا مگر میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اس کی خفیہ نگرانی کرواؤں گا اور اگر اس کی ذات کسی زاویے سے مشکوک ثابت ہوئی تو میں پوچھ گچھ کے لیے اسے تھانے بھی بلاؤں گا۔

نور شاہ کو میں نے تھانے بھیج دیا اور خود ٹہلتے ہوئے بڑے خان صاحب غلام مصطفیٰ کی حویلی کی جانب بڑھ گیا۔ چھوٹے خان نے تھانے میں آکر مجھے خاصا تنگ کیا تھا۔ مرتضیٰ کے رویے سے مجھے بہت ذہنی اذیت پہنچی تھی اسی لیے میں نے مرتضیٰ کے باپ غلام مصطفیٰ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ چھوٹے خان کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی ہے۔

جب میں غلام مصطفیٰ خان کی حویلی پہنچا تو ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی جس کی وجہ سے فضا میں موجود خنکی میں کافی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی۔ امید کی جا سکتی تھی کہ اب موسم کھل جائے گا۔

بڑے خان نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور بڑی عزت سے اپنی سجی سجائی بیٹھک میں بٹھایا پھر گھریلو ملازمہ کو میری خاطر تواضع کی ہدایت جاری کرنے کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔

''خیریت تو ہے نا تھانے دار صاحب!'' وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو آپ کو دیکھ کر چونک ہی گیا تھا۔''

''آپ کیوں چونک گئے تھے خان صاحب!'' میں نے بھی مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''آپ نے کون سا جرم کر رکھا ہے؟''

''جرم تو کوئی نہیں کیا ملک صاحب......'' وہ خوش دلی سے بولا۔ ''مگر آپ لوگوں کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اچھا خاصا بندہ بھی گھبرا جاتا ہے۔''

بڑے خان کے رویے میں ایک خاص قسم کی سمجھ داری اور بردباری جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت بھی ٹپکتی تھی، وہ اپنے بیٹے مرتضیٰ خان سے قطعی مختلف مزاج کا بندہ تھا۔ میں نے بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''خان جی! لوگوں نے بھی خوامخواہ ہی پولیس کا ایک ہوّا بنا لیا ہے۔ حالانکہ ہم دیکھ بھال کر ہی بندے پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔''

''یہ بھی خوب کہی آپ نے۔'' بڑے خان نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''لیکن جب آپ کسی بندے پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھر وہ مشکل ہی سے چھوٹتا ہے۔''

ہمارے درمیان اسی طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو جاری تھی کہ ایک گھریلو ملازمہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ٹرے کو میز پر رکھا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں نے دیکھا، ٹرے میں موجود مختلف پلیٹوں میں کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ بڑے خان نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ یہ سب آپ کے لیے ہے۔ ان نعمتِ خداوندی سے آپ نے پورا پورا انصاف کرنا ہے۔''

''خان صاحب! آپ اپنے بیٹے سے بہت مختلف ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ پھول ہیں اور وہ انگارا......''

''میں سمجھ رہا ہوں' آپ کی اس بات کے پیچھے کیا مقصد چھپا ہوا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''غلام مرتضیٰ نے تھانے جا کر جو کچھ کیا ہے، اس کی رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔ اس نے آپ کے سامنے خاصی اکڑفوں دکھائی ہے۔ اس کی طرف سے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

''شرمندہ نہ کریں خان صاحب۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''میں تو ان باتوں کو بھول بھی چکا۔''

''یہ آپ کا بڑا پن ہے۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جوانوں کا خون کچھ زیادہ ہی گرم ہوتا ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں نے غلام مرتضیٰ کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ آئندہ بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''بہت بہت شکریہ خان صاحب۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''چھوٹے خان صاحب حویلی میں نظر نہیں آرہے، کیا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؟''

''غلام مرتضیٰ بیوی بچوں کے ساتھ اپنی سسرال گیا ہوا ہے۔'' غلام مصطفیٰ نے بتایا۔ ''کل شام تک واپس آجائے گا۔ ویسے سب خیریت تو ہے نا......؟''

''خان جی! خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں......'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ کرم دین کی لڑکی خالو دو دن

سے غائب ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور دوسری طرف کرامت علی کا لڑکا فرید بھی دو دن ہی سے گم شدہ ہے۔ میں اسی سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں۔''

''اور آپ کا خیال ہے کہ یہ دونوں گم شدہ افراد میری حویلی میں پائے جاتے ہیں۔'' وہ زندہ دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے آپ ادھر تشریف لائے ہیں۔ اگر آپ کو واقعی ہم پر شک ہے تو یہ حویلی آپ کے حوالے ہے۔ آپ جس کونے کھدرے میں چاہیں' جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں خان صاحب!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر خالدہ یا فرید آپ کی حویلی میں چھپے ہوتے تو پھر غلام مرتضیٰ کو تھانے آکر اُدھم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو یہاں کسی اور ہی مقصد کے لیے حاضر ہوا تھا۔''

''جی حکم کریں' میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں بڑے خان کو چھوٹے خان کی غیر نصابی سرگرمیوں سے آگاہ کیا پھر کہا۔ ''بس میں اس معاملے کی تصدیق کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''ملک صاحب! میں کسی چیز سے بے خبر نہیں ہوں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس قسم کی باتیں میں بھی سنتا رہتا ہوں مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس کہانی میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ غلام مرتضیٰ شادی شدہ اور بچوں والا ہے۔ اسے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماشاءاللہ! اس کی بیوی کروڑوں میں ایک ہے۔ آپ کو اس حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یا تو بڑا خان اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے واقف نہیں تھا یا پھر وہ دانستہ اس کے کارناموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہرحال، میں نے اس سلسلے میں.... زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی اور حویلی سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پولیس کے ایک ہوشیار مخبر کو اپنے پاس بلالیا اور ضروری ہدایات کے بعد اسے گھمن شاہ کے آستانے کی سی آئی ڈی کے لیے روانہ کر دیا۔ یہ بہت ضروری تھا۔

اسی وقت ہیڈ محرر نے میرے پاس آکر استفسار کیا۔ ''ملک صاحب! کھانے کا کیا پروگرام ہے؟''

میں بڑے خان کی حویلی سے کافی کچھ کھا آیا تھا لہٰذا میں نے کہہ دیا۔ ''نہیں...... کھانے کی طلب نہیں ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں حوالدار بہادر علی' ایمن آباد سے واپس آگیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

''معراج دین سے ملاقات ہوئی؟''

''جی...... میں اسی سے مل کر آرہا ہوں۔''

''فرید کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''معراج دین نے بتایا ہے کہ اس نے ستائیس جنوری کی رات فرید کو کنگنی والا کے اندر صحیح سلامت اتارا تھا۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''اس کے بعد وہ نہیں جانتا کہ فرید کہاں گیا اور کیوں گیا۔''

''اوہ ......'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو اور بھی تشویش کی بات ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ خالدہ کی گم شدگی میں فرید کا کوئی ہاتھ نہیں...... اس نے ستائیس جنوری کو دو بجے فیکٹری سے چھٹی کی اور واہنڈو چلا گیا۔ وہ وہاں پورا وقت اپنے دوست انور کے ساتھ رہا اور پھر واہنڈو سے ٹریکٹر ٹرالی میں بیٹھ کر کنگنی والا پہنچا اور ...... اس کے کنگنی والا پہنچنے سے پہلے خالدہ غائب ہو چکی تھی لہٰذا فرید کو خالدہ کی گم شدگی کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا مگر......''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرید کنگنی والا سے گھر کیوں نہیں پہنچا؟''

''ایک اور سوال بھی تو پیدا ہوتا ہے ملک صاحب!'' بہادر علی نے کہا۔

''کون سا سوال؟'' میں نے پوچھا۔

''خالدہ کہاں غائب ہے......!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اور اسے کس نے غائب کیا ہے؟''

''کس نے غائب کیا ہے' یہ پتا لگانا باقی ہے......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے' آپ پتا لگا چکے ہیں کہ خالدہ کہاں غائب ہوئی ہے؟''

''بالکل پتا لگا چکا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اسے حشمت بی بی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

"اوہ...... یہ حشمت تو بڑی خطرناک عورت ہے!" بہادر علی نے کہا۔ "کہیں آپ سے اس نے غلط بیانی نہ کی ہو۔"

"ایسا ہوسکتا ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے تفصیلی ملاقات کر کے آیا ہوں اور مجھے یہ بہ خوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ کیسی چلتر باز عورت ہے۔ بہرحال، میں آج رات کھمن شاہ کے آستانے پر دھاوا بولنے والا ہوں۔ اگر حشمت نے مجھ سے کوئی غلط بیانی کی ہے تو خود ہی پچھتائے گی۔ میں تھانے میں الٹا لٹکا کر اس کی ایسی دھلائی کروں گا کہ سارے کس بل نکل جائیں گے۔"

حوالدار نے کہا۔ "اس فرید کو اب کہاں تلاش کریں؟"

"کنگنی والا اور اس کے گھر کے درمیانی راستے پر۔" میں نے کہا۔ "اس بات کا ہمیں ثبوت مل چکا ہے کہ وہ ستائیس جنوری کی رات کنگنی والا تک آیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ستائیس جنوری کی رات اپنے گھر نہیں پہنچا لہٰذا اغلب امکان یہی ہے کہ وہ اسی راستے میں کہیں غائب ہوا ہے۔"

"اور اسی راستے پر اس کی فیکٹری "حجاز پاٹری" بھی پڑتی ہے۔" بہادر علی نے کہا۔ "لیکن ظاہر ہے' وہ رات کو فیکٹری کس لیے جاتا اور...... اگر جاتا بھی تو پتا چل جاتا۔"

"فرید کا سراغ ادھر ہی سے ملے گا بہادر علی...... کنگنی والا اور اس کے گھر کے درمیانی علاقے سے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اس ایریا کے چپے چپے کو کھوجنا ہوگا۔"

"کنگنی والا سے دو راستے فرید کے گھر کی طرف آتے ہیں۔" حوالدار نے کہا۔ "ایک راستہ جی ٹی روڈ والا ہے اور دوسرا ریلوے لائن والا۔ معراج دین نے اسے کنگنی والا کے اندر اتارا تھا اس لیے زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ریلوے لائن کی پٹڑی کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوا ہوگا ورنہ اگر اسے سڑک کی طرف سے آنا ہوتا تو پھر وہ کنگنی والا کے اندر داخل نہ ہوتا بلکہ جی ٹی روڈ پر ہی ٹریکٹر ٹرالی سے اتر جاتا۔"

"بہادر علی! یہ تم نے پتے کی بات کی ہے۔" میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہمیں اس علاقے کا پوری طرح معائنہ کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے ریلوے ٹریک کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" حوالدار نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "میں ریڈی ہوں۔ آپ حکم کریں۔"

"حکم میں تھوڑی دیر کے بعد کروں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم کچھ کھا پی لو۔"

"کھانا پینا بھی ہوتا رہے گا ملک صاحب۔ پہلے ضروری کام نمٹا لیں۔"

"میں مانتا ہوں، یہ کام بہت ضروری ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "لیکن فرید اس علاقے میں کھڑا ہمارا انتظار نہیں کررہا جو اگر ہم دیر سے پہنچے تو وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ ہمیں اس علاقے کا جائزہ لینے جانا ہے لہٰذا جو بزرگ فرما گئے ہیں' ہم اسی پر عمل کریں گے۔"

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ "کون بزرگ ملک صاحب؟"

"بھئی گئے وقتوں کے سیانوں کو بزرگ کہا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بزرگوں کی کہاوتوں میں بڑا دم ہوتا ہے کیونکہ ہر کہاوت کے پیچھے انسان کا برسوں کا تجربہ چھپا ہوتا ہے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ نے وضاحت نہیں کی کہ بزرگ کیا فرما گئے ہیں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اول طعام بعد کام۔"

"ملک صاحب! یہ محاورہ ایسے نہیں ہے۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "اول طعام، بعد کلام۔"

"ایسے بھی ٹھیک ہے اور ویسے بھی ٹھیک ہے۔" میں نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "ہم دونوں محاوروں پر بہ یک وقت عمل کریں گے یعنی...... پہلے تم کھانا کھاؤ گے' پھر ہم کلام کرتے ہوئے کام پر روانہ ہوجائیں گے...... فرید کی تلاش کا کام!"

"یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا کر رہ گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں اور حوالدار بہادر علی کنگنی والا پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو جی ٹی روڈ سے لے کر ریلوے لائن تک پھیلا ہوا تھا اور گاؤں کا کچھ حصہ سڑک سے آگے اور لائن سے پیچھے تک بھی آباد تھا۔ گویا یوں سمجھیں کہ جی ٹی روڈ اور ریلوے ٹریک اس گاؤں کے اندر سے متوازی گزرتے تھے۔ حوالدار نے معراج دین سے اس مقام کے بارے میں اچھی طرح پوچھ لیا تھا جہاں اس نے فرید کو اتارا تھا لہٰذا ہم نے تلاش کا آغاز اسی جگہ سے کیا۔ یہ مقام ریلوے ٹریک کے کافی نزدیک تھا۔

یہ مین ریلوے ٹریک تھا جو لاہور اور پشاور تک جاتا تھا۔ اگر کراچی سے پشاور کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ محاورتاً "اسے کراچی ٹو خیبر" بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہم نے وہ سائڈ پکڑی جو فرید کے گاؤں کی طرف والی تھی یعنی ریلوے

لائن کی مغربی سمت۔ پٹری کے ساتھ پیدل چلنے کا راستہ تھا پھر مزید نیچے اتریں تو کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے تلاش کا کام شروع کرنے سے پہلے کنگنی والا کے بعض لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی تھی لیکن ان میں سے کسی نے فرید کو نہیں دیکھا تھا۔

ریلوے لائن کے ساتھ جو کچا راستہ تھا، اسے آپ باقاعدہ راستہ نہیں کہہ سکتے۔ دراصل یہ وہ خالی ایریا تھا جو پٹری کو کھیتوں سے الگ کرتا تھا۔ عموماً اس راستے پر مال مویشی آتے جاتے دکھائی دیتے تھے یا پھر ان کے رکھوالے۔ پیدل چلنے والے عموماً پٹری کے اندر چلتے تھے اور ٹرین کی آواز سنتے ہی وہ سائڈ میں ہو جاتے تھے۔ ٹرین کی اپنی ایک مخصوص دھمک ہوتی ہے۔ وہ ہارن نہ بھی بجائے تو پتا چل جاتا ہے۔ مذکورہ راستے میں جابجا گڑھے بھی دکھائی دے رہے تھے جن میں اکثر کے اندر بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔

ہم نے ریلوے ٹریک کے ساتھ اپنی تلاش کا کام جاری رکھا اور سوئے تک پہنچ گئے۔ یہ کوئی سلائی کرنے والا سوا نہیں تھا بلکہ گاؤں دیہات میں چھوٹی نہر یا بڑے نالے کو سوا کہا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیں کہ ایک ایسا نالا جو کسی نہر وغیرہ سے نکلتا ہو اور پھر کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزر کر انہیں سیراب کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہو۔ اس سوئے کے قریب ہی پٹری کی دوسری جانب گاؤں کا قبرستان بھی تھا۔ ہمارے بیچ فرید اور خالدہ کی گمشدگی کے حوالے سے بات چیت بھی ہو رہی تھی اور ہم چوکنا نظروں سے راستے کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ اس دوران میں تین چار افراد بھی ہماری جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ یہ لوگ کھیتوں میں معمول کا کام کرنے والے کسان تھے یا پھر جانور چرانے والے......!

اچانک بہادر علی کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ملک صاحب! وہ کیا ہے؟''

''وہ کیا ہے......!'' میں نے بے ساختہ کہا اور اس جانب دیکھا جدھر وہ انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔

''وہ...... وہ مجھے کسی کی جوتی نظر آ رہی ہے۔'' بہادر علی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

میری نگاہ بھی اس جوتی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جس کی طرف بہادر علی اشارہ کر رہا تھا۔ ہم دونوں مذکورہ جوتی کے پاس پہنچ گئے۔

وہ جوتے کا ایک پاؤں تھا جو گڑھے سے تھوڑے فاصلے پر پڑا تھا۔ مذکورہ گڑھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میں نے جوتے کا وہ پاؤں اٹھالیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کوئی ریٹائرڈ جوتا نہیں تھا کہ جسے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا گیا ہو۔ جوتے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے سال دو سال آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا اور اسی بات نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ کوئی پھٹا پرانا جوتا ہوتا تو یہ ایک عام سی بات ہوتی لیکن موجودہ صورتِ حال میں یہ بات بہت خاص ہو جاتی تھی۔

میں نے جوتے کا وہ پاؤں وہاں موجود افراد کو دکھانے کے بعد ان سے پوچھا۔

''تم لوگ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''یہ کسی کی جوتی ہے جناب!'' ایک سادہ لوح دیہاتی نے جواب دیا۔

وہ لوگ میرے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ ان میں سے کوئی بھی مذکورہ جوتے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس جوتے کے پاؤں کو دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کی ایک گھنٹی سی بج اٹھی تھی جس کی آواز کی بازگشت نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں نے ایک بندے کو گاؤں کی طرف بھیج کر فرید کے باپ کرامت علی کو موقع پر بلالیا۔

''بہادر علی! میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ یہ جوتا ہمیں فرید تک پہنچا سکتا ہے۔'' میں نے مذکورہ جوتے کو اپنے ہاتھ میں گھماتے ہوئے حوالدار سے کہا۔

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!'' وہ بھی بڑی دلچسپی سے اس جوتے کے پاؤں ہی کو دیکھے جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں کرامت علی وہاں پہنچ گیا۔ وہ خاصا ہانپا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میلوں سے دوڑتے ہوئے آیا ہو۔

''میرے فرید کا کچھ پتا چلا تھانے دار صاحب؟'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

اس کا دھیان میرے ہاتھ میں موجود جوتے کی طرف نہیں گیا تھا۔ میں نے جوتے کا وہ پاؤں اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ پتا چلا ہے کرامت علی......!''

جوتے پر نگاہ پڑتے ہی کرامت علی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''یہ...... آپ کو کہاں سے ملا؟''

''ادھر سے۔'' میں نے اس مقام کی جانب اشارہ کیا جہاں وہ جوتا پڑا ملا تھا پھر کرامت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے تم نے اس جوتے کو پہچان لیا ہے؟''

"کیسے نہیں پہچانوں گا سرکار......" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ تو میرے فرید کے جوتے کا پاؤں ہے......" پھر وہ اضطراری نظر سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "فرید کہاں ہے؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کرامت علی۔ فرید کا جوتا مل گیا ہے تو وہ بھی مل ہی جائے گا۔"

میں نے کرامت علی کو تسلی تو دے دی تھی لیکن مجھے اپنے یہ الفاظ بہت کھوکھلے محسوس ہوئے تھے۔ کوئی ایسی بات تھی جو اندر سے مجھے وارننگ دے رہی تھی کہ فرید خیریت سے نہیں ہے۔ کرامت علی چند لمحات تک بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"یہ ایک ہی جوتا کیوں ہے جناب...... دوسرا پاؤں کہاں چلا گیا؟"

کرامت علی کے پدرانہ احساس نے معاملے کی سنگینی کو بھانپ لیا تھا تبھی اس کی زبان پر یہ سوال آیا تھا۔ میں نے پھر اس کی تشفی کی خاطر کہا۔

"تم آرام سے ایک طرف بیٹھ جاؤ کرامت علی۔ میں تفتیش کر رہا ہوں نا۔"

جوتے کے پاؤں کی شناخت ہوگئی تھی۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ فرید کنگنی والا سے نکل کر اسی راستے سے اپنے گھر کی طرف آیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ گھر نہیں پہنچ سکا تھا لہٰذا یہ سوچا جاسکتا تھا کہ جس مقام سے اس کا جوتا ملا تھا' وہاں پر فرید کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

میں نے اس مقام کے آس پاس کے علاقے کا بڑی توجہ سے جائزہ لیا لیکن فرید کے حوالے سے کوئی سراغ نہ مل سکا۔ حوالدار نے مجھ سے کہا۔

"ملک صاحب! ہمیں کھوجی سے مدد لینا چاہیے۔"

بہادر علی کی تجویز نہایت ہی معقول تھی۔ میں نے کھوجی تاج محمد کو فوراً وہاں طلب کرلیا۔ تاج محمد آدھے گھنٹے کے بعد میری نظر کے سامنے موجود تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا۔

"کیا حکم ہے ملک صاحب...... کسی ڈاکو کا سراغ لگانا ہے جناب۔"

"فی الحال تو مجھے اس کا سراغ لگوانا ہے۔" میں نے فرید کے جوتے کا پاؤں اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بندہ ستائیس جنوری کی رات کنگنی والا سے نکلا تھا اور اسی راستے پر چلتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک غائب ہوگیا۔ اب تمہیں پتا لگانا ہے کہ یہ بندہ کہاں گیا ہے۔"

"آپ کو جوتے کا یہ پاؤں کس جگہ پڑا ملا ہے؟" کھوجی تاج محمد نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

میں نے جواب میں مذکورہ مقام کی نشان دہی کردی۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے کام میں جت گیا۔ پندرہ بیس منٹ کی کھوج کے بعد تاج محمد نے بڑی سنسنی خیز رپورٹ دی۔ میں اس رپورٹ کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

تاج محمد عرف "بابا تاجا" کی ماہرانہ تحقیق کے مطابق وقوعہ کی رات فرید کنگنی والا سے اس طرف آیا تھا اور جس جگہ اس کا جوتا پڑا ملا، وہاں تک وہ اپنے پاؤں پر چل کر پہنچا تھا پھر اس کے ساتھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے جب پوچھا کہ کیسی گڑبڑ تو اس نے بتایا کہ اسے لگتا ہے' یہاں کچھ لوگوں سے اس کا جھگڑا وغیرہ ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں فرید کے ساتھ کسی قسم کی مار پیٹ بھی کی گئی تھی۔

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "چاچا! یہ بتاؤ کہ اب فرید کہاں ہے؟"

"وہاں ہونا چاہیے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

میں نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو چونک کر رہ گیا۔ وہاں مجھے برساتی پانی سے بھرا ہوا گڑھا نظر آیا تھا۔ میں نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے' فرید اس گڑھے کے اندر ہے؟"

"جناب! میں آپ سے وہی کہہ رہا ہوں جو آثار و شواہد سے میں نے اخذ کیا ہے۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ جہاں سے آپ کو یہ جوتا ملا، وہاں اس جوتے والے سے مار پیٹ وغیرہ کی گئی ہے اور پھر اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے اس گڑھے میں لا کر پھینک دیا گیا ہے۔ اگر میرا علم دغا نہیں دے رہا تو فرید کو اس گڑھے کے اندر ہی ہونا چاہیے اور......" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آج تک میرے علم نے مجھے دغا نہیں دیا جناب۔"

تاج محمد کے انکشافات ہولناک اور سنسنی خیز تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ فرید راہ زنی کی کسی واردات کا شکار ہوگیا تھا۔ میں نے گاؤں سے فوراً چند بالٹیاں منگوائیں اور دو تین افراد کو ان بالٹیوں کی مدد سے گڑھے کا پانی نکالنے کو کہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ گڑھا خالی ہوگیا اور مذکورہ گڑھے کی تہ میں ایک انسانی لاش بھی دریافت ہوگئی۔ جلد

ہی اس لاش کی شناخت بھی ہوگئی۔ وہ فرید ہی کی لاش تھی۔
میں نے توجہ سے لاش کا جائزہ لیا اور پھر اس حقیقت تک پہنچ گیا کہ اس کے سر پر وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور بعد ازاں اس کی لاش کو گھسیٹ کر اس گڑھے میں پھینک دیا گیا تھا۔ کرامت علی کا یہ دعویٰ تھا کہ فرید کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی لہٰذا یہی سوچا جاسکتا تھا کہ وہ لیٹروں یا راہ زنوں کے ستم کا شکار ہوگیا۔
میں نے موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد فرید کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا اور خود تھانے آگیا۔ میں پچھلے دو دن سے جس کیس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا، اس کا ایک حصہ مکمل ہوگیا تھا۔ اب فرید کے قاتل یا قاتلوں کو تلاش کر کے انہیں قرار واقعی سزا دلوانے کا مرحلہ باقی تھا۔
شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ مخبر میرے پاس آیا جسے میں نے گھمن شاہ کے آستانے کی سن گن لینے پر مامور کیا تھا۔ اس ہوشیار بندے کا نام اللہ رکھا تھا۔ اللہ رکھا کی رپورٹ کافی معلوماتی اور حوصلہ افزا تھی۔ اس آستانے پر گھمن شاہ کے زیر سایہ بہت سے غلط کام ہو رہے تھے۔
حشمت بی بی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وقوعہ کی سہ پہر خالدہ عرف خالو اس کے ساتھ گھمن شاہ سے کوئی تعویذ لینے گئی تھی۔ حشمت نے مجھے بتایا تھا کہ گھمن شاہ سے تعویذ لینے کے بعد وہ دونوں آستانے سے واپس آگئی تھیں لیکن اہم بات یہ تھی کہ خالدہ اپنے گھر نہیں پہنچی تھی لہٰذا حشمت بی بی کے بیان پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر خالدہ آستانے سے واپس آئی تھی تو پھر وہ اپنے گھر کیوں نہیں پہنچی اور اگر حشمت نے کسی غلط بیانی سے کام لیا تھا اور خالدہ آستانے سے واپس ہی نہیں آئی تھی تو میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہوگیا تھا کہ خالدہ کے ساتھ آستانے پر کیا واقعہ پیش آیا تھا کہ وہ گھر نہ پہنچ سکی۔
میں نے ہوشیار قسم کے دو کانسٹیبلو کو سادہ لباس میں آستانے کی نگرانی کے لیے روانہ کردیا اور شام کے سائے پھیلتے ہی خود بھی حوالدار کے ساتھ گھمن شاہ کے آستانے پر دھاوا بولنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے مجھے بہت کچھ ملے گا۔ میں فرید کو تو زندہ بازیاب نہیں کرسکا تھا لیکن خالدہ کو جلد از جلد تلاش کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ گھمن شاہ جیسے ڈبا پیر میں نے بہت دیکھے تھے اور ان سے نمٹنے کے مجھے ایک سو ایک گُر آتے تھے۔ آج کی رات گھمن شاہ بھی میرے ہاتھ سے بچ نکلنے والا نہیں تھا۔ میں ایک ولولے کے ساتھ اس طرف جارہا تھا۔

☆☆☆

آج مطلع صاف اور موسم خوش گوار تھا۔ چاروں جانب تیز اور چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کافی دنوں کے بعد آج سورج کی شکل دیکھنے کو ملی تھی۔ جب میں تھانے پہنچا تو کانسٹیبلو کی ''محنت'' رنگ لاچکی تھی۔
پچھلی رات میں نے گھمن شاہ کے آستانے پر کامیاب آپریشن کیا تھا۔ گھمن شاہ نے چھوٹے خان سے بھی زیادہ اکڑفوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے ساتھ وقت برباد کرنے کے بجائے گھمن شاہ اینڈ کمپنی کو گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچادیا تھا اور اس کمپنی میں حشمت بی بی' اس کا شوہر بھولا اور گھمن شاہ کے دیگر دو چیلے بھی شامل تھے۔ گویا یہ پانچ افراد تھے جنہیں میں خطرناک قسم کے کانسٹیبلو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ میرے کانسٹیبلو نے بڑی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے ان پانچوں کو زبانیں کھولنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ کانسٹیبلو کی ''خاطر مدارات'' سے اتنے خوش ہوئے تھے کہ انہوں نے سب کچھ اگل دیا تھا۔ گویا انہوں نے اپنے سیاہ کارناموں کا اقبال کرلیا تھا۔
ان پانچ افراد نے جو بیانات قلم بند کروائے، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے انجام سے آگاہی حاصل کرسکیں۔
گھمن شاہ بہت ہی کائیاں اور شاطر شخص تھا۔ وہ اپنے شعبدوں اور عیاریوں سے بہ آسانی سادہ لوح افراد کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ لوگ اس کی چالاکیوں کو روحانی کمالات سمجھ کر آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرلیتے تھے۔ اس کے مریدوں کی تعداد اچھی خاصی تھی جس میں بعض بااثر افراد بھی شامل تھے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر ذرائع ابلاغ نے گاؤں دیہات تک رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ آج کل کی بات ہی کچھ اور ہے......!
گھمن شاہ نے اپنے پاس آنے والوں کو متاثر کرنے کے لیے کئی شعبدے ''ایجاد'' کر رکھے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سادہ دل افراد کی نفسیات سے بھی کھیلتا تھا۔ لوگ اس کے چلتروں کے رعب میں آکر پلک جھپکتے میں اس کے عقیدت مند بن جاتے تھے لہٰذا اس کے تمام کام آسان ہوجاتے تھے جن میں سرفہرست کام اپنی بے لگام شیطانی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے پاس

آنے والی خوب صورت عورتوں کو شکار کرلیا کرتا تھا۔ خالدہ سے پہلے کئی عورتیں اس کی ہوس کا نشانہ بن چکی تھیں لیکن خالدہ گھمن شاہ کے لیے تر نوالہ ثابت نہ ہوسکی۔ وہ دوسری عورتوں سے بہت مختلف ثابت ہوئی تھی۔

جب خالدہ تعویذ لینے کے لیے گھمن شاہ کے پاس پہنچی تو وہ اسے دیکھتے ہی پھڑک اٹھا تھا۔ حشمت نے اس کے سامنے خالدہ کے حسن کی تعریف تو بہت کر رکھی تھی لیکن اس وقت خالدہ مجسم اس کے سامنے موجود تھی لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا۔ حسن کے پیکر کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بے قابو ہوگیا تھا۔

خالدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گھمن شاہ کے آستانے پر اسے ایسی صورتِ حال کا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ گھمن شاہ کے ناپاک عزائم کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھی۔ اس نے نہ صرف گھمن شاہ کی بات ماننے سے انکار کردیا بلکہ اسے دھمکی بھی دی کہ وہ پورے گاؤں کو اس کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتائے گی۔ مجبوراً گھمن شاہ کو ہمیشہ کے لیے خالدہ کو ''خاموش'' کرانا پڑا۔

اس شیطانی کھیل میں حشمت بی بی اور اس کا گھر والا بھولا ڈنگر چور گھمن شاہ کے لیے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ وہ گھمن شاہ کے لیے ''شکار'' گھیرنے پر مامور تھے۔ حشمت بی بی اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ تھی کہ چھوٹا خان غلام مرتضیٰ ہاتھ دھو کر خالدہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خالدہ چھوٹے خان سے شدید نفرت کرتی تھی لہٰذا اس نے خالدہ کو گھیرنے کے لیے اس کی نفسیات سے کام لیا۔

وقوعہ سے چند روز پہلے حشمت اور خالدہ کی جب کھیتوں میں ملاقات ہوئی تو حشمت نے اس موقع کو سنہری جانا اور وہ خالدہ کو ایک طرف لے گئی۔ خالدہ نے پوچھا۔ ''چاچی! خیریت تو ہے نا......!''

''سب خیریت ہے جھلی۔'' حشمت بی بی نے.... رازدارانہ .... لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں اور یہ بات تمہارے ہی فائدے کی ہے۔''

اپنے فائدے کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے، لہٰذا خالدہ حشمت کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''آخر بات کیا ہے' کچھ پتا تو چلے؟''

''بتاتی ہوں ......'' حشمت نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''چھوٹا خان تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے نا؟''

''ہاں ...... یہ بات تو ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''کیا تم چھوٹے خان سے جان چھڑانا چاہتی ہو؟'' حشمت نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

خالدہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے چاچی ...... پر کیا کروں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لوفر سے کیسے جان چھڑاؤں؟''

''جب انسان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو تو اسے کسی دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے۔'' حشمت نے شاطرانہ انداز میں کہا۔ ''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ بس اس تک پہنچنے کی بات ہے۔''

''میں کس سے مشورہ کروں؟'' خالدہ بے بسی سے بولی۔ ''چاچی! کیا تم مجھے اس مسئلے کا کوئی حل بتاسکتی ہو؟''

''کیوں نہیں ......'' حشمت نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر تو میری بات ماننے کے لیے تیار ہوجائے تو چھوٹا خان ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنے دل و دماغ سے نکال دے گا۔''

''تو پھر بتانا چاچی ......'' خالدہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''یہ بجھارتیں کیوں ڈال رہی ہے۔ بتا' مجھے تیری کون سی بات ماننا پڑے گی؟''

حشمت بی بی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم شاہ صاحب سے تعویذ کیوں نہیں لیتی ہو؟''

''شاہ صاحب......!'' خالدہ نے الجھن زدہ نظر سے حشمت کی طرف دیکھا۔

''اری پاگل ......میں گھمن شاہ کی بات کررہی ہوں۔'' حشمت اس کی الجھن کو رفع کرتے ہوئے بولی۔ ''جن کا آستانہ ادھر نہر کے کنارے پر ہے۔''

''کیا تعویذ اس مسئلے کو حل کرسکتا ہے؟'' خالدہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں۔'' حشمت نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''شاہ صاحب بہت پہنچے ہوئے انسان ہیں۔ ان کے تعویذوں میں بڑی تاثیر پائی جاتی ہے' بالکل جادو کی طرح کام کرتے ہیں۔''

''اچھا......'' خالدہ نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''پھر تو میں گھمن شاہ سے ضرور تعویذ لوں گی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے حشمت سے کہا۔ ''چاچی! تو ہی مجھے ایک تعویذ لادے نا۔''

''تو بھی بڑی جھلی ہے۔'' حشمت نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پگلی! ہر بندے کو اپنے حصے کا پانی خود کنواں کھود کر نکالنا پڑتا ہے۔''

"میں کبھی نہیں چاچی۔" خالدہ پلکیں جھپک کر رہ گئی۔

"مطلب یہ کہ تمہیں اپنے کام کے لیے خود شاہ صاحب کے پاس جانا پڑے گا۔" حشمت وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"مگر میں تو پہلے کبھی ادھر گئی نہیں۔" خالدہ نے ہچکچاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ "کیا تم میرے ساتھ آستانے تک نہیں چل سکتی ہو؟"

"میں تمہاری خاطر چلی چلوں گی۔" حشمت مکاری سے بولی۔ "لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" خالدہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم گاؤں میں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گی۔" حشمت اسے پکا کرتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ خبر اڑتی ہوئی چھوٹے خان تک پہنچ گئی کہ تم ان کے خلاف تعویذ دھاگے کروا رہی ہو تو پھر خود ہی سوچ لو...... تمہارا کیا حشر ہوگا!"

"توبہ...... توبہ......" خالدہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے بولی۔ "میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے کہ میں خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماروں گی۔ تم اطمینان رکھو چاچی، میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"شاباش!" حشمت ستائشی نظر سے خالدہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو خوامخواہ تمہیں 'جھلی جھلی' کہہ رہی تھی۔ تو تو بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ بس، تو بے فکر ہو جا۔ اب میں خود کسی دن تجھے اپنے ساتھ شاہ صاحب کے پاس لے کر جاؤں گی۔ سمجھ لے کہ تیرا کام یوں ہو جائے گا۔" بات کے اختتام پر حشمت بی بی نے چٹکی بجا کر دکھائی۔

خالدہ خوشی خوشی گھر واپس آگئی۔ چند روز بعد یعنی وقوعہ کی سہ پہر حشمت بی بی خالدہ کو لے کر گھمن شاہ کے آستانے پر پہنچ گئی۔

اس وقت گھمن شاہ اپنے حجرے میں تھا لہٰذا اس نے انہیں اپنے پاس ہی بلا لیا۔ گھمن شاہ نے بڑی سنجیدگی اور توجہ سے خالدہ کا مسئلہ سنا۔ اس دوران میں وہ بھوکی نظر سے خالدہ کے بدن کو بھی ٹٹولنے میں مصروف رہا تھا۔ ادھر خالدہ کی داستان ختم ہوئی، ادھر گھمن شاہ کی ہوس پھنکار کر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ خالدہ چونکہ نگاہ جھکائے دوزانو گھمن شاہ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی لہٰذا وہ اس کی آنکھوں میں موجود ہوس کی چنگاریوں کو نہ دیکھ سکی۔

گھمن شاہ نے پانی لانے کے بہانے حشمت بی بی کو حجرے سے باہر بھیج دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے شرافت کا لبادہ اتار کر ایک طرف پھینکا اور اپنا بھیڑیا پن خالدہ پر ظاہر کر دیا۔ خالدہ "شاہ صاحب" سے ایسے رویے کی توقع نہیں کر رہی تھی لہٰذا وہ بری طرح بدک گئی۔

گھمن شاہ کا اب تک کا تجربہ یہی تھا کہ اگر اس نے کسی عورت پر ہاتھ رکھ دیا تو پھر اسے ناکامی...... کا منہ نہیں دیکھنا پڑا لیکن خالدہ اس کے لیے نیا تجربہ ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف بری طرح گھمن شاہ کا ہاتھ جھٹک دیا بلکہ بڑے خطرناک انداز میں اسے دھمکی بھی دی کہ وہ پورے گاؤں کو اس کی اصلیت کے بارے میں بتا دے گی۔

اس صورتِ حال نے گھمن شاہ کو پریشان کر دیا۔ اس نے اپنے کھیل کو بگڑتے ہوئے دیکھا تو "نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری" کے مصداق گلا گھونٹ کر خالدہ کا کام تمام کر دیا۔ پھر وہ کمینہ شخص اپنی ناپاک خواہش کی تکمیل کے لیے خالدہ کے مردہ بدن کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ گویا اس نے انسانیت کی تذلیل اور بے حرمتی کی ایک عبرت ناک مثال قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اس خبیث گھمن شاہ نے خالدہ کی لٹی پٹی لاش کو نہر کے کنارے اگی جھاڑیوں میں دبا دیا تھا۔ یہ کام گھمن شاہ کے دستِ راست بھولا نے بہ آسانی کر دیا تھا۔ میں نے گھمن شاہ کی نشان دہی پر خالدہ کی لاش برآمد کر لی اور گھمن شاہ، حشمت بی بی، بھولا اور شاہ صاحب کے دو خاص چمچوں کے خلاف خاصا مضبوط پرچہ کاٹ کر انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔

میں نے یہاں گھمن شاہ کے جن دو چیلوں کا ذکر کیا ہے، یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے وقوعہ کی رات فرید پر حملہ کیا تھا۔ وہ راہ زنی کے ارادے سے اس کی طرف بڑھے تھے لیکن فرید نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا لہٰذا انہوں نے اپنی حفاظت کی خاطر فرید کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیا پھر اس کی لاش کو گھسیٹ کر پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں پھینک دیا تھا۔

اس کیس کے اختتام پر میں بہت سے معاشرتی ناسوروں کو جیل بھجوانے میں کامیاب رہا تھا لیکن مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ میں ان کمینوں کے دستِ ستم کا شکار ہونے والے فرید اور خالدہ کو نہیں بچا سکا تھا۔

قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کے راز وہی جانتا ہے۔ وہی سب سے بڑا مصلح ہے، وہی سب سے بڑا صلح جو ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

لارڈ رچرڈ کی عمر تو ساٹھ سے کچھ اوپر ہی تھی مگر اپنے سرخ و سپید چہرے اور مضبوط چوڑی جسامت کے باعث وہ اپنی عمر سے کہیں کم کے نظر آتے تھے۔ وہ اب بھی کسی نوجوان کی طرح چاق و چوبند تھے۔ ڈیوڈ کا ان کی صحت کے بارے میں خیال تھا کہ لارڈ رچرڈ عمر بھر معاشی تفکرات سے دور رہے تھے اسی لیے وہ اتنے صحت مند ہیں۔

لارڈ رچرڈ ایک سچا اور کھرا انسان تھا۔ ڈیوڈ یہ بات اکثر سنا کرتا تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی دل سے اس بات کا قائل ہو چکا تھا۔ ایک واقعے نے تو اسے حیران کر دیا۔

لارڈ رچرڈ کا کسی کے ساتھ رقم کے لین دین پر تنازع تھا اور عدالت میں ان کا ذہین وکیل کیس کو اس نہج پر لے آیا تھا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی مطلوبہ رقم سے ایک لاکھ ڈالرز زیادہ حاصل کر سکتے تھے مگر اس سچے اور کھرے انسان نے ایسا نہیں کیا۔ ڈیوڈ کو یہ واقعہ سن کر یقین ہی نہ آتا تھا کہ جھوٹ اور فریب زدہ امریکی معاشرے میں لارڈ رچرڈ جیسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کی لارڈ سے دوستی کو تقریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا

اندھے اعتماد اور منفرد تعلق کی عجیب کہانی

بعض راستے ایسے ہوتے ہیں کہ انسان چاہ کر بھی ان کی طرف نہیں جاسکتا مگر... کبھی کچھ راہیں آگے بڑھ جانے والوں کو اپنی طرف واپس کھینچ بھی لیتی ہیں... وہ جو پیٹھ میں خنجر گھونپنے والوں میں شامل تھا، پھر کیسے اپنے خیر خواہ کی آنکھوں میں نفرت دیکھنے کے لیے پلٹتا لیکن... وہ دوست ہی کیا جو چوٹ کھا کر منہ کو موڑ لے... لہٰذا ان دونوں میں سے ایک ہیرا اور دوسرا دوست پتھر ثابت ہوا۔

واپسی

شاکر لطیف



تھا۔ ڈیوڈ حیثیت میں لارڈ کے ہم پلہ نہ تھا، وہ ایک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کر رہا تھا جبکہ لارڈ رچرڈ کو وراثت میں اتنی دولت ملی تھی کہ انہوں نے ساری عمر خود کوئی کام ہی نہ کیا تھا تاہم اس طبقاتی فرق کے باوجود دونوں میں گہری دوستی تھی اور ڈیوڈ کا شمار لارڈ کے پسندیدہ لوگوں میں ہوتا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈیوڈ شطرنج کا ماہر کھلاڑی تھا اور لارڈ رچرڈ بھی اس کھیل کے بہت شوقین تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے دونوں میں خوب جمتی تھی تاہم ڈیوڈ کا پلڑا اکثر بھاری رہتا تھا۔

ڈیوڈ ہر ویک اینڈ پر لارڈ کے بنگلے پر جاتا اور پھر گھنٹوں بیٹھ کر ان کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔

لارڈ رچرڈ اپنے اس وسیع وعریض بنگلے میں صرف ایک ملازم کے ساتھ رہتے تھے۔ چاہتے تو ملازمین کی پوری فوج رکھ سکتے تھے مگر تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ بھیڑ اور شور پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے قریبی دوستوں کی فہرست بھی خاصی مختصر تھی۔ بہرحال ڈیوڈ کے لیے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات موجود تھے اور ڈیوڈ ان کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اکثر اوقات لارڈ کی ہمدردی کا فائدہ بھی اٹھاتا رہتا تھا۔ اپنی غربت اور مجبوریوں کا رونا رو کر لارڈ سے پیسے بٹورنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اگرچہ وہ پیسے قرض کے طور پر ہی وصول کرتا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس نے لارڈ رچرڈ کو آج تک ایک پائی بھی نہیں لوٹائی تھی اور نہ ہی کبھی لارڈ نے اپنی رقم کا تقاضا کیا تھا۔ شاید دوسروں کی مدد کرنے کے لیے لارڈ نے یہ انوکھا انداز اپنا رکھا تھا کیونکہ اس طرح لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی تھی۔

ڈیوڈ کی ان سے پہلی ملاقات سمندر کنارے ہوئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ شطرنج کی بازی کھیل رہا تھا۔ لارڈ رچرڈ جو وہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے، کھیل دیکھنے کے لیے ان کے قریب آ گئے۔ وہ ڈیوڈ کی مہارت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ڈیوڈ کو باقاعدہ اپنے بنگلے میں آکر کھیلنے کی دعوت دے ڈالی اور یوں دونوں کی دوستی کا آغاز ہو گیا۔ اب ڈیوڈ پچھلے دو سال سے لارڈ کے بنگلے میں آ رہا تھا۔ لارڈ رچرڈ چونکہ ایک لارڈ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے بنگلے کی تزئین و آرائش سے بھی ان کی امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کا بنگلا باہر سے تو پرانا اور قدیم طرز کا معلوم ہوتا تھا مگر جو بھی اندر سے دیکھتا تعریف کیے بنا نہ رہ سکتا۔

آج ویک اینڈ تھا اور ڈیوڈ حسب معمول لارڈ کے ساتھ شطرنج کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔ ویسے تو لارڈ رچرڈ بھی اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے اور اکثر اوقات ڈیوڈ کو ہرا بھی دیتے تھے مگر آج ان کا ستارہ کھیل کے شروع سے ہی گردش میں تھا۔ وہ آج ایک بھی بازی جیت نہیں پائے تھے۔

''بس بھئی اب مزید نہیں...... میرا خیال ہے اب چائے پی لی جائے۔'' ڈیوڈ نے مسلسل تیسری بار انہیں مات دی تو انہوں نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

''آج میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے اکلوتے ملازم کو چائے لانے کا کہا۔

کچھ ہی دیر میں گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے ان کے سامنے رکھ دی گئی۔

''تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟'' لارڈ نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ڈیوڈ سے سوال کیا۔

''بس لارڈ رچرڈ! آپ تو میرے حالات سے واقف ہی ہیں۔ اپنے انہی نامساعد حالات کی وجہ سے میں آج تک شادی نہیں کر سکا حالانکہ اب چالیس سے اوپر کا ہو چکا ہوں مگر اس تنخواہ میں اپنی گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔ بیوی اور بچوں کا خرچہ کیسے اٹھاؤں گا۔'' بات کرتے ہوئے ڈیوڈ نے اپنے چہرے پر مظلومیت طاری کرنے کی پوری کوشش کی۔

''ارے ارے...... مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' لارڈ نے چائے کا کپ سامنے موجود ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنا بٹوا نکال کر سو ڈالر کے پانچ نوٹ ڈیوڈ کی طرف بڑھا دیے۔

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی لارڈ صاحب!'' ڈیوڈ نے باچھیں پھیلا کر کہا تاہم اس نے نوٹ لینے میں دیر نہ لگائی۔

''کوئی بات نہیں۔'' لارڈ نے انکسارانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک دوست ہی دوسرے دوست کے کام آتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ملازم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا تجوری میں رکھ دیا ہے؟''

''جی لارڈ صاحب!'' ملازم نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ بہت قیمتی اور نایاب ہے، اس کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں ہے۔ ایک دو دن تک اسے بلینک لاکر میں رکھوا دیا جائے گا، وہاں یہ زیادہ محفوظ رہے گا۔'' لارڈ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''جی بہتر......'' ان کے ملازم نے مختصر سا جواب دیا۔

لاکھوں ڈالرز کا سن کر ڈیوڈ کے کان کھڑے ہو گئے۔

لارڈ کی تجوری میں لاکھوں ڈالرز کی کوئی قیمتی چیز موجود تھی، غالباً کوئی ہیرا ہی ہوسکتا تھا چونکہ امریکا میں دو چھٹیوں کا رواج تھا اس لیے اگلے دن بھی بینک بند تھے یعنی اس قیمتی چیز کو کل تو کسی صورت بینک میں نہیں رکھوایا جاسکتا تھا۔

لارڈ نے اگر اس قیمتی چیز کی قیمت لاکھوں ڈالرز بتائی ہے تو پھر وہ واقعی بہت قیمتی ہوگی کیونکہ ڈیوڈ جانتا تھا کہ لارڈ رچرڈ مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس بیش قیمت چیز کو حاصل کر کے اسے بیچنے میں بھی کامیاب ہوجائے تو...... اس کے ذہن میں ایک منصوبہ گردش کرنے لگا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے قسمت اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے، بس اسے تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی۔ ''لارڈ صاحب! میں کل بھی فارغ ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں کل بھی حاضر ہوجاؤں۔ آج کھیلنے میں مزہ نہیں آیا۔'' ڈیوڈ نے اپنے ذہن میں پنپنے والے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' لارڈ رچرڈ نے خوش دلی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گا۔ آج تو تم آسانی سے جیت گئے ہو مگر کل ہمارا زوردار مقابلہ متوقع ہے۔''

''ٹھیک ہے لارڈ صاحب...... تو پھر کل دوپہر کو ملتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنی چائے ختم کرتے ہوئے کہا اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لارڈ سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر باہر کی جانب روانہ ہوگیا۔

بنگلے کے صحن میں لارڈ کی انتہائی قیمتی اور خوب صورت کار کھڑی تھی۔ ڈیوڈ اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا پاس ہی موجود اپنی کھٹارا کار کی طرف بڑھ گیا جو تقریباً چھٹے سیلف پر اسٹارٹ ہوئی۔ لارڈ کے ملازم نے جو اسے رخصت کرنے کے لیے ساتھ ہی آیا تھا، پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ ڈیوڈ نے گاڑی باہر نکالی اور پھر اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اپنے فلیٹ میں پہنچ کر وہ ایک آرام دہ کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اس کے ذہن میں اب بھی وہ فقرے گونج رہے تھے جو لارڈ نے اپنے ملازم سے کہے تھے۔ تجوری میں رکھی گئی اس چیز کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں ہے۔

ڈیوڈ اپنے موجودہ حالات سے خاصا ناخوش تھا۔ وہ اپنی باقی کی زندگی اس طرح سے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی میں تبدیلی کے لیے اسے کوئی بڑا کام کرنا ہوگا چاہے اس کے لیے اسے کسی جرم کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کے بعد وہ امریکا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر میکسیکو چلا جاتا۔ ویسے بھی وہ میکسیکو نژاد ہی تھا اس لیے وہاں جا کر سیٹل ہونا اس کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔ وہ کافی عرصے سے کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جس سے اس کی زندگی بدل جائے اور آج لارڈ رچرڈ کی باتیں سن کر اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ موقع اس کے بالکل سامنے ہے۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو فیصلہ کرنے کے بعد اس پر فوری عمل بھی کر گزرتے تھے۔ اس نے لارڈ رچرڈ کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ خودغرض اور فریب زدہ امریکی معاشرے میں وہ ایک کھرا انسان تھا، اسے دوسروں کا درد محسوس ہوتا تھا اور وہ کسی کی بھی بے لوث مدد کر کے خوش ہوتا تھا، ڈیوڈ خود بھی اس سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔ کیا اس جیسے بے غرض دوست کو دھوکا دینا ٹھیک تھا۔ کیا اس کا ضمیر یہ گوارا کرلے گا؟ وہ وقتی طور پر شش و پنج میں پڑ گیا مگر پھر لالچ اس کے تمام خیالات پر حاوی ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے یہ موقع ضائع کردیا تو تمام عمر پچھتاتا رہے گا۔

اس کا پلان بھی بڑا سادہ سا تھا، لارڈ کے گھر میں داخل ہونا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اسے بس لارڈ اور اس کے ملازم کو وقتی طور پر بے ہوش کرنا تھا اور پھر تجوری سے وہ قیمتی ہیرا یا جو کچھ بھی تھا حاصل کر کے اپنی اسی کھٹارا گاڑی پر امریکا کے سرحدی علاقے تک پہنچنا تھا، جہاں اس کا بھائی مائیکل رہتا تھا۔ وہ کچھ دن تک مائیکل کے پاس روپوش رہ سکتا تھا اور پھر موقع ملتے ہی سرحد پار کر کے میکسیکو میں داخل ہوجاتا اس کے بعد امریکی پولیس اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سرحد پر اگر اسے کوئی محافظ روک بھی لیتا تو چند سو ڈالرز دے کر اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی دفعہ میکسیکو اسی راستے سے جاچکا تھا اور پھر حکومت کی طرف سے وہاں جانے کی قانونی اجازت بھی موجود تھی۔ چونکہ اب وہ فیصلہ کرچکا تھا اس لیے اپنے پلان پر عمل درآمد کے لیے اسے کچھ ضروری سامان کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ لارڈ کے ملازم کو بے ہوش کرنا شاید اتنا مشکل نہ ہوتا کیونکہ وہ خاصا کمزور آدمی تھا مگر اس کے برعکس لارڈ کے معاملے میں یہ کام مشکل بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ تنومند اور جسیم لارڈ رچرڈ اگر ڈیوڈ کے مقابلے میں مزاحمت پر اتر آتا تو ڈیوڈ کو یقینی طور پر لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ وہ لارڈ کو اچانک اور غیر متوقع طور پر بے ہوش کردے اور انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ دے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ ڈیوڈ کو نیند آنے لگی۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اپنے بیڈ پر دراز ہوگیا۔ کل

وہ ایک ایسا جرم کرنے جارہا تھا جس کی ناکامی کی صورت میں وہ انجام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے پاس دوسرا چانس نہیں تھا۔

اگلی صبح وہ جلدی اٹھ گیا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور پھر چائے پینے کے بعد گھر سے روانہ ہوگیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک شہر کے مختلف علاقوں میں گھومنے کے بعد اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی تو اس نے گھر واپسی کا فیصلہ کیا۔ گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے وہ اپنے فلیٹ میں آگیا۔ وہ اپنے اس پلان میں استعمال ہونے والی سب سے ضروری اور اہم چیز کلوروفارم کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے اثر سے لارڈ اور اس کا ملازم چھ سے سات گھنٹوں تک بے ہوش رہیں گے اور اتنا وقت اس کے لیے کافی تھا۔

تقریباً تین بجے کے قریب وہ اپنی گاڑی پر لارڈ کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں کلوروفارم سے تر کیا گیا رومال موجود تھا جبکہ اس نے اپنے کپڑے اور ضروری سامان بھی ساتھ لے لیا تھا کیونکہ اب اس واردات کے بعد اسے اس شہر کو چھوڑ کر اپنے بھائی مائیکل کے پاس جانا تھا، جہاں کچھ عرصے روپوش رہنے کے بعد وہ میکسیکو نکل جاتا۔ اس کے علاوہ مائیکل کے پاس جانے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اگرچہ ابھی تک اس کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ لارڈ رچرڈ کی تجوری میں لاکھوں ڈالرز کی وہ چیز کیا تھی مگر اس کا اپنا خیال یہی تھا کہ وہ کوئی قیمتی ہیرا ہی ہوسکتا تھا اور اس کا بھائی مائیکل کسی دور میں ہیروں کے بزنس سے منسلک رہا تھا لہٰذا وہ ڈیوڈ کی اس معاملے میں خاصی مدد کرسکتا تھا اور مارکیٹ میں اس کا خریدار بھی آسانی سے تلاش کرسکتا تھا۔ لارڈ رچرڈ کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہارن دیا تو کچھ ہی دیر میں مین گیٹ کھول دیا گیا۔ ڈیوڈ نے گاڑی اندر بڑھائی اور پھر اسے لارڈ کی قیمتی گاڑی کے پیچھے کھڑا کر کے نیچے اتر آیا۔ لارڈ کا ملازم بھی مین گیٹ بند کر کے اس کے پاس آچکا تھا۔

''آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں، لارڈ صاحب آرہے ہیں۔'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں ڈیوڈ سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہورہی تھی شاید اس لیے کہ اب عملی کام کا وقت شروع ہوگیا تھا۔ اس نے اب فوری حرکت میں آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لارڈ کے آنے سے پہلے اس ملازم کو بے ہوش کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا کیونکہ دونوں کی موجودگی میں شاید یہ کام ناممکن ہوجاتا۔ یہ بہترین موقع تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں موجود کلوروفارم سے تر کیے گئے رومال پر جم گیا اور پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے لارڈ کے ملازم کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اپنا رومال نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ لارڈ کا ملازم فوری طور پر کچھ سمجھ نہ سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ حیرت سے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہوگیا۔

وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف صوفے کے پیچھے لے آیا اور پھر اسے آرام سے لٹا دیا۔ لارڈ ابھی تک شاید اپنے کمرے میں ہی تھے۔ ڈیوڈ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے لارڈ کے آتے ہی ان پر بھی حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ اب وہ مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر وہاں سے دور نکل جائے اور پھر لارڈ کے قدموں کی آواز سن کر اس کے اعصاب تن گئے۔ لارڈ رچرڈ اپنے ملازم کی طرح کمزور جسامت کے نہیں تھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈیوڈ انہیں بھی آسانی سے زیر کرلیتا اس لیے وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ بہترین حکمت عملی یہی تھی کہ وہ ان پر پیچھے سے اچانک حملہ کرتا۔ اس لیے جیسے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، ڈیوڈ اچھل کر ان کی پشت پر سوار ہوگیا۔ اس نے کلوروفارم سے تر کیا ہوا رومال مضبوطی سے لارڈ کے منہ پر جما دیا۔ اس ناگہانی افتاد پر لارڈ وقتی طور پر بوکھلا گئے اور ان کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آوازیں خارج ہونا شروع ہوگئیں اور انہوں نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگانا شروع کردیا مگر ڈیوڈ ان کی متوقع مزاحمت کے پیش نظر ہی اچھل کر ان کی پشت پر سوار ہوا تھا۔ اس لیے لارڈ باوجود کوشش کے خود کو نہ چھڑوا سکے۔ رفتہ رفتہ ان کی مزاحمت دم توڑنے لگی کیونکہ ڈیوڈ نے وافر مقدار میں کلوروفارم رومال پر انڈیل رکھا تھا اس لیے کچھ ہی دیر میں لارڈ بھی تیورا کر زمین پر جاگرے۔ ڈیوڈ نے بمشکل خود کو ان کے جسم کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔

وہ ایک طرف کھڑا ہوکر گہری گہری سانسیں لینے لگا کیونکہ لارڈ کے ساتھ زور آزمائی میں اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو اعتدال میں لانے کے بعد اس نے رومال اپنی جیب میں ڈالا اور تیزی سے لارڈ کی تلاشی لینے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ تجوری کی چابی عام طور پر لارڈ کے پاس ہی رہتی تھی تاہم کبھی کبھی کوئی چیز رکھنے کے لیے وہ چابی اپنے قابل اعتماد ملازم کو بھی دے دیا

کرتے۔ اگرچہ تجوری میں رقم وغیرہ بھی موجود ہوتی تھی مگر لارڈ رچرڈ کو اپنے اس بوڑھے ملازم پر مکمل اعتبار تھا۔ ڈیوڈ چونکہ کافی عرصے سے یہاں آرہا تھا اس لیے یہ تمام باتیں جانتا تھا۔

لارڈ کے کوٹ سے چابی برآمد ہوتے ہی وہ وقت ضائع کیے بغیر ان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ لارڈ اور اس کے ملازم کے بارے میں اب اسے کوئی فکر نہ تھی اور ان کا چھ سے سات گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔ لارڈ کی تجوری کھلی تو ڈیوڈ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی خوش قسمتی کا دروازہ کھل گیا ہو۔ اس نے اندر کا جائزہ لیا، وہاں نقدی نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ کچھ کاغذات وغیرہ موجود تھے جو ڈیوڈ کے کسی کام کے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی ڈبیا اور کاغذات کے اوپر ایک پتھر بھی رکھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے پُرتجسس انداز میں اس پتھر کو اٹھا کر دیکھا مگر اسے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ یہ اس کے کسی کام کا نہیں۔ وہ ایک عام سا پتھر تھا۔ شاید لارڈ اسے پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس نے پتھر تجوری میں واپس رکھ دیا اور وہ چھوٹی سی ڈبیا اٹھالی۔

اس نے جیسے ہی ڈبیا کھولی، اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ ڈبیا میں واقعی میں ایک چھوٹا سا ہیرا موجود تھا۔ ڈیوڈ کو ہیروں کی پہچان تو نہیں تھی مگر اس ہیرے کی چمک دمک دیکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ لارڈ نے اسی بارے میں اپنے ملازم کو کہا تھا اور پھر اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز تجوری میں موجود نہیں تھی جس کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں ہوسکتی تھی۔

ڈیوڈ نے ہیرے کو ڈبیا میں ڈالا اور پھر اسے اپنی جیب میں ڈال کر باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا اور اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کھیل میں سب سے زیادہ اہمیت وقت ہی کی ہے۔ اب وہ جتنی جلدی اس شہر سے دور ہوجاتا، اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہوتا۔

اس نے مین گیٹ کھولا اور پھر اپنی گاڑی نکال کر باہر آگیا۔ اس کے بعد وہ گاڑی سے نیچے اترا اور بنگلے کا گیٹ بند کر کے چھوٹے خارجی دروازے سے باہر آگیا۔ مین گیٹ بند کرنا ضروری تھا کیونکہ اسے کھلا دیکھ کر لارڈ کا کوئی ہمسایہ مشکوک بھی ہوسکتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے لارڈ کے وسیع وعریض بنگلے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور پھر روانہ ہوگیا۔ اسے اپنے اندر ہلکی سی بے چینی کا احساس بھی ہورہا تھا۔ شاید اس کا ضمیر اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ اس سچے اور کھرے انسان کو دھوکا دے کر آرہا تھا جس نے ہمیشہ ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ اسے کبھی اس کی کمتر حیثیت کا احساس نہیں دلایا تھا۔ ایک اچھا دوست سمجھ کر ہمیشہ اس پر اندھا اعتماد کیا تھا مگر اپنے حالات کو سدھارنے کے لیے ڈیوڈ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لارڈ کو اس ہیرے کی چوری سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا مگر اس کے دن پھر جائیں گے۔ وہ دنیا کی سیاحت کرنا چاہتا تھا اور اب اسے یقین تھا کہ وہ اپنی ساری تمنائیں اور حسرتیں پوری کرسکے گا۔

وہ خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا کیونکہ لارڈ ہوش میں آتے ہی پولیس کو اطلاع کرتے اور وہ امریکن پولیس کی کارکردگی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ پولیس پہلے اس کا فلیٹ چیک کرتی اور اسے خالی پاکر فوراً اس کی گاڑی کی تلاش شروع کردیتی۔ وہ کسی بھی شہر نکل جاتا اس گاڑی پر پولیس سے بچنا مشکل تھا۔ پولیس کا مواصلاتی نظام بہت تیز رفتار تھا۔ ایک بار اس کی تلاش شروع ہوجاتی تو شہری علاقے میں اس کا بچنا ناممکن ہوجاتا۔ اسی لیے اس نے مائیکل کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جگہ شہر سے دور ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں اس کے بھائی مائیکل سمیت دوسرے لوگوں کا کاروبار ڈیری فارمنگ سے منسلک تھا۔ اس جگہ ہر طرف جانوروں کا گوبر بکھرا رہتا تھا۔ پولیس تو کیا عام شہری بھی بلاضرورت اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر امریکی بہت نفاست پسند طبیعت واقع ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی گاڑی کو جانوروں کا گوبر گندا کردے۔

ڈیوڈ وہاں اپنی کار بھی چھپا سکتا تھا اور کچھ دنوں تک آرام سے رہ بھی سکتا تھا اور پھر اس ہیرے کو فروخت بھی تو کرنا تھا۔ ایک بار رقم ہاتھ میں آجاتی تو اس کے بعد وہ میکسیکو نکل جاتا اور پھر کچھ عرصے کے بعد دنیا کی سیاحت کے لیے روانہ ہوجاتا۔

تقریباً پانچ گھنٹے کی مسلسل اور تھکادینے والی ڈرائیونگ کے بعد وہ شہر سے نکل کر اس دیہاتی علاقے میں داخل ہوا تو اس کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ اب وہ خاصی حد تک پولیس کی دسترس سے محفوظ ہوچکا تھا اور پھر اس کا خیال تھا کہ ابھی تک پولیس کو اس واقعے کی خبر ہی نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ ممکن تھا کہ لارڈ رچرڈ اور ان کا بوڑھا ملازم ابھی تک ہوش میں ہی نہ آئے ہوں۔

اس سڑک پر خاصا گردوغبار تھا، اس لیے ڈیوڈ اب خاصی آہستہ رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا

پھیل چکا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے سہارے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

عام طور پر اس کے بھائی مائیکل کا فارم یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھا مگر رات ہونے کی وجہ سے ڈیوڈ کو وہاں پہنچنے میں تین سے چار گھنٹے کا وقت صرف ہوا۔ وہ تقریباً دو سال کے بعد مائیکل سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا، ورنہ دونوں کا رابطہ بس فون کی حد تک رہ گیا تھا۔

اس نے ڈیری فارم کے گیٹ پر ہارن دیا تو کچھ ہی دیر میں مائیکل ہاتھ میں ٹارچ پکڑے باہر آگیا۔

''اوہ ڈیوڈ تم۔'' اس پر نظر پڑتے ہی وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں مین گیٹ کھول رہا ہوں، گاڑی اندر لے آؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے گیٹ کھول دیا۔ ڈیوڈ گاڑی اندر لے گیا۔ وہ جیسے ہی نیچے اترا مائیکل گرم جوشی سے .... اس کی طرف بڑھا۔

''تمہاری آمد خاصی اچانک اور غیر متوقع ہوئی ہے۔'' وہ ڈیوڈ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔

''بس تمہاری اور اپنے بھتیجوں کی یاد آرہی تھی اس لیے ملنے آگیا۔ ویسے مجھے تم سے ایک ضروری کام بھی تھا۔'' ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کون سا ضروری کام؟'' مائیکل نے چونک کر پوچھا۔

''ارے، ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے کرلو گے، اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور یہ بتاؤ تمہارے بیوی بچے نظر نہیں آرہے؟'' ڈیوڈ نے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ جب ہیروں کے بزنس میں کساد بازاری آئی تھی تو مائیکل نے اس کاروبار کو خدا حافظ کہہ کر ڈیری فارمنگ کا کام شروع کردیا تھا اور اپنے بچوں کے ساتھ رہائش بھی اسی جگہ اختیار کرلی تھی۔

''وہ اپنے نانا سے ملنے لاس اینجلس گئے ہوئے ہیں۔ آؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔'' مائیکل نے جواب دیا تو ڈیوڈ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔

''آج تمہیں بڑے عرصے بعد ہماری یاد آئی، آنے سے پہلے فون یا ای میل کردیتے تو بچوں کو روک لیتا۔'' اندر بیٹھتے ہی مائیکل نے شکوہ کیا۔

''بس تم تو میری مصروفیت سے واقف ہی ہو۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ''اگر اپنے آفس سے ایک دن کی چھٹی کرلوں تو تین دن کی تنخواہ کٹ جاتی ہے۔ ویک اینڈ اپنے دوسرے کاموں کو نمٹاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اس وقت بھی میں تمہارے پاس بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔''

''اوکے تو پھر باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' مائیکل اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں پہلے تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرلوں، رات کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ فارم میں موجود کچن کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیوڈ پُرخیال نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اس ہیرے کے بارے میں کیا بتائے۔ وہ کسی دور میں ہیروں کی مارکیٹ میں ایک کامیاب بزنس مین کے طور پر پہچانا جاتا تھا اور چوری اور اسمگلنگ کا مال خریدنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا تاہم جب بازار میں کساد بازاری اور مندی آئی تو کافی نقصان اٹھانے کے بعد اس نے یہ ڈیری فارم بنالیا تھا اور ڈیوڈ کی معلومات کے مطابق اس کا یہ کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا۔ فارم کے اندر ہی اس کا تین کمروں اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل چھوٹا سا گھر موجود تھا جہاں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ ڈیوڈ نہیں جانتا تھا کہ اگر وہ مائیکل کو ساری حقیقت بتا دے تو اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ کیا وہ اب کسی غیر قانونی کام میں ڈیوڈ کی مدد کرنے پر تیار ہوگا اور پھر ڈیوڈ کے پاس اتنے قیمتی ہیرے کی موجودگی سے اس کا شک میں مبتلا ہونا بھی یقینی تھا۔ بہتر یہی تھا کہ جب تک ممکن ہو، وہ یہ بات مائیکل سے چھپا کر رکھے۔ اس نے مائیکل کو اس ہیرے کے بارے میں سنانے کے لیے ایک کہانی سوچ لی تھی۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اسے یہ فکر بھی کھائے جارہی تھی کہ پولیس اب تک اس کی تلاش میں سرگرم ہوچکی ہوگی۔ اگر لارڈ رچرڈ اپنا ذاتی اثر رسوخ استعمال کرتے تو یہ بات خارج از امکان نہیں تھی کہ اس خبر کو باقاعدہ میڈیا پر بھی نشر کردیا جاتا جس کے بعد اس کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا اور ممکن تھا کہ مائیکل کو بھی علم ہوجاتا۔ مائیکل نے اس کے لیے کھانا تیار کردیا تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی اور اس نے وقتی طور پر اپنے ذہن میں آنے والے تمام اندیشوں کو جھٹک دیا۔

وہ کھانے سے فارغ ہوا تو مائیکل نے اس کے سامنے موجود ٹیبل پر کافی رکھتے ہوئے سوال کیا کہ وہ کون سا ضروری کام ہے جس کے متعلق وہ بات کررہا تھا۔

''بات دراصل یہ ہے......'' ڈیوڈ نے اپنے ذہن میں پننے والی فرضی کہانی کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''میرے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کرتا ہوں جو نکہ کافی

عرصے سے تم سے اور تمہارے بچوں سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی اس لیے میں نے اپنی کمپنی میں چند دنوں کی چھٹی حاصل کرنے کے لیے درخواست دی تھی جس پر کمپنی کے باس نے مجھے طلب کرلیا۔ اس نے مجھ سے چھٹیوں کے متعلق استفسار کیا تو میں نے سچ سچ بتا دیا۔ باتوں باتوں میں تمہارا ذکر بھی ہوا۔ میں نے باس کو بتایا کہ تم کسی دور میں ہیروں کے بزنس سے منسلک رہے ہو جس پر باس نے میری درخواست تو منظور کر ہی لی، ساتھ ساتھ مجھے ایک ذمے داری بھی سونپ دی۔ دراصل باس کو اس کی بیوی نے ایک ہیرا تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہے مگر باس کو شک ہے کہ اس کی بیوی نے اس سے...... جھوٹ بولا ہے۔ تمہارے بارے میں جاننے کے بعد اس نے وہ ہیرا مجھے دیا ہے اور کہا ہے کہ میں تم سے اس کی مارکیٹ ویلیو معلوم کروں۔ وہ بہت مصروف آدمی ہے اس لیے خود وقت نہیں نکال پاتا۔'' بولتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی اپنی کہانی میں جھول محسوس ہو رہا تھا۔

''حیرت ہے۔'' مائیکل متعجب لہجے میں بولا۔ ''تمہارا باس تم پر اس قدر اعتماد کرتا ہے کہ اس نے ایک بیش قیمت ہیرا تمہارے حوالے کر دیا۔''

ڈیوڈ کو اس کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کی پرچھائیاں صاف نظر آئی تھیں۔ وہ مائیکل کی شقی القلب طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا مگر فوری طور پر وہ اس سے بہتر کہانی سنانے سے قاصر تھا۔

''تم ان باتوں کو چھوڑو، بس اس ہیرے کی قیمت کا اندازہ لگاؤ۔'' اس نے اپنی جیب سے ڈبیا نکال کر اسے مائیکل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ آج تمہاری مہارت کا امتحان ہے۔''

مائیکل نے ڈبیا لے کر اس میں سے ہیرا نکالا اور پھر اس کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ڈیوڈ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں معلوم ہونے والا تھا کہ لارڈ کے گھر سے چوری یا ڈکیتی کا جو جوا کھیلا تھا، اس میں اسے کتنا منافع ہوا تھا۔ اسی لمحے مائیکل نے ہیرا اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''آئی ایم سوری ڈیوڈ! اپنے باس کو کہہ دینا کہ اس کی بیوی نے واقعی اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اس ہیرے کی مارکیٹ زیادہ سے زیادہ دو ہزار ڈالرز کے لگ بھگ ہے۔''

ڈیوڈ کو اس کی آواز بڑی دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''نہیں...... نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ پُریقین لہجے میں بولا۔ ''میں باس کی بیوی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اتنے پیسوں کے تو جوتے خرید لیتی ہے۔ اپنے شوہر کو وہ اتنا سستا تحفہ ہرگز نہیں دے سکتی۔ لگتا ہے تم نے ہیرے کو سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد فوراً ہی اپنی رائے دے دی ہے۔''

اس کا اعتراض سن کر مائیکل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں نے اس کاروبار میں ایک عمر گزاری ہے مگر پھر بھی حرفِ آخر کا دعوے دار نہیں ہوں۔ ویسے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری رائے غلط نہیں ہے لیکن دوبارہ تسلی کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ڈیوڈ کے چہرے پر اب ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مائیکل اس کے ساتھ غلط بیانی نہیں کر سکتا تو کیا...... لارڈ چرڈ نے اس دن غلط بیانی یا مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا؟ کیا وہ بھی اندر سے ایک جھوٹا یا شیخی باز انسان ہے، جس نے دنیا کو دکھانے کے لیے ایمانداری اور سچائی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا؟ ڈیوڈ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اس نے لارڈ کی تجوری کو اچھی طرح سے چیک کیا تھا، وہاں اس ہیرے کے سوا کوئی دوسری قیمتی چیز موجود نہیں تھی۔

اسی لمحے مائیکل ہاتھ میں ایک خوردبین نما عدسہ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے ڈیوڈ سے ہیرا لے کر اس بار بڑی باریک بینی سے اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے اسے دوبارہ ڈیوڈ کی طرف بڑھا دیا۔ ''اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس ہیرے کی قیمت کا بالکل درست تعین کیا ہے۔ یہ ڈائمنڈ کی سب سے ہلکی اقسام سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شفافیت بھی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ ہیروں کی دنیا میں شفافیت سے ہی ہیرے کی اصل قیمت کا تعین کیا جاتا ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آرہی۔'' مائیکل نے ڈیوڈ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس بات سے تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ تمہیں اس سے کیا غرض کہ یہ مہنگا ہے یا بے قیمت ہے؟ تمہارا کام تو بس اتنا ہی تھا کہ تم اس بارے میں اپنے باس کو حقیقت سے مطلع کر دو۔''

''اوہ، نہیں...... میں پریشان نہیں ہوں۔'' ڈیوڈ نے جبراً مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ ''اصل میں یہ سفر کی تھکان ہے جو میرے چہرے سے پریشانی کی صورت عیاں ہو رہی ہے۔''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''تو پھر تم آرام کرو۔'' مائیکل نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے سونے کے لیے بستر لگا دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ڈیوڈ نے ہیرا ڈبیا میں رکھا اور پھر اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے سارے خواب لمحوں میں بکھر گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ لارڈ نے ہوش میں آتے ہی پولیس میں رپورٹ درج کروادی ہوگی۔ اس لیے وہ جتنی جلدی امریکا چھوڑ دیتا اتنا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ اس نے سوچا کہ اگلے دن ہی میکسیکو میں داخلے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ وہاں جاکر شاید اسے اپنی زندگی بنانے کے لیے نئے سرے سے جدوجہد کرنا پڑتی۔ امریکا کی نسبت وہاں زندگی زیادہ مشکل اور کٹھن ثابت ہوسکتی تھی مگر وہاں جاکر کم ازکم وہ امریکی پولیس سے تو بچ سکتا تھا۔ اگرچہ امریکا اور میکسیکو کے درمیان مجرموں کو پکڑنے کا معاہدہ موجود تھا مگر ڈیوڈ جانتا تھا کہ اس پر شاذونادر ہی عمل ہوتا تھا۔ میکسیکو جرائم پیشہ افراد کے لیے کسی ارضی جنت سے کم نہ تھا مگر ڈیوڈ جیسے لوگوں کے لیے شاید وہ جگہ مناسب نہ تھی اس لیے برسوں پہلے اس نے امریکا آکر یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی۔ اگرچہ امریکی شہریت حاصل کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا مگر اس سلسلے میں اس کے بھائی مائیکل نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ وہ ڈیوڈ سے بہت پہلے یہاں آکر آباد ہوچکا تھا۔ اس کی بیوی بھی ایک امریکی تھی۔

بہرحال ڈیوڈ کو ایک بار پھر اپنے آبائی وطن لوٹنا پڑ رہا تھا۔ مجبوری کے تحت ہی سہی مگر جیل جانے سے تو بہتر تھا۔ مائیکل نے اسے ہیرے کی قیمت کے بارے میں بتا دیا تھا مگر وہ خود بھی ذاتی طور پر تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے دن شہر روانہ ہوگا اور میکسیکو جانے سے پہلے ایک دفعہ اس ہیرے کو کسی ماہر سے چیک کروائے گا۔ اس بات کو خارج ازامکان قرار نہیں دیا جاسکتا تھا کہ مائیکل کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اب اپنی گاڑی کے ساتھ شہری علاقے میں داخلہ خطرناک بھی ہوسکتا تھا اور اگر وہ اپنی گاڑی وہیں چھوڑتا تو مائیکل کا اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہونا ایک یقینی امر تھا۔

اس نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر اسی گاڑی پر شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہیرے کو چیک کروانے کے بعد وہ اسے کسی پارکنگ ایریا میں چھوڑ کر اپنا باقی سفر ٹیکسی کے ذریعے بھی طے کرسکتا تھا جو اسے سرحدی علاقے تک پہنچا دیتی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ کچھ عرصہ سرحد پار کرنے کے بعد آرام سے رہ سکے کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ اسے فوری طور پر کوئی کام مل جاتا۔

اس کے پاس نقدی کی شکل میں تقریباً پانچ سو ڈالرز تھے۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ اس نے لارڈ کی تجوری میں رقم نہ دیکھ کر فوری طور پر ہیرا اٹھا کر نکلنے کی جلدی کی تھی۔ اگر وہ لارڈ کی جیب سے اس کا بٹوا برآمد کرلیتا تو شاید چند ہزار ڈالرز مزید ہاتھ آسکتے تھے مگر اس نے چابی برآمد ہوتے ہی تجوری کا رخ کرلیا۔ بہرحال گزرا ہوا وقت واپس تو نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس کا فوری طور پر ہیرا فروخت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اگر وہ ایسا کر بھی دیتا تو زیادہ سے زیادہ دو ہزار ڈالرز حاصل ہوسکتے تھے۔

اس کے علاوہ اس کی گاڑی میں ایک لیپ ٹاپ بھی موجود تھا جسے بیچ کر چھ سات سو ڈالرز حاصل کیے جاسکتے تھے۔ گاڑی فوری طور پر فروخت کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے اس سے جلد ازجلد نجات حاصل کرنا ہی بہتر تھا۔

وہ سونے کے لیے مائیکل کے لگائے گئے بستر پر دراز ہوا تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ لارڈ رچرڈ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اوپر سے سچا اور کھرا نظر آنے والا وہ خاندانی لارڈ، اندر سے اپنی شہرت کے برعکس ثابت ہوا تھا۔ دکھاوے اور دولت کے زعم میں مبتلا ایک شیخی باز اور فریبی شخص...... اگر وہ اپنے ملازم سے لاکھوں ڈالرز کی بات نہ کرتا تو ڈیوڈ بھی اس جرم کا ارتکاب نہ کرتا۔ اسے لگنے لگا جیسے سارا قصور لارڈ رچرڈ کا ہی ہے جس کی وجہ سے وہ دربدر ہونے پر مجبور ہوا تھا۔ اسے اس بات کا بھی ادراک ہوچکا تھا کہ لارڈ رچرڈ نے اس وقت لاکھوں ڈالرز کی جو بات کی تھی، وہ ڈیوڈ کے سامنے محض اپنی امارت کا اظہار کرنے کا دکھاوا تھا۔

اس جھوٹے لارڈ کی وجہ سے اس کی نوکری بھی گئی تھی اور اب اسے امریکا کو بھی خیرباد کہنا پڑ گیا تھا۔

اگلی صبح اس نے ناشتا کرنے کے بعد مائیکل کو اپنی واپسی کا عندیہ دیا تو وہ حیرت سے بولا۔

''مگر تم تو کچھ دن رہنے کے لیے آئے تھے پھر یوں اچانک واپسی کی کیا وجہ ہے؟ میں تو تمہاری خاطر بچوں کو بھی واپس بلانے کا سوچ رہا تھا۔''

''دراصل رات کو میرے موبائل پر باس کی کال آئی تھی۔'' ڈیوڈ نے جواب دیتے ہوئے ایک اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''ایک ضروری کام آن پڑا ہے اسی لیے مجھے یوں اچانک جانا پڑ رہا ہے۔ اگلی دفعہ آؤں گا تو پھر تمہارے بچوں کے ساتھ ہم کسی تفریحی مقام پر سیر کے لیے چلیں گے۔'' حقیقت تو یہ تھی کہ ڈیوڈ نے اپنا موبائل فون اپنے

فلیٹ میں ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ موبائل کی وجہ سے پولیس اسے ٹریس کر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ اب میں زبردستی تو تمہیں روکنے سے رہا۔“ مائیکل نے کندھے اچکا کر کہا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے ڈیوڈ کی وضاحت نے مطمئن نہیں کیا تاہم اس نے ڈیوڈ سے مزید کوئی تعرض نہ کیا۔

چند منٹ بعد ہی ڈیوڈ، مائیکل سے بغل گیر ہوتے ہوئے اپنی گاڑی پر شہری علاقے کی جانب روانہ ہو گیا چونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے مطلع صاف ہونے کی وجہ سے وہ خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے شہر کی ایک بڑی جیولری مارکیٹ تک پہنچنے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا۔ ابھی وہ اپنی گاڑی پارکنگ ایریا میں داخل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے عقبی آئینے میں پولیس کی ایک گاڑی اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے دل کی دھڑکن یکلخت تیز ہو گئی اور سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ چند ثانیوں کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے مگر شاید اسے غلط فہمی ہوئی تھی۔ پولیس کار لمحہ بھر کے لیے اس کی کار کے برابر آئی اور پھر اسی رفتار سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اپنی کار پارکنگ ایریا میں داخل کر دی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک جیولری مارکیٹ میں گھومتا رہا۔ اس دوران اس نے مختلف جیولرز کو ہیرا دکھا کر اپنی پوری تسلی کر لی۔ اس کے بھائی مائیکل نے اس کے ساتھ غلط بیانی نہیں کی تھی۔ یہ ہیرا واقعی میں دو ہزار ڈالرز سے زیادہ کا نہ تھا۔ وہ مایوس ہو کر مارکیٹ سے باہر نکل آیا۔ ایک جرم کے ارتکاب کے بعد بھی اس کے ہاتھ کیا آیا تھا؟ وہ اپنی زندگی سہل بنانا چاہتا تھا مگر شاید آنے والے دن اس کے لیے مزید کٹھن ثابت ہونے والے تھے۔ اس ہیرے سے زیادہ مالیت کی تو اس کی گاڑی تھی اور میکسیکو جانے کے لیے اسے اپنی اس کھٹارا کار سے بھی ہاتھ دھونے پڑ گئے تھے۔ ایک لحاظ سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہی ہوا تھا۔

کار میں بیٹھتے ہی اس پر مایوسی کا شدید دورہ پڑا۔ اسے اب خیال آرہا تھا کہ اس کی زندگی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ اس کی جاب اگرچہ اس کے معیار کے مطابق نہیں تھی لیکن کمپنی کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ جلد ہی اس کی ترقی کر دی جائے گی۔ وہ لالچ میں آکر اپنا مستقبل اور حال دونوں تباہ کر بیٹھا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس منحوس ہیرے کو کہیں دور پھینک دے جس کی وجہ سے اس نے یہ سارا بکھیڑا پالا تھا۔ اس پر آہستہ آہستہ ایک ہیجانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کے دل میں لارڈ رچرڈ کے لیے نفرت کا ایک لاوا سا کھول رہا تھا۔ وہ اب اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور پھر اسے گود میں رکھ کر ساری احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے انٹرنیٹ سے لنک ہو گیا۔

اس نے لارڈ رچرڈ کے نام ایک ای میل ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

”لارڈ رچرڈ! تم ایک جھوٹے اور مکار شخص ہو۔ اپنے قبیل کے دوسرے لارڈز کی طرح تم نے بھی اپنے اوپر سچائی اور شرافت کا جھوٹا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے گھر سے ہیرا چرا کر تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے مگر حقیقت میں مجھ میں اور تمہاری شخصیت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ میں ایک چور ہوں جبکہ تم ایک جھوٹے، فریبی اور شیخی باز انسان ہو اور اپنی دولت کے بارے میں مبالغہ آرائی کر کے دوسروں کو خود سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم نے اپنے ملازم سے میرے سامنے لاکھوں ڈالرز کی بات محض مجھے مرعوب کرنے کے لیے کی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہاری اسی بات نے مجھے جرم کرنے پر اکسایا اور آج میں پولیس سے بھاگتا پھر رہا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم مجھ سے بڑے مجرم ہو۔“

ڈیوڈ نے ای میل لارڈ کو سینڈ کی تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ شاید ایسا کرنے سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بعد اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بہتر ہے وہ ہیرا فروخت کر دے اور اس کے ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ کو بھی۔ گاڑی کا مزید استعمال خطرے سے خالی نہیں تھا اگرچہ وہ جائے واردات سے خاصا دور تھا مگر وہ جانتا تھا کہ آج کے جدید دور میں ان فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ گاڑی کو اسی پارکنگ میں چھوڑ دے اور پھر ہیرا اور لیپ ٹاپ فروخت کر کے میکسیکو کی سرحد کی طرف باقی کا سفر ٹیکسی پر طے کرے۔ اس کی گاڑی کی ڈکی میں اس کے کپڑے وغیرہ موجود تھے۔ فیصلہ ہوتے ہی اس نے جیسے ہی لیپ ٹاپ کو بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، وہ بے اختیار چونک پڑا۔ اسے لارڈ رچرڈ کی طرف سے جوابی ای میل موصول ہوئی تھی۔ شاید اتفاق سے وہ بھی آن لائن تھے۔ ڈیوڈ نے میل اوپن کی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

”میرے محترم دوست ڈیوڈ! سب سے پہلے میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس سے مجھے دلی طور پر افسوس ہوا ہے۔ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لالچ انسان کے ہوش وحواس چھین لیتی ہے۔ تم نے مجھے جھوٹا اور مکار شخص قرار دیا۔ میں اس بارے میں تمہیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں جذبات میں آکر بھی ادب واحترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تم نے لکھا میں نے اس دن اپنے ملازم کے سامنے لاکھوں ڈالرز کی جو بات کی تھی وہ جھوٹ پر مبنی ہے...... ہرگز نہیں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ حیرت ہے تم نے میرے بارے میں اس طرح سوچا۔ تمہاری باتوں سے مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ میں تمہیں جواب دینے یا وضاحت کرنے کا پابند تو نہیں ہوں مگر کیونکہ تم نے میری سچائی اور ایمانداری پر انگلی اٹھائی ہے اس لیے وضاحت کر رہا ہوں۔

”اصل میں تم اپنی غلط فہمی یا کم عقلی کی وجہ سے مار کھا گئے۔ تم اس دن ہیرا تو لے اڑے مگر تم نہیں جانتے کہ جس پتھر کو تم حقیر اور معمولی سمجھ کر تجوری میں چھوڑ گئے تھے، اس کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں ہے۔ میری توجیح یقیناً تمہارے لیے ناقابلِ قبول ہوگی۔ ایک معمولی پتھر بھلا لاکھوں ڈالرز کا کیسے ہوسکتا ہے؟ بالکل ہوسکتا ہے مگر یہ بات کوئی ماہر فلکیات یا ارضیات ہی جان سکتا ہے۔ تم نے زمین پر گرنے والے شہاب ثاقب کے ٹکڑوں کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرتا چلوں، ان کی قیمت حقیقتاً لاکھوں ڈالرز میں ہوتی ہے کیونکہ کسی دوسری ارض سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ انتہائی نایاب ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے علم میں ہو تو دنیا کی سب سے مہنگی گھڑیوں میں ان پتھروں کے انتہائی چھوٹے ٹکڑوں کو بطور تزئین وآرائش استعمال کیا جاتا ہے۔ ویسے تمہارے لیے یہ بیکار ہی تھا کیونکہ عام مارکیٹ میں اس کی خرید وفروخت نہیں ہوتی۔

میری تجوری میں موجود پتھر میرے والد نے آج سے پندرہ سال پہلے خریدا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ کافی عرصے تک ہمارے آبائی گھر میں موجود رہا اور پھر میں نے اسے حفاظتی نقطۂ نظر کے تحت وہاں سے منگوالیا تاکہ اسے بینک لاکر میں محفوظ کیا جاسکے۔ امید ہے تم میری بات کچھ نہ کچھ سمجھ گئے ہوگے۔ میرے مرحوم والد نے میری تربیت ہی ایسی کی ہے کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ جس سے مجھے نفرت ہو، وہ میں بول کیسے سکتا ہوں۔ رہ گئی تمہارے پولیس سے بھاگتے پھرنے کی بات تو ایسا تمہارے ذہن پر چھائے ہوئے خوف کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم مجھے ایک سچے انسان کے طور پر قبول کرلو تو میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ پولیس سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے تمہارے خلاف پولیس میں شکایت ہی درج نہیں کرائی حالانکہ میرا خاندانی ملازم پولیس کو اطلاع کرنے کے بارے میں بضد تھا۔ ہم دونوں کو چھ سے سات گھنٹوں بعد ہوش آگیا تھا۔ شاید تم نے ہم پر کلوروفارم استعمال کیا تھا بہرحال اب ہم خیریت سے ہیں۔ تم میرے اصولوں سے بخوبی واقف ہو اس لیے امید کرتا ہوں کہ دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کروگے۔ اپنے فلیٹ پر واپس جاؤ اور نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو۔ مقاصد کے حصول کے لیے محنت اور ایمانداری کا راستہ اپناؤ، شارٹ کٹ بعض اوقات انسان کی زندگی کا شارٹ کٹ بھی ثابت ہوجاتا ہے۔ وہ ہیرا میری اور اپنی دوستی کی یادگار کے طور پر تحفتاً رکھ لو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی خواہشات کے اسیر کبھی مت بننا۔ تمہارا خیر خواہ لارڈ رچرڈ!“

ڈیوڈ میل پڑھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت شرمندگی، افسردگی اور حیرت کے تاثرات امڈ آئے۔ وہ پتھر اس قدر قیمتی ہوگا یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ آخر ایک معمولی پتھر کو تجوری میں اس قدر سنبھال کر کیوں رکھا گیا ہے؟ وہ شہاب ثاقب کے ٹکڑوں کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہ رکھتا تھا مگر اخبارات وغیرہ میں اس کے بارے میں کئی مضامین اس کی نظروں سے گزر چکے تھے۔ کسی دوسری ارض سے آئے ہوئے یہ نایاب پتھر واقعی انتہائی بیش قیمت تھے۔ ڈیوڈ کو ادراک ہو رہا تھا کہ اسے لارڈ کے الفاظ کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی تھی ورنہ اس نے لارڈ کے ساتھ دو سال کا عرصہ گزارا تھا اور بہ ذات خود بھی اس کی سچائی کا قائل تھا۔ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد اس نے خود ہی لارڈ کے متعلق اپنے ذہن میں ایک نظریہ قائم کرلیا تھا اور انہیں جھوٹا اور فریبی قرار دے دیا تھا مگر اب سب کچھ واضح ہوچکا تھا۔ وہ صرف ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوکر لارڈ کے لیے ایسا سوچ رہا تھا۔ اس سچے اور کھرے انسان نے اس کے خلاف پولیس کو مطلع نہ کرکے اس کی برائی کا جواب اچھائی سے دیا تھا۔ اسے یقین آچکا تھا کہ لارڈ نے اس بار بھی سچ ہی بولا ہے۔ گویا اب اسے پولیس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ لارڈ نے اسے واپسی کا جو موقع دیا تھا، وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔



بہ ظاہر

منظر امام

آنکھوں دیکھا یا کانوں سنا بعض اوقات محض ایک جھوٹا قصہ ثابت ہوتا ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناقابلِ یقین واقعات جو شاید کسی کے قیاس میں بھی بہ مشکل آئیں مگر وقت ان کی سچائی کی گواہی دیتا ہے۔ جیسا کہ یہ واقعہ اور اس کا ثبوت خود اس کی اپنی ذات تھی۔

محبت کی ایک انوکھی روداد جس کا انجام ہر آنکھ کو اشکبار کر گیا

وہ بہت مختلف قسم کی خاتون تھیں۔ نوجوان سی، نازک، خوبصورت۔ ہم سب ان سے پیار کیا کرتے تھے۔ وہ ہماری لٹریچر کی ٹیچر تھیں۔ اردو ادب پڑھاتی تھیں۔ بولنے کا انداز بھی بہت دلنشین تھا۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ پڑھاتے وقت صرف نصاب تک نہیں رہتی تھیں بلکہ دنیا بھر کے واقعات بھی سنایا کرتیں جن سے ان کے لیکچر میں جان پڑ جاتی تھی۔ جویریہ نام تھا ان کا۔

ایک دن وہ کہانیوں کی تاریخ بتا رہی تھیں کہ کہانیاں

کہاں سے شروع ہوئیں۔ ہم سب بہت دھیان سے سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"کہانیوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ انسان اپنے وہ واقعات بتایا کرتا تھا جو دن بھر اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ شام کے وقت سب ایک جگہ جمع ہو جاتے پھر واقعات بیان کیے جاتے۔ اس زمانے میں فینٹیسی نہیں ہوا کرتی تھی۔ بس جو کچھ سامنے ہوتا وہ بتا دیا جاتا پھر آہستہ آہستہ اس میں زیب داستان کے لیے کچھ بڑھاتے چلے گئے اور داستانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان داستانوں میں جن بھوت اور پریاں ہوا کرتیں۔ اس کے بعد ایسی کہانیوں کا دور آیا جب زندگی سے واقعات لیے جانے لگے۔ سیدھی سادی کہانیاں۔ سیدھے سادے انداز میں بیان کردی جاتیں۔ باہر تو اس کی روایت بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ اردو میں منشی پریم چند نے ایسی کہانیاں شروع کیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔"

اس وقت میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ "میڈم! مجھے بھی کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ میں نے دو چار کہانیاں لکھی بھی ہیں۔"

"واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم مجھے اپنی کہانیاں دکھانا۔"

"ضرور میڈم! میں کل ہی لیتی آؤں گی۔" میں نے کہا۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ جویریہ جیسی میڈم نے میری کہانیوں کو دیکھنے کی بات کی تھی۔ وہ جو بھی مشورہ دیتیں وہ میرے لیے سب سے بہتر ہوتا۔ کہانیاں لکھنے کا شوق مجھے میرے نانا سے ملا تھا۔ وہ ایک مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کی دو کتابیں آچکی تھیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا بات تھی۔ میں ان ہی سے مشورے لیا کرتی۔ میں خود بھی سوچ رہی تھی کہ کوئی مجھے اصلاح دینے والا مل جائے۔ اب یہ میڈم جویریہ مل گئی تھیں۔

دوسرے دن میں نے اپنی ڈائری اٹھائی اور کالج پہنچ گئی۔ انتظار کرتی رہی کہ پیریڈ ختم ہو اور میڈم اسٹاف روم میں پہنچ جائیں پھر میں ان کو اپنی کہانیاں دکھاؤں۔ بہر حال پیریڈ ختم ہوا اور میں اسٹاف روم میں پہنچ گئی۔ میڈم نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ میں نے ڈائری ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ ڈائری کا مطالعہ کرنے لگیں۔ میں سامنے بیٹھ کر ان کے تاثرات دیکھتی رہی۔ بہت دیر بعد انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "شبانہ! تم کہانیاں لکھ سکتی ہو۔ تم میں صلاحیت تو ہے۔ تحریر میں روانی بھی ہے لیکن تمہاری زیادہ تر کہانیاں فینٹیسی ہیں۔ یعنی تصوراتی، خیالی...... ماحول داستانوں والا ہے۔ جبکہ ہمارا لٹریچر بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب زندگی تمہارے آس پاس ہے۔ تم ان سے کہانیاں حاصل کر سکتی ہو۔"

"جی میڈم! میں کوشش کروں گی۔"

"تم اپنے آس پاس گھومتے کرداروں کو دیکھو۔ ہر قسم کے لوگ ملیں گے۔ مظلوم، ظالم، بے بس، مفلس...... ہر آدمی اپنے ساتھ ایک کہانی لیے گھوم رہا ہے۔ تم ان کی کہانیاں لکھو۔ ان کو اپنے سامنے رکھو۔ جس حد تک زندگی کے پاس جا سکتی ہو، چلی جاؤ۔"

"کردار نہیں ملتے میڈم!" میں نے کہا۔

"مل جائیں گے۔ خود مجھے ایک کہانی یاد ہے۔ اگر کہو تو وہ سنا دوں۔ اس کو لکھ لینا۔ دیکھتی ہوں، کیسی کہانی لکھتی ہو۔"

"ضرور سنائیں میڈم!" میں خوش ہو گئی تھی کہ شاید کوئی اچھی کہانی ملنے والی تھی۔

میڈم کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دو بار ابو کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے سے گزر چکی تھی۔ اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے میڈم کے پورے حالات بھی نہیں معلوم تھے یعنی ان کی شادی ہوئی تھی یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس دن میں نے میڈم سے کہا کہ اگر وہ کل فری ہوں تو میں ان کے پاس آجاؤں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ میں نے ابو سے کہا اور انہوں نے مجھے میڈم کے گھر پہنچا دیا۔

میڈم گھر پر ہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ "بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں میڈم!" میں نے انکار کیا۔ "میں چائے نہیں پیتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو پیتی ہوں نا۔" وہ مسکرادیں۔

"تو پھر مجھ سے کہیں میڈم۔ میں بنا دیتی ہوں۔"

"نہیں بھائی۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ جو خود چائے نہیں پیتا، وہ بہت بری چائے بناتا ہے۔"

میں ہنس پڑی۔ میڈم کچن کی طرف چلی گئیں۔ میں پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔ ڈرائنگ روم بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں جو ان کے ادبی ذوق کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر میں چائے بنا کر

لے آئیں۔

وہ اپنے لیے چائے اور میرے لیے جوس لے کر آئی تھیں۔ ''لو جوس پی لو۔''

جوس پینے کے دوران میں نے ان سے پوچھا۔

''میڈم! کیا آپ اکیلی رہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ......''

''میں سمجھ گئی۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ ہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ میں نے شادی نہیں کی۔ اس کے علاوہ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماں کا تو بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ میری پرورش ابو نے کی تھی۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ بس پھر کون تھا جو میری طرف دھیان دیتا کہ اس کی شادی ہوئی یا نہیں۔ یہ گھر ابو نے اپنی زندگی میں خرید کر مجھے دے دیا تھا۔ اسی لیے اس طرف سے بے فکری ہے۔''

''افسوس ہوا یہ سن کر۔'' میں نے کہا۔

''کس بات کا افسوس؟''

''یہی کہ آپ بالکل اکیلی ہیں۔''

وہ ہنس پڑیں۔ ''کمال ہے۔ تم کو افسوس ہو رہا ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کو تو اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ اب میرا کوئی نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہ اتنا بڑا گھر میرے پاس کیوں ہے۔ ان کے خیال میں مجھے بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ یہ ان کے لیے بہت بری بات ہے۔''

''میں سمجھ گئی میڈم۔''

''میں نے اس لیے کہا تھا کہ زندگی کے حقائق بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ زندگی کی کہانیاں بہت پُر اثر ہوتی ہیں۔ ایک کہانی مجھے بھی یاد ہے۔ میں نے وہی سنانے کی بات کی تھی۔''

''یس میڈم! میں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کہانی دو محبت کرنے والوں کی ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔ ایک دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے۔ ان کی شادی بھی محبت کی تھی۔ اس قسم کے حالات میں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے بھی کیا لیکن ایک دوسرے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شوہر کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ لڑکی کے گھر والوں کو یہ پسند نہیں تھا کیونکہ وہ خود پیسے والے لوگ تھے۔''

''میڈم! یہ سب تو بہت عام سی بات ہے۔ یعنی ہمارے معاشرے میں اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔''

''ہاں۔ یاد رکھو کہ دنیا کی ہر کہانی کے کچھ پہلو مختلف بھی ہوا کرتے ہیں۔ نفرت، محبت، انتقام، ایثار، قربانی وغیرہ۔ کہانیاں ان ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ کہانی بھی محبت سے شروع ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی محبت اور پھر قربانی، ایثار۔ ہاں تو میں یہ بتا رہی تھی کہ اس راہ میں انہیں بہت دشواریاں ہوئیں لیکن وہ ایک دوسرے سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اصل کہانی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ قسمت نے لڑکے کا ساتھ دیا اور وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ دونوں کے ستارے ایک دوسرے کو راس آ گئے تھے۔''

''میڈم! مجھے اجازت دیں کہ میں بس یہیں تک کی کہانی لکھوں۔'' میں نے کہا۔

''اے دل''

دل کے متعلق ڈاکٹر حضرات کا نظریہ اپنی جگہ پر ہے...... جس سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کتابیں پڑھ کر اور تجربات کر کے ڈاکٹری کی ڈگری لی ہوئی ہے لیکن جسم کو خون پہنچانے کے علاوہ بھی دل کے اور بہت سے کام یار لوگوں نے نکال لیے ہیں۔ یہ کسی پر آ بھی جاتا ہے۔ چاہے کسی گدھی پہ آ جائے...... اگر آپ کا دل چوری ہو جائے تو آپ کو صبر شکر کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کی چوری کی رپورٹ کسی تھانے میں قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ نہ یہ قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ ظاہر ہے اس چوری پر قانون کی دفعات معذرت خواہ ہیں۔ ویسے شاید یہ واحد چیز ہے جسے اگر کسی کو دے بھی دیا جائے تو یہ اپنا کام، اپنی ہی جگہ پر کرتا رہتا ہے۔ ہے نا حیرانگی کی بات...... لیکن قارئین صرف اس پر ہی حیران نہ ہوں۔ یہ جب ٹوٹ جاتا ہے تو بھی اپنا کام خوش اسلوبی اور تندہی سے کرتا رہتا ہے۔ شاعر اسے چیرنے کی بات کرتے ہیں تو خون کا فقط ایک قطرہ نکلتے ہیں۔ ہے نا اچنبھے کی بات۔ جتنا خون ایک دن میں دل رگوں میں بھیجتا ہے۔ اس کا حساب کتاب جان کر مت گم ہو جاتی ہے۔ اس میں کسی کو رکھا بھی جا سکتا ہے اور جب جی چاہے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ اسے کانچ کا گھر بھی کہا جاتا ہے جو بے وفائی کی ایک ٹھوکر سے چکنا چور ہو جاتا ہے اور اس کی ایک کرچی ڈھونڈنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل کام ہے اور میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔ ڈر ہے کہیں آپ کا دل بھر نہ جائے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"کیوں؟" میڈم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ کہانی تو ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔"

"یس میڈم! میں جانتی ہوں کہ کہانی ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ نے بتادیا ہے کہ شادی کے بعد حالات بدلنے لگے تھے۔ اب آگے مجھے سوچنے دیں کہ اس کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ میں اپنے تصور کی مدد سے اس کہانی کو مکمل کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم اپنے تصور سے کام لینا چاہتی ہو۔" میڈم نے کہا۔ "لیکن کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم جو انجام سوچو گی، اس کہانی کا وہی انجام ہو۔"

"یس میڈم! یہ کوئی ضروری نہیں ہے لیکن میں تین چار قسم کے امکانات لکھوں گی۔ ان میں سے کوئی ایک تو ہوگا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میڈم مسکرادیں۔ "یہ سمجھ لو کہ یہ تمہارے لیے ایک چیلنج ہے۔"

میں نے کہہ تو دیا تھا لیکن یہ واقعی چیلنج تھا۔ نہ جانے اس کہانی کا انجام کیا ہوا ہو اور میں کیا لکھ کر لے جاؤں.... بہرحال میں نے دو تین انجام سوچ لیے۔ کہانی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ خوب پیسے والے ہوتے چلے گئے اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ لڑکی کے والدین نے دونوں کو قبول کرلیا۔ کیونکہ اب وہ شخص بھی ان کا ہم پلہ ہوگیا تھا۔ دونوں خوش خوش زندگی گزارنے لگے۔ یہ ایک انجام تھا اور دوسرا انجام یہ تھا کہ بیوی کی موت ہوجاتی ہے اور شوہر صدمے سے پاگل ہوجاتا ہے۔ یہ بالکل فلموں والا انجام تھا۔ لیکن یہ بس ایک امکان ہی تھا اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ پیسا آنے کے بعد مرد اپنی بیوی سے بے وفائی کرجاتا ہے۔ وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ بس اس کہانی کے یہی دو چار انجام ہوسکتے تھے۔

میں سب لکھ کر میڈم کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے سب پڑھا پھر بولیں۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اچھا لکھا ہے۔ لیکن اس کہانی کا انجام ان سب سے مختلف ہے۔"

"پتا نہیں میڈم! میں نے تو اپنی سی کوشش کی ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں اس کہانی کا اصل انجام بتاتی ہوں۔"

میں ان کے سامنے جم کر بیٹھ گئی۔ میڈم نے کہانی سنانی شروع کردی۔

"میں یہ بتا چکی ہوں کہ دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔ اس محبت نے مرد کو حوصلہ دیا، ہمت دی اور وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ یہاں تک ہوگیا کہ وہ ایک فرم کا مالک بن گیا اور ایک دن اچانک بیوی بیمار پڑ گئی۔ معمولی سی بات تھی۔ اس کے پیٹ میں درد تھا۔ ہاں...... ایک بات میں بھول گئی۔ ان کے یہاں ایک بچی کی بھی پیدائش ہوچکی تھی۔ وہ بچی ایک سال کی تھی جب بیوی بیمار ہوئی۔ شوہر اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں دیں۔ اس قسم کے درد ہو ہی جاتے ہیں۔ مختلف وجوہات ہوتی ہیں لیکن اس کے پیٹ کا درد ٹھیک ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ کہتے ہیں نا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ شوہر بے چارہ بہت پریشان تھا کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ عزت بھی کرتا تھا اس کی کیونکہ وہ عورت اپنے امیر گھرانے کو چھوڑ کر اس کی بنی تھی۔"

"میڈم! میں پھر بھی کہوں گی کہ اس قسم کی ہزاروں کہانیاں ہوا کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اب میں تمہیں ایک بات بتادوں۔"

"یس میڈم!"

"وہ بات یہ ہے کہ اگر تم میں سننے کا حوصلہ نہیں ہے تو پھر تم اچھا لکھ بھی نہیں سکتیں۔ ہوتا یہ ہے کہ رائٹر کے لیے دو تین چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا مشاہدہ اچھا ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں سننے کا حوصلہ ہو۔ وہ بہت اچھا سامع ہو۔ عام لوگوں کے درمیان پھرتے ہوئے نہ جانے کب وہ کوئی ایسی نئی بات سن لے جو اس کی کہانی کا مواد بن سکے۔"

"یس میڈم، سوری۔" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ ابھی تمہیں زندگی کا تجربہ نہیں ہے نا، اسی لیے۔ خیر، تو پھر یہ ہوا کہ بیوی کا مرض بڑھتا چلا گیا۔ ایک ماہر کو دکھایا گیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ان کو ملک سے باہر کسی پُر فضا مقام پر لے جائیں۔ ایک دو مہینوں میں آب و ہوا بدلے گی تو ان کی صحت پر اچھا اثر ہوگا۔ اگر یہ مشورہ پہلے آتا تو سوائے بے بسی کے اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اب ان کے پاس پیسا تھا۔ وہ یورپ کے دورے پر جاسکتے تھے۔ اس وقت شوہر نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا......ہم یورپ کی سیر کے لیے جارہے ہیں۔ میری برسوں کی خواہش پوری ہورہی ہے۔ کاش یہ سب کچھ اس وقت ہوتا جب نادیہ صحت مند ہوتی۔"

"تو بیوی کا نام نادیہ تھا میڈم؟"

"ہاں۔ بیوی کا نام نادیہ تھا اور شوہر کا نام ہمایوں سمجھ

لو۔ کہانی کے کرداروں کو نام تو دینا ہی پڑتا ہے۔''
''میڈم! کہانی کرداروں کی ہوتی ہے یا کہانیوں کے کردار ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔'' میڈم نے بتایا۔
''خیر، اب سوال یہ تھا کہ بچی کا کیا کیا جائے، کس کے حوالے کیا جائے۔ اس کو ساتھ لے کر جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ہاں ایک بات اور...... یورپ جانے کا مقصد صرف یورپ گھمانا نہیں تھا بلکہ کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھانا بھی تھا۔ اب ان کے پاس پیسے تھے۔ وہ مہنگا علاج بھی کر سکتے تھے۔
''اس دوران جانے کس طرح لڑکی کے گھر والوں کو اپنی بیٹی کا خیال آ گیا۔ وہ ملنے پہنچ گئے۔ گلے شکوے ہوتے رہے، مختصر یہ کہ دونوں میاں بیوی یورپ چلے گئے۔ جبکہ وہ بچی اپنے نانا اور نانی کے پاس رہ گئی۔''
''میڈم!'' میں نے پھر مداخلت کی۔ ''کیا لڑکی کے گھر والوں کو اپنی بیٹی کی بیماری کا پتا نہیں چل سکا؟''
''کیوں نہیں۔ انہیں سب بتا دیا گیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ ان کی بچی کو رکھنے پر تیار ہو گئے تھے۔ وہ دونوں یورپ پہنچ گئے۔ سیر و تفریح کے ساتھ علاج کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دونوں ایک جزیرے کی سیر کے لیے گئے۔ وہ جزیرہ کافی فاصلے پر تھا اور وہاں تک صرف کروز سے جایا جا سکتا تھا۔ کروز سمجھتی ہو نا؟''
''یس میڈم! پانی کا چھوٹا جہاز۔''
''ہاں تو وہ کروز ان کو لے گیا۔ وہ دن بھر جزیرے کی سیر کرتے رہے۔ بیوی بہت خوش تھی۔ وہ ہنستی، مسکراتی رہی، سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھر شام کے وقت ان کی واپسی ہوئی اور ابھی وہ آدھے راستے میں تھے کہ سمندر میں شدید طوفان آ گیا۔ اتنا شدید کہ کروز ڈوبنے لگا۔''
''اوہ خدا...... تو یہ ہے اس کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، یہ ٹرننگ پوائنٹ نہیں ہے۔'' میڈم نے کہا۔
''ابھی تو کئی موڑ باقی ہیں۔ تو ہوا یہ کہ طوفان آ گیا اور کروز ڈوبنے لگا۔ فوراً ایک لائف بوٹ پانی میں اتاری گئی۔ لوگ اس میں کود کود کر سوار ہونے لگے۔ آخر یہ ہوا کہ صرف ایک آدمی کی جگہ رہ گئی۔ بیوی آگے تھی۔ شوہر نے اچانک بیوی کو ایک دھکا دیا اور خود کشتی میں کود گیا۔ اس وقت بیوی نے چلا کر کچھ کہا اور کشتی روانہ ہو گئی۔ کروز ڈوب گیا۔ کچھ لوگ مر گئے۔ ان میں سے ایک اس کی بیوی بھی تھی۔'' اتنا کہہ کر میڈم خاموش ہو گئیں۔ کہانی شاید ختم ہو گئی تھی۔

میں ایک سناٹے کے عالم میں یہ کہانی سنتی رہ گئی تھی۔ کیا انجام تھا اس کہانی کا۔ اس آدمی نے کیسی خود غرضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کہاں گئی اس کی محبت۔ اس کے دعوے۔ زندگی بھی کتنی پیاری ہوا کرتی ہے۔ کوئی بھی سامنے ہو، آدمی جان بچاتے ہوئے اس کو بھول ہی جاتا ہے۔
''ہاں بھئی سن لی کہانی؟'' میڈم نے پوچھا۔
''یس میڈم!'' میں نے کہا۔
''اب یہ بتاؤ کہ اس عورت نے کیا کہا ہوگا؟''
''ظاہر ہے میڈم! اس نے شوہر کو بے وفا کہا ہوگا۔ اس کو برا بھلا کہا ہوگا اور بے چاری کیا کر سکتی تھی۔''
''نہیں، اس نے یہ نہیں کہا تھا۔'' میڈم نے بتایا۔
''تو پھر کیا کہا تھا میڈم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''اس نے یہ کہا تھا کہ میری بچی کا خیال رکھنا۔'' میڈم نے بتایا۔ ''اب یہ بتا دو کہ شوہر نے ایسی خود غرضانہ حرکت کیوں کی تھی؟''
''ظاہر ہے میڈم! اس نے صرف اپنی جان کی پروا کی۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، ایسا نہیں تھا۔ یہی تو اس کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ وہ عورت صرف چند دنوں کی مہمان تھی۔ اس کے پیٹ میں کینسر تھا۔ ڈاکٹرز نے بتا دیا تھا۔ وہ دونوں ہی اس بات کو جانتے تھے اور بیوی یہ جانتی تھی کہ اگر شوہر ڈوب کر مر گیا تو کچھ دنوں کے بعد وہ خود بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے شوہر کو زندہ رہنا چاہیے تاکہ وہ بچی کی دیکھ بھال کر سکے اور شوہر کو بھی یہ معلوم تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی جان بچانا ضروری سمجھا۔ سمجھ میں آ گئی کہانی؟''
''یس میڈم...... آ گئی۔ یہ تو محبت کی ایک عجیب کہانی ہے۔ قربانی کی لازوال مثال ہے۔ لیکن میڈم! یہ کہانی آپ کے ذہن میں کیسے آئی؟''
''اس لیے کہ وہ بچی میں ہی ہوں جس کو بچانے کے لیے میری امی اور ابو دونوں ہی نے قربانی دی تھی۔'' میڈم کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں سکتے کے عالم میں میڈم کو دیکھ رہی تھی جو اب انتہائی خاموشی سے رونے لگی تھیں۔ ان کے بے آواز آنسو کہانی میں ایسا سوز پیدا کر رہے تھے کہ مجھے اپنے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی...... واقعی کہانی تو زندگی کا دوسرا نام ہے...... اور زندگی کے جتنے روپ کہانی کے اتنے پہلو...... جس پر نگاہ پڑ جائے، فنکار اس پہلو کو اجاگر کر دے...... بشرطیکہ اسے کہانی کو سمجھنے اور لفظوں سے کھیلنے کا ہنر آتا ہو......



محفلِ شعر و سخن

❋ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
بلندیوں کی تمنا ہمیں بھی ستاتی ہے
مگر ہم کسی کو روند کر اونچا نہیں ہوتے

❋ جاوید اختر رانا...... پاک پتن شریف
لفظ کتنے تیرے پیروں سے لپٹے ہوں گے
تو نے جب آخری خط میرا جلایا ہوگا
تو نے جب پھول کتابوں سے نکالے ہوں گے
دینے والا بھی تجھے یاد تو آیا ہوگا

❋ ساگر تلوکر...... چشمہ بیراج
بھٹک جانے کا خدشہ ہے بہت اس مرحلے پر
زباں کے عہد سے آنکھیں مکرتی جا رہی ہیں

❋ ریاض بٹ ...... حسن ابدال
وہ گیت جو تم نے سنا نہیں
میری عمر بھر کا ریاض تھا
وہ میرے درد کی تھی داستاں
جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

❋ ناہید یوسف...... اسلام آباد
بانٹ جی بھر کے اسے دشت کے صحراؤں میں
پیار دولت تو نہیں ہے کہ جو گھٹ جائے گی

❋ لبنیٰ وکیل ...... کوئٹہ
ذرا سی خاک اڑا دو زمیں سے لے کر
کوئی جو پوچھے کہ انجامِ زندگی کیا ہے

❋ وسیم احمد...... ملتان
قسمت نے کیے وہ دل پہ ستم، دو چاہنے والے مل نہ سکے
کہنے کو بہار آئی تھی، دو پھول چمن میں کھل نہ سکے

❋ اویس احمد ...... سرگودھا
اپنے آنچل پہ ستاروں سے میرا نام نہ لکھ
میں تیرا خواب ہوں پلکوں میں چھپا لے مجھ کو

❋ محمد امجد ریاض...... اقبال نگر چیچہ وطنی
جڑ کے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
راہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

❋ گل ناز رئیس...... گلستان جوہر، کراچی
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

❋ ماریہ چودھری...... پاک پتن شریف
بیچ میدان وہ میرے لشکر سے بغاوت کر گیا دلنشیں
جیت کے سلطنت، جس کے نام کرنی تھی

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
طب کے ہزار نسخوں کے بعد
وہ آئے مسکرائے اور شفا ہوگئی

❁ محمد اشفاق سیال ...... شورکوٹ سٹی

رات گئے جب چاند ستارے لکن میٹی کھیلیں گے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چھو لوں گا

❁ ماہین فاطمہ ...... اوکاڑہ

تم کچھ تو نبھا جاتے، آخر کو محبت تھی
ہم نے تو عقیدت میں، لہجہ بھی نہیں بدلا

❁ داؤد اشفاق ...... اوکاڑہ

تجھ سے برا وجود سنبھالا نہ جاسکا
میں نے ترا غبار بھی رکھا سمیٹ کر

❁ ملائکہ حریم ...... اوکاڑہ

بدلا یوں رنگ اس نے کہ حیرت ہوئی مجھے
موسم کو مات دے گئی فطرت انسان کی

❁ اشفاق شاہین ...... لاہور

کوئی غم خوار، غم گسار کہاں
غم سے گفتگو خود میں کرتا ہوں

❁ محمد خواجہ ...... کورنگی نمبر 6، کراچی

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کتنا ہی اٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

❁ طارق محمود ...... تحصیل و ضلع اٹک

بند در یچے بھی اک دن وا ہوں گے، ہوا آئے گی
یہ جو پرندے چپ سے ہیں، ان کی صدا آئے گی

❁ انعم کمال ...... حیدر آباد

راہوں کی مشکلات میں کھوئے تو غم نہ تھا
رونا تو اس کا ہے سرِ منزل بھٹک گئے

❁ وزیر محمد خان ...... بفل ہزارہ

یہی ہے موت جو تجھ سے بچھڑ کر ہم نے دیکھی ہے
وہی تھی زندگی جو تیری محفل میں گزار آئے

❁ جنید احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی

کندھا بدلتے جاتے ہیں ہر دو قدم کے بعد
لاشہ بھی دوسروں کو ہرا بارِ دوش تھا

❁ محمد قدرت اللہ نیازی ...... خانیوال

میں نازک برف کا اک ٹکڑا
تو رکھ کے بھول گیا مجھ کو
میں قطرہ قطرہ پگھلا ہوں
تو میری اذیت کیا جانے

❁ مہتاب احمد ...... حیدر آباد

تم سرِ حشر ملو گے یہ سنا ہے جب سے
تیرے دیوانوں نے اک حشر اٹھا رکھا ہے

❁ اطہر حسین ...... کراچی

ہوا کا کس جو اپنے کواڑ کھولتا ہے
تو دیر تک بھرے گھر کا سکوت بولتا ہے

❁ زرین آفریدی/ بینش صدیقی ...... حیدر آباد

تتلیاں ہم پر دن بھر بیٹھا کرتی تھیں
ہم پھولوں سے اتنے ملتے جلتے تھے......

❁ عائشہ ملک ...... دبئی

ایک خوشبو کی طرح زندہ رہو دنیا میں
اور پھر کیا ہے اگر خود کو بکھر جانے دو

❁ شاہانہ سلطان ...... اردو بازار، کراچی

مجھ میں بھری تنہائی کو ڈھلتے کس نے دیکھا ہے
ہول کی تہ میں خار کو پلتے کس نے دیکھا ہے
جن ہونٹوں نے محفل میں مسکان سجائی ہے
ان کے دلوں میں غم کو پلتے کس نے دیکھا ہے

❁ ادریس احمد خان ...... ناظم آباد، کراچی

اسی دھن میں گزارے جا رہا ہوں زندگی اپنی
کبھی تو زندگی کے مرحلے آساں بھی ہوں گے

❁ فضا شاہ ...... لاہور

دل بھی بجھا ہو، شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جایئے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں
آنکھوں کی سرخ لہر ہے موج سپردگی
یہ کیا ضروری ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

❁ محمد طلحہ شہیر اسامہ سیال ...... روہڑی، سکھر

عجب ہے رات سے ان آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

❁ عدیم راجپوت ...... لیہ

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

❁ طیب شاہین ...... کٹھیالہ شیخاں

چاہا ہے تجھ کو تیرے تغافل کے باوجود
اے زندگی تو یاد کرے گی کبھی ہمیں

❁ عبدالجبار رومی انصاری......لاہور
تلاش کرتی ہے سائے تمہارے آنچل کے
چمن میں بادِ صبا کا یہ حال ہوتا ہے
❁ رانا کلیم......بھکر
میری آرزو ہے کہ موم ہوں
کبھی ان کے دل بھی میرے لیے
جنہیں بیر ہے میری ذات سے
جو ہیں بدگماں میرے نام سے
❁ طاہر مجاہد......پھالیہ
اک تیری برابری کے لیے
خود کو کتنا گرا چکا ہوں میں
❁ فہیم شناس صدیقی......کراچی
کیا بتاؤں میں حال دنیا کا
راستے میں ہیں صبح و شام ابھی
❁ سائرہ نواب......پشاور
جانے کیسی ہے کشش بہتے ہوئے پانی میں
ساتھ آنکھیں بھی چلی جاتی ہیں حیرانی میں
❁ یمنیٰ جاوید......کراچی
رنگ سے رنگ چراتا کوئی آسان تو نہیں
زندگی مجھ سے چرائے لیے جاتی ہے مجھے
❁ نعیم احمد......بہاولپور
کر آئے تیرے ہجر کا ہر مرحلہ عبور
آنکھوں میں دھول، پاؤں میں رستہ لیے ہوئے
❁ نادیہ ریاض......نواب شاہ
پھر بھی ہم لوگ گزارے ہی چلے جاتے ہیں
ایک لمحہ بھی نہیں جبکہ گزارے جیسا
❁ کامران شاہد......میرپورخاص
وہ کھڑکیاں مدت سے یوں ہی دیکھ رہا ہوں
پردے سرکتے تھے، سرکتے ہیں ابھی تک

❁ صبا حمید......ٹنڈو الہیار
انہی آنکھوں میں، سلگتا ہوا صحرا ہے جہاں
اتنا پانی تھا کہ اِک شہر یہاں ڈوب گیا
❁ سحر خان......کوئٹہ
روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں
❁ منیر شگفتہ......وہاڑی
وہ کہاں ہے یہ ہوا پوچھتی ہے
راستہ روک کے اکثر میرا
❁ عاصم خان......کراچی
جانے کس لہر میں تھا کوزہ گر
خاک ہوتی رہی ادھر سے اُدھر
❁ صبا سحر......کراچی
تتلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمحے
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں انہیں ہم
❁ مہوش خان......حیدرآباد
بچھڑ کے تجھ سے تری یاد بھی نہیں آئی
مکاں کی سمت پلٹ کر ہمیں نہیں آیا
❁ عمران شیروانی......لاہور
عمر بھر حادثے ہی کرتے رہے استقبال
وقت ایسا تھا کہ سینے سے لگائے گئے ہم
❁ شاہد علی......فیصل آباد
اگرچہ چھین لیا ہے جہان نے سب کچھ
ہے پھر بھی لہجہ و کردار باغیانہ وہی
❁ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ
یہ کائناتِ دل و جاں اُسی کی ہے لیکن
کسی مقام پہ ٹھہرے نگاہِ سیمابی
❁ حنظلہ شاہد......سکھر
بُھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تری زندگی رہا ہوں

کوپن
برائے
شمارہ
مئی
2017

مُحفلِ شِعر و سُخن

نام : ____

پتا : ____



سراب

علی اختر

ایک چہرے پر کئی چہرے سجالیتے ہیں لوگ ... اور ہر چہرہ محبت اور اپنایت کی انوکھی داستان رقم کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ اونچی اڑان کا موقع ملنے کے باوجود زمین سے جڑے رہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور کچھ دیر میں ہی آسمان کی وسعت سے اکتا کر واپسی کی راہ لیتے ہیں۔ اور وہ بھی خواب سراب کے اس گورکھ دھندے سے صاف بچ نکلی تھی البتہ ... جال تو جال ہی ہوتا ہے ... جسے ہر حال میں کسی نہ کسی کو پھانس لینا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے چنگل میں ایک اور چڑیا قید ہو گئی۔

گھمنڈ اور تکبر کی انتہا کو چھو لینے والے ایک بے ضمیر کا قصہ

میں اپنے چیمبر میں آ کر ابھی بیٹھی ہی تھی۔ آج کی تاریخ میں مختلف عدالتوں میں لگے کیسز کی فائلیں میری میز پر پڑی تھیں۔ میں انہیں دیکھ رہی تھی کہ وہ چپ چاپ آکر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ کلف لگی سفید پگڑی باندھے اور کھڑکھڑاتی کاٹن کی شلوار قمیص پہنے ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ خود اس نے اپنا چہرہ سیاہ رنگ کی بڑی سی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف اس کی دو بڑی بڑی پریشان سی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن کے بھاری پپوٹے

دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے گرد سوجن ٹھہری گئی ہو۔

''جی بیٹھیے......!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''شکریہ......'' اس نے کرسی گھسیٹ کر میری میز کے نزدیک کرلی اور اس پر بیٹھ گئی جبکہ اس کے ساتھ آیا ہوا شخص بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ بات اسی نے شروع کی۔

''وکیل صاحبہ...... یہ میری بیٹی عابیہ ہے۔ یہ اپنے خاوند سے خلع لینا چاہتی ہے۔''

''آپ نے انہیں سمجھایا ہوتا...... آپ کو پتا ہے، ہمارے معاشرے میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' میں نے فائل میں لگے کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

''اس میں ہماری مرضی بھی شامل ہے۔'' اس نے رعب دار لہجے میں کہا۔ تب میں نے پہلی بار فائل سے نظریں اٹھا کر پہلے اس کی طرف اور پھر عابیہ کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے خوف کی ایک لہر نظر آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''کیوں بی بی...... کیا اس میں آپ کی مرضی بھی شامل ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ......'' میں نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''جی......'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

''دیکھیے...... ایسا کام بڑا سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے تاکہ بعد میں کسی قسم کا پچھتاوا باقی نہ رہے۔ جذباتی فیصلے بعض اوقات زندگی بھر کا روگ بن جایا کرتے ہیں۔ آپ ایک بار اور سوچ لیں۔ میں اتنی دیر تک عدالت میں کیس سن کر آتی ہوں۔ امید ہے کہ اس کیس میں آج بھی تاریخ ہی ملے گی۔'' میں یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھی اور جاتے جاتے اپنے منشی سے کہا۔

''سلطان! ان کو چائے پلواؤ...... میں عدالت سے ہو کر آتی ہوں۔''

مجھے اٹھتے دیکھ کر اس کی اداس نظریں میرے ساتھ ہی اٹھیں...... اور پھر خاموشی سے جھک گئیں۔ میں عدالت کی جانب چل دی...... وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ جاتے ہی اس کیس میں مجھے اگلی تاریخ مل گئی۔ اس فیلڈ میں اب مجھے خاصا تجربہ ہوچکا تھا اور ایک تجربہ کار وکیل کی طرح میں سونگھ کر ہی بتا دیتی ہوں کہ اس کیس کا کیا ہوگا...... میرا یہی تجربہ میرے کام میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ میں سوچتی آرہی تھی کہ اگر وہ لوگ ابھی تک بیٹھے ہوئے ملے تو ان سے کیس کی نوعیت پوچھ کر دعویٰ دائر کردوں گی۔

میں جب واپس چیمبر میں آئی تو وہ چائے پی چکے تھے۔ میں نے کیس کی فائل میز پر رکھی، سلطان کو کیس کی اگلی پیشی کی تاریخ بتائی اور ایک بار پھر اس کو مخاطب کیا۔

''ہاں تو بی بی...... اب کہیے۔''

''میں اس کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتی۔ ایک پل کے لیے بھی اس کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔ میں اگر اس بار وہاں گئی تو وہ لوگ مجھے قتل کردیں گے۔'' اس نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں جواب دیا۔ درمیان میں اس کا والد اس کی گفتگو کو سہارا دیتا جارہا تھا۔

''کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو......؟'' میں نے اسے کیس کرنے پر آمادہ دیکھ کر پوچھا۔

''آج پورے تین سال ہونے کو آگئے ہیں۔''

''ان تین سالوں میں آپ نے اپنے شوہر کو اچھی طرح جان لیا تھا......؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، انسان تو دو قدم کسی کے ساتھ چلے تو وہ اس کو پہچان جاتا ہے۔ تین سال تو بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ وہ بڑا سنگدل ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ شروع سے ہی بڑا درشت رہا ہے۔ بالکل وحشی ہے......!'' وہ بولی۔

''کیا شروع سے ہی وہ......'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں...... پہلے پہل وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی۔ شادی تک یہ سلسلہ بڑی خیر و خوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ عروۃ الوثقیٰ کے والہانہ انداز کو دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ میرا انتخاب بہت اچھا ہوگا اور ہم دونوں کی جوڑی بڑی شاندار ثابت ہوگی۔ عروۃ الوثقیٰ ہمارے خاندان سے نہیں تھا لیکن اس کے باوجود میرے گھر والوں نے اسے میرا انتخاب سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔'' وہ بتا رہی تھی۔

''دراصل وکیل صاحبہ...... ہمیں اپنی بیٹی کی پسند پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اس میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو کسی اچھے داماد میں ہوتی ہے۔'' اس کے والد نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے باتوں کی لگام اپنے ہاتھ میں لی۔

''اس کا خاندان بھی بہت اچھا تھا۔ ہمارے معیار کا...... شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ ہینڈسم تھا...... باتوں کے حصار میں دوسروں کو لے لینے کی خوبی اس میں بدرجہ اتم

موجود تھی۔ پہلے پہل اس کا رویہ بھی اچھا خاصا تھا مگر شادی کے کچھ عرصے بعد اس کے رویے میں اچانک تبدیلی آ گئی......

''عابیہ بیٹی کی جانب سے دبے دبے لفظوں میں اس کی شکایات مجھ تک پہنچنے لگی تھیں۔ پہلے پہل تو میں نے اس پر غور نہ کیا کہ چھوٹے موٹے جھگڑے تو میاں بیوی کے درمیان ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن بات جب حد سے بڑھنے لگی تو میں نے عابیہ کو اپنے گھر بلالیا...... اور پھر واپس نہ جانے دیا۔ اسی دوران ان کی طرف سے مجھے دو ایک بار پیغام بھی ملے......مگر ہم نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ تب ان کی طرف سے دھمکیاں آنے لگیں بلکہ ایک فنکشن میں عروۃ الوثقیٰ سے میری اچانک ملاقات ہوئی۔ اس نے میرے ساتھ انتہائی بدتمیزی کی...

''جانتے ہو حشمت خاں، خوبصورتی بگاڑنا اور غرور توڑنا میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ جس چیز پر تمہاری بیٹی کو اس قدر گھمنڈ ہے، میں اسے منٹوں میں خاک میں ملا سکتا ہوں۔''

''شرفاء کی محفل میں جس قدر اونچی آواز میں وہ دہاڑا تھا، میں اگر اسی لہجے میں اس کا جواب دیتا تو یقیناً نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی۔ اس لیے میں کڑوا گھونٹ سمجھ کر اس کی باتوں کو پی گیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ حالانکہ اس کے بولتے ہی کئی نظریں ہم دونوں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ اسی طرح کی بات اس کی والدہ نے عابیہ سے کہی تھی۔ کیا کہا تھا عابی...... سناؤ بیٹی......!'' اس نے باتوں کا رخ عابیہ کی طرف موڑا۔

''اس روز......'' جیسے عابیہ کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے نکلی ہو۔

''اس روز وثقیٰ کی والدہ کا فون آیا تھا۔ اس نے بڑی بدتمیزی سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے بُرا بھلا کہا۔'' وہ یہ کہہ کر چپ ہوئی تو اس کے والد نے اسے پھر بولنے پر مجبور کر دیا۔

''ذرا کھل کر بتاؤ...... عابی...... یہ ہماری وکیل ہیں۔ انہیں سب کچھ علم ہونا چاہیے تاکہ دعوے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔''

''ہاں...... ہاں...... بی بی! تم اس وقت وکیل کے پاس بیٹھی ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی مگر عروۃ الوثقیٰ کا نام سن کر نہ جانے میرے دل کی دھڑکنوں میں مدوجذر سا کیوں پیدا ہونے لگا

پاکستانی ایجنٹ

جب امریکی پہلی بار چاند پر پہنچے تو وہاں ایک پاکستانی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''تم ہم سے پہلے چاند پر کیسے پہنچ گئے؟''

پاکستانی روتے ہوئے بولا'' ایک ٹریول ایجنٹ مجھے دبئی کے بجائے یہاں چھوڑ گیا ہے۔''

لمبی عمر

آدمی۔ ''ڈاکٹر صاحب زندگی لمبی کرنے کا طریقہ بتادیں۔''

ڈاکٹر۔ ''شادی کرلو۔''

آدمی۔ ''کیا اس طرح عمر لمبی ہوجائے گی؟''

ڈاکٹر۔ ''نہیں، جینے کا شوق ختم ہوجائے گا۔''

جاپانی کھاوتیں

☆ بارش ٹوٹی ہوئی جھونپڑی پر زیادہ زور سے برستی ہے۔

☆ کنگال کا گھر گلی کا کتا بھی پہچانتا ہے۔

☆ گھر آنے والے غریب رشتے دار کے پاؤں نہیں چومے جاتے۔

☆ خوشی اور خالی پیٹ کی دوستی نہیں نبھتی۔

☆ منحوس صورت والے کو دکانداری نہیں کرنی چاہیے۔

☆ مہمان سے نہ پوچھیے کہ کیا مرغی ذبح کروں؟

☆ پیادے کا درد گھڑ سوار کیا جانے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

صاف گوئی

گاہک منیجر سے ''ایک گھنٹا ہوگیا ہے انتظار کرتے کرتے، ابھی تک کھانا نہیں آیا۔ کیا ابھی پکا نہیں ہے؟''

منیجر۔ ''نہیں، صرف گرم ہورہا ہے۔ پک تو پچھلی جمعرات کو ہی گیا تھا۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

تھا...... کہیں یہ...... وہ بھی تو......!

میری سوچیں بھٹکنے سے پہلے ہی اس کی آواز ابھری۔

''سلمٰی ملک انتہائی خطرناک عورت ہے۔ میری اور آپ کی سوچوں سے بھی زیادہ مکار...... اس کے اندر ایک جاگیر دارنی چھپی رہتی ہے جو وقت آنے پر اپنی ساری ظلمتوں سمیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ سنا ہے کہ ساری زمینیں اسے اپنے والدین کی طرف سے وراثت میں ملی ہیں اور وثقیٰ کے والد کے پاس تو صرف چند ایکڑ زمینیں تھیں جو سلمٰی ملک کی زمینوں کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی جاگیر کا روپ دھار چکی ہیں۔ وثقیٰ کے والد کی حیثیت ایک کھلونے کی سی تھی اور ان سب کا حساب کتاب سلمٰی ملک کے پاس ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آسکی کہ اس کے تعلقات بڑے بڑے سیاستدانوں اور عہدے داروں سے کیونکر ہو گئے۔ البتہ اتنا ضرور علم ہے کہ سلمٰی ملک کے والد اور بھائی اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کے زیادہ قریب ہوتے ہوئے اکثر حکومتی مراعات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے سلمٰی ملک کے بھی ایسے لوگوں سے مراسم بن گئے ہوں۔ اب وہ ان مراسم سے فائدہ اٹھانے کا ڈھنگ جان گئی ہے۔ اس لیے اس کی سوسائٹی کے لوگ اس سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اس روز گھر میں کوئی نہ تھا جب اس کا ٹیلی فون آیا۔

''عابیہ...... یوں روٹھ کر بیٹھنے سے تم سمجھتی ہو کہ میرے بیٹے کی ہمدردیاں حاصل کر لوگی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ وثقیٰ کو اگر میں ایک اشارہ کردوں تو وہ تمہارے جسم سے کھال کھینچ کر میرے آگے ڈال دے۔ تم خوبصورت ڈائن ہو مگر یاد رکھو...... تمہارا یہ روپ، تمہاری یہ خوبصورتی...... ایک لمحے میں بدصورتی میں بدل سکتی ہے۔ ایسا چہرہ بگاڑوں گی تمہارا کتیا...... کہ ساری عمر روتی پھرو گی۔ تم مجھے نہیں جانتیں...... میرا بیٹا، صرف میرا بیٹا ہی نہیں...... میرا دیوانہ ہے۔ وہ کسی لمحے تمہیں اٹھوا کر صفحۂ ہستی سے مٹا بھی سکتا ہے۔ سنا تم نے...... ہم نے جو حویلیوں میں پالتو کتے پال رکھے ہیں، وہ تمہیں بند کمرے اور دیواروں کے اندر سے بھی نکال سکتے ہیں...... جب ہم اپنی آئی پر آجائیں تو تمہارے بوڑھے والد کا اثر رسوخ بھی منتیں ترلے کرتا پھرے گا...... اور ایک بات یاد رکھنا۔ ہمارے پاس اگر تمہیں رہنا ہے تو ہماری شرائط پر یہاں رہنا ہوگا...... ورنہ ساری زندگی نہ تم اپنا گھر بسا سکو گی اور نہ تم اجڑ کے جی سکو گی...... تم ہمیں جھکانا چاہتی ہو۔ تم تو آزادی کے لیے ترسو گی اور پھڑپھڑاتی رہو گی...... وثقیٰ اکیلا نہیں ہے۔ سلمٰی ملک اس کی والدہ اس کے ہر فیصلے میں اس کے ساتھ ہے...... یوں جانو...... ابھی میں نے کتیا کے گلے کی زنجیر کھول رکھی ہے......!''

یہ باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے جنہیں وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے بار بار صاف کر رہی تھی۔

''یقین کریں۔ اس روز سے میں انتہائی خوف زدہ ہوں۔ مجھے گھر سے نکلتے اور کہیں آتے جاتے ہوئے بڑا ڈر محسوس ہوتا ہے۔ میری ساس انتقام لینے میں بڑی ظالم ہے۔ دوسروں کے لیے وہ بڑی شائستہ اور مہذب دکھائی دیتی ہے۔ شاید لوگوں نے اس کا دوسرا روپ نہ دیکھا ہو۔ میں ایک بار اس کی حویلی اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے میرے سامنے اپنی ایک نوکرانی کو پالتو کتوں کے آگے محض اس لیے پھنکوا دیا تھا کہ اس نے اس کی حکم عدولی کی تھی۔ گاؤں تو گاؤں شہر بھر کی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس کے مراسم اس حد تک ہیں کہ وہ انہیں جب اور جس وقت چاہے محض ٹیلی فون کی ایک کال پر بلوا سکتی ہے اور شہر کی اونچی سوسائٹی میں رہنے والے مرد اس کی مٹھی میں ہیں جن سے وہ ہر جائز اور ناجائز کام لے سکتی ہے اور وثقیٰ کی حیثیت بھی اس کے سامنے کچھ ایسی ہی ہے۔ میں اگر اب صلح کر کے ان کے پاس چلی بھی جاؤں گی تو میرا وہاں نباہ مشکل ہوگا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ کسی وقت اور کسی بھی دن عابیہ ایک اپاہج بن کر آجائے۔ یا پھر اس کی لاش میرے والدین کو مل جائے۔ اس سے بہتر نہیں...... کہ میں یہیں رہ جاؤں۔ یہاں کم از کم میری جان تو محفوظ ہے۔ میرا اب وثقیٰ کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا......''

''ٹھیک ہے...... میں دعویٰ تیار کرتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ ہمارا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ کسی معاملے پر ہماری ضرورت ہو۔ تو فون کرلیں۔ وگرنہ دعویٰ تیار ہوجائے گا تو عابیہ آکر دستخط کر دے گی۔'' اس کے والد نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے پکڑایا اور پھر وہ چلے گئے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ پر سرسری سی نظر ڈالی۔

حشمت خاں گروپ آف انڈسٹریز کا چیف ایگزیکٹو تھا مگر اپنی بیٹی کے لیے وہ اس قدر بے بس کیوں تھا حالانکہ ایسے لوگوں کے لیے قانون توڑنا اور غلط کام کرنا ایک معمولی بات ہوتی ہے۔ پتا نہیں وہ کس مجبوری کے تحت قانون کا

سہارا لینا چاہتا تھا۔ میں نہیں جان سکی تھی۔ کیا عروۃ الوثقیٰ کے والدین اس سے زیادہ طاقتور تھے یا پھر وہ ویسے ہی ان سے خوفزدہ تھا۔ کچھ تھا ضرور...... بہرحال سارے دن کی بک بک اور جھک جھک سے اکتائی ہوئی جب میں شام کو گھر پہنچی تو ایک بار پھر وہی دو آنکھیں میری یادداشت کے جھروکوں سے مجھے جھانکنے لگیں۔

عابیہ کی دو بڑی بڑی پریشان آنکھیں۔ یقیناً وہ دعوؤں کی حد تک خوبصورت ہوگی۔ اس کی معصومیت اور باتیں کرنے کا انداز مجھے کھینچے چلا جا رہا تھا اور اس کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ میری سوچیں عابیہ سے ہوتے ہوتے عروۃ الوثقیٰ کے نام پر آ کر ٹھہر گئیں۔

عروۃ الوثقیٰ یقیناً ایک ایسا نام تھا جو ہمارے معاشرے میں بہت کم سننے کو ملتا ہے اور پھر اگر اس نام کے ساتھ حسین یادیں وابستہ ہوں تو اس نام پر ٹھٹکنا معمولی بات تھی۔ اسی نام نے میری زندگی میں پیاس ہی پیاس بھر دی تھی...... ایسا ہی نام...... میری زندگی کی ساری سوچوں کو تلپٹ کر گیا تھا...... یہی وجہ تھی کہ جب میں نے ان کی زبانی یہ نام سنا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا کوندا لپکا...... کہیں یہ وہی تو نہیں...... عروۃ الوثقیٰ نام کی ساری یادیں دھیرے دھیرے میرے ذہن میں دوبارہ بجنے لگیں۔

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ اگر والد ڈاکٹر ہے تو اس کا بیٹا بھی ڈاکٹر ہوگا اور اگر والد پڑھانے کے شعبے سے وابستہ ہے تو ان کی بیٹی بھی ٹیچر یا لیکچرار بنے گی...... بس یہی کہانی ہمارے گھر بھی دہرائی جانے لگی تھی۔ میں اپنے والدین کی بڑی بیٹی تھی...... مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور تھیں۔ ان کے بعد بھائی کا نمبر آتا تھا۔ میں نے گریجویشن کرنے کے بعد ایل ایل بی میں صرف اس لیے داخلہ لینے کی ضد کی کہ میرے والد کا شمار اس وقت شہر کے معروف ایڈووکیٹس میں ہوتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ کیس بھی ان کو دے دیں فیصلہ انہی کے حق میں ہوتا ہے۔ اس لیے نہ صرف ان کے مؤکل بلکہ ان کے ساتھ وکلاء بھی قانونی پیچیدگیوں میں ہمیشہ انہی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لیا تو ایک روز انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔

’’بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ تم اس پیشے کو اپناؤ...... جان کو خواہ مخواہ روگ لگانے کے مترادف ہے۔ بہت محنت اور جان عذاب میں ڈالنے والا کام ہے۔ تم کسی اور مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لو اور کوئی دوسرا شعبہ اختیار کر لو۔ تمہارے لیے آسانی رہے گی......!‘‘

مگر میں نے ہنس کر کہا۔ ’’بابا جان...... کیا آپ کو اپنی بیٹی کی صلاحیتوں پر شک ہے؟ اور کیا میں محنت سے جی چراتی ہوں؟ بابا جان...... میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی اولاد محنت سے جی چرانے والی بھی نہیں ہے......!‘‘

پھر انہوں نے مسکرا کر میرے ماتھے کو چوما اور مجھے ایل ایل بی کرنے کی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اس میں میری مدد بھی کرنے لگے۔

میں نے کالج میں نہ صرف داخلہ لے لیا، بلکہ میری پڑھائی میں محنت کو دیکھتے ہوئے بابا جان نے مجھے کالج کے ہاسٹل میں کمرا بھی دے دیا، تاکہ میں یکسوئی کے ساتھ پڑھائی مکمل کر سکوں۔

عروۃ الوثقیٰ ایل ایل بی کا طالب علم تو نہ تھا، اور نہ ہی ہمارے کالج کا اسٹوڈنٹ...... اس کا تعلق یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات سے تھا۔ میری اور اس کی ملاقات ایک بین الکلیاتی مباحثے میں ہوئی تھی جہاں میں اپنے کالج کی نمائندگی کر رہی تھی اور عروۃ الوثقیٰ یونیورسٹی کی ٹیم میں شامل تھا۔ اس مباحثے میں مجھے اول انعام ملا تھا اور دوسری پوزیشن عروۃ الوثقیٰ کی تھی۔

سب میری اس کامیابی پر مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ ہم سب دوسروں سے ہٹ کر اپنی چوپال جمائے گفتگو کر رہے تھے کہ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ وہ سارے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

’’مبارک ہو مس......‘‘ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ شاید وہ میرا نام بھول گیا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو میری ایک سہیلی نے اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا......

’’مس شارینہ......‘‘

’’جی...... جی...... مس شارینہ......‘‘ ایک بار پھر وہ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا تو میری سہیلیاں زور سے ہنسنے لگیں اور وہ شرمندہ سا واپس چلا گیا۔ بس اتنی سی بات تھی...... بات آئی گئی ہوگئی۔

ہماری اگلی ملاقات بھی اسی طرح کے ایک اور مباحثے میں ہوئی۔ اس روز بھی پہلا انعام میں نے جیتا تھا جبکہ بہاولپور یونیورسٹی کی شامعہ طفیل نے دوسری اور عروۃ الوثقیٰ نے تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔

’’ایک بار پھر آپ کو بہت بہت مبارک باد...... یقیناً

آپ کی اپروچ آپ کی طرح خوبصورت اور مکمل ہوتی ہے تبھی تو......!''

اس نے میرے نزدیک آکر کہا۔

''شکریہ...... لیکن مجھے افسوس ہے۔ شاید اس بار آپ کی تیاری مکمل نہ تھی۔ تبھی تو آپ کی پوزیشن سلپ کرگئی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک سمجھی ہیں آپ ...... اس بار مجھے تیاری کا بہت کم موقع ملا۔ دراصل سمیسٹر کلوز ہورہا تھا۔ اس لیے اس کی تیاری میں لگا رہا۔'' اس نے بتایا۔

''کوئی بات نہیں...... اگلی بار سہی۔'' وہ ہنسا۔ ''اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو یہاں قریب ہی کینٹین پر چائے پی جاسکتی ہے۔'' وہ رکتے رکتے بولا۔

''کوئی حرج نہیں۔'' اور یوں ہم ہجوم سے نکل کر کینٹین کے ایک گوشے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہیں سے عروۃ الوثقیٰ کی میرے ساتھ ملاقاتیں بڑھیں۔ تبھی مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ عروۃ الوثقیٰ کے والد اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں اور عروۃ الوثقیٰ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا ہے۔

اب ہم دونوں اپنے اپنے تعلیمی ادارے کی طرف سے اکثر بین الکلیاتی مباحثوں میں اکٹھے ہوجاتے تھے اور پھر وہاں ہماری گپ شپ کا سلسلہ رہتا۔ جانے یہ کب کی بات ہے جب میرے دل نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ عروۃ الوثقیٰ کی نظروں میں میرے لیے پسندیدگی کی بدلیاں جھلملانے لگی ہیں۔ اس کی سوچوں میں میرے لیے مٹھاس سی اترنے لگی ہے...... اور اس کا اظہار اس نے ایک روز کر ہی ڈالا۔

اس روز اس نے میرے کالج ٹیلی فون کرکے مجھے کہیں...... باہر ملنے کو کہا تھا اور ساتھ ہی ضد بھی کی تھی کہ میں کالج سے باہر نکل کر قریب ہی اس کا انتظار کروں۔ وہ خود وہاں سے مجھے لے لے گا۔ میں اس کے مقررہ وقت پر کالج سے نکل کر ذرا پرے اس کا انتظار کرنے لگی کہ ایک پجیرو کی بریکیں میرے نزدیک آکر چیخیں......

میں ڈر ہی تو گئی تھی...... میں چھلانگ لگا کر دوسری طرف ہوئی تو اس میں سے عروۃ الوثقیٰ باہر نکلا۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔

''تم......'' میری آواز میں خوف نمایاں تھا۔

''جی آپ کا خادم...... آیئے۔'' اس نے میری جانب کا دروازہ کھولا اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ میں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی...... گاڑی چلی تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کس کی مانگ کرلائے ہو...... یا رینٹ کی ہے؟''

''نہ تو مانگ کرلایا ہوں اور نہ ہی یہ رینٹ کی ہے۔ ڈیڈی نے گاؤں سے ڈرائیور بھجوایا تھا کہ وہ مجھے لے آئے...... میں نے ڈرائیور کو اس کے رشتے داروں کے گھر ڈراپ کردیا اور خود آپ کے لیے گاڑی لے آیا ہوں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''وثقیٰ! تمہیں پتا ہے مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میرا تعلق ایسے خاندان سے ہے جہاں لالچ اور جھوٹ دونوں کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے ہمیشہ اپنی چادر میں رہنا سیکھا ہے اور اس سے پاؤں کبھی باہر نہیں نکلے۔ میرے والد نے قناعت کا جو درس ہمیں دیا ہے، وہ اب ہماری فطرت بن چکا ہے۔ اس لیے زندگی کی کسی نمود و نمائش سے مجھے قطعاً نفرت ہے۔''

میں نے دھیرے دھیرے کہا تو اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''شاری...... میں بھی حقیقت کی دنیا میں رہنے والا شخص ہوں۔ میں نے کبھی بھی اپنی دولت کی نمائش نہیں کی۔ یقین کرو...... یہ ہماری اپنی گاڑی ہے......!''

میں اس کی اس بات کو سن کر چپ ہورہی۔ پھر وہ مجھے لے کر شہر یار میں آ گیا...... شہر یار بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ خاصا رومان پرور ماحول...... دھیمی روشنی میں دلوں کو چھیڑتی لوک موسیقی کی دھنیں اس ماحول کو اور بھی جان لیوا بنا رہی تھیں۔

''واؤ...... بیوٹی فل......!'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ لفظ نکلے...... تو وثقیٰ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے۔ میں تو سمجھا تھا شاید تمہیں یہ جگہ اور ماحول پسند نہ آئے۔''

''خوبصورتی شائستگی کے پیراہن میں ملبوس ہو تو سونے پر سہاگا ہوتی ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''بالکل تمہاری طرح......'' اس نے لفظوں کو اپنے مطلب و معنی دیتے ہوئے جواب دیا۔

''شکریہ...... آپ کے حسنِ نظر کا۔'' میں ہنسی۔

''شارینہ! میں سوچتا ہوں جب دونوں کی طرف سے دلیلوں کی بھرمار ہوگی تو جیت کی ٹرافی اٹھانا مشکل ہوجائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں چپ چاپ ہار مان لوں کہ لفظوں میں مات کم از کم تمہیں تو نہیں دے سکتا۔''

''وکیل کی بیٹی ہوں...... جانتی ہوں کون سی دلیل کہاں کام دیتی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ قائل ہو گیا۔

زندگی کی فضاؤں میں خوبصورت لمحے بہت جلد تحلیل ہو جایا کرتے ہیں۔ شاید یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ میں ان خوبصورت لمحوں اور حسین ساعتوں کو سدا اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی تھی مگر لمحے سدا کب کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ تو سوکھی ریت کے مانند انسانی مٹھی سے گرتے چلے جاتے ہیں۔ اس روز میرا خالی پیریڈ تھا اور میں ہاسٹل میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ جب میرے فون کی گھنٹی بجی......

''شارینہ کے لیے کال ہے......''

''جی بول رہی ہوں۔'' میں نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

''عروۃ الوثقیٰ ہوں...... مجھے آج اسلام آباد یونیورسٹی سے دعوت نامہ ملا ہے۔ وہاں ایک بین الکلیاتی مباحثہ ہو رہا ہے۔ کیا تمہیں اس کا دعوت نامہ ملا ہے؟''

''ابھی تو نہیں۔''

''اوہ...... تم اپنے پرنسپل سے ملو اور دیکھو...... ضرور ڈاک میں آیا ہوگا اور اگر نہیں آیا تو ٹیلی فون کر کے اپنا اور ٹیم کا نام رجسٹرڈ کراؤ۔'' اس نے کہا۔

''مگر وثقیٰ......''

''اگر مگر کچھ نہیں...... دیکھو، اس میں دو فائدے ہیں۔ کچھ فراغت کے لمحے مل جائیں گے اور دوسرے وہاں سے کچھ دیر کو مری وغیرہ کے لیے بھی نکل سکتے ہیں۔'' وثقیٰ نے جذباتی ہوتے ہوئے اصرار کیا۔

''لیکن شاید میں نہ جا سکوں۔'' میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہہ دیا...... حالانکہ میرا جی بھی چاہ رہا تھا کہ میں اس میں حصہ لوں۔

ابھی میں اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ مجھے اطلاع ملی کہ پرنسپل صاحب یاد کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً اس سے معذرت کی۔

''اچھا، میں تمہیں دوبارہ فون کرتی ہوں۔ اس وقت مجھے اپنا پیریڈ لینے جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''او کے...... میں نے جو کہا ہے وہ ضرور کرنا۔'' وثقیٰ نے ایک بار پھر مجھے کہا۔

میں پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے مجھے اسلام آباد یونیورسٹی کا دعوت نامہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''شارینہ! تم اور تمہاری ٹیم نے ہمارے ادارے کی نیک نامی کے لیے جو کچھ کیا وہ سراہے جانے کے قابل ہے۔

اب تو غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمارے ادارے کا نام سرفہرست آنے لگا ہے۔ یہ صرف اور صرف تمہاری ذہانت کی وجہ سے ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ اس بار بھی ٹرافی ہمارا کالج اٹھائے گا؟''

''ان شاءاللہ سر...... میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔'' میں نے سر جھکائے جواب دیا۔

اب میں اس انتظار میں تھی کہ اس کی خبر کب وثقیٰ تک پہنچاؤں گی مگر میں اسے ستانے کے موڈ میں تھی۔ نہ جانے لوگ اس کو کیا نام دیتے ہوں گے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اب میں اور وثقیٰ اس حد تک آ پہنچے تھے جہاں ایک دوسرے سے مذاق اور ستانے میں مزہ آنے لگا تھا۔ میں اب اسی انتظار میں تھی۔

اور یہ انتظار اس قدر جان لیوا ہوتا ہے...... اس بات کا احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ پہلے تو گھڑیاں بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا مگر آج جب میں نے اسے تنگ کرنے کا پروگرام بنایا تھا تو لمحے گزر ہی نہیں رہے تھے۔ بالآخر کچھوے کی چال چلتے لمحوں کو اپنی ہار ماننا ہی پڑی۔ میں نے جلدی جلدی یونیورسٹی کے نمبر ملا کر وثقیٰ کے کمرے کا نمبر مانگا۔ تھوڑی دیر بعد وثقیٰ لائن پر تھا۔

''شارینہ......'' میں نے مختصراً کہا۔

''تم اگر اپنا نام نہ بھی لو...... تو خوشبو تمہارا پتا دے دیتی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈائیلاگ اچھا بول لیتے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارے لیے یقین کرو شاری لفظوں کو بڑا سنبھال سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے اور پھر ان کے لیے موقع محل بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کیوں میں تمہارے ساتھ بات کرتے ہوئے الجھ سا جاتا ہوں۔ حالانکہ تقریروں اور مباحثوں میں الفاظ میرے ذہن کی لوح پر خود بخود اترنے لگتے ہیں۔'' اس نے دھیرے دھیرے کہا۔

''اچھا...... اچھا...... بناؤ مت...... اور سنو...... اسلام آباد سے دعوت نامہ آیا ضرور ہے مگر اس بار پرنسپل نے وہاں جانے والی ٹیم میں میرا نام شامل نہیں کیا...... میں نے پوچھا تو فرمانے لگے۔ ضروری نہیں مس شارینہ کہ ہر بار صرف تم ہی ہر جگہ جاؤ۔''

میں نے رکتے رکتے جواب دیا۔

''لیکن تم نے...... انہیں کہنا تھا......'' اس کی ساری شوخی جیسے دھری رہ گئی ہو۔

''میں نے کہا تھا...... بہت بار...... اور پھر منتیں

ترلے بھی کر ڈالے مگر وہ نہیں مانے...... سوری وُثقیٰ۔'' میں نے روہانسے لہجے میں بتایا۔

''یہ تو شاری بہت برا ہوا...... تم ایک بار اور کوشش کر دیکھو...... دیکھو صرف میری خاطر...... وگرنہ میں بھی انکار کردوں گا۔'' اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

''نہیں وثقیٰ تم ضرور جاؤ...... میرے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اس بار ٹرافی تم جیت کر لاؤ۔'' میں نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

''شاری ...... تم یوں کرو اگر وہ لوگ تمہیں نہیں جانے دیتے تو تم چھٹیاں لے کر میرے خرچے پر میرے ساتھ وہاں چلو۔ ہم وہاں اکٹھے گھومیں گے۔ خوب انجوائے کریں گے۔ سارا خرچہ میرے ذمے ...... اوکے؟'' اس نے تجویز دی۔

''آخر تمہارے اندر کا جاگیردار بول ہی اٹھا...... نہ جانے تمہارے اندر کا جاگیردار ایسے لمحوں کی تلاش میں کیوں رہتا ہے۔ جونہی اسے موقع ملتا ہے، فوراً اپنا آپ دکھانے لگتا ہے۔'' میں نے لہجے میں زبردستی کی کڑواہٹ سمو کر کہا۔

''سوری شارینہ! میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا...... قسم لے لو...... میں نے کبھی اس نہج پر نہیں سوچا...... پھر بھی اگر تم نے محسوس کیا تو مجھے اس کا سخت افسوس ہے اور میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اپنے سارے الفاظ بارگاہِ حسن سے واپس لینے کا خواستگار ہوں۔'' اس نے لجاجت بھرے لفظوں سے کہا۔ لیکن اب مجھے مزہ آنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے وثقیٰ اس میں تمہارا قصور نہیں ...... پہلے احساس پرچرکا لگانا اور پھر معذرت کرنا...... یہ سب تم ایسے وڈیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم مجھے اس قدر گھٹیا سمجھو گے۔ بہرحال میں وہاں نہیں جاسکوں گی...... خدا حافظ!''

یہ کہہ کر میں نے فون بند کرنا چاہا۔ اس کی آوازیں دیر تک آتی رہیں۔

''شاری ...... خدا کے لیے فون بند نہ کرنا۔ میری بات تو سنو۔ اگر نہیں سنو گی تو میں خود آجاؤں گا......'' اس کی آوازیں دیر تک میرا پیچھا کرتی رہیں مگر میں تو فون بند کرچکی تھی۔

ہم نے دو دن بعد اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا تھا اور اس کے لیے میں نے ابھی سے تیاری شروع کردی تھی۔ موضوع کے حساب سے میٹر اکٹھا کرنا تھا...... سو میں اس کام میں لگ گئی۔ اگلے دن صبح ہی اس کا فون آگیا۔ میں نے اپنے لہجے میں اکتاہٹ سی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو شارینہ......!''

''مس شارینہ...... کیا تم کسی ناکردہ گناہ کے مجرم کو معاف نہیں کرسکتیں۔ یقین کرو میں ساری رات اسی ادھیڑبن میں رہا ہوں کہ آخر میں نے کہہ کیا دیا۔'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

''مجھے بات نہیں کرنی ...... میں نے پیریڈ لینے جانا ہے۔ اس لیے بند کر رہی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''کیا تم مجھے آج کسی وقت مل سکتی ہو...... میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''سوری مسٹر وثقیٰ......'' میں نے اپنے لفظوں کو مزید تلخی کی سان پر چڑھایا۔

''تمہیں تمہاری سب سے پیاری چیز کا واسطہ!'' وہ اب ندامت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اگر میں نے اسے مزید تنگ کیا تو وہ بے حد ٹوٹ جائے گا۔

''ہوں...... تو سنو...... مسٹر وثقیٰ ...... مجھے اسلام آباد کے لیے تیاری کرنا ہے۔ اس لیے میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے قطعاً وقت نہیں ہے۔'' میں نے اپنے اندر کی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

''کیا...... دوبارہ کہو......'' اس نے برجستگی سے اونچی آواز میں کہا۔ یقیناً اس کے اردگرد کے لوگ اس کے انداز اور اونچی آواز کو سن کر حیران ہوئے ہوں گے۔

پھر میں نے ٹیلی فون بند کردیا۔

......

اسلام آباد یونیورسٹی میں بین الکلیاتی مباحثے کا اختتام یقیناً ہماری سوچوں کے مطابق ہوا۔ اس بار عروۃ الوثقیٰ نے دوسری...... میں نے پہلی اور میری ٹیم کی دوسری ممبر نے تیسری پوزیشن لے کر ٹرافی اٹھالی تھی۔

''تم نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔'' مجھے ٹرافی لیتے دیکھ کر اس نے کہا۔

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج کرکے ٹرافی اپنے حق میں کی ہے اور یہ سب تم نے دانستہ کیا ہے۔ اس دھاندلی پر تمہیں جرمانہ ہونا چاہیے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر میں مکر جاؤں تو......'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''دیکھو شاری...... شاید یہ میری زندگی میں پہلی بار ہوا کہ میں چاہنے لگا ہوں کہ میں ہمیشہ تمہارے سامنے جیت کر بھی ہار جاؤں اور تم ہمیشہ میرے سامنے جیتتی رہو۔ پتا نہیں کیوں میں سوچتا ہوں اگر تم مجھے نہ مل پاتیں تو میرا وجود ادھورا رہ جاتا...... آج کل میں میرا ایسٹر ختم ہو رہا ہے۔ میں کوشش میں ہوں کہ کسی دوسرے مضمون میں داخلہ لے کر یونیورسٹی میں رہ جاؤں۔ کیونکہ میں اگر تم سے دور ہو گیا تو شاید جی بھی نہ سکوں۔ ڈیڈی بضد ہیں کہ میں نے کونسا نوکری کرنا ہے۔ لہٰذا تعلیم ختم کر کے زمینوں کا حساب کتاب سنبھال لوں مگر میری کوشش ہے کہ ابھی یہیں رہوں، تمہارے آس پاس...... کیا یوں نہیں ہو سکتا کہ تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔''

''دیکھو وقتی...... علم انسان کو زندگی کا شعور دیتا ہے اور ہمارے معاشرے میں آس امیدیں پیدا ہوتے ہی اپنی گرہوں میں ہمیں باندھنا شروع کر دیتی ہیں۔ یقیناً میرے والدین نے مجھے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے مگر اس بارے میں، میں اپنے والدین کے فیصلوں کی محتاج رہنا پسند کرتی ہوں۔ میں اپنے والدین سے بات کر کے تمہیں اس بارے میں بتا سکوں گی۔'' میں نے اس کی باتوں کا پہلی بار سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں کب تک منتظر رہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہاں سے جاتے ہی کالج سے چھٹی لے کر گھر جاؤں گی تب ہی تمہیں کچھ بتا سکوں گی۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''لیکن وعدہ کرو...... بہت جلد۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔

وہ دن ہم سب نے مل کر بہت انجوائے کیا۔ بہت سی یادوں کو اپنے ذہن کے دامن میں سمیٹا اور پھر یہ لمحے بھی پَر لگا کر ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ میں واپس آ کر کالج سے چھٹیاں لے کر گھر آئی اور ایک روز میں نے موقع پا کر والدہ سے بات کی۔ پہلے تو انہوں نے اسے ماننے سے یکسر انکار کر دیا لیکن پھر میرے اصرار اور ضد پر اس بات پر رضامندی ظاہر کر ڈالی کہ اگر میرے والد نے اجازت دے دی تو انہیں اعتراض نہ ہوگا......

وہ رات یقیناً میرے لیے نہایت صبر آزما تھی۔ میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گئی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں پانی پینے کے لیے باہر نکلی...... تو مجھے بابا کے کمرے کی لائٹ جلتی نظر آئی۔ میں نے سمجھا شاید وہ کسی

نوبت

ایک بزرگ گاڑی چلاتے ہوئے اپنے نوجوان بیٹے کو نوجوانوں کی تیز ڈرائیونگ کے نقصانات کے بارے میں بتا رہے تھے کہ ان کی گاڑی کے آگے ایک سائیکل سوار آ گیا اور بزرگ جو آہستہ اسپیڈ میں گاڑی چلا رہے تھے، بریک لگا دیے، یوں ایکسیڈنٹ سے بچاؤ ہو گیا۔

تو وہ اپنے بیٹے سے کہنے لگے۔ ''اگر میری جگہ تم ہوتے تو یہ ایکسیڈنٹ ضرور ہوتا۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''اس ایکسیڈنٹ کی نوبت ہی نہ آتی کہ میں اس جگہ سے ایک گھنٹا پہلے گزر چکا ہوتا۔''

غلط فہمی

ایک پروفیسر صاحب اپنے کسی دوست کے گھر رات کے کھانے پر گئے تو اپنے ساتھ لالٹین اس خیال سے لے گئے کہ شاید واپسی میں دیر ہو جائے گی اور اندھیرا بڑھ جائے گا۔ کھانے سے فارغ ہوتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اندھیری رات میں گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کے دوست نے ملازم کے ہاتھ خط بھیجا۔

''پروفیسر صاحب! آپ کے جانے کے بعد آپ کی لالٹین ملی۔ برائے مہربانی میرے طوطے کا پنجرہ واپس بھجوا دیں۔''

قابل دید

ایک شخص سونے کا کپ اٹھائے ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا اور کپ اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے دھم سے صوفے پر گر گیا۔ بیوی نے خوش ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

''دوڑ میں اور کتنے آدمی شریک تھے؟''

''صرف تین......'' شوہر نے جواب دیا۔ ''سب سے آگے میں تھا پھر پولیس والا...... پھر کپ کا مالک۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کیس کی تیاری میں لگے ہوں مگر جب امی کی آواز سنی تو میرے پاؤں جیسے وہیں جم گئے...... بابا...... میری امی کو سمجھا رہے تھے۔

''نجیدہ بیگم ......تم نہیں جانتیں اب زمانہ کس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ ہم سے پوچھ رہی ہے تو یہ اس کی اچھی پرورش کا نتیجہ ہے۔ پھر زندگی بھی تو اسی نے گزارنی ہے۔ تعلیم نے اسے اتنا شعور تو دے ہی دیا ہے کہ وہ اپنا برا بھلا سوچنے کے قابل ہوگئی ہے۔ اگر وہ لڑکا اسے پسند ہے تو ہمیں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے......

''اسے کہو......وہ اس کو مجھ سے ملائے اور لڑکے کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے ہمارے ہاں بھجوائے۔ جیسے ہر شریف خاندان کرتا ہے۔ ہماری طرف سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی......اسے اعتماد دو گی تو وہ تمہارے اعتماد کو عزت و تکریم دے گی۔ سمجھیں؟''

میں وہیں سے پلٹ آئی...... مجھے میری باتوں کا جواب مل گیا تھا۔ اب میرا جی چاہتا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکے وثیق کو اس بات کی اطلاع دوں...... چنانچہ میں نے اگلے روز ہی واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مجھے تیاری کرتے دیکھ کر والدہ نے مجھے بابا کے فیصلے سے متعلق بتا دیا تھا اور میں نے حامی بھی بھر لی تھی کہ اگلے مراحل انہی کی مرضی سے طے ہوں گے۔

کالج پہنچتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ وثیق کو فون کر ڈالا۔ کتنی ہی دیر اس کے کمرے میں فون کی گھنٹی بجتی رہی......شاید وہ کمرے میں موجود نہ تھا۔

اس روز جس قدر میرے دل کو بے چینی لگی ہوئی تھی، یہ صرف میں ہی جانتی تھی۔ کچھ توقف کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو اس کے روم میٹ بشارت سے بات ہوئی۔

''وثیق کہاں ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''مس شارینہ بول رہی ہیں؟'' اس نے تصدیق کی۔

''جی ...... جی میں شارینہ ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو گھر گیا ہے۔ شاید کل تک واپس آجائے۔'' اس نے بتایا۔

''جیسے ہی وہ واپس آئے......اسے کہنا مجھے کال کرے۔'' میں نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

اگلے دو تین دن اسی انتظار میں گزر گئے...... پھر میں کچھ یوں مصروف ہوئی کہ مجھے بات کرنے کا دھیان ہی نہ رہا۔ کتنے دنوں بعد اچانک ایک بار پھر مجھے خیال آیا۔ وثیق نے ابھی تک مجھے فون کیوں نہیں کیا......؟

اس خیال کے آتے ہی میں نے دوبارہ اس کا نمبر ملایا...... دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد ٹیلی فون اٹھایا گیا تو میرے دل کی دھڑکنوں میں یونہی بے ترتیبی سی در آئی۔

''وثیق بول رہے ہو؟'' دوسری طرف سے خاموشی پا کر میں نے پوچھا۔

''جی......!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کہاں رہ گئے تھے۔ میں اتنے دنوں سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ وثیق تمہیں میرا ذرا خیال نہیں رہا۔ تم کب آئے ہو۔ تمہیں کم از کم بتانا تو چاہیے تھا......خیریت تو تھی...... اتنے دن لگا دیے......'' وہ خاموشی سے سنتا چلا گیا اور میں بولتی رہی...... معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے اسے تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس نے بھی ایک بار میری بات نہیں کاٹی...... چنانچہ میں چپ ہو رہی۔ دوسری طرف سے ابھی تک خاموشی تھی۔

''کیا بات ہے وثیق میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟ میں نے تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری دینا ہے۔ جیسے بھی ہو...... مجھے آج ہی ملو...... بلکہ ابھی اور اسی وقت......!''

''شاری! میں بہت مصروف رہا ہوں۔ پہلا ایم اے بڑے اچھے نمبروں میں پاس کر لیا ہے۔ اب نفسیات میں داخلہ لے رہا ہوں۔ ابھی تو انہی چکروں میں ہوں لیکن تمہیں جلد ہی ملوں گا پھر باتیں ہوں گی۔'' اس کے لہجے کی سرد مہری مجھے عجیب سا احساس دلا رہی تھی۔

''لیکن آج ہی کیوں نہیں...... مجھے کچھ پتا نہیں...... تم فوراً مجھ سے ملو......!'' میں نے ضد کی۔

''کہا نا بے بی...... آج نہیں...... میں خود ہی تمہیں کال کروں گا۔ مجھے ذرا فارغ ہو لینے دو۔'' اس کے لہجے میں برف ایسی ٹھنڈک موجود تھی۔

''لیکن کب؟'' میں نے مایوس ہو کر کہا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ایک انہونی پریشانی نے خواہ مخواہ سر اٹھا لیا تھا۔

''ہوں...... بہت جلد تمہیں ملوں گا...... اچھا اللہ حافظ!'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

وثیق کے رویّے نے مجھے پہلے سے زیادہ پریشان کر ڈالا تھا اور میں سوچنے لگی تھی کہ اسے آخر کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اسے گھر والوں سے کوئی پریشانی ہو...... یہ

بھی تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے مضمون میں اسے داخلہ نہ مل رہا ہو...... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی تو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسے اس قدر پریشان کروں۔ میں اگر اس کی پریشانیوں کو بانٹ نہیں سکتی تو اسے کم از کم ہمدردی تو دے سکتی ہوں۔

میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ تب ہی میری روم میٹ ندمہ شہباز بولی۔

''شارینہ...... فوراً تیار ہو جاؤ۔ شہر چلتے ہیں۔''

''نہیں ندمہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں نے انکار نہیں سننا...... چلو اٹھو۔'' اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اور پھر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ شہر چلی آئی۔ بازار سے گزرتے ہوئے اچانک ندمہ نے مجھے پکڑ کر تقریباً جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ارے...... یہ تمہارا عروۃ الوثقیٰ تو نہیں...... مگر اس کے ساتھ کون ہے؟''

میں نے دیکھا، وہ لیڈیز ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان سے نکل رہے تھے۔ لڑکی نے ہاتھ میں دو تین ڈبے پکڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہی مجھے ایک بار یوں لگا جیسے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی ہوں۔

''ہے تو وہی......'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''پتا نہیں...... اس کو اللہ نے کس مٹی سے بنایا ہے۔ ہر دوسری لڑکی اس پر مرنے کو تیار ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا......'' میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''تو اور کیا...... میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ کہیں تم محسوس نہ کر جاؤ۔ ورنہ اسے جب دیکھو نئی لڑکی اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھرتی ہے اور یہ بھی اول درجے کا دغاباز ہے۔ فلرٹ کرنے میں تو ماہر ہے۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی نہیں چھوڑ رہا۔ اس کے ساتھ والے اپنی پڑھائی کرنے کے بعد چلے گئے مگر یہ ابھی یہیں کا یہیں ہے۔ پھر جائے بھی کیوں...... ہر بار کوئی نہ کوئی تتلی اس کی مٹھی میں موجود ہوتی ہے جس کا رنگ اترنے سے پہلے یہ دوسری طرف دوڑنے لگتا ہے۔'' ندمہ مجھے اس طرح بتا رہی تھی جیسے وہ بھی اس کے دام میں پھنس چکی ہو۔

وہ باتیں کر رہی تھی مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... واپس کالج آتے ہی میں نے اس کا نمبر ملایا۔ حیرانی کی بات تھی کہ فون بھی اسی نے اٹھایا۔

''شارینہ......'' میں نے مختصراً کہا۔

''ہاں بتاؤ...... اب کیا ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''تم نے آنا تھا...... ایک خوشخبری میں نے کب سے تمہارے لیے سنبھال رکھی ہے۔ اب تو وہ پرانی ہو چکی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔

''بتایا نا شاری میں مصروف ہوں۔ ابھی شاید ایک دو روز اور لگیں گے۔ تم ایسے ہی فون پر کہہ ڈالو...... کیا بات تھی؟''

اس کے لہجے میں بلا کی ٹھنڈک تھی۔

''میں نے گھر والوں سے بات کی تھی۔ وہ تمہارے لیے راضی ہیں مگر تم ایک بار میرے ساتھ چل کر بابا جان سے مل لو......!'' میں نے بتاتے ہوئے سوچا کہ وہ یہ بات سن کر اچھل پڑے گا مگر وہ تو سمندر کی طرح شانت تھا اور میری حالت یہ بتاتے ہوئے یوں ہو رہی تھی جیسے سمندر نے اپنے من کی ساری خالی سیپیاں نکال کر باہر پھینکی ہوں۔

''مل لوں گا بابا...... بس......'' اس نے اسی ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے مگر کب؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''جلد ہی......'' اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

''ہیلو...... ہیلو......'' میں نے کئی بار کہا مگر کال کٹ چکی تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ عروۃ الوثقیٰ میرے لیے کبھی فارغ نہ ہوا۔ میں فون کرتی تو ادھر سے اکتاہٹ بھرے لہجے میں بات کی جاتی...... ایک دو بار مقابلے میں آمنا سامنا بھی ہوا مگر ہر بار وہ میرا راستہ کاٹ جاتا...... اب تو بڑی شدت کے ساتھ مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ جن راستوں پر میں اب تک بڑی آس اور امیدوں کو لے کر چلتی رہی، اس کے آگے تو میرے لیے ہمیشہ سراب ہی رہے تھے اور پھر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ زندگی میں ہر امید پوری ہی ہو......

انہی دنوں میرا رزلٹ آ گیا اور میں نے بڑے اچھے نمبروں سے امتحان پاس کر لیا۔ اب میں پاپا کے ساتھ پریکٹس کرنے لگی تھی۔ میں نے انہی کا آفس جوائن کر لیا تا کہ انہی کے زیرِ سایہ اپنی ٹریننگ مکمل کر سکوں۔

پھر اس کام میں اتنی مصروف ہوئی کہ مجھے اس کا دھیان ہی نہ رہا۔ دوریاں، فاصلے سمیٹنے کے بجائے انہیں بڑھا دیتے ہیں۔

یہی کچھ میرے ساتھ ہوا...... پر وثقیٰ کا نام میری یادوں کا ایک ایسا خوشگوار لمحہ بن کر رہ گیا جس کو یاد کرتے ہوئے کبھی کبھی میں طمانیت محسوس کر لیتی تھی۔

لمحوں کا پنچھی ہر روز میرے ہاتھوں سے نکلتا اور پھر اڑتے اڑتے امیدوں کے افق میں دور کہیں جا کر ڈوب جاتا...... ایسے ہی دنوں میں بابا جان کا انتقال ہوگیا۔ یہ میرے لیے کسی سانحے سے کم نہ تھا مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں نے آہستہ آہستہ ان کے کام کو سنبھال لیا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب اپنی موت سے کچھ دن پہلے ایک کیس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''شاری...... اس کیس کو تم نے از خود ڈیل کرنا ہے۔ یہ تمہاری قابلیت کا امتحان ہے۔''

''مگر بابا...'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''آج ڈیل کرو گی تو تمہاری گھبراہٹ ختم ہوگی۔ کل اگر میں نہیں بھی ہوں گا تو ایسے کئی مراحل تمہیں خود سے طے کرنا ہوں گے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

اور ان کی بات درست ثابت ہوئی۔ وہ چلے گئے ...... اور میں اکیلی رہ گئی۔ شہر کے معروف ایڈووکیٹ حسن ضامن کی بیٹی شارینہ ضامن...... جو اس روز سے آج تک ان کے دفتر میں اکیلی وکالت کر رہی ہے۔ بابا جان کی تربیت اور ان کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرتے کرتے مجھے اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ اب مجھے کسی بھی کیس کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ بابا جان کے بعد جب میں نے آفس آنا شروع کیا تو آفس میں کام اس قدر زیادہ اور بکھرا ہوا تھا کہ مجھے اس کو سمجھنے میں کافی عرصہ بیت گیا۔ اب تو چاہت کے ان راستوں پر بھی دھول جم چکی تھی جن پر کبھی میرے ساتھ وثقیٰ کے قدموں کے نشان تھے...... دنیا بدل گئی اور کئی موسم بیت گئے۔

مگر آج ایک بار پھر اس نام سے وابستہ یادوں کا منہ کھل گیا۔ انہوں نے جب پہلی بار عروۃ الوثقیٰ کا نام لیا...... تو میرا دھیان فوراً ادھر چلا گیا تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں ایک لمحے کو ارتعاش پیدا ہوا۔ کہیں یہ وثقیٰ وہی تو نہیں...... اک بھولا بسرا میرا زندگی کا باب...... مگر میں نے اپنی اس سوچ کو خود ہی تھپک تھپک کر سلا دیا۔ آج رات بیٹھ کر میں نے بڑے اطمینان سے عابیہ کا دعویٰ تیار کیا...... اس کی نوک پلک سنواری اور دعویٰ تیار کرنے کے بعد میں نے اپنے ریک میں پڑے اس کے وزیٹنگ کارڈ سے نمبر لے کر اسے فون کر ڈالا۔ فون کی دوسری تیسری گھنٹی کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا۔

''شارینہ ایڈووکیٹ بات کر رہی ہوں۔ عابیہ سے بات کرا دیں۔''

''جی بول رہی ہوں۔'' وہی ڈری ڈری سی آواز آئی۔

''کیا بات ہے۔ تم ابھی تک خوف کے حصار میں ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ لوگ انتہائی چالاک اور خطرناک ہیں۔ ابھی کل ہی ڈیڈی کو ان کی طرف سے پھر دھمکی ملی ہے۔'' اس نے اسی لہجے میں بتایا۔

''فکر نہ کرو...... تھوڑے عرصے کی بات ہے۔ تم کل آ کر اپنے دعوے پر دستخط کر دو۔'' میں نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، آ جاؤں گی۔'' اس نے پژمردہ لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

دوسرے دن وہ میرے دفتر میں تھی۔ اس بار اس کے ساتھ اس کے والد کے بجائے شاید اس کا ڈرائیور تھا۔

''تمہارے والد نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں کام تھا...... اس لیے میں ڈرائیور کے ساتھ آ گئی۔'' اس نے جواب دیا۔

اس بار وہ نقاب میں نہیں تھی۔ وہ واقعی میری سوچوں سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔ میں نے منشی کو کہہ کر ان کے لیے چائے منگوائی اور دعوے کی کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔

''میں نے خلع کے لیے لگائے جانے والے الزامات درست لکھے ہیں کیا......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں...... مگر کم ہیں۔ ان ظالموں کا رویہ میرے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''میں سوچتی ہوں۔ تم اس دلدل میں آخر پھنس کیسے گئیں؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''مقدر خراب ہوں تو راستے خود بخود بن جایا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں کسی اور کالج میں پڑھتی تھی اور یہ یونیورسٹی کی طرف سے ایک تقریری مقابلے میں ہمارے کالج آیا تھا۔ وہاں اس نے پہلا انعام حاصل کیا۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسے مبارکباد دینے آئی اور پھر ایک مکڑی کی طرح اس نے اپنی باتوں کے جالے میں مجھے پھانس لیا۔ کچھ اس طرح کہ میں کسی معمول کی طرح اس کے سحر میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ مجھے اس کا احساس اس وقت ہوا، جب پانی بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نے گھر

والوں سے بات کی۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ وہ مان گئے۔ عروۃ الوثقیٰ کے والدین بھی ہماری دولت اور گھر والوں کے حسنِ سلوک سے متاثر تھے اور یوں ہماری شادی ہوگئی......

''میں بہت خوش تھی کہ مجھے میری محبت مل گئی تھی۔ عروۃ الوثقیٰ کی طبیعت میں ٹھہراؤ تو پہلے سے ہی موجود نہ تھا۔ اوپر سے اس کی والدہ کی لگائی بجھائی نے میری راہ میں کانٹے بکھیرنے شروع کردیے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی میری ساس نے مجھے بانجھ ہونے کے طعنے دینے شروع کردیے تھے۔ میں نے کئی بار ان کا ذکر وثقیٰ سے کیا...... وثقیٰ کو یہ پسند ہی نہ تھا کہ ہم شادی کے بعد ابتدائی سالوں میں ماں باپ بن جائیں۔ اس لیے اس نے سختی سے اس کا منع کردیا۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگی۔ ساس کی خواہش تھی کہ میری گود میں بچہ کھیلے مگر شوہر اس بات کو پسند نہ کرتا تھا اور نہ ہی اپنی والدہ کو اس بارے میں کچھ بتانے کے حق میں تھا۔

''پھر یہی بات جھگڑے کا باعث بننے لگی۔ بظاہر بڑی ہمدرد، بڑی ملنسار سمجھی جانے والی عورت ......جس کا معاشرے میں ایک مقام بھی ہو اور اعلیٰ حکومتی عہدے دار اس کی مٹھی میں بند بھی ہوں، جب گھر میں ساس کا روپ دھارتی، تو وہ کسی ناگن سے بھی زیادہ زہریلی بن جاتی۔ اوپر سے وثقیٰ اس کے اس قدر زیرِ اثر تھا کہ وہ اگر دن کو رات کہتی تو وثقیٰ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرلیتا...... بات یہیں سے بگڑنے لگی تھی......

''اور پھر اب تو وہ رات رات بھر گھر سے باہر رہتا...... وہ خود تو عیاشیاں کرتا پھرتا تھا مگر میں اس کے گھر کے پنجرے میں کسی بے بس پنچھی کی طرح تڑپتی رہتی۔ میں نے کئی بار اس سے اس کی والدہ کے رویّے کی شکایت بھی کی مگر ہر بار میری شکایت پر وثقیٰ ایک ہنگامہ کھڑا کردیتا اور پھر اب تو وہ میری پٹائی بھی کرنے لگا تھا۔

''مجھے وہ رات کبھی نہ بھولے گی۔ جب رات کے پچھلے پہر وثقیٰ میرے بیڈروم میں آیا تو اس کے ساتھ ایک بڑی ہی خوبصورت اور جوان لڑکی بھی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس کی دوست ہے اور رات یہیں گزارے گی۔

''مگر یہ میرا کمرا ہے۔ کسی فاحشہ کا کمرا نہیں۔ میں نے غصے میں کہا تو وثقیٰ نے مجھے اس بات پر پیٹنا شروع کردیا۔ ہنگامے کی آواز سن کر میری ساس آگئی...... تو اس نے بھی بیٹے کو سمجھانے کے بجائے مجھے برا بھلا کہنا شروع کردیا۔

''اس کتیا کو آج ہوش کیسے آگیا......'' میرے شوہر نے چیخ کر پوچھا۔

''شاید آج کہیں کوئی بھول ہوگئی ہے......'' اس کی والدہ نے ترشی سے جواب دیا۔ ''صبح اس بشیراں کی بچی سے پوچھوں گی......''

رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلی صبح جب گھر کی نوکرانی بشیراں کام پر آئی تو میرے سامنے ہی میری ساس نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا......

''کم ذات......رات دودھ میں دوا ملانا بھول گئی تھی۔''

''جی ...... بی بی جی ...... بھول ہوگئی......'' بشیراں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ذلیل ...... کمینی ...... میں نے تمہیں سختی سے کہہ رکھا تھا کہ چھوٹی بی بی کے دودھ میں دوا ملا دیا کرو۔ رات اس کی طبیعت خراب ہوگئی...... تمہاری ذرا سی غلطی سے رات بھر یہاں تماشا ہوتا رہا۔ یہ تو شکر ہے کہ اس نے یہاں کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ پہلے آنکھ کھل جاتی......تو جانے کیا ہوتا......''

اتنا کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لیے اور اسے جھٹکا دیا تو وہ زمین پر گر پڑی...... پھر میں نے دیر تک اس کی صرف چیخیں ہی سنی تھیں۔ میں حیران تھی کہ ہر رات مجھے اس قدر پیار اور کبھی ڈانٹ کر دودھ کیوں پلایا جاتا تھا تاکہ میں بے ہوش پڑی رہوں اور یہ لوگ کھل کر کھیلتے رہیں۔ اس بات کے انکشاف نے مجھے اور بھی دہلا کر رکھ دیا تھا۔

''پھر اس روز میں واپس والدین کے ہاں آگئی ...... یقیناً وہ لوگ ایک بہت بڑا گینگ تھے۔ برائیوں کا گڑھ یا ایک خطرناک مافیا...... آپ جو بھی انہیں کہہ لیں، وہ کم ہے۔ خطرناک سے خطرناک کام کرانا، قتل اور اغوا ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی لیے میں نے وہاں دوبارہ جانے سے انکار کردیا۔''

اس کی داستان ختم ہوئی تو میں نے اسے لے جا کر دعویٰ دائر کردیا۔ وہ تو چلی گئی مگر میرے ذہن میں ایک نئی داستان چھوڑ گئی۔ وہ واقعی مظلوم تھی۔ مجھے اس کے ساتھ نہ جانے کیوں ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ میں نے ذاتی دلچسپی لے کر عدالت سے اس کے نام سمن جاری کروا لیے تھے میری کوشش تھی کہ ایک دو تاریخوں میں ہی

اس کی جان چھوٹ جائے۔

میں نے خود دلچسپی لے کر وثقیٰ کو سمن بھجوائے تھے۔ اس روز عدالت میں ان کی پہلی پیشی تھی۔ تبھی اس رات مجھے عابیہ کا فون آیا تھا۔

''شارینہ جی...... کل پھر وہ ڈیڈی کو ملا تھا۔ اسے سمن مل گئے ہیں اور اس نے مجھے عدالت سے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں بندوبست کرلوں گی۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

شاید اسی لیے میں نے آتے ہی مقامی پولیس اسٹیشن سے کچھ نفری اپنی اور اس کی حفاظت کے لیے بلوالی تھی۔ عدالت لگنے کے کوئی دو تین گھنٹے بعد میں اسے لے کر عدالت میں آ گئی تھی۔ ہم عدالت کے باہر احاطے میں کھڑے تھے کہ ایک لمبی سی کالی کار میں سے کچھ غنڈا ٹائپ افراد بھاری اسلحے سمیت باہر نکلے۔

''وہ آ گئے......'' عابیہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

''گھبراؤ نہیں......'' میں نے پولیس کی نفری کو اشارہ کیا۔ ابھی ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے تھے جب سفید رنگ کی ایک اور کار آ گئی...... اس میں سے عروۃ الوثقیٰ باہر نکلا...... اور یہ وہی عروۃ الوثقیٰ تھا...... وہی باوقار شخصیت...... وہی چلنے کے انداز میں تمکنت اور غرور...... وہ چلتا ہوا میرے قریب سے گزرا۔ آگے نکلتے ہی وہ ایک لمحے کو رکا...... اور دوبارہ پلٹا۔

''اگر میں غلط نہیں...... تو...... تم...... !'' وہ بات کرتے کرتے رکا۔

''آپ غلطی پر ہو ہی نہیں سکتے...... کیونکہ اندازوں اور آس امیدوں پر جینے والے لوگ تو ہم ہیں۔ اس معاشرے میں رہنے والے وہ لوگ جو صحیح سمتوں کے ادراک میں چلتے چلتے ہمیشہ سراب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ہم ہی ہیں...... جو سپنوں کے گھروندے بناتے ہیں تو حالات کی گرم آندھی انہیں گرا جاتی ہے۔ میں شارینہ ہوں عروۃ الوثقیٰ...... !''

میں اس سے باتیں کر رہی تھی تو عابیہ اپنے والد کے ساتھ عدالت کی دیوار سے لگی کھڑی کانپ رہی تھی۔

''ہوں...... تو تم وکیل بن گئیں اور غالباً تم میرے خلاف کیے گئے میری بیوی کے کیس میں اس کی وکیل بھی ہو......''

اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا اور پھر اس نے پیچھے کی جانب دیکھا جدھر اس کے ٹاؤٹ کھڑے تھے۔

''ایک سودا ہو سکتا ہے وکیل صاحبہ...... تو کیوں نہ ہم باہر ہی یہ سودا طے کرلیں۔ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں...... زندہ اور ہمیشہ کے لیے...... اگر تم...... میرے پاس لوٹنا چاہو...... تو...... !''

اس کی گفتگو میں انتہائی عامیانہ پن جھلک رہا تھا۔

''ورنہ یہ تو آج ہی آزاد ہو جائے گی ہمیشہ کے لیے۔'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا...... عابیہ کے والد کو نہ جانے کہاں سے اس قدر جوش آ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جماتے ہوئے کہا۔

''حرامزادے...... کتے...... کیا سمجھتا ہے تو...... معاشرے کی ہر لڑکی تیری باج گزار ہے اور صرف تیری دسترس میں ہے...... میں عابیہ اور شارینہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا...... تو نے ایسی بات کرنے کی جرأت کیسے کی؟''

اس کے بعد لوگوں نے گولیوں کی آوازیں سنی۔ میں نے بڑی گھبراہٹ اور جرأت کے ساتھ عابیہ کو کھینچا اور عدالت کے کمرے میں لے گئی۔ عابیہ نے دوسرے ہاتھ سے اپنے والد کو پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ ہم دوڑ کر جج کے کمرے میں چھپ گئے اور عدالت کے باہر...... نہ جانے کب تک فائرنگ ہوتی رہی...... بڑی بھاگ دوڑ لگی رہی...... پھر جلد ہی سنا پولیس کی مزید نفری پہنچ گئی ہے۔

ہمیں علم نہیں ہم کب وہاں سے نکالے گئے...... سنا تھا ان کی فائرنگ سے دو شخص مارے گئے اور لاتعداد زخمی بھی ہوئے۔ ہاں البتہ اگلے روز میرے ساتھ وکلاء نے نہ صرف عدالتوں کا بائیکاٹ کیا بلکہ جب تک وثقیٰ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار نہیں کرلیا جاتا۔ انہوں نے احتجاج کا سلسلہ جاری رکھا...... وثقیٰ آج بھی جیل میں ہے...... عابیہ کو خلع مل چکا ہے اور وثقیٰ کی والدہ اور رشتے داروں کے بے پناہ دباؤ کے باوجود وثقیٰ کی ضمانت اس لیے نہیں ہو پا رہی کہ مدعی شارینہ ضامن ہے۔ اپنے وقت کے ایک بہترین ایڈووکیٹ حسن ضامن کی بیٹی...... جو ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس راستے پر چلنے کی خواہش مند ہے...... جہاں چلتے چلتے اچانک سراب سے نظر آنے لگتے ہیں۔ شاید اب یہ سراب ہی اس کی زندگی بن چکے ہیں۔



باعثِ زحمت

اے ایچ آلائی

کبھی چوروں کو پڑتے ہیں مور اور کبھی کہیں ڈاکوئوں کی ہو جاتی ہے چاندی... اسے ہی مقدر کی شرارت کہتے ہیں۔ جس سے جان جانے کا خطرہ تھا، وہ ہی جی جان سے اپنی جان نچھاور کر بیٹھا... یہ تو کمال ہو گیا جس پر ہر کوئی حیران تھا... واقعی قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔

مغرب سے درآمد شدہ ایک ڈکیتی کا سنسنی خیز احوال

مرد زنانہ موزے کو چہرے پر چڑھائے ہوئے تھا اور کیشیر سے کہہ رہا تھا۔ ”تمام رقم اس تھیلے میں ڈال دو۔“ اس نے ایک بڑا سا تھیلا کیشیر کے سامنے رکھ دیا۔ بینک میں اس وقت عملے کے علاوہ پانچ افراد موجود تھے۔ ان میں سے تقریباً سب ہی چیخ پڑے۔ ڈاکو فوراً ان کی طرف مڑا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”اگر آپ میں سے کسی نے ذرا حرکت کی تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔“ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سب سہم گئے تھے۔

کیشیر ابھی تک کچھ متردد تھا۔ ڈاکو نے اسے ڈانٹا۔

”جلدی کرو، ورنہ......“

کیشیر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”ابھی دیتا ہوں مگر آج قسمت خراب ہے باس! آج تو میرے پاس آٹھ ہزار ڈالرز سے زیادہ رقم ہے ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ڈبا کھولا اور نوٹوں کی گڈیاں نکال کر تھیلے میں ڈال دیں۔

جب ڈاکو مطمئن ہو گیا تو بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

اور ہاتھ بڑھا کر ایک عورت کا بازو پکڑ لیا جو سیاہ ماتمی

لباس پہنے ہوئے تھی۔ ”چلو میرے ساتھ!“ اس نے اسے دروازے کی طرف زبردستی دھکیلتے ہوئے کہا۔

عورت فریاد کرنے لگی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ تمہیں نظر نہیں آتا میں سوگ میں ہوں۔ ابھی تو میرے شوہر کو مرے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ میرے حال پر رحم کرو۔“

ڈاکو نے اسے زور سے جھڑکا۔ ”خاموش رہو۔ میں تمہارے شوہر کی جگہ پُر کرنے کو تیار ہوں۔“

عورت نے جدوجہد کرنا چاہی مگر ڈاکو اسے زبردستی گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا اور ایک کار میں دھکیل دیا۔ عورت زور زور سے چلّاتی رہی مگر کار فوراً اسٹارٹ ہو کر تیزی سے روانہ ہوگئی۔

اگلے روز کے اخبارات، بینک میں ڈکیتی کے واقعے سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں ڈاکو کی دیدہ دلیری کے تذکرے تھے اور یہ سوال بھی تھا کہ وہ سیاہ پوش عورت کون تھی جسے ڈاکو بطور یرغمال لے گئے تھے۔ اس کا جواب تو پولیس افسران کے پاس بھی نہیں تھا جو اس ڈکیتی کی تفتیش پر مامور کیے گئے تھے۔ انہیں بھی بینک میں موجود بقیہ چار افراد سے صرف اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ اس عورت کا نام مسز گروبر تھا اور وہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے آئی تھی۔

پولیس افسر نے مزید تحقیق کی تو اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ عورت اس شہر کی رہنے والی نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ شوہر کے انتقال کے بعد یہاں چلی آئی ہو اور اسی لیے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے آئی ہو۔

اسی روز دوپہر کے بعد بینک کے منیجر نے پولیس افسر کو فون کیا۔ ”آپ کے لیے ایک تازہ خبر ہے۔ پانچ منٹ پیشتر اسی ڈاکو نے فون کیا تھا کہ اسے بیس لاکھ ڈالرز چاہئیں۔ اس کے بعد ہی وہ اس عورت کو آزاد کرے گا۔“

افسر نے پوچھا۔ ”اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ رقم کس طرح وصول کرے گا؟“

”کیوں نہیں، وہ تو اتنا نڈر ہے کہ شاید کوئی بڑے سے بڑا بدمعاش بھی کیا ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ وہ کسی کو بھیج کر بینک سے رقم منگوالے گا۔ شرط یہ ہے کہ نوٹ سو، سو کے ہوں اور پرانے ہوں۔“

”بہت خوب! اس سے اچھی کیا بات ہے۔ ہم اس شخص کا پیچھا کر کے اس کی اصلی پناہ گاہ تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”لیکن اس نے تہدید کردی ہے کہ اگر اس کے فرستادہ کا ایک بال بھی بیکا ہوا یا کسی نے اس کے ساتھ بداخلاقی کا سلوک کیا تو وہ عورت کو فوراً قتل کردے گا۔“

”ارے آپ فکر نہ کریں، میں تو زندگی بھر ایسے ہی مجرموں سے نمٹتا آیا ہوں۔ بہرحال ان محترم چور صاحب سے ہرگز بدسلوکی نہیں کی جائے گی۔ البتہ بڑی خاموشی سے اس کا پیچھا کر کے یہ ضرور معلوم کیا جائے گا کہ وہ یہ رقم کس کو دیتا ہے۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ اس یرغمالی عورت کو کب آزاد کرے گا؟“

”رقم کی وصولی کے ایک روز بعد۔“

”بہت خوب! اچھا اب آپ کسی پر یہ ظاہر مت کیجیے گا کہ آپ نے پولیس کو مطلع کردیا ہے۔ میں خود کیشیر کے روپ میں بینک میں موجود ہوں گا۔“

چار بجے جب بینک کے کاروباری اوقات ختم ہوچکے تھے، ایک ٹیکسی بینک کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے ایک جوان لڑکا باہر نکلا جو دراز قد اور سرخ بالوں والا تھا۔ اس نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور بینک میں داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں مشکی رنگ کا ایک بڑا سا بریف کیس تھا۔ اس نے اندر آتے ہی سیدھا کاؤنٹر کا رخ کیا اور کیشیر سے بولا۔

”میں وہ رقم لینے آیا ہوں......“

پولیس افسر نے جو اس وقت کیشیر کے روپ میں تھا، اسے غور سے دیکھا اور نوٹوں کی گڈیاں، بریف کیس میں بھر کر اس کے حوالے کردیا۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا اور ٹیکسی میں ڈرائیور کی بغلی نشست پر بیٹھ کر اس کو چلنے کا اشارہ کیا۔

پولیس افسر جو اس کے پیچھے ہی باہر نکلا تھا، کار میں بیٹھ کر جلدی جلدی وائرلیس کے ذریعے پولیس اسکواڈ کو اطلاع دینے میں مصروف ہوگیا۔

”ٹیکسی نمبر 15173 ......شہر سے شارمن نامی قصبے کی طرف جانے والی سڑک پر جارہی ہے، اس پر نظر رکھی جائے۔ کسی قسم کی مزاحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے شخص کو اس تعاقب کا علم نہیں ہونا چاہیے۔“

لیکن پولیس افسر نے ٹیکسی کی منزلِ مقصود کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ ٹیکسی پانچ منٹ بعد ہی ایک ہوٹل کے پاس جاکر رک گئی اور نوجوان نکل کر ہوٹل میں چلا گیا۔

پولیس افسر نے یہ اطلاع پاتے ہی اطلاع دینے والے سے کہا۔ ”تم میں سے ایک شخص اس نوجوان کے پیچھے ہوٹل میں جائے کیونکہ ممکن ہے وہ ہوٹل میں کسی کو یہ بریف کیس دے دے اور باقی افراد ہوٹل کے سامنے موجود رہیں۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔“

جب پولیس افسر ہوٹل کے سامنے کار سے اترا تو خفیہ پولیس کے ایک سارجنٹ نے اسے بتایا کہ وہ نوجوان اب تک

ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ بریف کیس اب بھی اس کے پاس ہے۔

وہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ نوجوان چائے سامنے رکھے بیٹھا تھا اور بریف کیس اس کے دونوں پیروں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک کونے کی میز پر بیٹھ گیا۔ اس کی تمام تر توجہ اسی نوجوان کی طرف تھی۔ بہت دیر ہو گئی یہاں تک کہ ہوٹل کے بند ہونے کا وقت آ گیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہے کیونکہ وہ ہر آنے جانے والے کو متوقع نظروں سے دیکھتا تھا۔

جب ایک بیرے نے تمام گاہکوں سے درخواست کی کہ اب وہ باہر تشریف لے جائیں کیونکہ ہوٹل بند ہونے والا ہے تو وہ نوجوان نیم دلی سے باہر نکل گیا۔ ایک دو منٹ باہر کھڑا آنے جانے والوں کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر ایک طرف چل پڑا۔

پولیس افسر فوراً اس کے پاس پہنچا۔ وہ بہ مشکل سولہ سترہ سال کا رہا ہوگا۔

''بیٹے! کیا بات ہے، تم جس کا انتظار کر رہے تھے، وہ نہیں آیا؟''

نوجوان ٹھٹک کر رک گیا اور بولا۔ ''آپ...... آپ کون ہیں؟''

''میرا تعلق پولیس سے ہے اور یہ میرا کیس ہے...... مگر مجھے تم سے نہیں، اس بریف کیس سے دلچسپی ہے۔''

''مگر کیوں؟ آپ اطمینان رکھیے اس میں بم نہیں ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس میں جو شے ہے، وہ بم سے زیادہ اچھی ہے۔ اب تم میرے ساتھ پولیس کار میں آ جاؤ تاکہ کچھ گفتگو ہو سکے۔''

نوجوان بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ آ گیا۔

''جس نے تمہیں بینک بھجوایا تھا، وہ کون ہے اور اب کہاں ملے گا؟''

نوجوان صادقانہ لہجے میں بولا۔ ''میں اس کو نہیں پہچانتا۔ کل مجھے ایک اجنبی آدمی ملا تھا اور اس نے مجھے یہ بریف کیس دے کر کہا تھا کہ اگر میں بینک جا کر اس کی امانت اس میں لے آؤں تو مجھے ایک ہزار ڈالرز انعام دے گا۔ حسنِ نیت کے مظاہرے کے طور پر اس نے یہ رقم مجھے پہلے ہی دے دی۔ اس نے مجھے یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ مقررہ وقت پر ایک ٹیکسی مجھے ایک طے شدہ مقام پر مل جائے گی۔ مجھے اسی میں آنا اور جانا ہے۔ پھر ہوٹل میں پہنچ کر وہ بریف کیس مجھ سے حاصل کر لے گا۔ پتا نہیں وہ کیوں نہیں آیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رقم کا کیا کروں؟ اور اس آدمی کے آنے تک اسے کہاں رکھوں؟''

پولیس افسر نے بریف کیس اس کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ اسے کھولتے ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اندر کاغذ کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔

پولیس افسر کو نوجوان کی باتوں پر شک نہیں تھا لہٰذا اس نے پوچھا۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ بینک سے نکلنے کے بعد ہوٹل تک پہنچنے کے درمیان کیا کیا ہوا۔ بریف کیس اس تمام وقت میں تمہارے ہاتھ میں تھا یا نہیں؟''

''نہیں! ڈرائیور نے بریف کیس میرے ہاتھ سے لے کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا اور اترتے وقت مجھے اٹھا کر دے دیا تھا۔''

''اوہ میں سمجھا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''یہ ڈاکو تو میری توقع سے بھی زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ ایک جیسے دو بریف کیس لایا ہوگا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ٹیکسی کا نمبر میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ڈرائیور سے معلوم ہو جائے گا۔''

لیکن اس کی یہ امید بھی اس وقت دم توڑ گئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ٹیکسی چوری کی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ بھی بدل دی گئی تھی۔ کام ختم ہو جانے کے بعد ٹیکسی کو ایک سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔

اگلے روز بینک کے منیجر کو اسی سیاہ پوش عورت کا ٹیلی فون وصول ہوا۔

''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں جناب کہ آپ نے میری جان کی خاطر بیس لاکھ قربان کر دیے۔''

منیجر خوش ہو کر بولا۔ ''مسز گروبر! آپ آزاد ہو گئیں؟ خیریت سے تو ہیں نا؟''

''جی ہاں! آپ کا بہت بہت شکریہ!''

''شکریہ کس بات کا خاتون! رقم تو آتی جاتی ہے۔ انسان کی جان کا بدل نہیں مل سکتا۔ مگر آپ ہیں کہاں؟ پولیس تو آپ کی تلاش میں ہے...... تاکہ ان ڈاکوؤں کا کچھ پتا چل سکے۔''

عورت بولی۔ ''میں مجبور ہوں جناب! ان مجرموں نے مجھے تنبیہ کی ہے کہ اگر میں نے زبان کھولی تو مجھے فوراً ہلاک کر دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

چھ ہفتے بعد پولیس افسر کو جنوبی امریکا سے ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''ہم دونوں تفریح میں مشغول ہیں اور آپ کو جو زحمت ہماری وجہ سے ہوئی ہے، اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔''

نیچے مسٹر اینڈ مسز گروبر کے دستخط تھے۔

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔





مئی کا مہینا قریب الختم تھا۔ موسم گرما بڑی تیزی سے اپنے جوبن کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ اگرچہ دن ڈھل چکا تھا اور رات نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا تاہم فضا میں ابھی تک ایک خاص نوعیت کی حدت اور شدت موجود تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت درجۂ حرارت تیس ڈگری سینٹی گریڈ کے قریب رہا ہوگا۔ یہ بیرونی درجۂ حرارت کا ذکر ہے جبکہ میں تو اس وقت ٹھنڈے ٹھار اسٹور کے اندر تھا۔ یہ اسٹور ''سرکل اے'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔

''سرکل اے'' ایک گروسری اسٹور تھا جو براز وریا کاؤنٹی میں خاصی شہرت کا حامل تھا۔ براز وریا امریکی ریاست ٹیکساس میں واقع ایک کاؤنٹی ہے جس کے شہر اینگلٹن میں سرکل اے گروسری تھی جہاں میں ایوننگ شفٹ میں کام کرتا تھا۔

کراچی اور ٹیکساس کا موسم کم و بیش ایک جیسا ہی ہے اور ٹیکساس کے مختلف شہر خصوصاً اینگلٹن اپنے ماحول کے باعث دیکھنے میں بھی کراچی جیسا ہی نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم گلشن اقبال یا نارتھ ناظم آباد میں گھوم رہے ہوں۔

ایوننگ شفٹ میں ہم دو افراد پورے اسٹور کو سنبھالتے تھے۔ ہماری ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے رات گیارہ بجے تک تھی۔ مارننگ شفٹ صبح چھ بجے سے دوپہر دو بجے تک ہوا کرتی تھی اور اس شفٹ میں بھی دو افراد ہی کام کرتے تھے۔ مضافات میں واقع ہونے کی وجہ سے ''سرکل اے'' میں تیسری شفٹ میں کام نہیں ہوتا تھا۔ رات گیارہ بجے اسٹور بند کر دیا جاتا تھا جبکہ رونق والے پرہجوم شہروں میں اس نوعیت کے اسٹورز چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے اور رات گیارہ بجے سے صبح چھ بجے تک والی تیسری شفٹ کو گریویارڈ شفٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کلاک رات کے دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میری چھٹی میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ آج مجھے چھٹی کا انتظار اس لیے بھی تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے شارو سے ملاقات کرنا تھی۔ شارو میری ایک خاص الخاص دوست تھی۔ شارو کا تعلق برازیل سے تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے ٹیکساس ہی میں مقیم تھی۔ ہماری دوستی زیادہ پرانی نہیں تھی تاہم اسے گہری دوستی ضرور کہا جا سکتا تھا۔

میرے ساتھی نظار نے مجھ سے کہا۔ ''علی! لگتا ہے گرمی نے کسٹمرز کی مت مار دی ہے۔ وہ ہمارے اسٹور کا راستہ ہی بھول گئے ہیں۔''

''اگر وہ اسٹور کا راستہ بھول گئے ہوتے تو ہمارے کولرز تیسری مرتبہ خالی نہ ہو جاتے۔'' میں نے اسٹور کے ایک کونے میں موجود کولرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کولرز'' امریکی اسٹورز کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ آپ اسے کنگ سائز کے فریج سمجھ لیں۔ کولرز میں تمام اقسام کے سافٹ ڈرنکس، بیئرز اور ڈیٹرائٹ کے ٹن رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ ٹھنڈے رہیں۔ ڈیٹرائٹ کے ٹن میں گلوکوز کا پانی ہوتا ہے جو موسم گرما میں بہت چلتا ہے۔ ''سرکل اے'' میں لیکور یعنی شراب فروخت نہیں کی جاتی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو علی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ گرم موسم کا اثر ہے۔ خیر! اسٹور بند کرنے سے پہلے تمہیں کولرز کو بھرنا ہوگا۔''

''بے شک! یہ تو جاب کا حصہ ہے نظار۔'' میں نے کہا۔ ''مارننگ شفٹ والوں کو ہر شے ریڈی ملنا چاہیے۔''

نظار کا تعلق پاکستان سے تھا۔ اس کی فیملی کراچی میں رہتی تھی۔ اس نے امریکا ہی میں شادی کر لی تھی اور اپنی بیوی کے ساتھ اینگلٹن ہی میں رہائش پذیر تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ نظار کی عمر چھبیس سال تھی اور وہ اسماعیلی کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کئی سال پہلے ٹیکساس آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

ہمارے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ دو میکسیکن لڑکے اسٹور میں داخل ہوئے۔ دونوں کی عمریں پچیس کے اریب قریب تھیں۔ وہ صورت شکل سے بڑے بے پروا اور آوارہ دکھائی دیتے تھے۔ ٹیکساس میں میکسیکن اور ریڈ انڈین افراد کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ بڑے جفاکش اور سخت جان ہوتے ہیں۔ محنت مزدوری کے کاموں میں زیادہ تر یہی نظر آتے ہیں۔

دونوں میکسیکن نے اسٹور میں آنے کے بعد کسی چیز کا آرڈر نہیں دیا بلکہ متلاشی نظروں سے اسٹور کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے۔ جس شیلف پر تیل کی بوتلیں اور گیلن رکھے تھے، اس شیلف کو انہوں نے بہ غور دیکھا پھر اسٹور میں نصب سی سی ٹی وی کیمروں پر نگاہ ڈالی اور چپ چاپ اسٹور سے باہر نکل گئے۔

''یہ کیا بات ہوئی......!'' نظار نے بیزاری سے کہا۔ ''اگر کچھ خریدنا نہیں تھا تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی... خوامخواہ اپنا اور ہمارا وقت برباد کیا۔''

نظار کا اشارہ ان دو میکسیکن کی طرف تھا جو چند لمحے پہلے اسٹور سے خالی ہاتھ رخصت ہوئے تھے۔ میں نے کولرز کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

''نظار! ہماری تو یہ ڈیوٹی ہے جس کی ہمیں تنخواہ ملتی ہے لہٰذا ہمارا وقت برباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جہاں تک ان کے وقت کے برباد ہونے کا تعلق ہے تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم نے وہ شعر نہیں سنا......''

''کون سا شعر؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

میں نے کولرز کو بھرتے ہوئے جواب میں یہ شعر سنا دیا۔

''کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں''

''یار علی! تم بھی کمال کرتے ہو۔'' اس کی بیزاری میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے ایسا کیا کر دیا جو تمہیں کمال نظر آ رہا ہے؟ کولرز کی فلنگ تو روز کا معمول ہے یار۔''

''میں کولرز کی فلنگ کی بات نہیں کر رہا۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ سردیوں کی نہیں، گرمیوں کی شام ہے۔''

''اوہ ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے یار! شام تو شام ہی ہوتی ہے، گرمیوں کی ہو یا سردیوں کی اور جہاں تک ان دو میکسیکن کا تعلق ہے تو یار، یہ گاہک ہیں۔ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں، موت اور گاہک کا کوئی بھروسا نہیں، یہ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر وہ دونوں میکسیکن دوبارہ اسٹور میں داخل ہوئے۔ اس وقت کاؤنٹر پر نظار اکیلا ہی تھا۔ میں عقبی حصے میں کولرز کی فلنگ میں مصروف تھا۔

انہوں نے نظار سے ایک لیٹر آئل والی بوتل خریدی اور ان میں سے ایک تیل والی بوتل لے کر اسٹور سے باہر نکل گیا۔ دوسرے نے نظار سے پوچھا۔

''آئل کے کتنے پیسے ہیں؟''

نظار نے اسے قیمت بتا دی۔

میکسیکن نے ادائیگی کے لیے جیب سے پرس نکالنے کے بجائے گن نکال لی اور نظار کو نشانے پر رکھتے ہوئے غرایا۔ ''پرس، کیش...... سب کچھ میرے حوالے کر دو...... ہری اپ!''

کولرز کے ساتھ مصروف میرے ہاتھ رک گئے اور میں نے پلٹ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ شاید میکسیکن نے میرے چہرے پر کسی قسم کی مہم جوئی کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ وہ گن کو لہراتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''اے...... کوئی ہوشیاری نہیں ورنہ گولی مار دوں گا۔''

اس قسم کی صورتِ حال کے لیے اسٹور کے مالک نے ہمیں واضح احکامات دے رکھے تھے۔ ہمیں کسی بھی قیمت پر مزاحمت نہیں کرنا تھی لہٰذا نظار نے باس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا پرس میکسیکن کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ کیش رجسٹر میں جتنے پیسے تھے، وہ رقم بھی بے چون و چرا اس گن بردار ڈاکو کو تھما دی۔

میکسیکن ڈاکو نے مال سمیٹنے کے بعد گن چلا دی۔ پہلی گولی نظار کے سینے میں لگی اور وہ کاؤنٹر کے پیچھے ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا فائر اس نے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کیا تھا اور اس کا ٹارگٹ میں تھا مگر نشانہ خطا ہو گیا چنانچہ میں سلامت رہا۔

اس صورتِ حال نے مجھے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ ٹیکساس اسٹیٹ میں چوری ڈکیتی کی واردات کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے ہمیں مزاحمت کی اجازت نہیں تھی لیکن یہاں تو سب کچھ خلافِ توقع ہوا تھا۔ نظار نے گن بردار میکسیکن کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے سارا کیش اس کے حوالے کر دیا تھا پھر فائرنگ کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

میں بجلی کی سی سرعت سے چلتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچا اور کاؤنٹر کے پیچھے اسٹور کے فرش پر پڑے نظار کا جائزہ لیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ گولی نے اس کے دل کو چھید ڈالا تھا سینے پر سے اس کی شرٹ خون میں تر بتر ہو رہی تھی۔ اس کے بدن کو ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ ان لمحات میں میرا ذہن برق کی رفتار سے کام کرنے لگا۔ میں نے اگلے ہی لمحے اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ فون کر کے اس سانحے کی اطلاع دی۔ اس کے ساتھ میں نے نائن الیون پر بھی ایک کال مار دی۔ اس کے بعد میں نے اسٹور کے مالک کو فون کیا۔ دوسری طرف فوراً کال اٹینڈ کر لی گئی۔ باس نے پوچھا۔

''علی! خیریت...... تم کافی گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو؟''

''اسٹور میں ڈکیتی کی واردات ہو گئی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میکسیکن ڈکیت سارا کیش لوٹ کر لے گئے ہیں اور نظار کو انہوں نے گولی مار دی ہے ......'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

''کک...... کیا ......؟'' دوسری جانب باس اچھل پڑا۔ ''میں نے تم لوگوں کو سختی سے منع کر رکھا ہے تا کہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرنا۔''

''نظار نے مزاحمت نہیں کی تھی باس۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"پھر......؟" باس کی حیرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"لگتا ہے اس میکسیکن کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے نائن ڈبل ون پر کال کی؟"

"جی کردی ہے۔" میں نے بتایا۔ "اور اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ والوں کو بھی اطلاع دے دی ہے۔"

"اوکے...... میں آرہا ہوں۔" باس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

باس کی رہائش شوگر لینڈ کے علاقے میں تھی جو اینگلٹن سے لگ بھگ اناسی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ کم و بیش پچاس منٹ کی ڈرائیو تھی جبکہ اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ صرف ڈیڑھ کلومیٹر دور کینن ڈرائیو پر تھا۔ یہ چند منٹ کا فاصلہ تھا۔ گویا اب تب میں پولیس وہاں پہنچنے والی تھی۔

اسٹور کے اندر ہونے والی فائرنگ کی آواز باہر بھی سنی گئی تھی، ہمارے پڑوس میں جو گھر تھا، وہاں سے دو افراد نکل کر میرے پاس پہنچ گئے اور صورت حال کو جاننے کے لیے مجھ سے مختلف سوالات کرنے لگے لیکن مجھے زیادہ دیر تک ان کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا پڑا کیونکہ اگلے ہی لمحے فضا میں ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی تھی پھر جلد ہی وہ ہیلی کاپٹر دکھائی بھی دینے لگا۔ یقیناً یہ پولیس والے تھے۔

"سرکل اے" گروسری کے سامنے اچھی خاصی کھلی جگہ تھی۔ ہیلی کاپٹر کو بڑی مہارت کے ساتھ وہاں اتار لیا گیا۔ ہیلی کاپٹر کے اندر سے چار افراد برآمد ہوئے۔ ان کے بدن پر پولیس کا مخصوص یونیفارم تھا۔ ان میں سے دو نے ایک اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔

وہ لوگ اسٹور کے اندر پہنچے اور آن واحد میں انہوں نے شدید زخمی نظار کو اسٹریچر پر ڈالا اور ہیلی کاپٹر کی جانب دوڑ پڑے۔ باقی دو پولیس والے میرے پاس رک گئے۔ ان میں سے ایک سینئر تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر دوسرے سے کہا۔

"تم بھی ساتھ جاؤ۔"

"اوکے سر۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

"لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں۔" آفیسر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "فوراً سٹی اسپتال پہنچو۔ میں اسپتال میں فون کردیتا ہوں۔"

پہلے اسٹریچر کو ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا گیا پھر تیسرا پولیس والا بھی ہیلی کاپٹر پر سوار ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں نظار کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا کر رہا تھا۔

ہرمن میموریل سٹی اسپتال یوسٹن میں تھا اور یہ اسپتال گیسنر روڈ پر واقع تھا۔ یوسٹن اور اینگلٹن کے درمیان اکہتر کلومیٹر کا فاصلہ تھا اسی لیے نظار کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے یوسٹن منتقل کیا گیا تھا تاکہ اسے جلد از جلد فوری طبی امداد دی جاسکے۔

پولیس آفیسر نے میری طرف متوجہ ہونے سے پہلے دو فون کیے۔ ایک سٹی اسپتال یوسٹن اور دوسرا پولیس اسٹیشن۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ڈیپارٹمنٹ سے دو افراد بلائے تھے۔ جس دوران میں نظار کو ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا گیا پولیس آفیسر کرائم سین یعنی جائے وقوعہ کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

"تمہارا نام؟" اس نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اسد علی۔"

"سرکل اے پر کب سے کام کر رہے ہو؟"

"تقریباً ایک سال سے۔"

"جس لڑکے کو گولی لگی، اس کا کیا نام ہے؟"

"نظار......" میں نے بتایا۔

"جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، تم دونوں کے علاوہ اسٹور میں اور کون تھا؟" آفیسر رفتہ رفتہ تفتیش کو آگے بڑھانے لگا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "صرف ہم دونوں ہی تھے۔"

"اسٹور کا منیجر کہاں ہے؟"

امریکا میں اسٹور کے مالک کو منیجر کہا جاتا ہے۔ میں نے بتایا۔ "باس اپنے گھر میں ہے۔ میں نے اسے اس واقعے کی اطلاع دے دی ہے۔"

"تمہارے منیجر کا کیا نام ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔ "اور وہ کہاں رہتا ہے؟"

"جیک خواجہ۔" میں نے بتایا۔ "وہ فیئر مونٹ اپارٹمنٹس، شوگر لینڈ میں رہتا ہے۔"

ہمارے باس کا اصل نام ذوالفقار خواجہ تھا لیکن امریکن اسٹائل کے مطابق اس نے اپنا نام جیک خواجہ رکھ لیا تھا۔ "تم سرکل اے سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

''کہیں نہیں، یہ میری پہلی جاب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''گڈ!'' اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا پڑھ رہے ہو؟''

''سائیکالوجی۔'' میں نے بتایا۔ ''براز وسپورٹ کالج سے بیچلر ڈگری کر رہا ہوں۔ امتحانات دے چکا ہوں۔ آج کل فارغ ہوں۔''

''تم نے بتایا کہ دو میکسیکن اسٹور میں آئے تھے۔'' وہ تفتیش کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک آئل کی بوتل لے کر باہر چلا گیا۔ دوسرے نے گن نکال کر کیش لوٹا اور تمہارے ساتھی کو شوٹ کر دیا... ہوں؟''

''جو واقعہ پیش آیا میں نے آپ کو وہی بتایا ہے۔''

''کیا تمہارے ساتھی اور میکسیکن کے بیچ کوئی تلخ کلامی ہوئی تھی؟'' آفیسر نے استفسار کیا۔ ''جس سے مشتعل ہو کر میکسیکن نے گن نکال لی ہو۔''

''سر! ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے وہ میکسیکن نفسیاتی مریض لگتا ہے۔''

''مجھے بھی......'' آفیسر نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''وہ کتنا کیش لوٹ کر لے گئے ہیں؟''

''تقریباً ایک ہزار ڈالرز۔'' میں نے بتایا۔ ''روزانہ دن میں بارہ اور ایک بجے کے دوران میں باس اسٹور کا چکر لگاتا ہے اور کیش کا زیادہ حصہ وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔''

''میکسیکن نے جس وقت تمہارے ساتھی کو شوٹ کیا تم کہاں تھے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اسٹور کے کس حصے میں تھے؟''

''میں کولرز میں فلنگ کر رہا تھا۔'' میں نے اسٹور کے عقبی حصے میں واقع کولرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ آفیسر سبک قدموں سے چلتے ہوئے کولرز کے قریب پہنچ گیا پھر چند لحات تک وہ کولرز کے گرد و پیش کا تنقیدی جائزہ لیتا رہا۔ اس کی عقابی نگاہ کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہارے بیان کے مطابق میکسیکن نے دو فائر کیے تھے۔ ایک تمہارے ساتھی نظار کے سینے پر اور دوسرا تم پر۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نو سر! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے آفیسر کی تائید میں کہا۔ ''ایسا ہی ہوا تھا۔''

''ایک گولی نظار کے سینے میں لگی اور دوسری گولی......'' اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور میری آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے، سنسنی خیز لہجے میں سوال کیا۔ ''مسٹر علی! دوسری گولی کہاں گئی؟''

مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔

''کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے؟''

''بات یقین اور بے یقینی کی نہیں مسٹر علی!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''پولیس کو ہر چیز کا ثبوت چاہیے ہوتا ہے۔ اگر ایک گولی تم پر بھی چلائی گئی تھی اور تم اس گولی سے محفوظ رہے ہو تو پھر اصول کے مطابق وہ گولی یہیں کہیں ہونا چاہیے...... ہونا چاہیے یا نہیں؟''

''جی بالکل ہونا چاہیے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور وہ کہیں بھی نہیں ہے......'' آفیسر نے ایک خاص انداز میں کندھے اچکا دیے۔

''آپ تلاش کریں۔'' میں اتنا ہی کہہ سکا۔ ''گولی آپ کو ضرور کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر دوسری گولی چلی ہے تو پھر اسے ضرور مل جانا چاہیے...!''

شاید آفیسر یہ سوچ رہا تھا کہ میں دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوں۔ اس واردات میں میرا کوئی ہاتھ ہے اور میں خود کو بچانے کے لیے اسے کوئی من گھڑت کہانی سنا رہا ہوں۔ اس دوران میں آفیسر کی مدد کے لیے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ایک گاڑی میں دو پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ آفیسر نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور مجھے لے کر وہ کاؤنٹر کی جانب آ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

آفیسر نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ''یس......!''

پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی اور میں اس کے چہرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اضطراری انداز میں دو تین مرتبہ ''اوں''...... ''ہوں''...... ''یس'' کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اوکے...... تم وہاں کے معاملات کو سنبھالو۔''

کال ختم ہوئی تو میں نے آفیسر سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج

کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میری تشویش میں اضافہ ہوگیا۔

''ایک بری خبر ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیسی بری خبر......؟''

''نظار چلا گیا ......'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اسپتال پہنچنے سے پہلے ہیلی کاپٹر ہی میں وہ ختم ہوگیا تھا ......سوسیڈ۔''

میرا دل کٹ کر رہ گیا گزشتہ ایک سال میں نظار کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ ہمارے بیچ گہری دوستی قائم تھی۔ اس کی ناگہانی موت کا سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی ہو۔ میرے ذہن میں اچانک وہ گفتگو تازہ ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں کے بیچ ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا ...... نظار! موت اور گاہک کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔

کاش! میں نے ایسا نہ کہا ہوتا ...... مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے الفاظ یوں حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ گاہک اور موت دونوں ایک ساتھ اسٹور میں داخل ہوئے تھے اور ہنستے مسکراتے نظار کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔

اس سے پہلے کہ آفیسر مجھ سے مزید کوئی سوال کرتا' میرا اسیل فون جاگ اٹھا۔ میں نے سیل کے ڈسپلے پر نظر ڈالی۔ وہاں شارو کا نام چمک رہا تھا۔

میں نے آفیسر کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ایک دوست کا فون ہے۔'' میں نے بتایا۔

''گرل فرینڈ؟''

''یس......!''

''اٹینڈ کرو۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

میں نے کال ریسیو کی اور کہا۔ ''ہیلو شارو!''

''کیسے ہو علی؟'' وہ چہکی۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو؟'' وہ کھنک دار آواز میں مستفسر ہوئی۔ ''گیارہ تو بج گئے۔ اسٹور سے کب نکلو گے؟''

''شارو! آج کی ملاقات کینسل۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''کیوں......کیا ہوا؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

''اسٹور میں ڈکیتی کی واردات ہوگئی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''نظار کو گولی لگی ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ میں ابھی اسٹور سے نہیں نکل سکتا۔ ہم کل ملیں گے......اوکے؟''

''اوکے......'' اس نے کہا پھر پوچھا۔ ''نظار ٹھیک تو ہے نا؟''

''نہیں......'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں بتایا۔ ''ہی از ڈیڈ......!''

''مائی گاڈ......'' وہ چلائی۔ ''ویری بیڈ......بہت افسوس ہوا......کیا میں تمہاری مورل سپورٹ کے لیے آؤں؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے بوجھل دل سے کہا۔

''اوکے ......ٹیک کیئر۔'' شارو کی ہمدردی بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

الوداعی کلمات کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

''تمہارے منیجر کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔'' آفیسر نے مجھ سے کہا۔ ''وقت گیارہ سے آگے بڑھ چکا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے تائید میں گردن ہلا دی۔

اسی لمحے باس اپنی قیمتی کار میں وہاں پہنچ گیا۔ آفیسر مجھے چھوڑ کر باس کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ ان کے بیچ پندرہ بیس منٹ تک خاصی سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ وہ دونوں مجھ سے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ میں ان کی باتیں سن نہیں سکتا تھا تاہم مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ان کے درمیان میں ہی زیر بحث تھا۔ آفیسر باس سے بات کرتے ہوئے بار بار میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے تک پولیس کی تفتیشی سرگرمیاں جاری رہیں پھر آفیسر اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ اسٹور سے رخصت ہوگیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اور باس سے چند دو ٹوک باتیں کی تھیں۔

''مسٹر جیک!'' اس نے باس سے کہا۔ ''کل اسٹور معمول کے مطابق کھلے گا۔ ابھی ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔ باقی کا کام ہم کل کریں گے اور نظار کے لواحقین کو اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع بھی دے دیں تاکہ وہ سٹی اسپتال سے اس کی ڈیڈ باڈی وصول کرلیں۔''

''اوکے سر!'' جیک خواجہ نے فرماں برداری سے کہا۔ ''یہ سب ہو جائے گا۔''

''اور تم ......'' آفیسر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب تک نظار کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا' تم ٹیکساس سے باہر نہیں جاؤ گے۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو پہلے تم پولیس اسٹیشن کو انفارم کرو گے اس کے بعد اسٹیٹ سے باہر

قدم نکالو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی...... اچھی طرح سمجھ گیا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''جب تک اس کیس کی تفتیش چل رہی ہے، تم اسٹور سے چھٹی نہیں کرو گے۔ ہم کسی بھی وقت تم سے پوچھ تاچھ کرنے آسکتے ہیں اور......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور...... ضرورت پڑنے پر تمہیں پولیس اسٹیشن بھی بلایا جاسکتا ہے۔''

''اوکے سر!'' میں نے کہا۔ ''آئی ایم ایور ریڈی۔''

پولیس والوں کے جانے کے بعد باس مجھے گھیر کر بیٹھ گیا اور اس واقعے کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوال کرنے لگا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے ''اے ٹو زی'' ساری کہانی سنا دی۔

''علی! مجھے تم پر بھروسا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم اس معاملے میں کسی بھی طور پر ملوث نہیں ہو لیکن پولیس کا ذہن تمہاری طرف سے صاف نہیں ہے۔''

''مجھے اس بات کا اندازہ ہے باس۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''اینی ہاؤ...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب تمہاری کوئی غلطی نہیں تو پھر تمہارا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔''

''انشاء اللہ!'' میں نے پُر وثوق انداز میں کہا۔

''اسٹور بند کریں؟'' جیک خواجہ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے جواباً کہا ''شیور۔''

سرکل اے گروسری کی تاریخ میں آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسٹور رات گیارہ کے بجائے ایک بجے بند ہو رہا تھا۔ نظار کو پیش آنے والا واقعہ معمولی نوعیت کا نہیں تھا اور...... ہمیشہ غیر معمولی واقعات ہی تاریخ کو تبدیل کیا کرتے ہیں۔

☆☆☆

میرا نام اسد علی ہے۔ میں اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماں کون ہے اور مجھے اپنے باپ کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور شعور کی منزل پر قدم رکھا تو خود کو انکل سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ وہی میرے سرپرست، میرے مربی اور میرے سب کچھ تھے۔ اس وقت میں بیس سال کا ہو چکا تھا اور اپنی یادداشت کے مطابق یہ تمام عرصہ میں نے انکل سلطان کی زیرنگرانی گزارا تھا۔ انہوں نے بچپن سے جوانی تک اپنی سگی اولاد کے مانند میرا خیال رکھا تھا اور کبھی مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ میرے والد نہیں تھے۔ ان کے ساتھ میرا جو بھی رشتہ تھا، وہ ابھی تک ایک سربستہ راز تھا۔ یہ راز میرے ذہن کو نامعلوم بے چینی میں گھیرے رہتا تھا۔

انکل علی سلطان ٹیکساس کے ایک کامیاب بزنس مین تھے لیکن آج کل بزنس کی دنیا میں ان کا کردار زیادہ فعال نہیں رہا تھا۔ ایک کار ایکسیڈینٹ میں ان کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہو گیا تھا اور وہ وہیل چیئر پر آگئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ دمے کے مریض بھی تھے۔ موسم سرما میں ان کی سانس کی تکلیف بہت بڑھ جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک ادھیڑ عمر عورت کو رکھا ہوا تھا جس کا نام مارتھا تھا۔ مارتھا کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ بڑی محنت سے انکل کا خیال رکھتی تھی اپنی صحت کے معاملات کے پیش نظر وہ سلیپنگ پارٹنر کے طور پر بزنس کو چلا رہے تھے۔ انہوں نے کئی ایک مالیاتی اداروں میں محفوظ سرمایہ کاری کر رکھی تھی جہاں سے ہر ماہ ایک مخصوص رقم انہیں مل جاتی تھی۔ وہ ایک آسودہ اور خوش باش زندگی گزار رہے تھے۔

میں انکل سلطان کی فیملی کے بارے میں بھی زیادہ نہیں جانتا تھا۔ بس یہ بات میرے علم میں تھی کہ انہوں نے بہت پہلے ایک عیسائی عورت سے شادی کی تھی۔ اس عورت کا نام ریتا میگڈالین تھا۔ ریتا سے انکل سلطان کی ایک بیٹی ہوئی تھی۔ انکل نے اس کا نام آمنہ رکھا تھا لیکن ریتا اسے ٹفنی کہہ کر پکارتی تھی۔ ان دنوں انکل سلطان امریکی ریاست اوٹاہ کے شہر ''سالٹ لیک سٹی'' میں رہتے تھے۔ یہ شادی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور ریتا انکل کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ آمنہ/ٹفنی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ پھر وہ بچی ہمیشہ کے لیے ٹفنی ہی بن گئی۔ ٹفنی نے بہت محنت کی اور دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آج کل وہ ایک معروف امریکی نیوز چینل ''فوکس نیوز'' کے لیے کام کر رہی تھی۔ میری آج تک ٹفنی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ انکل سلطان کے رابطے میں تھی مگر بہت کم۔ انکل بھی اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس

وقت ٹفنی پینتیس سال کی تھی۔ فوکس نیوز اسے ماہانہ پچیس ہزار ڈالرز پے کرتا تھا۔ اس جاب کی وجہ سے وہ ''ایل اے'' یعنی لاس اینجلس (کیلی فورنیا) میں قیام پذیر تھی۔

جیسا کہ میں نے بتایا، علی سلطان ایک کامیاب کاروباری شخص تھے۔ ان کی رہائش ''بے سٹی'' جیسے ٹیکساس کے مہنگے علاقے میں تھی۔ نیکولز اسکوائر میں ان کا دو بیڈروم کا ایک شان دار اپارٹمنٹ تھا جو ہیمن روڈ پر واقع تھا۔ پہلے میں بھی اسی اپارٹمنٹ میں انکل سلطان کے ساتھ رہتا تھا پھر جب میں اسکول سے کالج میں آیا تو انہوں نے مجھے ہاسٹل میں شفٹ کر دیا تھا۔

''ایسا کیوں انکل؟'' میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''کوئی شکایت نہیں میرے بچے۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تم بڑے ہو گئے ہو اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے اندر اعتماد کی کمی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شخصیت کی تعمیر میں کوئی نقص باقی نہ رہے۔ ہاسٹل لائف میں تمہیں زندگی کو ایک نئے انداز میں انجوائے کرنے کا موقع ملے گا اور میں نے سوچا ہے، تم کالج میں سائیکالوجی لو۔''

''ٹھیک ہے انکل! آپ جو کہیں گے، میں وہی کروں گا۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''ویسے مجھے خود بھی سائیکالوجی میں بہت دلچسپی ہے۔ آپ نے میرے دل کی بات کر دی لیکن......''

میں بولتے بولتے رکا تو انکل سلطان نے پوچھا۔

''لیکن کیا میرے بچے؟''

وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے ''میرے بچے'' کے الفاظ ہی استعمال کیا کرتے تھے اور ان الفاظ سے خلوص اور اپنایت کی جھلک جھلکتی تھی۔ میں نے ان کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''لیکن یہ کہ...... میں ہاسٹل میں آپ کو بہت مس کروں گا۔''

''میرے بچے! میں تمہیں ہاسٹل بھیج رہا ہوں، کوئی امریکا سے باہر کسی اور دنیا میں نہیں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ''تمہارے کالج کے نزدیک ہی ''دی گیٹ وے'' اپارٹمنٹس ہیں۔ میں نے وہاں تمہارے لیے ایک بیڈ، ایک باتھ کا خوب صورت اپارٹمنٹ بک کروایا ہے اور پھر......'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''تمہارا کالج اور دی گیٹ وے اپارٹمنٹس دونوں لیک جیکسن میں ہیں اور لیک جیکسن، بے سٹی سے محض باسٹھ... کلو میٹر ہے...... صرف اڑتالیس منٹ کی ڈرائیو۔ تم ویک اینڈ پر میرے پاس آ سکتے ہو۔ عام دنوں میں بھی تمہارے آنے پر کوئی پابندی تھوڑی ہے۔ تمہارا جب دل چاہے، تم آ سکتے ہو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور میں ہر طرح سے تمہارا خیال رکھنے کو تیار ہوں......''

بولتے بولتے ان کی سانس پھولنے لگی تھی۔ چند لمحات کو رک کر انہوں نے اپنی سانس ہموار کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بورڈنگ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا اپنا ایک مزہ ہے، مجھے یقین ہے کہ تم بہت انجوائے کرو گے۔ کالج کی بغل میں رہو گے تو تمہارا وقت بھی بچے گا اور تم پڑھائی پر زیادہ توجہ دے سکو گے۔''

''تھینک یو انکل۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

اس کے بعد برازوسپورٹ کالج میں میری پڑھائی شروع ہو گئی۔ مذکورہ کالج کونکارڈ ایونیو اور لیگزنگٹن ایونیو کے بیچ کالج ڈرائیو پر واقع تھا جبکہ میرا ہاسٹل یعنی دی گیٹ وے اپارٹمنٹس لوگن بیری اسٹریٹ پر تھا اور یہ کالج کے نزدیک ہی تھا۔ لیک جیکسن ٹیکساس کا ایک دل کش اور خوب صورت علاقہ ہے۔

میں برازوسپورٹ کالج میں بیچلرز ڈگری کے لیے آیا تھا اور میرا اسبجیکٹ تھا سائیکالوجی یعنی علم نفسیات۔ اس کے علاوہ مذکورہ کالج میں بزنس اکاؤنٹنگ، اکنامکس، ہسٹری اور فزیکل ایجوکیشن کی کلاسز ہوتی تھیں۔ کالج سے میرا ہاسٹل چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔

انکل سلطان نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ بورڈنگ کی لائف کا اپنا ایک الگ مزہ تھا۔ میں آزادانہ زندگی کو بڑے بھرپور انداز میں انجوائے کر رہا تھا۔ ''دی گیٹ وے'' والا اپارٹمنٹ بہت عالی شان تھا۔ انکل نے یہ اپارٹمنٹ میرے لیے کرائے پر حاصل کیا تھا جس کا ماہانہ کرایہ آٹھ سو ڈالرز تھا اور اس کا ڈیپازٹ صرف دو سو پچاس ڈالرز تھا۔

ہاسٹل میں آنے کے بعد میں نے باقاعدہ جیم جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ورزش کا شوق تو مجھے شروع ہی سے تھا لیکن قاعدے اور اصول کے مطابق ایکسر سائز کرنے کا یہ موقع مجھے لیک جیکسن آنے جانے کے بعد ہی ملا تھا۔ میں نہایت پابندی کے ساتھ ہائی وے پر واقع ایک ہیلتھ کلب ''پاور ہاؤس'' جا رہا تھا۔ پاور ہاؤس لیک جیکسن کا ایک

معروف جیم تھا۔ میرے ہر نوعیت کے اخراجات انکل سلطان ہی اٹھاتے تھے۔

جب تک میں چھوٹا تھا تو میں اپنے والدین کے بارے میں سوچتا ضرور تھا لیکن اتنی شدت سے نہیں جتنا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد۔ کم سنی کا عرصہ بڑا لاابالی اور بے پروا ہوتا ہے۔ انسان کسی ایک نکتے پر زیادہ دیر تک اپنی توجہ کو مرکوز نہیں رکھ سکتا مگر اب میں کالج کا اسٹوڈنٹ' مینٹلی میچور ہوچکا تھا۔ اپنے ماں باپ کے حوالے سے میرے ذہن میں سیکڑوں سوالات سر اٹھاتے تھے اور ان سوالات کے جوابات صرف اور صرف انکل سلطان ہی دے سکتے ہیں مگر وہ ہر بار بڑی خوب صورتی سے کنی کاٹ جاتے تھے۔ اب میں ویک اینڈ پر ہی ان سے ملنے جاتا تھا اور چند گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر واپس اپنے ہاسٹل میں آجاتا تھا۔ ایک روز جب ہمارے درمیان معمول کی گفتگو جاری تھی تو میں نے اچانک کہا۔

''انکل! ایک بات تو بتائیں؟''

''پوچھو میرے بچے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

''پہلے وعدہ کریں کہ جو میں پوچھوں گا، آپ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ یکا یک محتاط ہوگئے اور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میرے بچے! میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ یہ الگ بات کہ میرا جواب تمہیں ٹھیک لگے یا ٹھاک ٹھاک......!''

وہ ذومعنی گفتگو کرنے کے ماہر تھے۔ میں نے بدستور ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ میں اب بچہ نہیں رہا؟''

''ہاں میرے بچے! اب تم بچے نہیں رہے۔'' انہوں نے گول مول جواب دیا۔

''پھر آج آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کر ہی دیں۔'' میں مچل گیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئے۔ ''کون سی حقیقت؟''

''یہی کہ میں کون ہوں......'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے ماں باپ کون ہیں اور وہ کہاں ہیں؟ آپ کب تک اس راز کو مجھ سے چھپائے رکھیں گے؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے رہے پھر گمبھیر انداز میں پوچھا۔ ''میرے بچے! تمہاری عمر اس وقت کتنی ہے؟''

''اٹھارہ سال یا...... اس سے کچھ زیادہ۔'' میں نے جواب دیا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو لگ بھگ دو سال پہلے ہو رہی تھی جن دنوں میں نے کالج نیا نیا جوائن کیا تھا۔

''کیا تم اس وقت بھی اتنے بڑے تھے جب تمہاری عمر محض ایک سال تھی؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے!'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ایک سال کی عمر میں تو میں بہت چھوٹا سا تھا...... ایک ننھا منا بچہ۔''

''اچھا یہ بتاؤ......'' وہ سنجیدہ گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''اگر تم ایک سال کی عمر میں یہ خواہش کرتے کہ اٹھارہ سال کے دکھائی دو یا اگر اب تم یہ خواہش کرو کہ ایک سال کے نظر آؤ تو کیا ایسا ممکن ہے؟''

''ناممکن!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔''

''گڈ!'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہیں یہی بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ قدرت کے کارخانے میں ہر کام کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ کوئی بھی کام اپنے مخصوص وقت سے پہلے یا مخصوص وقت کے بعد نہیں ہوسکتا۔ اگر اس اصول کو توڑنے کی کوشش کی جائے تو سوائے بگاڑ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

''لیکن ...... اس فلسفے کا میرے سوال سے کیا تعلق؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''بہت گہرا تعلق ہے میرے بچے!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا لیکن مناسب وقت آنے پر۔ بس' تھوڑا سا اور انتظار ...... بلکہ صبر کرو۔ میں ہر بات کی اس طرح وضاحت کردوں گا کہ تمہارا دل اور ذہن پھول کی طرح ہلکے ہوجائیں گے۔''

مجھے یقین تھا کہ انکل سلطان مجھ سے غلط بیانی نہیں کررہے تھے۔ اگر انہوں نے کہا تھا کہ مناسب وقت آنے پر وہ مجھے سب کچھ بتادیں گے تو یقیناً وہ ایسا کرتے بھی لیکن اس وقت تک میرے دماغ کی پتا نہیں ...کیا حالت ہوجاتی۔ میں جب بھی اپنے والدین کے بارے میں سوچتا تو میرا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اور بے نام سی اذیت میرے پورے وجود میں پھیلتی چلی جاتی۔ میں شعوری اور لاشعوری طور پر ایک

پُرخلش کشمکش کا شکار ہوجاتا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کرلیا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ...... اب میں اپنے والدین کے حوالے سے انکل سلطان سے کوئی سوال نہیں کروں گا اور اس وقت کا انتظار کروں گا جب ساری حقیقتیں خود بہ خود مجھ پر آشکار ہوجائیں گی۔ اس وقت کو بھی آخر ایک دن آنا ہی تھا۔

میں نے اپنی ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کردی۔ میں دوسرے اسٹوڈنٹس کو دیکھتا تھا کہ وہ اسٹڈی کے ساتھ جاب وغیرہ بھی کرتے تھے، اس طرح ان کی اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی اور ان کے والٹ ہمیشہ ڈالرز سے بھرے رہتے تھے۔ انکل سلطان نے کبھی مجھے پیسے کی کمی تو محسوس نہیں ہونے دی تھی لیکن میرا دل مچل رہا تھا کہ میں بھی کوئی پارٹ ٹائم جاب پکڑلوں۔ میں نے اس سلسلے میں انکل سلطان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا۔

''اگر تمہاری پڑھائی متاثر نہ ہو تو تم یہ شوق پورا کرسکتے ہو۔''

''میں نے ہر انداز میں سوچ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پڑھائی بالکل متاثر نہیں ہوگی۔''

''کہاں جاب کرنا چاہتے ہو میرے بچے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اینگلٹن میں ایک گروسری اسٹور ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''مضافات میں ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ میں صبح کالج جاؤں گا اور ایوننگ میں اسٹور پر جاب کروں گا۔''

''دونوں چیزوں کو مینیج کرلوگے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی...... بہت اچھی طرح۔'' میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے بہ خوشی جاب کی اجازت دے دی۔

چنانچہ ایک سال پہلے سرکل اے گروسری پر میں نے کام شروع کردیا تھا۔ باس ذوالفقار خواجہ عرف جیک خواجہ مجھے دس ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے تنخواہ دیتا تھا۔ دوپہر دو بجے سے رات گیارہ بجے تک میری ڈیوٹی ہوا کرتی تھی، یعنی میں روزانہ نو گھنٹوں میں نوّے ڈالرز کما لیتا تھا۔ جب ایک سال پہلے میں نے سرکل اے پر جاب کا آغاز کیا تو ریگولر اسٹڈی کی وجہ سے میں پارٹ ٹائمر تھا یعنی صرف چار گھنٹے کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی لیکن اب میں امتحانات سے فارغ ہوچکا تھا لہٰذا فل ٹائمر ہوگیا تھا اور پورے نو گھنٹے ڈیوٹی کررہا تھا۔ سرکل اے گروسری ٹیکساس کے ایک کم مصروف علاقے اینگلٹن میں واقع تھا لہٰذا وہاں صرف دو شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ مارننگ شفٹ صبح چھ بجے سے دوپہر دو بجے تک یعنی آٹھ گھنٹے کی شفٹ اور ایوننگ شفٹ دوپہر دو بجے سے رات گیارہ بجے تک یعنی نو گھنٹے کی شفٹ جبکہ مصروف ترین اور گنجان آباد ریاستوں جیسے نیویارک، کیلی فورنیا، فلوریڈا وغیرہ میں ''سیون الیون'' اور دیگر سپر اسٹورز میں آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹس ہوا کرتی ہیں اور کسی ایک اسٹور میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ جاب کی قانوناً اجازت نہیں ہے۔

مجھے اگر جیک خواجہ دس ڈالرز فی گھنٹا کے حساب سے دے رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں مقامی تھا یعنی میرے پاس امریکا کی سٹیزن شپ (شہریت) تھی۔ میرا ڈرائیونگ لائسنس، آئی ڈی کارڈ اور ''ایس ایس'' یعنی سوشل سیکیورٹی کارڈ بنا ہوا تھا ورنہ جو لوگ امریکا میں غیر قانونی طور پر آباد ہیں، انہیں ایک تو بڑے اسٹورز پر جاب نہیں ملتی اور اگر وہ سرکل اے گروسری جیسے مضافاتی اسٹورز پر کام کرتے ہیں تو انہیں سات ڈالرز فی گھنٹا سے زیادہ معاوضہ نہیں ملتا۔ اسٹور کا مالک ایسے افراد کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور عموماً اسٹور کے عقبی حصے میں مختلف امور کی انجام دہی پر مامور کردیتا ہے۔

ہم ہر وقت پاکستان میں کرپشن کا رونا روتے رہتے ہیں یقین مانیں امریکا میں بھی کچھ کم کرپشن نہیں ہے۔ پانچ سو ڈالرز میں آپ کا کسی بھی اسپینش (ہسپانوی) نام سے ایس ایس کارڈ بن جاتا ہے۔ سو ڈالرز میں آئی ڈی کارڈ اور دو سو ڈالرز میں ڈرائیونگ لائسنس۔ اس کے بعد چل سو چل...... جو لوگ امریکا پہنچ کر سلپ (SLIP) ہوجاتے ہیں یا غیر قانونی طور پر میکسیکو یا کینیڈا کا بارڈر کراس کرکے امریکا یعنی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا میں داخل ہوتے ہیں، انہیں کسی اچھی جاب کے لیے بس انہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کی جیب میں مال ہوتا ہے، وہ چھ ماہ کے اندر اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کرلیتے ہیں مگر پاکستانی شناخت یا نام کے ساتھ نہیں بلکہ ہسپانوی نام کے ساتھ کیونکہ ہمارا قد کاٹھ، رنگت اور مزاج ہسپانوی قوم کے کافی قریب ہے۔ اس نوعیت کی شناخت میں ایک خاص قسم کا تحفظ حاصل رہتا ہے، ورنہ نائن الیون والے واقعے کے بعد ایک پاکستانی مسلمان کے لیے امریکا میں بہت مشکلات ہیں اور اگر آپ کے نام کے ساتھ ''محمد'' بھی لگا ہوا ہے تو سمجھ لیں کہ یہ مشکلات سوگنا بڑھ جائیں گی۔ آج کل تو اگر پاکستانی مسلمان امریکا کے کسی بھی ائیرپورٹ پر اترتا ہے تو ملک میں داخلے سے پہلے اس کا ای میل ایڈریس، فیس بک آئی ڈی،

اسکائپ آئی ڈی، لنکڈن آئی ڈی اور اسی نوعیت کے آئی ٹی استعمال کے دوسرے ذرائع بھی نوٹ کر لیے جاتے ہیں تاکہ اس کی انٹرنیٹ کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔ میں نے ایک تلخ حقیقت آپ کے سامنے رکھی ہے۔

اوپر میں نے ''سلیپ'' کی ٹرم استعمال کی ہے۔ یہ ایسے افراد کے لیے ہے جو از خود یا پھر کسی ایجنٹ کے ذریعے وزٹ ویزے پر امریکا جاتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر امریکا میں محنت مزدوری کر کے ڈالرز کمانا ہوتا ہے۔ ایسے افراد امریکا میں اِن ہوتے ہی اپنا پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات پہلی فرصت میں تلف کر دیتے ہیں اور چھپ چھپا کر یا پھر مضافاتی علاقوں میں پانچ سے سات ڈالرز فی گھنٹا کی نوکریاں کرتے رہتے ہیں۔ امریکا اتنا بڑا ملک ہے کہ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا کہ تم کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو، کیا کر رہے ہو، کیوں کر رہے ہو؟ جب تک آپ کسی قانون شکنی کے مرتکب ہو کر پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائیں، آپ ہر لحاظ سے محفوظ ہیں۔ میں بعض ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو سالہا سال سے امریکا میں سلیپ لائف گزار رہے ہیں۔ یہ ست الوجود یا بہت مجبور لوگ ہیں ورنہ جن کی کھوپڑی میں دماغ اور جیب میں ڈالرز ہوتے ہیں، وہ پہلی فرصت میں اپنی آئی ڈی اور ایس ایس بنوانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بہتر جاب حاصل کر سکیں۔

امریکا ایک بے پروا اور آزاد منش ملک ہے۔ یہاں ہر شخص اپنے حال میں مست ہے، کسی کو کسی کی فکر نہیں۔ نیویارک، فلوریڈا، کیلی فورنیا، الی نوائے، اوہائیو، واشنگٹن، پینسلونیا اور انڈیانا میں تو نفسا نفسی کا وہ عالم ہے کہ خدا کی پناہ۔

پچاس ریاستوں پر مشتمل یہ ملک لگ بھگ اٹھانوے لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی حالیہ آبادی تین سو بائیس ملین یعنی بتیس کروڑ بیس لاکھ ہے۔ امریکا میں ہر قسم کی ریاستیں پائی جاتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی، گنجان آباد اور کم آباد یا غیر آباد۔ ریاست الاسکا رقبے کے لحاظ سے امریکا کی سب سے بڑی ریاست ہے یعنی کم و بیش سترہ لاکھ مربع کلومیٹر۔ پاکستان جیسے دو ملک الاسکا کے اندر بہ آسانی سما سکتے ہیں لیکن الاسکا کی آبادی محض سات لاکھ ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ پاکستان کا رقبہ آٹھ لاکھ مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی سوا انیس کروڑ ہے۔ ٹیکساس اسٹیٹ انیس بیس کے فرق سے رقبے میں پاکستان کے برابر ہی ہے تاہم آبادی میں کوسوں دور ہے۔ ٹیکساس کا رقبہ سات لاکھ مربع کلومیٹر اور آبادی دو کروڑ چھتر لاکھ ہے۔

مجھے لیک جیکسن سے ارلنگٹن جانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ انیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا جو... بہ آسانی سولہ منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔ یہ ساری تفصیلات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ میرے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ میری زندگی کا ایک اہم کردار شارو بھی ہے۔ ایک ماہ پہلے اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت ہی مختصر عرصے میں ہمارے بیچ گہری دوستی قائم ہو گئی تھی اور یہ دوستی خاصی ہنگامہ پرور ثابت ہو رہی تھی۔ میں جب سے اس سے جڑا تھا، میری زندگی میں ایکشن اور تھرل شامل ہو گیا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات کئی حوالوں سے ہنگامہ خیز اور یادگار تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا، شارو کا تعلق برازیل جنوبی امریکا سے تھا اور وہ کافی عرصے سے ٹیکساس میں مقیم تھی۔ ہماری پہلی ملاقات لیک جیکسن کے ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی۔ ونی لاؤنج نامی یہ نائٹ کلب پلانٹیشن ڈرائیو پر واقع تھا اور شارو وہاں گلوکاری کرتی تھی۔ اس نائٹ کلب میں ڈرنک، کھانا، ڈانس اور میوزک سب کچھ ہوتا تھا۔ یہ ایک فل انٹرٹینمنٹ کلب تھا۔ یہاں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا تھا۔ میں اکثر وہاں ڈنر کے لیے چلا جاتا تھا اور یہ ڈنر عموماً نصف شب ہی ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ گیارہ بجے تو میں سرکل اے گروسری سے نکلتا تھا۔ ہاں، چھٹی والے دن میں نو اور دس بجے کے درمیان ادھر چکر لگاتا تھا اور وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔

شارو گٹار تھامے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ کوئی حزنیہ نغمہ گا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی جھلک رہی تھی۔ کلب کے اندر اچھا خاصا رش تھا۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ رنگ برنگی روشنیوں نے اندرونی ماحول کو بڑا خواب ناک بنا رکھا تھا۔ وہاں پر موجود تمام لوگ بڑی توجہ سے شارو کا گانا سن رہے تھے۔ اگرچہ یہ ایک سیڈ سانگ تھا لیکن شارو کے چہرے کی دل کشی اور الفاظ کی ادائیگی ایسی تھی کہ ہر ایک کی نظر اس کے سراپا سے گویا چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ تھی ہی جاذب نگاہ شخصیت کی مالک۔

میرا کھانا قریب الختم تھا کہ شارو کا گانا بھی اختتام پذیر ہو گیا۔ گانے کے آخری بول کافی چنچل اور خوش گوار تھے۔ حزن و ملال کی جگہ اب شارو کے چہرے پر تازگی اور مسرت دکھائی دیتی تھی۔ اس ہیپی اینڈنگ نے کلب کے ماحول میں ایک جان سی ڈال دی تھی۔ وہ اسٹول سے اٹھی پھر ایک ادا کے ساتھ گردن جھکا کر حاضرین محفل کو سلام کیا۔ ہر طرف خوشی سے معمور آوازیں گونج رہی تھیں لیکن شادمانی کے یہ

لمحات دیر پا ثابت نہ ہوئے۔ اگلے ہی لمحے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے کلب کے ماحول کا سوا ستیاناس مار دیا تھا۔

تین چار افراد تیز قدموں سے چلتے ہوئے کلب کے اندر داخل ہوئے۔ وہ اپنے خدوخال سے میکسیکن دکھائی دیتے تھے۔ ان کا رخ شارو کی جانب تھا۔ شارو اگرچہ گانا ختم کر چکی تھی تاہم وہ گٹار تھامے ابھی اسٹیج پر موجود تھی۔ باہر سے آنے والوں نے شارو کے ساتھ بدتمیزی شروع کر دی۔

ان لوگوں کی یہ حرکت مجھے بہت بری لگی۔ اچھا کھانا تو لیک جیکسن میں متعدد مقامات پر ملتا تھا۔ میں اگر ''ونی لاؤنج'' کا رخ کرتا تھا تو اس کا بنیادی سبب شارو ہی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی اسی لیے ان بدقماش افراد کی حرکت مجھے سخت ناگوار گزری تھی۔

کلب کا منیجر فوراً موقع پر پہنچا اور ان غنڈوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن ان کا جو سرغنہ تھا، اس نے منیجر کے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ سرغنہ بڑے متکبرانہ انداز میں اپنے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے ہوئے تھا اور ہاتھ آزاد چھوڑ رکھے تھے۔

سرغنہ کی اس حرکت نے اس کے ساتھیوں کو شہ دی اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے ندیدوں کے مانند شارو کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ یہ صورتِ حال میری برداشت سے باہر تھی۔

میں بجلی کی سی سرعت سے اٹھا اور بہ آوازِ بلند کہا۔

''رک جاؤ!''

میرے مخاطب وہ بدتمیز میکسیکن تھے لیکن میری آواز نے ان پر کوئی اثر نہ کیا تاہم ان کا سرغنہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ بھی ایک گینڈا نما قدآور میکسیکن تھا۔ اس دوران میں سرغنہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کے نزدیک سے گزر کر شارو کی جانب بڑھنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک لیا۔ میں نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔ منع کرو اپنے بندوں کو۔''

''کیوں؟'' وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا شارو تمہاری بیوی ہے جو تم اس کے لیے اتنے جذباتی ہو رہے ہو؟''

اس دوران میں وہ ہونٹوں میں دبے سگریٹ کے کش بھی لیتا جا رہا تھا۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''شارو میری بیوی نہیں ہے لیکن وہ ایک انسان ہے۔ تم لوگ اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آنا چاہیے ایسی حرکت کرتے ہوئے۔ آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''شارو کے ساتھ ہمارا پرانا حساب ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہمارے بیچ میں نہ آؤ۔'' اس کے آخری الفاظ میں دھمکی چھپی تھی۔

میں نے اس کی دھمکی کو جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں بیچ میں کود چکا۔ تم مجھے ہٹا نہیں سکو گے۔''

وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو اسی لیے اکڑ دکھا رہے ہو۔ میرا نام لیونارڈو ہے۔ کوئی مجھ سے پنگا لینے کی ہمت نہیں کرتا۔''

''تم لیونارڈو ہو یا پراڈو ہو۔'' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے ساتھیوں کو روکتے ہو یا......''

''یا کیا......؟'' اس نے سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کر لو گے؟''

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میرا ہاتھ برق کی رفتار سے حرکت میں آیا اور میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ اڑتے ہوئے پیچھے کی جانب گیا پھر چاروں خانے چت ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ نکل کر دور جا گرا اور لیونارڈو کے لبوں سے خون جاری ہو گیا۔

وہ مجھ سے ایسے جارحانہ ردعمل کی ہرگز توقع نہیں رکھتا تھا۔ اس نے میری جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''پکڑ لو اس کمینے کو اور...... اس کی ہڈی پسلی ایک کر دو۔''

اس ہنگامی صورتِ حال نے وہاں موجود افراد کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے بعض لوگ وہاں سے کھسکنے کی کوشش میں نظر آ رہے تھے۔ کلب کے اندر افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

لیونارڈو کے ساتھی شارو کو چھوڑ کر میری جانب بڑھے۔ میں شارو کی حمایت میں جو قدم اٹھا چکا تھا وہ اب واپس نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے خود پر حملہ آور افراد کو آڑے ہاتھوں لیا۔ نائٹ کلب دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔

ان کا باس لیونارڈو مجھ سے تھپڑ کھانے کے بعد فرش بوس ہو چکا تھا۔ ان میں سے دو افراد اپنے سرغنہ کو اٹھانے کے لیے اس کی جانب بڑھ گئے تھے' باقی تین مجھ پر پل پڑے تھے۔ میں نے ان کی مرمت کرنے میں کوئی کسر نہ

چھوڑی۔ لات، مکا، دھکا...... جو بھی میری سمجھ میں آیا اور جس کا موقع ملا، میں ان کی خاطر داری کرنے لگا۔ لیونارڈو کے بقول، وہ لوگ شارو سے کوئی پرانا حساب چکانے آئے تھے لیکن میری شکل میں ان پر ایک افتاد آن پڑی تھی۔ وہ سنبھل نہیں پاتے تھے کہ میں ایک کاری وار کر دیتا تھا۔

کلب کا منیجر لیونارڈو سے ایک کرارا تھپڑ کھا چکا تھا۔ اس نے مارا ماری کی صورتِ حال دیکھی تو پولیس سے مدد لینے کے لیے ٹیلی فون کی جانب بڑھا۔ منیجر کی اس حرکت نے انہیں چوکنا کر دیا۔ لیونارڈو نے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ اگر پولیس ونی لاؤنج پہنچ جاتی تو ان کے لیے کوئی بڑی مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔

''اے، واپس چلو۔'' لیونارڈو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس کمینے سے بعد میں نمٹ لیں گے۔''

اس کے ساتھی اپنے سرغنہ کی جانب سے کسی ایسے ہی فراری احکام کے انتظار میں تھے۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے سرغنہ کی معیت میں ونی لاؤنج سے نو دو گیارہ ہو گئے۔

منیجر میرے پاس آیا اور تشکرانہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا بہت شکریہ جوان۔ تم نے شارو کو ان غنڈوں سے بچایا۔ یہ بہت ہی بُرے لوگ ہیں۔''

''جب تم جانتے ہو، وہ بُرے لوگ ہیں تو پھر تم نے ان سے حفاظت کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کر رکھا؟'' میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''شارو روزانہ تمہارے کلب میں سنگنگ کرتی ہے۔ اس کی حیثیت تمہارے ریگولر اسٹاف ایسی ہے، پھر یہ غفلت کیوں؟''

''سوری سر!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''ہم اس بارے میں کافی عرصے سے سوچ رہے ہیں۔''

''صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا منیجر صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو عملی اقدام اٹھانے چاہئیں۔ یہ نائٹ کلب آپ کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ آپ کی روزی روٹی ہے۔ اگر یہاں آئے دن اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی رہی تو اس کلب کی رونقیں ماند پڑ جائیں گی اور ہو سکتا ہے، پھر یہاں الو بولنے لگیں۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''اٹس او کے۔'' میں نے ہاتھ جھاڑے اور نائٹ کلب سے نکلنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے تعاقب میں آ رہا ہو، میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شارو تھی۔ مجھ سے نگاہ ملی تو وہ ہونٹوں پر بڑی مطمئن مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے!''

میں رک گیا۔ ''ہاں بولو؟''

اس وقت تک میں کلب کے احاطے سے باہر آ چکا تھا۔ وہ میرے قریب آتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''علی۔'' میں نے بتایا۔ ''اسد علی۔''

''علی! تمہارا بہت شکریہ۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم نے ان غنڈوں سے مجھے بچایا۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے کی معصومیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے بلیک اسکرٹ پر وائٹ ہاف شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس پہناوے نے اس کے حسن اور جوانی کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں اپنا گٹار بھی اٹھا رکھا تھا۔ ان لمحات میں وہ ایک گڑیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے بے طرح اس پر پیار آنے لگا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اس احسان کو زندگی بھر یاد رکھنے سے بھلا مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟''

''تم مجھ سے کس قسم کا فائدہ چاہتے ہو؟'' اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔

''ایسا فائدہ جس کی عمر عارضی نہ ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''مستقل اور جاودانی فائدہ......''

''مسٹر علی! میں کچھ سمجھی نہیں۔'' اس کی معصومیت بھری الجھن دوچند ہو گئی۔ ''تم بڑی مشکل باتیں کرتے ہو......''

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم کس پر ہو...... میرا مطلب ہے، تمہاری گاڑی؟''

''میرے پاس ذاتی گاڑی نہیں ہے۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''پھر گھر کیسے جاتی ہو؟''

''کیب سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آج میں ڈراپ کر دوں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......!''

''نو ایشو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اٹس او کے......''

''آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

شارو نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم پارکنگ کی جانب بڑھنے لگے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامے

تھامے پوچھا۔
''مجھ سے دوستی کرو گی؟''
''کیا ابھی تک ہوئی نہیں؟'' وہ چہک کر بولی۔
میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ؟''
''اگر ہوئی نہ ہوتی تو میں آدھی رات کو تمہارا ہاتھ تھامے یوں سکون سے نہ چل رہی ہوتی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم سے دوستی تو اسی لمحے ہوگئی تھی جب تم میری حفاظت کے لیے میدان میں کودے تھے۔ کوئی دوست ہی اس طرح مدد کے لیے آگے آتا ہے۔''
میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ گٹار کو ایک طرف پھینک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ ہم یک جان دو قالب ہوگئے۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں چند لمحات تک اس کے زرخیز بدن کی حدت اور منہ زور جذبات کی شدت کو اپنے جسم پر محسوس کرتا رہا پھر اس کے انگارا ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے‘ اس کا وجود جیسے انداز میں لرز رہا تھا جیسے اس کے اندر کیف وسرور کی لہریں دوڑ رہی ہوں۔ ان لمحات میں اس کے لبوں کے گداز نے مجھے بتایا کہ جب وہ گاتی تھی تو اس کی آواز میں شیرینی کیسے بھر جاتی تھی وقت گویا تھم کر رہ گیا تھا۔ صرف ہماری سانسیں چل رہی تھیں جو ہمارے زندہ ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔
چند منٹ اسی نشاط انگیز کیفیت میں گزر گئے پھر میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میری گاڑی ادھر کھڑی ہے۔''
ساتھ ہی میں نے پارکنگ میں موجود اپنی گاڑی کی سمت اشارہ بھی کردیا۔ وہ اپنے گٹار کو سنبھالتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔
''اٹس او کے......!''
میرے استعمال میں سرخ رنگ کی ہنڈائے سانتافی اسپورٹ ماڈل کی کار تھی جو میں نے پچیس ہزار ڈالرز میں خریدی تھی۔ میرے ہر نوعیت کے اخراجات تو انکل سلطان ہی اٹھایا کرتے تھے۔ اس اسپورٹ کار کی خریداری کے لیے میں نے سرکل اے گروسری والی جاب سے رقم جمع کی تھی۔ مجھے ہنڈائے اسپورٹ کار بہت پسند تھی۔
شارو کار کے اندر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''علی! تمہاری گاڑی تو زبردست ہے۔''
''میری ہر شے زبردست ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کار کو پارکنگ سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''جیسے میری دوست شارو......!''
''سولو ولی۔'' وہ کھنک دار آواز میں بولی۔ ''تم باتوں کے جادوگر ہو۔''
''اب بتاؤ‘ جادو کے زور پر تمہیں کہاں پہنچادوں؟''
''سانتافی میں بیٹھے ہیں تو سانتافی ہی چلتے ہیں۔'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔
میں نے حیرت بھری نظر سے اپنے پہلو میں بیٹھی شارو کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم سانتافی میں رہتی ہو؟''
میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ سانتافی دراصل امریکی ریاست نیومیکسیکو کی ایک کاؤنٹی تھی اور اس کی حیثیت نیو میکسیکو کے کیپٹل کی تھی جبکہ ہم اس وقت ریاست ٹیکساس کے شہر لیک جیکسن میں تھے۔ نیو میکسیکو اسٹیٹ‘ ٹیکساس اور ایری زونا اسٹیٹ کے درمیان واقع تھی۔ ایری زونا کے بعد کیلی فورنیا اسٹیٹ شروع ہوجاتی تھی۔ کیلی فورنیا دنیا کا آخری مغربی کنارہ ہے۔ اس کے بعد ٹھاٹھیں مارتا ہوا دنیا کا سب سے بڑا سمندر پیسیفک اوشین یعنی بحرالکاہل ہزاروں کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اختتام پر دنیا کا آخری مشرقی کنارہ یعنی جاپان شروع ہوجاتا ہے۔
''ارے نہیں، میں تو مذاق کررہی تھی۔'' شارو کی نقرئی آواز نے میری سماعت میں رس گھول دیا۔ ''میں تو ادھر سپر ایٹ میں رہتی ہوں۔''
''سپر ایٹ موٹل؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں ہاں...... وہی۔'' وہ گردن ہلاتے ہوئے بولی۔
میں نے گاڑی کو آگے بڑھادیا۔ سپر ایٹ موٹل ہائی وے ڈبل تھری ٹو پر واقع تھا۔ یہ لیک جیکسن ہی کا علاقہ تھا اور لیک جیکسن سٹی سے محض چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں شارو نے مجھے بتایا کہ وہ سپر ایٹ کے جس کمرے میں رہتی تھی، وہاں اس کے ساتھ پاؤلا نامی ایک اور لڑکی بھی قیام پذیر تھی۔ سپر ایٹ موٹل کے مذکورہ کمرے کا کرایہ پچاس ڈالر یومیہ تھا لیکن انہوں نے چونکہ ماہانہ بنیادوں پر وہ کمرا حاصل کررکھا تھا لہٰذا وہ موٹل کو ماہانہ پانچ سو ڈالرز ادا کرتی تھیں۔ اس طرح ہر ایک کے حصے میں ڈھائی سو، ڈھائی سو ڈالرز آتے تھے۔
ہم ہائی پر آئے تو چار موٹر سائیکل سواروں نے ہمیں گھیر لیا۔ اگر میں گاڑی کو بریک نہیں لگاتا تو کوئی سنگین حادثہ پیش آسکتا تھا۔ ان موٹر سائیکل سواروں کے تیور بتاتے تھے کہ ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ ان چاروں کے پاس اسپورٹ بائیکس تھیں اور انہوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے جس کے باعث ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے

تھے۔ مجھے یہ وفی لاؤنج والے واقعے ہی کا شاخسانہ لگتا تھا۔

میں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکا اور شارو سے کہا۔ ''کچھ بھی ہو جائے، تم گاڑی سے باہر نہیں نکلنا۔ میں ذرا ان سے نمٹ کر آتا ہوں۔''

''ذرا سنبھل کر علی!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''مجھے تو یہ لیونارڈو ہی کے بندے لگ رہے ہیں......''

''بندے تو سب اللہ ہی کے ہیں لیکن بعض لوگ اللہ کے احسانات کو بھلا کر شیطان کی چاکری میں چلے جاتے ہیں پھر وہ لیونارڈو جیسے شیطان کے چیلوں کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ مجھے ایسے گم راہ لوگوں سے بہ خوبی نمٹنا آتا ہے۔''

میں گاڑی سے باہر آگیا۔ وہ نصف شب کا وقت تھا۔ ہائی وے سنسان پڑی تھی۔ اسی سناٹے اور ویرانی کا سہارا لے کر انہوں نے مجھے گھیرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ میں چاہتا تو انہیں روندتے ہوئے اپنی گاڑی کو آگے بڑھا لے جاتا لیکن اس کے نتائج یقیناً خاصے ناخوشگوار برآمد ہوتے۔ میری ہنڈائے بری طرح متاثر ہوتی اور ان میں سے بھی کوئی لازماً جان سے جاتا لہٰذا میں نے ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اپنی گاڑی کو ہائی وے کے کنارے روک دیا تھا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے بہ آواز بلند انہیں للکارا۔ ''ہمت ہے تو چہروں سے ہیلمٹ اتار کر اپنی شکلیں دکھاؤ۔''

انہوں نے مجھے گھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ ایک ہیلمٹ کے پیچھے سے بولا۔ ''اگر ہمت نہ ہوتی تو یہاں تک نہ آتے اور تم نے پوچھا' ہم کیا چاہتے ہیں؟'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ''ہمیں وہ لڑکی چاہیے ......شارو ......اور ہم یہ لڑکی لے کر ہی جائیں گے مگر تمہاری مرمت کرنے کے بعد......''

آخری جملہ ادا کرنے کے بعد وہ بڑے بھونڈے انداز میں ہنسا تھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' میں کسی چٹان کے مانند جم کر کھڑا ہو گیا۔ ''دیکھ لیتے ہیں' کون کس کی مرمت کرتا ہے اور ......شارو کس کے ساتھ جاتی ہے!''

انہوں نے چاروں طرف سے مجھ پر چڑھائی کر دی۔ میں ڈاج دے کر خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہائی وے کے کنارے پر ایک جانب چند خالی ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ ان ڈرمز کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا اور میں موٹر سائیکلوں کی یلغار سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے قدم قدم پیچھے' ان ڈرمز کی جانب کھسکنے لگا۔

ہیلمٹ بردار موٹر سائیکل سواروں کے تیور بڑے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ ان کے انداز سے میرے لیے شدید نوعیت کی نفرت جھلکتی تھی۔ وہ مجھے اپنی موٹر سائیکلوں کے ٹائرز کے نیچے کچل کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ انہیں میری سرکوبی کے لیے لیونارڈو نے بھیجا تھا۔ مجھے لیونارڈو کے الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔ مجھ سے طمانچہ کھانے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا...... پکڑلو اس کمینے کو اور ......اس کی ہڈی پسلی ایک کر دو!

لیونارڈو کے گماشتے اپنی موٹر سائیکلوں کی مدد سے میری ہڈیوں کا سرمہ بنانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے لیکن میں کسی بھی طور پر ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ میرا جسم برق رفتاری سے دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی زد میں لانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے پھر مجھے ایک موقع مل گیا۔

دو موٹر سائیکل سوار دو مخالف سمتوں سے میری جانب بڑھے۔ میرے نزدیک پہنچنے سے پہلے انہوں نے بائیک کے اگلے ٹائروں کو ہوا میں اٹھا لیا جیسے میرے سر کو نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر پہنچے' میں اچھلا اور بیک جمپ لگا کر ایک خالی ڈرم پر چڑھ گیا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائے تھے۔

میرا یہ اقدام بہت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ میں تو محفوظ رہا لیکن وہ دونوں موٹر سائیکل بری طرح ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ ان کے ٹکراؤ سے مخصوص قسم کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ان پر سوار افراد کی کرب ناک چیخوں نے رات کے سناٹے میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ وہ دونوں افراد اس ٹکراؤ کے نتیجے میں بری طرح زخمی ہو کر نیچے گرے تھے پھر انہیں اٹھ کر سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ میں ڈرم سے نیچے کودا اور میں نے انہیں لاتوں اور مکوں پر رکھ لیا۔

اپنے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں درگت بنتے دیکھی تو دوسرے دو موٹر سائیکل سوار وحشیانہ انداز میں میری طرف بڑھے۔ میں ہوا میں اچھلا اور ایک موٹر سائیکل سوار کے کندھے پر فلائنگ کک رسید کر دی۔ میں نے کوئی باقاعدہ فائٹنگ کا فن نہیں سیکھا تھا لیکن جیم جانے کے سبب میرے جسم میں ایک خاص قسم کی پھرتی آگئی تھی اور میری صحت بھی ماشا اللہ ٹھیک ٹھاک ہی تھی لہٰذا ہاتھ پاؤں میکانکی انداز میں بڑی سرعت سے حرکت میں آتے تھے اور مد مقابل کا کباڑا

کر کے رکھ دیتے تھے۔

ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ لڑائی بھڑائی کے لیے جسمانی طاقت کے علاوہ حوصلے کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان کے جسم میں بے پناہ طاقت ہو مگر وہ اندر سے بزدل ہو تو ایسی طاقت سوائے شرمندگی کے ... کچھ نہیں دیتی۔ جسمانی طاقت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر انسان کو اندر سے مضبوط ہونا چاہیے اور الحمدللہ! میں اندر سے نڈر اور دلیر تھا...... بے خوف اور پُراعتماد تھا۔

میری فلائنگ کک کا شکار ہونے والا موٹر سائیکل سوار فضا میں بلند ہوا اور پشت کے بل خالی ڈرمز سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ نے اس کی کمر کا سوا ستیاناس مار ڈالا تھا۔ اس کے حلق سے ایسی آواز خارج ہوئی جیسے کسی بکرے کو ذبح کیا گیا ہو۔

سوار کا تو جو حشر نشر ہوا، سو ہوا لیکن آزاد موٹر سائیکل نے چوتھے موٹر سائیکل سوار کو مشکل میں ڈال دیا۔ بغیر ڈرائیور کے موٹر سائیکل سیدھی جا کر چوتھے موٹر سائیکل والے کے اوپر چڑھ گئی پھر یہ دونوں موٹر سائیکلیں آپس میں الجھ کر ان دو افراد پر جا گریں، تھوڑی دیر پہلے میں نے لات کِکّے سے جن کی خاطر داری کی تھی۔ گویا میرے چاروں دشمن کسی نہ کسی انداز میں میرے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔

میں ہاتھ جھاڑ کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھا تو وہ چاروں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب میں ایک کرڈرم پر چڑھا تھا تو میں نے ان ڈرمز کے نزدیک چند لکڑیاں پڑی دیکھی تھیں جن میں سے بعض ڈنڈے ایسی تھیں۔ میں نے خالی ڈرمز کے نزدیک سے ایک مضبوط ڈنڈا اٹھا لیا اور تاک تاک کر ان کی مرمت کرنے لگا۔ ہوسکتا ہے، یہ سلسلہ کچھ دیر اور چلتا کہ وہاں کی سچویشن آچانک بدل گئی۔

میں نے ایک قیمتی گاڑی کو آن واحد میں نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ تیز رفتاری سے ہمارے قریب آئی پھر اس نے پوری قوت سے بریک لگا دیے۔ ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ سے فضا گونج اٹھی۔ وہ سلور کلر کی اوڈی کار تھی اور اس بیش قیمت کار کی عقبی نشست پر ایک پُرکشش ہسپانوی عورت براجمان تھی۔

یہ اوڈی کار کا جدید ترین ماڈل ''کیوسیون'' تھا جس کی قیمت کم و بیش پچپن ہزار ڈالرز تھی۔ چار چھلوں والی کار میں موجود خوب صورت ہسپانوی خاتون نے شیشہ گرا کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اے...... اسٹاپ فائٹنگ......!''

اسی دوران میں اس کا باوردی ڈرائیور گن تھامے اوڈی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے ہم سب کو اپنے نشانے پر رکھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔

''چلو...... دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔''

اس کی دھمکی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تاہم وہ چاروں حملہ آور موٹر سائیکل سوار اپنی اپنی بائیک سنبھال کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگا تو گن بردار ڈرائیور نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اے مسٹر! میڈم تمہیں بلا رہی ہیں۔''

ظاہر ہے، میڈم سے اس کی مراد وہی طرح دار ہسپانوی عورت تھی جو اوڈی Q-7 کی عقبی نشست پر براجمان تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور گاڑی کے اندر موجود شارو کو محفوظ ...... پا کر سکون کی سانس لی پھر سبک خرامی سے اوڈی والی میڈم کی جانب بڑھ گیا۔

میں جب لگژری سلور اوڈی کے نزدیک پہنچا تو اس عورت نے بڑی دل آویز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا اور پوچھا۔

''اے بہادر نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ عورت بڑی بارعب اور متاثر کن شخصیت کی مالک تھی لیکن میں اس کے رعبِ حسن میں نہیں آیا اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اسد علی!''

''مسٹر علی! تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''ویلس گڈ!'' وہ اپنے مخصوص دل نشین انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''رات میں ہائی وے پر ذرا احتیاط سے چلا کرو اور...... تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔''

''تھینک یو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''مجھے بہادر اور جی دار لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ''اور میں ایسے افراد کی بڑی قدر کرتی ہوں۔ تمہیں اگر زندگی میں کبھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو یاد کر لینا، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس کی پیش کش کو قبول کرنے کا عندیہ دیا اور نہ مسترد کرنے کا اشارہ۔

اس نے اپنے بیش قیمت بیگ میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو۔ مجھ سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔

''بائے ......!'' اس نے ہاتھ ہلا کر متبسم انداز میں مجھے الوداع کہا اور اس کے ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے چار چھلوں والی اوڈی آگے بڑھا دی۔

میں اپنی ہنڈا ئے میں بیٹھا اور گاڑی کو ہائی وے پر ڈال دیا۔ شارو نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''چار چھلوں والی گاڑی میں کون تھی؟''

اوڈی کار کو امریکا میں یار لوگ عموماً ''چار چھلوں والی گاڑی'' کہہ کر پکارتے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اوڈی کے لوگو میں چار رنگ بنے ہوئے ہیں جو دراصل چار مختلف آٹو موبائل کمپنیز کی نمائندگی کرتے ہیں' اوڈی کار کا بانی ایک جرمن شخص ''اوگسٹ ہاش'' تھا جس نے 1910ء میں چار آٹو موبائل کمپنیز کو ایک ساتھ ملا کر اوڈی کمپنی کی بنیاد رکھی تھی اور ان چار کمپنیز میں سر فہرست واکس واگن کمپنی ہے۔ اوڈی کی زندگی میں واکس واگن کی حیثیت والد محترم ایسی ہے۔ ایک سو پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی اوڈی کار کی شان و شوکت اور قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ آج بھی اس کا شمار دنیا کی بیش قیمت عمدہ آٹومیٹک لگژری کاروں میں ہوتا ہے۔

میں نے اس اوڈی والی میڈم کا وزیٹنگ کارڈ شارو کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''خود دیکھ لو۔''

اس نے میرے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ لے کر بہ آواز بلند پڑھا۔ ''ڈیلفینا ...... گیلویسٹن۔''

''کچھ پتا چلا' یہ کیا چیز ہے؟'' میں نے شارو سے پوچھا۔

''بس یہی پتا چلا ہے کہ اس کا نام ڈیلفینا ہے اور یہ... گیلویسٹن میں کہیں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''نیچے اس کا فون نمبر درج ہے۔'' پھر اس نے ڈیلفینا کا نمبر بھی پڑھ ڈالا۔ ''ایٹ ڈبل زیرو ڈبل فور فائیو ڈبل زیرو نائن زیرو۔''

''کچھ پلے پڑا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''نہیں ......'' شارو نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس کے کانٹیکٹ نمبر میں ''ڈبل'' کی بہت تکرار ہے جس سے لگتا ہے یہ عورت ڈبل کراس قسم کی کوئی شے ہے۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اس نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی تھی یہ ڈیلفینا؟''

''کہہ رہی تھی کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت محسوس ہو تو میں اسے یاد کرلوں۔'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''پھر تو تمہیں ڈیلفینا کا کارڈ بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھنا چاہیے۔'' وہ مذکورہ وزیٹنگ کارڈ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے وہ کارڈ اپنی جیب میں رکھنے کے بعد کہا۔ ''شارو! آج جو کچھ پیش آیا اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تم میرے چند سوالات کا جواب دو گی؟''

''ضرور دوں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''دوستی میں کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ تم جو پوچھو گے' میں بتاؤں گی۔''

''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ چاروں موٹر سائیکل سوار لیونارڈو کے بھیجے ہوئے تھے۔'' میں نے سپر ایٹ موٹل کی جانب سفر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ' لیونارڈو کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے؟''

''کوئی معاملہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھو شارو! کوئی خواہ مخواہ کسی کا دشمن نہیں ہوجاتا'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وَنی لاؤنج میں جب لیونارڈو سے میری تلخ کلامی ہوئی تو اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ تمہارے ساتھ اس کا کوئی پرانا حساب ہے لہٰذا میں بیچ میں نہ آؤں۔ میں جاننا چاہتا ہوں' تمہارا اس کے ساتھ کون سا حساب ہے۔ کیا کوئی پیسوں کا لین دین ہے؟''

''ہاں' ایسی ہی بات ہے۔'' اس نے کہا۔

''مطلب' تم نے اس سے کچھ رقم لے رکھی ہے اور وہ واپسی کے لیے تم پر دباؤ ڈال رہا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے' مجھے بتاؤ۔'' میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

''لیونارڈو ایک غنڈا اور بدمعاش شخص ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ چاہتا ہے' میں اسے غنڈا ٹیکس دوں۔ وہ ماہانہ دو سو ڈالرز کا مطالبہ کررہا ہے' یہ اس کا دھندا ہے۔ وہ کمزور افراد پر دھونس جما کر مال بناتا ہے اور عیش کرتا ہے۔ میں کافی دنوں سے اسے بہلا پھسلا کر ٹال رہی ہوں۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے لہٰذا اب وہ کھلم کھلا بدمعاشی پر اتر آیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''تم وَنی لاؤنج کی گلوکاری سے کتنا کما لیتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ہزار ڈالرز!'' اس نے بتایا۔

''کیا تم اس آمدنی میں خوش ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''مگر میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ زندگی تو آخر گزارنا ہی ہے نا۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی بے بسی نے مجھے دل گرفتہ کردیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''تم فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی تمہارے لیے کوئی راستہ نکالوں گا۔ ایک بات بتاؤ؟''

''کیا بات علی...... پوچھو!'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''اگر تمہیں کوئی باعزت اور بہتر جاب مل جائے تو کیا تم وَنی لاؤنج کو چھوڑ سکتی ہو؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں...... چھوڑ دوں گی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''اوکے...... میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''پریشان نہیں ہونا۔ میں بہت جلد تمہیں اس دلدل سے نکال لوں گا۔''

میری ہنڈا ئے سپر۔ ایٹ موٹل کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے گاڑی کو سائڈ پر روکتے ہوئے کہا۔ ''شارو! تمہاری منزل آگئی۔''

وہ گٹار کو اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اوکے' میں چلتی ہوں۔''

''میرا نمبر رکھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر کوئی پرابلم ہو تو تم مجھے کال کرسکتی ہو۔''

''شیور......'' اس نے کہا۔

اس کے بعد ہم نے آپس میں سیل نمبرز کا تبادلہ کیا پھر ایک بھرپور اور گرم جوش معانقہ کرنے کے بعد وہ میری گاڑی سے اتر گئی اور تیز قدموں سے سپر۔ ایٹ کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

شارو موٹل کے اندر داخل ہوگئی تو میں نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

پھر ہماری اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ہماری ہر ملاقات پہلے سے زیادہ کیف آور اور رنگین و سنگین ہوتی۔ ہمارے بیچ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ چند روز پہلے ایک اور ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

ہم دونوں ڈکسی ڈرائیو پر واقع میموتھ پارک میں وقت گزارنے کے بعد باہر نکلے تو لیونارڈو سے سامنا ہوگیا۔ وہ ہمارے تعاقب میں وہاں تک نہیں آیا تھا بلکہ یہ ایک

اتفاقیہ آمنا سامنا تھا۔ اس کے ساتھ دو میکسیکن اور بھی تھے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا تو اس نے مجھے ماں کی ایک غلیظ گالی دی۔ میں اس کی اس کمینی حرکت کو برداشت نہ کر سکا اور ہمارے بیچ مارا ماری شروع ہو گئی۔

پچھلے معرکوں کی طرح اس بار بھی نتیجہ میرے حق میں برآمد ہوا اور لیونارڈو اینڈ کمپنی کو میرے ہاتھوں پٹنے کے بعد دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس روز گھر کی جانب واپسی کے سفر کے دوران میں' میں نے شارو سے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

''کل سے تم ونی لاؤنج نہیں جاؤ گی...... ڈیٹس آل!''

''ونی لاؤنج نہیں جاؤں گی تو پھر کیا کروں گی؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ تو میرا روزگار ہے۔''

''اپنے موٹل میں آرام کرو گی۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ ''میں تمہارے لیے کسی معقول جاب کا انتظام کروں گا اور تمہارا روزگار چل نکلے گا۔''

''اور جب تک انتظام نہیں ہو جاتا......'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''میرا گزارہ کیسے ہو گا؟''

''میں تمہیں فیڈ کروں گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کسی بھی حوالے سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن اس نیک کام میں دیر نہیں لگانا'' وہ تاکیدی لہجے میں بولی ''میں تم پر زیادہ دباؤ...... نہیں ڈالنا چاہتی ...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بھی میری ایک بات ذہن نشین کر لو شارو'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''دوستی میں دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دوستی کسی پُل کے مانند ہوتی ہے جس کے ستونوں پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ دوستی کے پل کو قائم و دائم اور مضبوط رکھنے کے لیے ستونوں کو ہر نوعیت کا دباؤ سہنا پڑتا ہے۔''

''اوکے...... میں سمجھ گئی۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس روز کے بعد میں نے شارو کی کسی معقول جاب کے لیے سنجیدگی سے کوشش شروع کر دی تھیں۔ میں چاہتا تھا' وہ کسی ایسی جگہ کام کرے جہاں اسے اچھے پیسے ملیں اور اسے عزت و جان کا تحفظ بھی حاصل ہو۔ میری یہ کوشش جاری تھی کہ نظار والا واقعہ پیش آ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کو میں دیر تک نظار کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور جب صبح میں بیدار ہوا تو تب بھی وہ میرے ذہن پر سوار تھا۔ گزشتہ روز اسٹور پر جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نظار سے میری ایک سال سے وابستگی تھی۔ وہ بہت ہی ملنسار اور خوش اخلاق شخص تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اس کی موت سے مجھے گہرا صدمہ ہوا تھا۔

میں سو کر اٹھا تو سر سوا من وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں درد کی ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ مجھے سر پر کسی قسم کی کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ یہ سب اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ بہرحال، ایک نئے دن کا آغاز تو کرنا تھا۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور انکل سلطان کی طرف آ گیا۔ کل والے سانحے کی انہیں اطلاع دینا بہت ضروری تھا۔

''میرے بچے!'' پوری بات توجہ سے سننے کے بعد انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں، تمہارا دل تمہاری نیت اور تمہارے ہاتھ صاف ہیں اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میں اپنے لیے پریشان نہیں ہوں انکل۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے چہرے پر آپ کو جو فکرمندی نظر آ رہی ہے، یہ سب نظار کی ناگہانی جدائی کے سبب ہے۔ میرا اس کے ساتھ دل لگ گیا تھا۔''

''میرے بچے! دل کے معاملات ایسے ہی سنگین ہوتے ہیں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولے۔ ''دل جب کہیں لگ جاتا ہے تو پھر انسان کے احساسات اسی نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو شکر کرو نظار ایک مرد تھا۔ اگر کسی لڑکی سے تمہارا دل لگ گیا ہوتا تو پھر یہ لمحات بڑے اذیت ناک ہو جاتے۔''

میرے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میرا دل بے طرح شارو کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ میں اسے پسند کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میری اس پسندیدگی کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ہاں' اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور میں اسے ہر وقت اپنے آس پاس، دل کے قریب محسوس کرتا تھا۔

شاید یہ انکل کی بات کا تسلسل تھا یا انہوں نے میرے دلی جذبات کو چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے بھانپ لیا تھا۔ نہایت ہی گمبھیر انداز میں انہوں نے کہا۔

''چند روز پہلے کسی نائٹ کلب میں تمہارا غنڈوں سے

پھڈا ہو گیا تھا۔ وہ لوفر میکسیکن تھے اور تم نے بتایا ہے، کل جو دولڑکے تمہارے اسٹور پر آئے وہ بھی میکسیکن تھے۔ کیا یہ اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں؟''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر یہ وہی پرانا معاملہ ہوتا تو وہ لوگ نظار کو نہیں' مجھے نشانہ بناتے۔ میں سمجھتا ہوں' یہ ایک عام ڈکیتی کی واردات تھی جس میں پاگل میکسیکن نے نظار پر بلاوجہ گولی چلا دی تھی۔ مجھے ان دونوں واقعات میں کوئی ربط ضبط نظر نہیں آتا۔''

''ہوں ......'' انہوں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''میرے بچے! تم نے پولیس کے ساتھ پورا تعاون کرنا ہے۔ وہ جو بھی سوال کریں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہے۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔''

میں مزید تھوڑی دیر تک انکل سلطان کے پاس بیٹھا حالات حاضرہ پر بات چیت کرتا رہا پھر بے سٹی سے اینگلٹن کی جانب روانہ ہو گیا۔ ٹھیک دو بجے مجھے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ بے سٹی سے اینگلٹن محض اڑتالیس منٹ کی ڈرائیو تھی اور میرے پاس ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ اگر میں آرام سے بھی ڈرائیو کرتا تو اکسٹھ کلومیٹر کا یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کیا جا سکتا تھا۔

جب میں سرکل اے گروسری پہنچا تو اسٹور کے باہر پولیس کار کو موجود پایا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میری آمد سے قبل پولیس نے اپنا تفتیشی کام شروع کر دیا تھا۔ میں اسٹور کے اندر داخل ہوا تو باس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ آج صبح ہی اسٹور پر آ گیا تھا۔ کبھی کبھار کسی ایمرجنسی میں ہم لوگ ایسا ہی کرتے تھے۔ اگر کوئی ورکر شارٹ ہوتا تو اس کی جگہ کوئی دوسرا ڈبل ڈیوٹی کرتا تھا۔ نظار عارضی طور پر شارٹ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی جدائی دائمی تھی لہٰذا باس کو اس کی جگہ کسی مستقل ورکر کو سیٹ کرنا تھا۔

میں نے باس کو سلام کیا تو اس نے کہا۔ ''اچھا ہوا' تم وقت پر آ گئے۔ پولیس والے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے تمہارا پوچھا۔ شاید وہ تمہیں پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہیں۔''

''پولیس اسٹیشن!'' میں نے چونک کر باس کی طرف دیکھا۔ ''مگر کیوں؟''

میری آواز اتنی بلند تھی کہ پولیس آفیسر میری جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے نزدیک آیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بس معمول کی پوچھ گچھ ہے۔ ایک گھنٹے سے پہلے تمہیں فارغ کر دیا جائے گا۔''

''آپ کل رات مجھ سے سب کچھ تو پوچھ چکے ہیں۔'' میں نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اب باقی کیا بچا ہے؟''

''کیا تمہیں پولیس اسٹیشن جانے پر کوئی اعتراض ہے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

''نن ...... نہیں ......'' میں اٹک کر بولا۔

''تو پھر چلو۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''ہمارے سینئر آفیسر تم سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ تم جس گاڑی میں جاؤ گے، تھوڑی دیر بعد تمہیں اسی گاڑی میں یہاں اسٹور پر چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اوکے، آئی ایم ریڈی۔'' میں نے کہا۔

باس نے میری حوصلہ افزائی کی اور کندھا تھپتھپایا۔

''وش یو گڈ لک!''

پولیس آفیسر نے اسٹور پر اپنا کام جاری رکھا اور میں ایک جونیئر پولیس والے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ ڈبل ون ڈبل زیرو سیمٹری روڈ سے ون زیرو فور کینن ڈرائیو تک پہنچنے میں ہمیں چند منٹ لگے ہوں گے۔ یہ ڈیڑھ کلومیٹر کا ایک مختصر سا فاصلہ تھا۔

مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ یقیناً وہ بھی کوئی پولیس والا ہی ہو گا مگر اس وقت وہ یونیفارم میں نہیں تھا۔ اس نے گول شیشوں اور نفیس فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا اور اس کے بال گھنگرالے، کسی پرندے کے گھونسلے کے مانند پھیلے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، کسی بے فکرے پرندے نے اس کے سر پر اپنا موبائل ہوم تعمیر کر رکھا ہو۔ مذکورہ شخص اپنے سامنے ایک چھوٹا ڈرائنگ بورڈ رکھے بیٹھا تھا۔ ڈرائنگ بورڈ کے نزدیک ہی میز پر مختلف نوعیت کی پینسلز، پوائنٹرز اور اسٹیشنری کا دوسرا سامان بھی موجود تھا۔ علاوہ ازیں میز پر ایک مکمل کمپیوٹر یونٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ان لوازمات کو دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی آرٹسٹ قسم کی ''چیز'' ہو گا۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

میرے ساتھ آنے والے پولیس والے نے اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''فریڈی! تم اس بندے سے ڈیٹیلز لے کر اسکیچ بنا ڈالو۔''

''اوکے!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دے کر سرسری انداز میں کہا۔

''مسٹر علی!'' پولیس والے نے مجھ سے کہا۔ ''کل جو دو

میکسیکن تمہارے اسٹور پر آئے تھے اور ان میں سے ایک نے تمہارے ساتھی نظار کو شوٹ کر دیا تھا' تم ان کے حلیوں کی تفصیل فریڈی کو بتاؤ۔ یہ ان کے خاکے تیار کر دے گا جس سے ان دونوں میکسیکن کی تلاش میں بہت مدد ملے گی۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں فریڈی کے سامنے بیٹھ گیا۔

پولیس والا ہم دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ فریڈی نے ڈرائنگ بورڈ پر ڈرائنگ شیٹ لگائی اور پینسل اٹھا کر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظر میں چھپے اشارے کو سمجھ کر میں شروع ہو گیا اور اسے ان میکسیکن کے حلیوں کی تفصیل کے بارے میں بتانے لگا۔ دونوں منحوسوں کے چہرے مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

پندرہ بیس منٹ کی محنت کے بعد فریڈی نے دو ڈرائنگ شیٹس پر دو خاکے تیار کر لیے پھر وہ خاکے مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

''انہیں غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ یہ ان میکسیکن لڑکوں سے کس حد تک مشابہت رکھتے ہیں؟''

فریڈی کے لہجے میں تحکم تھا نہ درخواست۔ اس کی آواز سپاٹ اور انداز خالصتاً پیشہ ورانہ تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہے اور میرے خیال میں دنیا بھر کے آرٹسٹ اور تخلیقی کام کرنے والے افراد کی اکثریت اسی مزاج اور اسی طبیعت کی مالک ہوتی ہے۔

''میرے خیال میں تم نے اپنے فن کی مدد سے میری بیان کردہ تفصیل کی پچاس فیصد ترجمانی کی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''رائٹ یو آر!'' وہ ہونٹوں پر ایک بے نام اور غیر محسوس سی مسکراہٹ کو سجاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کا ایک سبب ہے۔''

''کیسا سبب؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ویری کلیئر...... '' وہ دونوں اسکیچز کو اسکینر میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''ابھی میں نے پچاس فی صد کام کیا ہے۔ باقی پچاس فی صد کمپیوٹر کی مدد سے ہوگا۔''

ایک منٹ کے اندر دونوں اسکیچز اسکین ہو کر کمپیوٹر کے اندر پہنچ گئے۔ اس نے کمپیوٹر کے ڈسپلے کو میز پر مخصوص اینگل سے ایسے ایڈجسٹ کر دیا جہاں سے ہم دونوں بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ مجھ سے سوالات کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

فریڈی نے مجھ سے جو جو پوچھا، میں نے اپنی یادداشت کے سہارے من وعن بتا دیا۔ دونوں کے بالوں کا رنگ، اسٹائل، چہرے کی ساخت، کان، ناک اور ہونٹوں کی بناوٹ، چہرے کی ہڈیوں کے ابھار ......وغیرہ وغیرہ۔ الغرض، آئندہ پندرہ منٹ میں فریڈی نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت اور مہارت کو استعمال کر کے کمپیوٹر کی مدد سے دو ایسے خاکے تیار کر لیے جو صد فیصد نہیں، البتہ پچانوے فیصد انہی میکسیکن لڑکوں کے تھے جنہوں نے گزشتہ رات ہمارے اسٹور میں گڑبڑ کی تھی اور اس گڑبڑ کے نتیجے میں نظار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

''ونڈرفل!'' میں نے توصیفی نظر سے فریڈی کو دیکھا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ اسکیچز انہی میکسیکن لڑکوں کے ہیں؟''

فریڈی نے تصدیق طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔

''بالکل!'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری مہارت کو مان گیا ہوں۔''

''چلو چھٹی ہوگئی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''کیا مطلب!'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''چھٹی ہوگئی ...... میں سمجھا نہیں۔''

ادھر فریڈی کی بات ختم ہوئی، ادھر پولیس والا دوبارہ کمرے میں نمودار ہوا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔

مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہم پولیس چیف آفیسر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پولیس والا مجھے چیف کے کمرے میں داخل کر کے واپس چلا گیا تھا۔ اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ کے چیف آفیسر کا نام ڈیوڈ ایش برن تھا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں سے ذہانت اور چہرے سے بردباری ٹپکتی تھی۔ وہ ایک سنجیدہ، سمجھ دار دراز قامت شخص تھا۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ایک تصویر میری جانب بڑھائی اور پوچھا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

میں نے مذکورہ تصویر کا جائزہ لیا اور فوراً اس شخص کو پہچان لیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے جواب دیا۔

''یس سر! یہ لیونارڈو ہے۔''

یہ وہی غنڈا تھا جس کے ساتھ ایک ماہ قبل پہلی بار

میری مار اماری ہوئی پھر چند روز بعد ہم دوبارہ آمنے سامنے آئے تھے اور اس مرتبہ بھی اسے دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔

''چند روز پہلے تمہارا لیونارڈو سے جھگڑا ہوا تھا؟'' چیف کے لہجے میں سوال تھا۔

ڈیوڈ ایش برن نے ''چند روز پہلے'' کے الفاظ استعمال کیے تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ میری اور لیونارڈو کی دوسری مڈھ بھیڑ کا حوالہ دے رہا تھا۔ اس وقت بھی شارو میرے ساتھ تھی اور ہم میموتھ پارک سے باہر نکل رہے تھے۔ میموتھ پارک لیک جیکسن میں ڈکسی ڈرائیو پر واقع ایک پبلک پارک تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''یس سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟'' پولیس چیف نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہاری اس سے کوئی دشمنی وغیرہ ہے؟''

''نہیں جناب ...... کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''شاید وہ اپنی سابق ہزیمت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔''

''سابق ہزیمت؟'' چیف نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''تھوڑی تفصیل بتاؤ......!''

میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں چیف کو وہ واقعہ سنا دیا جب لگ بھگ ایک ماہ پہلے میں نے ''ونی لاؤنج'' نائٹ کلب میں لیونارڈو اور اس کے ساتھی غنڈوں کی دھلائی کی تھی۔ میرے پولیس اسٹیشن پہنچنے سے پہلے چیف تک میری حالیہ سرگرمیوں کی تفصیل پہنچا دی گئی تھی اسی لیے اس نے لیونارڈو کا قصہ چھیڑا تھا تاہم اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ونی لاؤنج والے واقعے سے واقف نہیں تھا۔ اس کی معلومات کا مرکز و محور میموتھ پارک والا واقعہ تھا لہٰذا میں نے بھی ونی لاؤنج کا ذکر کرتے ہوئے اوڈی والی میڈم کا تذکرہ گول کر دیا تھا۔ چار چھلوں والی وہ سلور اوڈی اور اس میں بیٹھی پُرکشش شخصیت کی مالک وہ میڈم ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھی۔ بعض چہرے اور شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں یاد نہیں رکھنا پڑتا۔ وہ از خود انسان کی یادداشت میں اپنی جگہ اور مقام بنا لیتی ہیں۔

''مطلب دو مرتبہ لیونارڈو سے تمہارا پھڈا ہو چکا ہے؟''

''یس سر!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''تم نے بتایا کہ پہلی مرتبہ جب تمہارا لیونارڈو سے جھگڑا ہوا تو اس کا سبب تمہاری گرل فرینڈ شارو تھی۔'' چیف سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا دوسری بار بھی کلیش کی وجہ شارو ہی تھی کیونکہ اس روز بھی میموتھ پارک میں شارو تمہارے ساتھ تھی!''

''نو سر!'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''اس بار لیونارڈو نے براہ راست مجھے نشانہ بنایا تھا حالانکہ شارو میرے ہمراہ تھی مگر لیونارڈو نے شارو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے منہ ماری کی تھی اور مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا......''

''لیونارڈو نے ایسی کیا بات کی تھی کہ تم آپے سے باہر ہو گئے؟'' چیف کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔

مجھے جس مقصد کے لیے پولیس اسٹیشن بلایا گیا تھا، موجودہ پوچھ تاچھ اس مقصد سے غیر متعلق نظر آتی تھی۔ مجھ سے گزشتہ رات والے واقعے کے بارے میں پوچھا جانا چاہیے تھا لیکن چیف ڈیوڈ گڑے مُردے اکھاڑنے میں مصروف تھا مگر ظاہر ہے، میں اسے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا تھا لہٰذا جواب دینا ضروری تھا۔

''اس کمینے نے میری ذات پر حملہ کیا تھا......میری ماں کو گالی دی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''اور......میں برداشت نہیں کر سکا تھا۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا اور ہمارے بیچ باقاعدہ مار پیٹ شروع ہو گئی تھی۔''

''لیونارڈو کے ساتھ اس روز دو میکسیکن بندے اور بھی تھے؟'' ڈیوڈ ایش برن نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا، میز پر رکھا ہوا فون بیدار ہو گیا۔ ڈیوڈ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ہیلو......!''

وہ چند لمحات تک دوسری جانب بولنے والے کی بات سنتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''او کے......آل رائٹ۔''

ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا۔ ''مورگن کی کال تھی ......وہ پولیس آفیسر جو سرکل اے پر تفتیش کر رہا ہے۔ تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں پولیس چیف کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسی اچھی خبر؟''

''دوسری گولی مل گئی ہے۔'' وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میکسیکن ڈکیت نے جو دوسرا فائر تم پر کیا تھا، وہ گولی کولرز کے نزدیک بنے ہوئے سیکنڈ شیلف کے چوبی فریم میں دھنس گئی تھی۔ وہ شیلف جس میں میڈیسنز (ادویات) رکھی ہوئی ہیں۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''علی! تم ایک لکی انسان ہو۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس میکسیکن ڈکیت کا نشانہ خطا نہ جاتا تو یہ گولی میڈیسن شیلف کے چوبی فریم کے بجائے تمہاری کھوپڑی میں بھی دھنس سکتی تھی......!''

''تھینکس گاڈ!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''لیونارڈو کے ساتھ اس روز دو بندے اور بھی تھے اور تم نے لیونارڈو کے ساتھ انہیں بھی دھو ڈالا تھا۔'' ڈیوڈ دوبارہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم ان دو افراد کے حلیوں سے واقف ہو؟''

''کافی حد تک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دوبارہ دیکھوں تو پہچان لوں گا۔''

''دوبارہ دیکھو تو پہچان لوگے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا پھر دو خاکے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ انہی افراد کے اسکیچز ہیں؟''

ڈیوڈ ایش برن نے مجھے جو اسکیچز دکھائے تھے، یہ وہی خاکے تھے جو تھوڑی دیر پہلے فریڈی نے میری یادداشت کے سہارے تیار کیے تھے۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''نو سر...... یہ تو ان دو میکسیکن ڈکیت کے خاکے ہیں جنہوں نے گزشتہ رات ہمارے اسٹور کا سکون برباد کیا تھا جس کے نتیجے میں میرا ایک دوست اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔''

''مجھے تمہارے دوست نظار کی موت کا بہت دکھ ہے۔'' ڈیوڈ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ہمیں چونکہ تمہارے اور لیونارڈو کے جھگڑے کا پتا چل چکا تھا اس لیے ہمارا ذہن لیونارڈو کی طرف گیا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ شاید لیونارڈو کے ساتھیوں نے پچھلی رات تمہارے اسٹور پر دھاوا بولا ہے لیکن ثابت ہوگیا کہ یہ دونوں معاملات الگ الگ ہیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''مسٹر علی! اگر مائنڈ نہ کرو تو تمہیں ایک مشورہ دوں!''

''شیور سر...... مجھے خوشی ہوگی۔''

''لیونارڈو جیسے لوگوں سے دور رہا کرو۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''میرے پاس لیونارڈو کے حوالے سے اور بھی شکایات ہیں۔ میں جانتا ہوں، وہ اچھا آدمی نہیں ہے مگر میں براہ راست اس کے معاملے میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہ سراسر لیک جیکسن پولیس کا ایشو ہے اور میری معلومات کے مطابق لیک جیکسن والے اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ کسی بھی دن ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ لیونارڈو کو دھرلیں گے اور عین ممکن ہے، وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔''

''اوکے سر......'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایات کو ذہن میں رکھوں گا اور آئندہ لیونارڈو جیسے فتنہ پرور افراد سے دور رہنے کی کوشش کروں گا۔''

''اب تم جاسکتے ہو۔'' ڈیوڈ ایش برن نے تفتیش کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ان دو میکسیکن ڈکیت کے جو اسکیچز بنوائے ہیں ان کی مدد سے ہم جلد انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ دونوں اسکیچز واقعے کی ہسٹری کے ساتھ ٹیکساس کے تمام پولیس ڈیپارٹمنٹس کو بھیج دیے جائیں گے بلکہ ٹیکساس کی پڑوسی تمام ریاستوں میں بھی اسی قسم کا اہتمام کیا جائے گا۔ وہ زیادہ دیر تک قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔''

''مجھے خوشی ہوگی اگر وہ دونوں شیطان اپنے قرار واقعی انجام کو پہنچیں۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''خاص طور پر وہ مردود جس نے نظار پر گولی چلائی تھی۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ خاصا تلخ ہوگیا تھا۔ نظار کی ناگہانی جدائی کا صدمہ میرے ایک ایک لفظ سے جھلک رہا تھا اور میری دلی آرزو تھی کہ وہ کمینے جلد از جلد قانون کے شکنجے میں کس دیے جائیں اور ڈیوڈ ایش برن نے ایسے ہی عزم کا اظہار کیا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''وہ ابھی تک ٹیکساس کے اندر ہیں یا کسی اور اسٹیٹ کا رخ کرچکے ہیں، ہر صورت میں وہ ہماری گرفت میں آئیں گے۔ تم ایک فون نمبر نوٹ کرو۔''

چیف کے آخری جملے کے جواب میں، میں نے جیب سے اپنا سیل فون نکال لیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''ایٹ فور نائن ٹو تھری ایٹ تھری۔''

میں نے مذکورہ نمبر اپنے سیل فون میں فیڈ کرلیا اور اس کے بعد چیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''غالباً یہ یہاں کا فون نمبر ہے۔''

''غالباً نہیں یقیناً۔'' ڈیوڈ نے پُروثوق لہجے میں کہا۔ ''اگر تم اینگلٹن سے دور ہو تو اس نمبر سے پہلے اینگلٹن کا سٹی کوڈ نائن سیون نائن بھی شامل کرلینا۔ تمہارا نمبر ہمارے پاس ہے۔ اگر تمہیں اس واقعے کے حوالے سے کوئی بھی چھوٹی بڑی بات پتا چلے تو تم فوراً ہمیں مطلع کرو گے...... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کو بھی جب میری ضرورت محسوس ہو، مجھے حاضر پائیں گے۔“

”میرا خیال ہے، اب تمہیں زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”بالفرض محال، اگر ایسا سینیریو بنا تو دیکھ لیں گے۔“

میں اینگلٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ کے چیف ڈیوڈ ایش برن سے گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد واپس سرکل اے گروسری آ گیا۔

ایک بات تو طے تھی کہ دوسری گولی کی بازیافت کے بعد پولیس کا شک میری طرف سے ہٹ گیا تھا ورنہ چیف آفیسر پولیس ڈیپارٹمنٹ کا نمبر دیتے ہوئے یہ نہ کہتا کہ اگر تم اینگلٹن سے دور ہو تو سٹی کوڈ بھی لگا لینا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نظار کے مرڈر کے حوالے سے میری ذات کلیئر ہو چکی تھی۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ پولیس بہت جلد ان دو میکسیکن ڈکیتوں کو ڈھونڈ نکالے گی۔

جب میں سرکل اے پہنچا تو پولیس والوں کی گاڑی کو غائب پایا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اسٹور پر انہوں نے اپنی انٹیروگیشن مکمل کر لی تھی۔ اگر تفتیش کسی کنارے نہ لگی ہوتی تو وہ اتنی آسانی سے ہرگز ٹلنے والے نہیں تھے..... انٹیروگیشن کے دوران میں یہ لوگ بال کی کھال اور کھال کے بال نکالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

جیک خواجہ نے مجھے بتایا۔ ”علی! پولیس نے تمہیں اس معاملے سے کلیئر کر دیا ہے۔“

”مجھے پولیس اسٹیشن میں ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا باس۔“ میں نے کہا۔

وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ ”اوہاں...... وہاں کیا رہا؟“

میں نے جواب میں باس کو، چیف ڈیوڈ ایش برن سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

”خدا کا شکر ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا ورنہ میں تمہارے لیے بہت فکرمند ہو رہا تھا۔“

”اللہ مدد کرنے والا ہے باس۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”نظار کی باڈی کا کیا ہوا؟“

”باڈی اس کی وائف کے سپرد کر دی گئی ہے۔“ باس نے بتایا۔ ”آج شام میں اس کی تدفین ہوگی۔ کیا تم اس کی تدفین میں شرکت کرو گے؟“

”ضرور......“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”میں نہیں رک سکوں گا۔“ باس نے کہا۔ ”ادھر شوگر لینڈ میں ایک ضروری کام ہے۔ ویسے میں نے نظار کی وائف کی مدد کر دی ہے۔“

”کیسی مدد؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”دیکھو علی! یہ ایک حقیقت ہے کہ نظار کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔“ باس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بھی سچ ہے کہ انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ میں کسی بھی صورت نظار کو واپس نہیں لا سکتا لیکن میں نے اس کی سوگوار بیوی کو کچھ رقم دے دی ہے جو یقیناً اس کے بہت کام آئے گی۔“

”آپ نے نظار کی وائف کو کتنی رقم دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دس ہزار ڈالرز......“ باس نے جواب دیا۔

”گڈ!“ میں نے سراہنے والی نظر سے باس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں نے بھی کچھ رقم پس انداز کر رکھی ہے۔ اس میں سے کچھ نظار کی وائف کو دے دوں گا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ باس نے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، یہ امریکا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ ہر شخص ڈالرز کمانے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے لیکن ہم مشرقی خصوصاً پاکستانی لوگ ابھی تک بعض روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دکھ درد میں ایک دوسرے کے کام آنا اور مالی مدد کرنا ہماری روایات کا حصہ ہے۔“

اس وقت تک میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا تعلق مشرق سے یا پاکستان سے تھا کیونکہ انکل سلطان نے ابھی تک یہ راز مجھ پر افشا نہیں کیا تھا البتہ، اس بات کا مجھے وثوق تھا کہ میں الحمدللہ مسلمان تھا اور میرے والدین بھی یقیناً مسلمان ہی تھے جبھی میرا نام خالصتاً مسلمانوں والا تھا۔

باس کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خواجہ صاحب۔ روایات کو قائم رکھنے ہی میں انسان کی بقا ہے۔ جو قومیں اور تہذیبیں اپنی روایات کو ترک کر دیتی ہیں، کچھ ہی عرصے کے بعد ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ بس پھر ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں ہی میں رہ جاتا ہے۔“

”تم آج چھٹی کر لو۔“ باس نے کہا۔ ”کل فریش ہو کر آجانا۔“

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ نظار کی تدفین کا وقت قریب تھا۔ اس کی رہائش اینگلٹن ہی میں تھی۔ اگر میں اپنے گھر چلا جاتا تو پھر تدفین میں شرکت کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا لہٰذا میں

نے یہ کام نمٹانے کے بعد ادھر ہی جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے اس فیصلے سے باس کو بھی آگاہ کر دیا۔

اس نے میرے فیصلے کو سراہا۔ میں باس سے مصافحہ کرنے کے بعد سرکل اے گروسری سے نکل آیا۔

میں روزانہ نظار کے ساتھ ڈیوٹی کرنے کا عادی تھا۔ اس کے بغیر اسٹور میں رکنے کا من نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کی ایک عادت سی ہوگئی تھی۔ بکری کا بچہ بھی کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہے تو آپ کو اس سے انسیت ہو جاتی ہے، نظار تو پھر ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ میرا دل نظار کے لیے خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن ظاہر ہے، یہ آنسو میری آنکھوں سے نہیں گر رہے تھے۔

جب آنکھیں خشک اور دل بوجھل ہو تو پھر آنسو اندر ہی گرتے ہیں اور یہ آنسو بڑے بے زبان ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا، خونِ جگر کس کے لیے بہہ گیا......!

☆☆☆

شام کے سات بجے تھے۔ میری گاڑی ہائی وے ٹو ڈبل ایٹ پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ میرا رخ اینگلٹن سے لیک جیکسن کی طرف تھا۔ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے گاڑی سائڈ میں لگائی اور فون اٹینڈ کیا۔ وہ انکل سلطان کی کال تھی۔

''ہیلو انکل...... گڈ ایوننگ۔'' میں نے کہا۔

''گڈ ایوننگ میرے بچے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ہائی وے ٹو ڈبل ایٹ پر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اسٹور سے گھر کی جانب جا رہا ہوں۔''

''اوہ، تم ڈرائیونگ کے دوران میں تو کال نہیں سن رہے ہو؟'' ان کی آواز میں تشویش ابھر آئی۔

''نہیں انکل! میں امریکا کا ایک قانون پسند شہری ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''گاڑی کو میں نے فون اٹینڈ کرنے سے پہلے روک دیا ہے۔''

''شاباش!'' وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ ''مجھے تم سے یہی توقع ہے۔''

مجھے ان کی آواز میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''انکل! فون کیسے کیا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''میرے بچے تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''کیا تم ابھی میرے پاس آسکتے ہو......''

''کیوں نہیں، میں آجاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''گڑبڑ دوسری نوعیت کی ہے۔''

''کوئی فکر والی بات تو نہیں؟''

''نہیں میرے بچے۔''

''اوکے، میں آرہا ہوں۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں نے دوبارہ گاڑی کو ہائی وے پر ڈالا اور کم و بیش ایک کلومیٹر کے بعد میں رچ ووڈ پہنچ گیا پھر رچ ووڈ سے میں نے اپنی گاڑی کا رخ بے سٹی کی سمت موڑ لیا۔ پینتیس منٹ کے بعد میں بے سٹی میں داخل ہو چکا تھا۔ پھر نکولز اسکوائر تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

انکل سلطان اس وقت گھر میں اکیلے ہی تھے۔ مارتھا مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ ''انکل! مارتھا کہاں ہے؟''

''یعنی......'' انہوں نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے کچھ بتائے بغیر ہی تم نے گڑبڑ کا اندازہ لگالیا!''

''میں کچھ سمجھا نہیں انکل؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''میرے بچے!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''میں نے جس گڑبڑ کا ذکر کرتے ہوئے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے، اس کا تعلق مارتھا ہی سے ہے۔''

''کیا مطلب!'' میری الجھن سوا ہوگئی۔ ''کیا ہوا ہے مارتھا کو؟''

''وہ نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔'' انکل سلطان نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔

''آپ پریشان نہ ہوں انکل!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے بھی امتحانات کے بعد اسٹڈی کا سلسلہ موقوف ہو چکا ہے۔ اب سمر ویکیشنز کے بعد ہی مزید پڑھائی ہوگی۔ میں آپ کا خیال رکھوں گا تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں میرے بچے۔'' وہ بڑی محبت سے بولے۔ ''تم دو چار دن کے لیے یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ جب کوئی مناسب بندوبست ہو جائے گا تو پھر تم واپس چلے جانا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے، میرا کچھ زیادہ کام نہیں ہے۔''

''جی...... مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں، انکل سلطان

کار کے ایک حادثے کا شکار ہو کر وہیل چیئر پر آ گئے تھے۔ ان کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج تھا۔ اس کے علاوہ انہیں دمے کی بھی شکایت تھی۔ یہ بات صدفی صد درست تھی کہ ان کا کام کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ اپارٹمنٹ کے اندر وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے تھے اور اپنے چھوٹے موٹے کام خود ہی کرلیا کرتے تھے۔ بس واش روم میں آمدورفت اور بیڈ پر لیٹنے کے لیے انہیں کسی دوسرے شخص کے سہارے اور مدد کی ضرورت پیش آتی تھی اور مارتھا ان معاملات میں انکل کا بھرپور خیال رکھا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی اور کھانے پینے کا.... بندوبست بھی سنبھالتی تھی۔

انکل سلطان کے حالیہ مسائل پر غور کرتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں شارو کا نام چمکا۔ اگلے ہی لمحے بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''مسئلہ حل ہو گیا......!''

میری آواز اتنی بلند تھی کہ انکل نے چونک کر پوچھا۔

''کون سا مسئلہ حل ہو گیا میرے بچے؟''

''ہر مسئلہ......'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''اگر آپ چاہیں گے کہ میں آپ کے پاس شفٹ ہو جاؤں تو مجھے بہت خوشی ہو گی لیکن اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ اس کام کے لیے کوئی اٹینڈنٹ ہی چاہیے تو ایک لڑکی ہے میری نظر میں۔''

''کون لڑکی؟'' انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میری ایک دوست ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''ادھر ونی لاؤنج نائٹ کلب میں رات میں دو تین گھنٹے کے لیے گلوکاری کرتی ہے۔ اس کا نام شارو ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اسے آپ کے پاس رکھوا دیتا ہوں۔''

''ونی لاؤنج تو لیک جیکسن میں ہے۔'' انکل نے کہا۔ ''کیا وہ روزانہ باسٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بستی آیا کرے گی اور ......'' لحاتی توقف کر کے انہوں نے گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''......وہ نائٹ کلب والی اپنی سنگنگ کی مصروفیات کا کیا کرے گی۔ اس کے لیے ان تمام معاملات سے نمٹنا مشکل ہو جائے گا۔''

''ہرگز نہیں!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ وہ نائٹ کلب کی جاب چھوڑ چکی ہے اور......''

''جاب کیوں چھوڑ دی اس نے؟'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انکل نے پوچھ لیا۔

''وہاں اس کے لیے کچھ مسائل پیدا ہو گئے تھے۔'' میں نے بتایا۔

''کس قسم کے مسائل؟'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کچھ غنڈے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے غنڈوں سے جان چھڑانے کے لیے کلب کی نوکری چھوڑ دی اور اب اپنے گھر میں جاب لیس بیٹھی ہے۔''

''وہ کہاں رہتی ہے؟'' انکل نے بہ دستور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''سپر۔ ایٹ موٹل میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ جاب کے لیے سخت پریشان ہے۔''

''کیا وہ مقامی ہے یا ہسپانوی؟''

''اس کا تعلق برازیل سے ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اسے ہسپانوی کہہ سکتے ہیں۔''

''تم سے شارو کی دوستی کتنی پرانی ہے؟'' انکل نے استفسار کیا۔

''لگ بھگ ایک ماہ ہوا ہے اس سے ملتے ہوئے۔''

''مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ لیونارڈو نامی میکسیکن غنڈے سے ونی لاؤنج نامی نائٹ کلب ہی میں تمہاری مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کیا اسی لیونارڈو کی وجہ سے شارو کو کلب کی نوکری چھوڑنا پڑی تھی؟''

''جی ہاں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تو گویا تمہارا لیونارڈو سے ٹکراؤ شارو کی وجہ سے ہوا تھا؟'' وہ معاملے کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولے۔

''جی بالکل، ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شارو بہت اچھی لڑکی ہے۔ لیونارڈو اور اس کے ساتھی غنڈوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں لیونارڈو اینڈ کمپنی سے بھڑ گیا تھا۔ میرے ہی کہنے پر شارو نے نائٹ کلب کی جاب چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لیے کسی اچھی جاب کا بندوبست کر دوں گا۔ وہ میرے سہارے بیٹھی ہے۔''

''کیا تم شارو کو ابھی یہاں بلا سکتے ہو؟'' وہ حتمی لہجے میں مستفسر ہوئے۔

''جی بالکل بلا سکتا ہوں۔'' میں نے اپنے سیل فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''او کے بلالو اسے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

''اسے بتا دو کہ اس کی جاب اور رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ سپر۔ ایٹ کو چھوڑ کر فوراً یہاں آ جائے۔ اب وہ

موٹل میں نہیں، اس اپارٹمنٹ میں رہے گی۔ نائٹ کلب کی زندگی کو چھوڑ کر اس نے بہت اچھا کیا ہے۔''

اگلے ہی لمحے میں نے اپنے سیل فون پر شارو کے نمبرز پنچ کیے اور تیسری گھنٹی پر ہمارا رابطہ ہوگیا۔

''ہیلو علی! تم کہاں غائب ہو؟'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ ''صبح سے تم نے ایک بار بھی کال نہیں کی۔ میں نے تم سے ازخود اس لیے رابطہ نہیں کیا کہ وہاں پولیس کی انٹیروگیشن چل رہی تھی۔ میں تمہیں خوامخواہ ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''انٹیروگیشن ختم ہوگئی، کم از کم سرکل اے گروسری کی حد تک یہ معاملہ نمٹ گیا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''کیا نظارکا قاتل پکڑا گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں...... مگر بہت جلد وہ قانون کی گرفت میں ہوگا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''علی! تم اس وقت اینگلٹن میں ہو یا لیک جیکسن میں؟''

''ان دونوں میں سے کسی بھی جگہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر کہاں ہو؟''

''بے سٹی میں۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ...... اپنے انکل کے پاس؟'' اس نے کہا۔

''بالکل، میں اس وقت انکل سلطان کے پاس ہی بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم بھی فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔''

''خیریت تو ہے نا۔'' وہ مستفسر ہوئی۔ ''تم مجھے بے سٹی کیوں بلا رہے ہو؟''

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیسی خوش خبری؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

''میں نے تمہارے لیے ایک عمدہ سی جاب کا بندوبست کردیا ہے۔'' میں نے اطلاع دینے والے انداز میں بتایا۔ ''جاب ود اکاموڈیشن۔ کیا تم فوراً اس موٹل کو چھوڑ کر بے سٹی آسکتی ہو؟''

''موٹل کو چھوڑنا کون سا مشکل کام ہے علی!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''یہاں پر تو کچھ بھی میرا نہیں ہے، سوائے چند جوڑے کپڑوں اور ایک گٹار کے......''

''اوکے۔ تم اپنے اس مختصر سے سامان کو پیک کرو اور کوئی کیب پکڑ کر بے سٹی آجاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''انکل سلطان کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس اینڈ لوکیشن میں تمہیں ٹیکسٹ کر رہا ہوں۔''

''اوکے...... میں آرہی ہوں...... بائے!''

''سی یو......'' میں نے کہا۔

پھر میں نے شارو کو یہ ٹیکسٹ کردیا۔ ''نیکولز اسکوائر اپارٹمنٹس۔ ٹو نائن زیرو ون۔ ہیمن روڈ۔ بے سٹی، ٹیکساس۔ فون نمبر، ایٹ ڈبل سیون تھری سیون سکس ون سیون نائن زیرو۔''

میں سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھ کر انکل کی جانب متوجہ ہوا تو انہوں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''ابھی شارو سے تم نے جس انداز میں گفتگو کی ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس ایک ماہ میں تم دونوں کے بیچ گہرے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''شارو ایک اچھی لڑکی ہے۔ مظلوم اور ضرورت مند۔ اگر میں اس کے لیے کچھ کرسکا تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں نے اس کا گانا سنا ہے۔ اس کی آواز میں بہت سوز و گداز ہے۔''

''میں تمہارے ان ہمدردانہ جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''موسیقی سننے کا مجھے بھی بہت شوق ہے۔ چلو اسی بہانے روزانہ تمہاری دوست کو سننے کا موقع بھی ملے گا۔''

''شارو کا گانا آپ کو بہت پسند آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور شارو بھی......''

''ونی لاؤنج نائٹ کلب میں گلوکاری کا اسے کتنا معاوضہ ملتا تھا؟'' انکل سلطان نے ایک اہم سوال کیا۔

''ایک ہزار ڈالرز۔'' میں نے بتایا۔

''بس...... یہ تو بہت کم ہے۔''

''وہ پارٹ ٹائم تھی۔ دو تین گھنٹے کے لیے وہاں جاتی تھی۔''

انکل نے پوچھا۔ ''اس کے علاوہ وہ اور بھی کچھ کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے، کوئی اور ذریعہ آمدنی؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس ایک ہزار ڈالرز میں سے وہ ڈھائی سو ڈالرز پر۔ ایٹ موٹل والوں کو دے دیتی تھی۔ وہاں اس نے پاؤلا نامی ایک لڑکی کے ساتھ موٹل کے ساتھ ایک کمرا شیئر کر رکھا تھا۔''

''اوہ...... تو اس غریب کو کھانے پینے کے لیے کیا بچتا ہوگا؟'' انکل نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''لیونارڈو کے ساتھ جھگڑا اسی بات کا تھا کہ شارو سے دو سو ڈالرز ماہانہ کا طلب گار تھا اور وہ افورڈ نہیں کر پا رہی

تھی۔'' میں نے شارو کی مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔
''یعنی غنڈا ٹیکس اور...... وہ بھی ٹیکساس میں؟''
انکل نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ''خدا غارت کرے اس نامراد لیونارڈو کو۔''
''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے!'' میں نے تہ دل سے کہا۔
''جب سے شارو نے جاب چھوڑی ہے، اس کا گزارہ کیسے ہو رہا ہے؟'' انکل نے ایک اہم سوال کیا۔
''میں اس کی مالی مدد کر رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔
''اس نے وعدہ کیا ہے کہ جیسے ہی اس کی جاب لگے گی، وہ میرا سارا قرض لوٹا دے گی لیکن میں قرض کی نیت سے اس کی مالی معاونت نہیں کر رہا۔ اسے اپنی ایک مخلص دوست سمجھ کر سپورٹ کر رہا ہوں۔ یہ رقم واپس لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''
''اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا میرے بچے۔'' انکل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔''
''بے شک!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔
لیک جیکسن سے بے سٹی باسٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ اڑتالیس منٹ کی ڈرائیو تھی لیکن شارو کو موٹل سے چیک آؤٹ بھی کرنا تھا۔ سپر۔ ایٹ کے معاملات کو نمٹانے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اسے ہمارے پاس پہنچنے میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹا لگ سکتا تھا۔ اس وقت کو گزارنے کے لیے میں انکل سلطان سے باتیں کرنے لگا۔
تھوڑی دیر پہلے تک ہمارا موضوعِ گفتگو شارو تھی لیکن اب ہم نظار کے ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ میں نے انکل کو پولیس کی انیوسٹی گیشن کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور پھر نظار کی تدفین کا احوال سنایا۔
''تمہارے باس نے نظار کی بیوی کی مدد کے لیے اپنے عظیم انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' انکل سلطان نے کہا۔ ''امریکا میں ایسے لوگ بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔''
''خواجہ صاحب بہت ہی ہمدرد اور پُرخلوص انسان ہیں'' میں نے کہا۔
انکل نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری دوست اس اپارٹمنٹ پر مستقل رکنے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ میرا مطلب ہے، اس کی دوسری سوشل سرگرمیاں بھی تو ہوں گی جن کے لیے اسے گھر سے باہر نکلنا ہوگا!''
''جہاں تک میں شارو کو جانتا ہوں، اس کا سوشل سرکل بہت ہی محدود ہے۔'' میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں انکل کو بتایا۔ ''میں نے اسے اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے نہیں پایا اور مجھے یقین ہے کہ اسے اپارٹمنٹ پر رکنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ باقی اس سے بات کر کے ہی صحیح اندازہ ہو سکے گا۔''
''ہاں ...... تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''ابھی تو ہم دونوں آپس میں بات کر رہے ہیں۔ صحیح فیصلہ اسی وقت ہو سکے گا جب شارو یہاں پہنچ جائے گی۔'' لحاتی توقف کر کے انہوں نے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر مجھ سے پوچھا۔
''کیا تمہیں شارو نام کے معنی معلوم ہیں؟''
''نن ...... نہیں'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
''یہ ہسپانوی زبان کا لفظ ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''اور اس کے معنی ہیں...... خوب صورت پھول۔''
''انکل! شارو اسم با مسمّٰی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ اسے دیکھیں گے تو وہ آپ کو ایک خوب صورت پھول ہی نظر آئے گی...... خوشبو لٹاتا اور فضا کو مہکاتا ہوا ایک تر و تازہ پھول۔''
تھوڑی دیر کے بعد شارو بہ نفسِ نفیس انکل سلطان کے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔ شارو غائبانہ طور پر انکل سے متعارف تھی لیکن یہ ان کی بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انکل نے اس سے کہا۔
''باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے کام کی بات ہو جائے۔ میرا مطلب ہے، تمہاری جاب کا معاملہ پہلے ڈسکس کر لیا جائے۔ کیا خیال ہے؟''
''شیور ...... بہت اچھا خیال ہے۔'' شارو نے کہا۔ ''علی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے لیے ایک ایسی جاب کا...... بندوبست ہو گیا ہے جس کے ساتھ اکاموڈیشن بھی ہے۔''
''علی نے میری موجودگی میں، یہیں سے تمہیں فون کیا تھا۔'' انکل نے کہا۔ ''جاب اور رہائش اسی گھر کے اندر، اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو......''
''انکل! تھوڑی وضاحت کریں۔'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔
''بھئی، بہت آسان اور سیدھی سادی جاب ہے۔'' انکل وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''میں اس اپارٹمنٹ میں اکیلا رہتا ہوں اور میرا زیادہ وقت وہیل چیئر پر گزرتا ہے۔ اپنے چھوٹے موٹے کام تو میں خود ہی کر لیتا ہوں مگر

بعض کاموں کے لیے مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کی جھاڑ پونچھ اور کچن کو دیکھنا ہے۔ اگر تم یہ سب کر سکتی ہو تو سمجھ لو، ابھی سے تمہاری جاب شروع ......'' انکل نے لحاتی توقف کر کے اپنی سانسوں کو ہموار کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''میں ان خدمات کے لیے تمہیں پندرہ سو ڈالرز دوں گا۔ کھانا پینا اور رہائش فری ہے۔ تم لیونگ روم میں آسانی سے رات گزار سکتی ہو۔''

امریکا میں ڈرائنگ روم کو لیونگ روم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور عموماً لیونگ اور ڈائنگ ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ انکل کے اپارٹمنٹ میں کچن کے ساتھ ایک کشادہ ہال تھا جس کی پیمائش بیس ضرب پچیس فٹ تھی۔ اس ہال کے ایک حصے کو جو کچن سے ملحق تھا، اسے ڈائننگ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ دوسرا حصہ جو اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے نزدیک تھا، وہ لیونگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مذکورہ لیونگ روم میں آٹھ دس افراد کی سٹنگ کے لیے آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے جن پر پُرسکون نیند بھی لی جاسکتی تھی۔ انکل نے اسی لیونگ روم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''میں علی کے کہنے پر سپر۔ ایٹ کو چھوڑ کر آئی ہوں تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ علی میرے لیے جو بھی جاب منتخب کرے گا، میں ضرور کروں گی۔'' شارو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر یہ تو بہت ہی معقول اور محفوظ جاب ہے اور تنخواہ بھی ہینڈسم ہے۔ بس تو سمجھیں...... ڈن! آپ علی کے انکل ہیں تو ایک دوست ہونے کے ناتے آپ میرے بھی انکل ہیں۔ آپ کے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کا خیال رکھ کر مجھے دلی خوشی ہوگی۔''

''تم سے پہلے میرے پاس مارتھا نامی ایک عورت ہوتی تھی جو یہ سارے کام سنبھالتی تھی۔'' انکل نے کہا۔ ''تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہوگی کہ چوبیس گھنٹے اپارٹمنٹ میں بند ہو کر بیٹھی رہو۔ تم اپنی سہولت اور آسانی سے کام نمٹانے کے بعد گھومنے پھرنے کے لیے کہیں بھی جاسکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے انکل، میں آپ کے پاس رکوں گی۔'' شارو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''انکل! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ شارو بہت اچھی سنگر بھی ہے۔'' میں نے انکل سلطان سے کہا۔ ''آپ کچھ سننا پسند کریں گے؟''

''ضرور سننا چاہوں گا مگر ابھی نہیں۔'' وہ زیرِلب مسکرائے۔

''پھر کیسے انکل؟'' میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''شارو کافی دور سے سفر کر کے یہاں پہنچی ہے اور یہ ڈنر کا وقت بھی ہے۔'' انکل وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''پہلے یہ فریش ہوگی۔ اس کے بعد ہم پیٹ پوجا کریں گے پھر محفلِ موسیقی کا اہتمام کیا جائے گا۔''

''اوکے انکل!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں پیزا کا ہوم ڈیلیوری آرڈر کر دیتا ہوں۔ جب تک کھانا آتا ہے، شارو فریش ہو جائے گی۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے بہ یک زبان ہو کر میری تجویز سے اتفاق کیا۔

ڈنر کرنے کے دوران ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ انکل نے شارو سے پوچھا۔ ''علی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا تعلق برازیل سے ہے...... برازیل کا کون سا علاقہ؟''

''ریوڈی جنیرو۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہت اچھی جگہ ہے۔'' انکل نے ستائشی نظر سے شارو کی جانب دیکھا۔ ''یہ برازیل کا دل ہے اور ٹراپک آف کیپری کورن پر واقع ہے۔ موسم بالکل آسٹریلیا جیسا یعنی جنوری دسمبر موسم گرما اور مئی جون موسم سرما اور ان موسموں میں بھی شدت نہیں۔ گرما میں درجۂ حرارت زیادہ سے زیادہ تیس ڈگری سینٹی گریڈ اور سرما میں کم از کم درجۂ حرارت پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ اور موسم برسات کے لیے بھی ترسنا نہیں پڑتا۔ آئے روز بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ تم اتنی اچھی سرزمین کو چھوڑ کر یہاں ٹیکساس میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟''

''بس انکل، روزگار انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے ریوڈی جنیرو کا بالکل درست تجزیہ کیا ہے مگر میری مجبوری مجھے ٹیکساس لے آئی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' انکل نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے اس پر انسان کا اختیار نہیں۔ اللہ نے انسان کا رزق جہاں لکھ رکھا ہے، اسے وہیں جانا پڑتا ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ برازیل میں عام آدمی کے لیے روزگار کے مواقع کا فقدان ہے لہٰذا لوگوں کو بہتر مستقبل کے لیے ادھر ادھر دیکھنا پڑتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''انکل! برازیل میں کیا ہسپانوی افراد کی اکثریت آباد ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے میرے بچے۔'' انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''نسلی بنیادوں پر اگر انسان

کو تقسیم کیا جائے تو برازیل میں تین بڑے گروہ آباد ہیں جن میں پہلا نمبر کیوکیشین کا ہے۔ اس گروپ میں پرتگالی، جرمن اطالوی، پولینڈی اور ہسپانوی نسلیں شامل ہیں۔ کیوکیشین دراصل برازیل کی آبادی کا اٹھاون فی صد ہیں۔ ان کے علاوہ چھتیس فی صد مولیٹو اور چھتیس فی صد افریقی ہیں۔''

''شارو اسپینش ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی ہسپانوی۔''

''وہ تو شکل ہی سے نظر آرہی ہے۔'' انکل نے اثبات میں گردن ہلائی۔

ڈنر کے بعد شارو کی گلوکاری سننے کا موڈ تھا۔ ہم ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر لیونگ روم میں آگئے۔ انکل کی وہیل چیئر بھی لیونگ روم میں آگئی۔ شارو نے گٹار سنبھال لیا۔ میں نے کہا۔

''شارو! آج شام سے پہلے میں نے اپنے ایک دوست کو سپرد خاک کیا ہے لہٰذا کچھ شوخ سننے کا موڈ نہیں ہورہا۔ کوئی حزنیہ چیز سناؤ۔ ویسے بھی تم اس شعبے میں کافی مہارت رکھتی ہو۔''

''یہ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا میرے بچے۔'' انکل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت تمہیں ایسے ہی نغمے سننے کی ضرورت ہے جو تمہارے زخموں پر مرہم کا کام کریں لیکن تم دونوں میری ایک بات ذہن نشین کرلو۔''

''کون سی بات انکل؟'' شارو نے استفسار کیا۔

''زندگی خوشی اور غم کا امتزاج ہے۔'' وہ مربیانہ انداز میں بولے۔ ''اندھیرے اور اجالے کا ملاپ ہے۔ اگر تاریکی نہ ہو تو روشنی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اگر انسان کی زندگی میں غم اور دکھ نہ ہو، رنج والم نہ ہو تو پھر خوشی اور شادمانی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ کچھ ہی عرصے بعد ہر آسائش، آرام اور آسودگی پھیکی پڑجاتی ہے۔ انسان بہت جلد عیش و عشرت کی زندگی سے اکتا جاتا ہے ...... بور ہوجاتا ہے لہٰذا ایک مکمل اور بھرپور انسانی زندگی میں ان دونوں موسموں کا عکس نظر آنا چاہیے۔ خوشی اور غمی کا سنگم ہی اصل زندگی کی پہچان ہے۔''

''ٹھیک ہے انکل! میں آپ کی بات سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''آج ہم شارو سے ایک سیڈ اور ایک ہپی گانا سنیں گے۔''

''اور اصول یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس دو خبریں ہوں، ایک خوشی کی اور ایک غمی کی تو پہلے غمی کی خبر سنانا چاہیے۔'' انکل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''تاکہ بعد والی خوشی کی خبر سے پہلی والی غمی کی خبر کے تاثرات ڈھل جائیں اور ہپی اینڈ ہو۔''

''او کے انکل! میں پہلے حزنیہ گانا سناؤں گی اور اس کے بعد طربیہ نغمہ چھیڑوں گی۔'' شارو نے کہا۔ ''تاکہ آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق، آج کی محفل کا اختتام ہپی ہو۔''

''علی! تم نے اچھی طرح چیک کرلیا، ہمارا داخلی دروازہ اور دیگر کھڑکیاں تو بند ہیں نا!'' انکل نے مجھ سے کہا۔ ''اس محفل موسیقی کی صدائیں ہمارے آس پڑوس میں نہیں پہنچنا چاہئیں ورنہ کوئی نئی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔''

پورے یورپ اور امریکا میں انسان کی پرائیویٹ لائف کو بہت زیادہ اہمیت اور تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ کسی بھی شخص کو اپنے پڑوسی کی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے بلکہ اس نوعیت کا ہر اقدام سنگین قسم کا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے گھر کے اندر اچھا کررہے ہیں یا برا، یہ آپ کا داخلی اور آپ کے پڑوسی کا خارجی مسئلہ ہے۔ آپ کے پڑوسی کو آپ سے کوئی سروکار نہیں لیکن اگر آپ کے گھر کا کوئی اچھا یا برا ایشو اور اس کے اثرات پڑوسی کے گھر کے اندر پہنچ گئے اور اس کی داخلی زندگی میں خلل ڈالنے لگے تو آپ کے پڑوسی کے ایک فون پر پولیس آپ کی سرکوبی کے لیے پہنچ جائے گی۔ یہ اصول اور قانون اچھا ہے یا برا، اس پر سوچنے کا اگر آپ کے پاس وقت ہے تو ضرور سوچیے گا۔

اس سوچ بچار کے نتیجے میں اگر کچھ سمجھ آجائے تو پھر اس بات پر بھی ذرا غور فرمایئے گا کہ ہم کس طرح قدم قدم پر دوسرے انسانوں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اور ہمارے خلاف کوئی تادیبی یا تعزیری کارروائی عمل میں نہیں آتی۔

ہم رات ایک بجے تک شارو کے نغمات سے لطف انداز ہوتے رہے پھر انکل سلطان نے کہا۔ ''بھئی، مجھے تو نیند آرہی ہے۔ تم لوگ چاہے گپ شپ کرو، میں تو سونا چاہوں گا۔'' پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''علی! رات کافی ہوگئی ہے۔ تم آج ادھر ہی رک جانا۔''

''ٹھیک ہے انکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ اس کے بعد ہم دونوں نے انکل کی وہیل چیئر کو ان کے بیڈروم میں پہنچادیا اور انہیں بستر پر لٹانے کے بعد ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے شارو سے کہا۔

''صبح سے تمہاری نئی جاب شروع ہورہی ہے۔ اس لیے تم ایک بھرپور نیند لے لو۔ میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' بات کے اختتام پر میں نے ایک جماہی لی۔

''اوکے......'' اس نے مختصراً کہا اور لیونگ روم کی

طرف بڑھ گئی۔
میں انکل کے برابر والے دوسرے بیڈ روم میں آ گیا۔ انکل کا اپارٹمنٹ دو بیڈ دو باتھ کٹیگری کا تھا اور اس کا کل رقبہ ایک ہزار دو سو پچاس مربع فٹ تھا جبکہ ''دی گیٹ وے'' والا میرا اپارٹمنٹ محض سات سو چوالیس مربع فٹ پر مشتمل تھا۔ اس کی کٹیگری ایک بیڈ، ایک باتھ تھی تاہم اس کے رومز کا سائز بھی کم و بیش اتنا ہی تھا۔
میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے پیچھے نظار کا چہرہ روشن ہو گیا پھر میں اس کی یادوں میں کھو گیا۔ اس کی ایک ایک بات، اس کے ساتھ بتایا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے یاد آنے لگا۔ پتا نہیں، میں کتنی دیر نظار کے بارے میں سوچتا رہا۔ ممکن تھا، یہ سلسلہ اور بھی دراز ہو جاتا کہ میں کسی کو اپنے قریب پا کر چونک اٹھا اور بے ساختہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔
شارو میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ کمرے کی لائٹ اگرچہ آف تھی تاہم اس کی سانسوں کی گرماہٹ مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''تم ابھی تک سوئی نہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔
وہ مخمور لہجے میں بولی۔'' مجھے نیند نہیں آ رہی۔''
''نیند کیوں نہیں آ رہی؟''
''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ خوابناک آواز میں بولی۔
میں نے پوچھا۔'' کیسا ڈر...... کس کا ڈر......؟''
''اکیلے پن کا ڈر، تنہائی کا ڈر۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔'' وہاں موٹل کے روم میں میرے ساتھ پاؤلا ہوتی تھی۔ کسی کی موجودگی کا احساس رہتا تھا۔''
''اس اپارٹمنٹ میں بھی تم اکیلی نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔'' ادھر ایک بیڈ روم میں انکل سلطان سو رہے ہیں اور ادھر میں موجود ہوں پھر ڈر کس بات کا؟''
''علی! تم مجھے سلا دو......'' وہ ملتجیانہ آواز میں بولی۔
میں نے بے ساختہ اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا اور کہا۔'' آ جاؤ......''
وہ پکے ہوئے پھل کے مانند تاریک ماحول کی نازک شاخ سے ٹوٹ کر میرے پہلو میں آ گری۔ میں نے بڑی احتیاط سے اسے سنبھال لیا۔ وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں بند ہو کر رہ گئی۔ اسیری اور رہائی کا مفہوم خلط ملط ہو کر رہ گیا۔
ہم دونوں خاموش تھے، ہماری زبانوں پر منوں وزنی تالے پڑ گئے تھے۔ تاریک بیڈ روم کے خوابیدہ ماحول میں ہمارے جسم بول رہے تھے۔ شارو کے ہسپانوی بدن کی ایک ایک معنی خیز اور حیات آفریں جنبش مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھی اور میں سمجھداری کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا فرق مٹ جاتا ہے، چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی ہی ہوتی ہے۔ آپ ہار کر بھی جیت سکتے ہیں اور جیت کر بھی ہار سکتے ہیں، بغیر کسی سود و زیاں کے......!
ہم کافی دیر تک اپنی جیت دوسرے کے نام کرتے اور اس کی ہار کو اپنے گلے کا ہار بناتے رہے۔ شارو باڑ پر آئی ہوئی ندی کا کردار ادا کر رہی تھی اور میں...... اس کی تلاطم خیز موجوں کو سمیٹنے اور سینچنے کا حق نبھا رہا تھا۔ سانسوں کی حدت اور دھڑکنوں کی شدت ہر قدم ہمیں ایک نئے طوفان سے آشنا کر رہی تھی۔ اس رات ہم ٹوٹ کر برسے اور ایک دوسرے کو سیراب کرتے چلے گئے......!

☆☆☆

خواجہ صاحب نے نظار کی جگہ ایک بندے کو رکھ لیا تھا۔ اس شخص کا نام حسین شاہ تھا۔ اب ایوننگ والی شفٹ میں حسین شاہ میرے ساتھ اسٹور کو سنبھال رہا تھا۔ دو چار روز میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ وقت بہت ظالم ہے۔ یہ اپنی مخصوص رفتار سے سفر جاری رکھتا ہے اور اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ صرف انہی لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں اور پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھتے۔
ایک روز میں سرکل اے پہنچا تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ میں نے اسٹور کی ڈیوٹی سنبھالی ہی تھی کہ خواجہ صاحب کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کی تو انہوں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
''علی! ایک اچھی خبر ہے۔''
''کیا آپ نے میرے معاوضے میں اضافے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''
بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔ اس کے پیچھے میری کسی سوچ یا ارادے کا دخل نہیں تھا۔ روشنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور انسانی سوچ بعض اوقات اس بھی زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر جاتی ہے۔ ان لمحات میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔
''اچھا یا دولا یا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔
''آئندہ ماہ سے تمہارے معاوضے میں دو ڈالر کا اضافہ کر دوں گا یعنی پھر تمہارا معاوضہ بارہ ڈالر فی گھنٹا ہو جائے گا لیکن اس وقت میں نے کوئی اور خوش خبری سنانے کے لیے تمہیں فون کیا ہے۔''
''یس باس!'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔'' میں سن

رہا ہوں۔''

''پولیس نے نظار کے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولے۔ ''وہ دونوں میکسیکن لفنگے گرفتار ہو چکے ہیں۔''

''کب ...... کہاں سے ......؟'' میں خوشی کی شدت سے چیخ اٹھا۔

''پولیس نے انہیں فی نکس سے گرفتار کیا ہے۔'' جیک خواجہ نے بتایا۔ ''تم نے چند روز قبل پولیس اسٹیشن جا کر ان کے جو خاکے تیار کروائے تھے، انہی خاکوں کی مدد سے وہ دونوں ڈکیت پولیس کی گرفت میں آئے ہیں۔''

''فی نکس'' ایری زونا اسٹیٹ کا کیپٹل تھا اور ایری زونا ٹیکساس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایری زونا اور ٹیکساس کے درمیان ریاست نیو میکسیکن واقع تھی۔ جیک خواجہ کی زبانی ان دونوں کمینوں کے نام کیون اور فرانکو معلوم ہوئے۔ نظار پر فرانکو نے گولی چلائی تھی اور وہی میرے ساتھی کا قاتل تھا۔

''یہ تو واقعی بہت بڑی خبر ہے خواجہ صاحب۔'' میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔''

''علی! اگلے ہفتے سے تم مارننگ شفٹ میں آسکتے ہو؟'' باس نے پوچھا۔ ''آج کل تمہاری سمر ویکیشنز چل رہی ہیں۔ جب کالج کھل جائیں تو دوبارہ ایوننگ شفٹ میں آجانا۔''

''نو ایشو باس! میں یہ کرلوں گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''اس کا کوئی سبب؟''

''میں روزانہ دن میں اسٹور کا چکر لگاتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اور تم اس وقت ہوتے نہیں ہو۔ ابھی تمہارے کالج کی چھٹیاں ہیں تو اس بہانے تم سے ملاقات ہو جایا کرے گی۔''

''ٹھیک ہے باس! یہ ہفتہ میں ایوننگ شفٹ میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگلے ہفتے سے میں مارننگ شفٹ میں آجاؤں گا۔''

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں جرائم نہ ہوتے ہوں لیکن جن ممالک میں جرم وسزا کے قوانین اپنی حقیقی صحت کے ساتھ نافذ العمل ہیں، وہاں جرم کرتے ہوئے انسان کو سوچنا پڑتا ہے کیونکہ پکڑے جانے پر بچت کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ قانون جب حرکت میں آتا ہے تو پھر بڑے سے بڑا مجرم بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظار کے کیس میں بھی ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ امریکا میں لاکھ برائیاں اور خرابیاں سہی مگر قانون کی عمل داری نظر آتی ہے اور یہ قانون بادشاہ اور عوام کے لیے ایک جیسا ہی ہے۔

میکسیکن لڑکوں کیون اور فرانکو کی گرفتاری سے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ اب وہ قرار واقعی سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتے تھے۔ اللہ کے کرم سے یہ معاملہ سیٹ ہو گیا تھا۔

ادھر شارو کی جاب بھی سیٹ چل رہی تھی۔ اس نے نہایت ذمے داری کے ساتھ انکل سلطان اور ان کے گھریلو معاملات کو سنبھال لیا تھا لیکن انکل کی ایک بات مجھے کچھ عجیب لگی تھی۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا۔

''میرے بچے! شارو تمہاری دوست ہے اور تم اس پر اندھا اعتماد کرتے ہو لیکن میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں اس لیے اگر تمہیں میری کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کا برا نہیں منانا۔''

میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''انکل! آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''دیکھو علی! میں اپنے تجربے کی روشنی میں چند روزہ رفاقت کی بنیاد پر شارو کی جانب سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''جب تک وہ کم از کم ایک ماہ میری نظر کے سامنے خود کو قابلِ بھروسا ثابت نہیں کر دیتی، میں اپنی تمام اہم اور قیمتی چیزوں کو لاک میں رکھوں گا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے انکل۔'' میں نے ان کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کا حق ہے۔ آپ کو اپنی قیمتی اشیا کی لازمی حفاظت کرنا چاہیے۔ مجھے آپ کی یہ بات ہرگز بری نہیں لگی۔''

''شاباش میرے بچے۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

انکل اپنی جگہ بالکل درست انداز میں سوچ رہے تھے۔ شارو پر مجھے تو پورا بھروسا تھا لیکن میں انکل کو ایسا کوئی یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ میں جو کچھ بھی کہتا، وہ زبانی کلامی ہوتا۔ میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا تھا اور اس قسم کے واقعات اکثر سننے اور پڑھنے کو مل جاتے تھے کہ...... کل وقتی گھریلو ملازمہ گھر کا صفایا کر کے رفو چکر ہو گئی ...... لہٰذا انکل کے احتیاطی اقدام میں مجھے کوئی قباحت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ایوننگ شفٹ کا میرا آخری دن تھا کہ لگ بھگ نو بجے میرے سیل فون پر انکل سلطان کی کال آگئی۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو انکل...... آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' ان کی گھبرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ''لیکن...... شارو کا کچھ پتا نہیں۔''

''شارو کا کچھ پتا نہیں ......'' میرا ماتھا ٹھنکا۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کہاں گئی وہ؟''

''یہی تو پتا نہیں چل رہا۔'' انہوں نے فکرمندی سے کہا۔ ''شام میں وہ گھر کی گروسری لینے مارکیٹ تک گئی تھی لیکن ابھی تک واپس نہیں آئی۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''انکل! آپ کی قیمتی چیزیں تو سلامت ہیں نا......؟''

''ہاں ہاں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولے۔ ''میں تو اس کے لیے پریشان ہوں۔ پتا نہیں اتنی دیر سے کہاں غائب ہے۔''

''آپ نے اس کا فون نمبر ٹرائی نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہ کوشش کئی بار کر چکا ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اس کا نمبر آف ہے۔''

''یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''وہ گروسری لینے کون سے اسٹور پر گئی تھی؟''

''میری گروسری ایک ہی جگہ سے آتی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اسٹینلے اسٹورز سے۔''

''اسٹینلے اسٹورز'' گروسری کی ایک بہت بڑی چین تھی اور بے سٹی میں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میں نے انکل سے استفسار کیا۔

''کیا آپ نے اسٹینلے اسٹورز فون کر کے شارو کے بارے میں معلوم کیا ہے؟''

''ہاں ...... میں نے وہاں فون کیا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''اسٹور کے اسٹاف کے مطابق، وہ دو گھنٹے پہلے گروسری لے کر وہاں سے نکل چکی ہے۔''

''اوہ......'' میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اسے گروسری کے علاوہ کہیں اور سے بھی خریداری کرنا تھی؟''

''نہیں...... وہ صرف گروسری لینے گئی تھی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں، میں آرہا ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ جہاں بھی ہوگی، خیریت سے ہوگی۔''

''اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

واپسی میں دیر ہو جانا اتنا بڑا ایشو نہیں تھا۔ تشویش والی بات یہ تھی کہ اس کا فون آف آرہا تھا۔ انکل سے بات کرنے کے بعد میں متعدد بار اس کا نمبر ٹرائی کر چکا تھا لیکن اس کا سیل فون ہر مرتبہ بند ہی ملا تھا۔

''شارو کو کہیں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا؟'' میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال نے سر اٹھایا اور آپوں آپ میرا دھیان لیونارڈو کی طرف چلا گیا۔

میں نے لیونارڈو کو کئی دفعہ شکست دی تھی۔ وہ کوئی شریف النفس انسان نہیں تھا کہ ان معاملات کو اپنی یادداشت سے کھرچ ڈالتا۔ وہ ایک خبیث النفس شخص تھا۔ کینہ پرور اور کمینہ۔ اس کی طرف سے کسی بھی اوچھی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

میں اپنی چھٹی سے پہلے ہی اسٹور سے نکل آیا۔ اپنے نئے ساتھی حسین شاہ کو میں نے کام سمجھا دیا تھا۔ میرا فوری طور پر بے سٹی انکل سلطان کے پاس پہنچنا ضروری تھا لہٰذا میں اپنی گاڑی پر سوار ہوا اور ہنڈائے کو بے سٹی والے راستے پر ڈال دیا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے میں نیکولز اسکوائر اپارٹمنٹس پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی کو پارکنگ میں چھوڑا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے انکل کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے میری انگلی ڈور بیل کے بٹن پر آگئی۔

انکل وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے پورے اپارٹمنٹ میں ادھر اُدھر چکراتے رہتے تھے اور کال بیل پر دروازہ کھولنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا لیکن جب تین بار کال بیل بجانے کے بعد بھی اندر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ''ناک'' کرنے کے لیے دروازے کو تھپتھپایا تو پتا چلا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میری دستک کے دباؤ سے دروازہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپارٹمنٹ کے اندر تھا۔

میں نے اپارٹمنٹ کے اندر قدم تو رکھ دیا تھا لیکن پھر ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ کوئی وزنی آہنی شے میرے سر کے عقبی حصے سے ٹکرائی تھی۔ یہ ضرب اتنی اچانک اور کاری تھی کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اگلے ہی لمحے میں کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہو گیا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رُلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

ایڈیٹر نے اکتاہٹ کے ساتھ نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے تجربے نے بتادیا تھا کہ یہ کوئی ناکام اور سرپھرا لکھاری ہے۔ لاشعوری طور پر ایڈیٹر کی نگاہ اپنے ڈیسک پر اور اطراف میں بکھرے مسودوں کے ڈھیر پر گئی۔

'اب یہ دعویٰ کرے گا کہ اس نے ایک شاہکار کہانی ارسال کی تھی...... طویل عرصہ ہوگیا اور تم لوگ گویا کچھوے کے مانند سست ہو...... وغیرہ...... وغیرہ۔ ہاں، کوئی ایسی ہی بات ہونے والی ہے۔' اس نے سوچا۔ ایک بار پھر اجنبی کو نگاہوں میں تولا۔

''اوہ نہیں...... یہ تو مسودہ ساتھ لایا ہے۔'' ایڈیٹر نے سوچتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اجنبی کو دیکھا جس نے مسودے کا پلندا اس کے چہرے کی جانب اس انداز میں بازو کھول کرتانا، جیسے وہ مسودہ نہیں بلکہ پستول ہے......

''اسے شائع کرو۔'' اجنبی نے بلاتکلف کہا۔

قلم کار

امجد رئیس

یوں تو ہمارے اردگرد بے شمار کہانیاں بکھری رہتی ہیں لیکن مصنف وہی کہلاتا ہے جو انہیں ترتیب دے کر لفظوں کا پیراہن عطا کرے۔ اسے بھی لکھنے کا جنون تھا مگر منظر میں رنگ بھرنے کے ہنر سے ناآشنا تھا اس کے باوجود اس نے اپنے اظہار کا معتبر انداز ڈھونڈ لیا تھا۔

ناکامیوں کی بھیڑ میں ایک تخلیق کار کی فتح کا قصہ



"بس اتنی سی بات ہے؟" ایڈیٹر نے سنبھل کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ڈیئر سر! بات یہ ہے......"

"اسے شائع کرو!" اجنبی نے سابقہ الفاظ دہرائے۔

جواباً ایڈیٹر کی مسکراہٹ میں دلچسپی کا عنصر شامل ہوگیا۔ "بے شک کہانی چھپوانے کے متعدد انداز ہیں۔" اس نے بولنا شروع کیا۔ "لیکن مسٹر...... مسٹر......؟"

"رگلی۔" اجنبی نے کہا۔ "لیو گلی۔" وہ اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ مسودہ جیسے ایڈیٹر کے منہ میں ٹھونسنا چاہ رہا ہو۔ "میں جانتا ہوں۔ کہانی چھپوانے کے تمام طریقوں سے آگاہ ہوں اور کئی سالوں میں تمام کو آزما چکا ہوں۔" رگلی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"واقعی؟" ایڈیٹر پھر مسکرایا تاہم اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ میں ہلکی سی بیزاری تھی۔

"ہر طریقہ ناکام رہا۔" وہ اسی طرح تنا کھڑا تھا۔

"اوہ، تو یہ بات ہے۔" ایڈیٹر سمجھ گیا کہ اس کا سامنا ایک ناکام اور دل برداشتہ مصنف سے پڑ گیا ہے۔

"حالانکہ میں نے اپنی کہانیوں کے ساتھ سابقہ کامیابیوں کے خطوط بھی منسلک کیے تھے۔" اس نے کندھے اچکا کر وضاحت کی۔ "مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"

"شاید تمہاری سابقہ کامیابیاں......" ایڈیٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن گلی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے سیکریٹریوں سے نمٹنے کے لیے بعض مصنفین سے ملتے جلتے نام بھی استعمال کیے...... کیونکہ ایڈیٹر تک پہنچنا ضروری تھا۔" اس نے ازخود انکشاف کیا۔ "حالانکہ جن ناموں کا میں نے سہارا لیا، ان میں مجھے کوئی صلاحیت دکھائی نہیں دی۔"

"تمہاری یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔" ایڈیٹر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور کمر کرسی کی پشت سے ٹکا دی۔ "تمہیں اندازہ ہوگیا کہ ایڈیٹرز کے لیے یہ چیز ناپسندیدہ ہے۔"

"بالآخر۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "گزشتہ برس میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس کو آزمانے پر مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔"

"یعنی تمہاری کہانیاں چھپنے لگیں؟" ایڈیٹر کی دلچسپی واپس آنے لگی۔

"بالکل!"

"ایسا کون سا خیال تھا؟"

"سادہ...... نہایت سادہ خیال۔" لیو گلی نے کہا۔ "اب مجھے جب بھی کوئی کہانی فروخت کرنی ہوتی ہے تو میں صرف ایڈیٹر منتخب کرتا ہوں، اس تک رسائی حاصل کرتا ہوں اور مسودہ آگے کر دیتا ہوں...... بالکل اسی طرح، جیسے ابھی کر رہا ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر...... میں آٹھ الفاظ بولتا ہوں۔"

"کون سے آٹھ الفاظ؟" ایڈیٹر نے حیرت محسوس کی۔

"آٹھ الفاظ......" وہ پہلی بار دھیرے سے مسکرایا۔ "زوردار، نہایت زورآور......"

"زوردار ہونے چاہئیں۔" ایڈیٹر نے کہا۔ "کامیابی ملی ہے تو یقیناً زوردار ہوگا لیکن میں سمجھ نہیں پارہا۔"

"تمہارا ابھی ابتدائی ردعمل تقریباً ملتا جلتا ہے۔" گلی نے تسلیم کیا۔ "جلد سمجھ جاؤ گے۔ بڑے ایڈیٹرز کے معیار بھی بلند ہوتے ہیں بلکہ میں تو ان کے لیے "ضدی" کا لفظ استعمال کروں گا۔ ضدی اور انا پرست......"

"تم کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو تاہم "ضدی" پر مجھے اعتراض ہے۔" ایڈیٹر کو ناگوار گزرا۔

رگلی نے کوئی اثر نہیں لیا۔ "ذرا سی محنت کے بعد بالآخر میں بیشتر ایڈیٹر حضرات کو قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ تاہم چند ایسے بھی تھے......" اس نے شانے اچکائے۔ "ان چند کو تم فوراً پہچان جاؤ گے۔ بس میرے اشارہ کرنے کی دیر ہے اور تم پہچان جاؤ گے......"

"مسٹر...... بس۔" ایڈیٹر نے ہاتھ اٹھایا۔ "بہت ہو گیا، تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔" ایڈیٹر نے ایک پیر سے ڈیسک کے نیچے ایمرجنسی الارم تلاش کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے تمہارے آٹھ الفاظ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ زوردار ہیں یا کمزور...... مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم یا کوئی بھی مجھ سے ایسی چیز شائع نہیں کرواسکتا جو مجھے پسند نہ ہو۔"

ایک لمحے کے لیے باریش لکھاری کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا پھر یک لخت بغیر کسی انتباہ کے اس نے مسودہ چھری کے مانند اور آگے کیا۔ ایڈیٹر کو ٹائٹل نظر آیا۔

"آٹھ الفاظ"

مصنف: لیو گلی

"اسے شائع کرو۔" وہ شروع ہوا تاہم اس مرتبہ اس کی آواز سرد اور قطعیت سے بھرپور تھی۔

"ورنہ......؟" ایڈیٹر نے اسے سوالیہ نظروں سے پرکھا۔

رگلی کے چہرے پر وحشت ناچ رہی تھی۔ "ورنہ!" اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ "ورنہ...... چوتھا لفظ ہے۔"

قطب الدین منور علیہ الرحمۃ

ضیا تسنیم بلگرامی

کہتے ہیں جس طرح رات کے بعد سویرا طلوع ہوتا ہے اسی طرح تکلیفوں کے بعد راحتیں جشن مناتی ہیں۔ اسی نظریے پر قائم اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے زندگی کا ہر لمحہ گزار دیتے ہیں اور شاید اس مالکِ حقیقی کو بھی ان کی ایسی ہی آزمائش منظور ہوتی ہے۔ بس یہ محبوب کی ایسی ادا ہے جس پر چاہنے والے سو جان سے قربان ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی انسانوں میں ہوتا ہے جو ثابت قدم رہ کر دنیاوی مشکلات کا سامنا مسکرا کر کرتے ہیں۔

کٹھن مراحل سے بے خوف و خطر گزرنے والے ایک نیک انسان کا ماجرا



حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء نے شیخ قطب الدین منور کو تخلیہ میں طلب فرمایا۔ شیخ قطب الدین منور مشہور زمانہ صوفی شیخ جمال الدین ہانسوی کے پوتے تھے اور ان کا بیشتر زمانہ ہانسی میں گزرا کیونکہ انہیں اپنے بزرگوں سے دوری قطعی گوارا نہ تھی لیکن کبھی کبھی جب یہ دہلی میں اپنے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہی کے پاس رہتے تو اس وقت تک ہانسی کا خیال تک اپنے دل میں نہ لاتے جب تک کہ ان کے پیر و مرشد انہیں ہانسی کی طرف متوجہ نہ کرتے چنانچہ جب انہیں ان کے پیر و مرشد

نے تخلیہ میں طلب فرمایا تو وہ مؤدب آپ کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ سر جھکا ہوا تھا اور نظریں اپنے ہی پاؤں کے انگوٹھوں پر ٹک کر رہ گئیں۔

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ''بابا قطب الدین! جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حضرت! غلام آپ کی توجہ اور فیض کا طالب ہے۔ آپ روشن ضمیر ہیں، بندہ حقیر و پُر تقصیر ہے اس لیے میں کیا عرض کروں کہ مجھے کیوں طلب فرمایا گیا ہے۔ آپ ہی ارشاد فرمائیں تو کچھ منکشف ہوگا۔''

حضرت محبوب الٰہی نے چند ورقی ایک تحریر ان کے حوالے کی اور فرمایا۔ ''یہ خلافت نامہ ہے، میں نے تمہیں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔''

اس کے بعد آپ دیر تک نصیحتیں اور وصیتیں فرماتے رہے اور قطب الدین منور انتہائی انہماک اور توجہ سے سنتے رہے ...... آخر میں فرمایا۔ ''بابا قطب الدین! اب جاؤ اور دوگانہ ادا کرو۔''

قطب الدین خلافت نامہ ہاتھ میں لیے ہوئے اٹھے، جماعت خانے میں گئے اور دوگانہ ادا کیا۔ اس دوران خلافت کی خبریں گشت کر چکی تھیں۔ دوستوں نے انہیں اپنے حلقے میں لے لیا اور مبارکباد دینے لگے۔

قطب الدین منور کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اپنے دوسرے مقبولِ بارگاہ مرید شیخ نصیر الدین محمود اودھی (روشن چراغ دہلی) کو طلب فرمایا اور انہیں بھی خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا اور انہیں بھی دیر تک نصیحتیں اور وصیتیں فرماتے رہے۔ شیخ نصیر الدین بیٹھنے کے بجائے مؤدب کھڑے رہے۔

حضرت محبوب الٰہی نے اچانک اپنے خادم کو آواز دی۔ جب وہ آ گیا تو آپ نے اسے حکم دیا۔ ''جاؤ قطب الدین منور کو بلا لاؤ۔''

خادم انہیں بلا لایا۔ آپ نے قطب الدین منور کو شیخ نصیر الدین کی طرف متوجہ کیا اور حکم دیا۔ ''بابا قطب الدین! میں نے بابا نصیر الدین کو اپنا خلیفہ نامزد کیا ہے انہیں اس کی مبارکباد دو۔''

قطب الدین منور نے اپنے پیر بھائی کو خلعتِ خلافت کی مبارکباد دی۔

اب آپ نے شیخ نصیر الدین محمود کو حکم دیا۔ ''اور بابا نصیر الدین! اب تم قطب الدین کو مبارکباد دو۔ یہ بھی خلعتِ خلافت سے آج ہی اسی وقت سرفراز ہوئے ہیں۔ اب تم دونوں آپس میں پکے پیر بھائی بن چکے ہو۔''

شیخ نصیر الدین نے قطب الدین کو خلعتِ خلافت کی مبارکباد دی۔

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ''دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاؤ۔''

دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر بھی ہو گئے۔ آپ نے اپنے دونوں مریدوں سے فرمایا۔ ''بابا! آپ دونوں سے گزارش ہے کہ خلافت نامے میں جو تقدیم اور تاخیر ہوئی ہے، اس کا دل میں خیال تک نہ لانا۔''

دونوں مرید جذباتی ہو گئے اور عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! آپ شرمندہ نہ فرمائیں' ہمیں آپ کی باتوں سے تکلیف ہوتی ہے۔''

کچھ دیر دونوں حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں موجود رہے' اس کے بعد اجازت لے کر دونوں باہر نکلے۔ شیخ نصیر الدین نے قطب الدین منور کو راستے ہی میں روک لیا اور کہا۔ ''بھائی قطب الدین! ہم دونوں پیر و مرشد کی خدمت اور تخلیہ میں کافی دیر رہے ہیں۔ اس دوران انہوں نے ہمیں بڑی نصیحتیں کی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان نصیحتوں اور وصیتوں کو میرے علم میں لے آئیں تاکہ جو نصیحتیں اور وصیتیں مجھے کی گئی ہیں' آپ کے علم میں لے آؤں، اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے محرم و ہمراز بھی بن جائیں گے۔''

قطب الدین منور نے جواب دیا۔ ''بھائی نصیر الدین! پیر و مرشد نے جو وصیتیں مجھے فرمائی ہیں، وہ ایک راز ہے، آپ نے وہ راز مجھ پر منکشف کر دیا۔ اب آپ ہی از روئے انصاف فرما دیں کہ پیر و مرشد کا راز دوسرے پر کس طرح منکشف کیا جا سکتا ہے۔ آپ کا راز آپ کے لیے ہے اور میرا راز میرے لیے ہے۔''

شیخ نصیر الدین نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا، بولے۔ ''بھائی قطب الدین! میں اپنے سوال پر بہت شرمندہ ہوں، آپ کا جواب نہایت مناسب ہے۔''

قطب الدین منور خلافت پانے کے بعد بھی پیر و مرشد ہی کی خدمت میں موجود رہے حالانکہ انہیں ہانسی اور ہانسی کے قبرستان میں اپنے آباؤ اجداد کی قبریں بہت یاد آتی تھیں۔ وہ جب تک ہانسی میں رہے' اپنے آباؤ اجداد کی قبروں پر پابندی

سے حاضریاں دیا کرتے تھے جس سے انہیں سکون ملتا تھا اور فیض بھی۔ آپ کے اس اندرونی اور پنہانی کرب سے حضرت محبوب الٰہی اچھی طرح واقف تھے، ایک دن انہیں طلب فرمایا اور پوچھا۔ ''بابا قطب الدین! کہو ہانسی کا کیا حال ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حضرت! کیا عرض کروں، میں دہلی میں، ہانسی کا حال ہانسی والے جانیں یا پیر روشن ضمیر۔''

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے آباؤ اجداد کی روحیں تمہاری جدائی میں سوگوار ہیں، تم ہانسی واپس جاؤ۔''

قطب الدین نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو چھوڑ کر کیونکر جا سکتا ہوں پیر و مرشد!''

پیر و مرشد نے فرمایا۔ ''میں تمہیں ہانسی جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔''

قطب الدین نے عرض کیا۔ ''اگر آپ جانے کی اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا۔''

اجازت حاصل کرنے کے بعد قطب الدین نے ہانسی جانے کی تیاری کی۔ اپنا مختصر سامان باندھا اور پیر و مرشد سے اجازت چاہی۔

حضرت محبوب الٰہی نے تصوف کی مشہورِ زمانہ کتاب 'عوارف' کا نسخہ ان کے حوالے کیا اور کہا۔ ''قطب الدین! زمانہ گزرا جب تمہارے دادا شیخ جمال الدین ہانسوی، بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں رہا کرتے تھے تو جب انہیں خلافت نامہ عطا کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ جو تبرکات بخشے گئے تھے' ان میں یہ عوارف کا نسخہ بھی شامل تھا۔ ان دنوں میں بھی بابا فرید کے پاس اجودھن ہی میں تھا۔ جب میں اجودھن سے دہلی واپس آیا تو راستے میں ہانسی میں قیام کیا۔ اس وقت تمہارے دادا نے عوارف کا یہ نسخہ یہ کہہ کر میرے حوالے کیا تھا کہ اس کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لو اور آئندہ جب کبھی میری کوئی اولاد تمہارے پاس تعلیم و تربیت حاصل کرنے آئے تو عوارف کا یہ نسخہ اس کے حوالے کر دینا۔ چنانچہ یہ نسخہ تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔''

قطب الدین نے اپنا سامان لیا اور پیر و مرشد سے جدا ہو کر ہانسی چلے گئے۔

☆☆☆

یہ سلطان محمد تغلق کا زمانہ تھا۔ سلطان کو اپنی عقل اور فہم و فراست پر بڑا ناز تھا۔ وہ شریعت کو اہمیت دیتا تھا اور طریقت سے گریزاں تھا۔ اس کے درباریوں اور مصاحبوں میں خوشامدی حضرات کسی نہ کسی کے خلاف شکایتیں اور چغلیاں کھایا کرتے تھے یہ حضرات ہر اس شخص کے خلاف سلطان کے کان بھرتے رہتے تھے جو دنیا سے الگ تھلگ باعزت زندگی گزار رہا ہوتا تھا۔ ان میں صوفیائے کرام کا نام سرفہرست تھا چنانچہ جب درباریوں نے یہ دیکھا کہ قطب الدین منور ہانسی میں دربارِ سرکار سے دور باعزت زندگی گزار رہے ہیں تو انگاروں پر لوٹنے لگے اور یہ اطلاعات اور زیادہ سوہانِ روح بن گئیں کہ قطب الدین منور گوشہ نشینی اور درویشی میں بھی بادشاہی کر رہے ہیں۔

حاسدوں نے سلطان کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ ایک نے آپ کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''حضورِ والا! غلام کچھ دنوں سے عجیب سی خبریں سن رہا ہے۔ اگر ان خبروں کو چھپایا جائے تو نقصِ امن، انتشار بلکہ بغاوت تک کا خطرہ پایا جاتا ہے اور اگر انہیں حضور کے گوش گزار کر دیا جائے تو اس کے چند درویشوں کی خبثِ باطنی مشتہر ہو جاتی ہے اور اس طرح نام نہاد اللہ والوں کے باطن بلکہ مکروہ باطن کی پردہ دری ہو جاتی ہے۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف کہہ۔''

حاسد نے کہا۔ ''حضورِ والا! بادشاہوں کو سب سے زیادہ خطرہ درویشوں سے ہوتا ہے کیونکہ درویش بھی انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ درویشوں میں بادشاہوں سے زیادہ انا اور خود پسندی ہوتی ہے جس سے وہ بادشاہوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تیرا اشارہ کس درویش کی طرف ہے؟''

حاسد نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! یہ درویش محنت مشقت تو کرتے نہیں، بس مریدوں اور ارادت مندوں کے نذرانوں اور تحفوں پر اپنی شاندار زندگی گزارتے ہیں، اگر انہیں دربار میں حاضری دینے کا پابند کر دیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔''

سلطان کو غصہ آ گیا، برہم ہو کر بولا۔ ''میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ تو یہ ساری باتیں کس درویش کی بابت کر رہا ہے؟''

حاسد نے جواب دیا۔ ''ہانسی کے شیخ قطب الدین منور کی بابت۔ میں نے سنا ہے شیخ بہت مغرور ہیں اور اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو بادشاہ کے خلاف ورغلاتے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہ کہتے ہیں، بادشاہی صرف اللہ کو زیب دیتی ہے۔

دنیاوی بادشاہ اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کی چاکری کی جائے کیونکہ دنیاوی بادشاہ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتا۔''
سلطان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں، پوچھا۔''قطب الدین منور اس قسم کی باتیں کرتا ہے؟''
حاسد نے جواب دیا۔''اس قسم کی کیا معنی، اس سے بھی زیادہ خطرناک باتیں کرتا رہتا ہے۔''
سلطان نے پوچھا۔''کیا تو نے وہ باتیں سنی ہیں؟''
حاسد نے جواب دیا۔''حضورِ والا! وہ باتیں میں نے اپنے کانوں سے تو نہیں سنیں، ہاں دوسرے لوگ جو وہاں آتے جاتے رہتے ہیں، وہ بتاتے رہتے ہیں۔''
سلطان نے دریافت کیا۔''کیا تمہارے پاس ایک بھی ایسا آدمی موجود ہے جو قطب الدین منور کے خلاف گواہی دے سکے؟''
حاسد گھبرا گیا، بولا۔''میں کوئی خاص گواہ تو پیش نہیں کر سکتا مگر یہ بات اظہر من الشمس ہے' ہانسی کے کسی بھی شخص سے معلوم کی جا سکتی ہے۔''
سلطان نے ''ہوں'' کہا اور کچھ سوچنے لگا، پھر بے خیالی میں کہا۔''تو تو کوئی گواہ نہیں پیش کر سکتا۔''
حاسد بہت گھبرایا ہوا تھا، بولا۔''جی بندہ پرور! میں کوئی گواہ نہیں پیش کر سکتا۔''
سلطان اٹھا اور تخلیہ میں چلا گیا، وہاں سے قاضی کمال الدین صدر جہاں کے نام فرمانِ طلبی جاری کر دیا۔
قاضی صاحب گھبرائے ہوئے تشریف لائے، پوچھا۔''جی بندہ پرور؟''
سلطان نے کہا۔''قاضی صدر جہاں! آپ قطب الدین منور سے بھی واقف ہیں کیا؟''
قاضی صاحب نے جواب دیا۔''خوب اچھی طرح۔ ہانسی کے قطب الدین منور شیخ جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں۔ ان سے کون واقف نہیں۔''
سلطان نے پوچھا۔''شیخ قطب الدین کیسا آدمی ہے؟''
قاضی نے جواب دیا۔''حضورِ والا! وہ نہایت بے ضرر درویش ہیں مگر حضور کا مطلب؟''
سلطان نے کہا۔''میں نے سنا ہے اس کے آس پاس جو لوگ موجود رہتے ہیں' وہ شیخ کی تکلیف دہ باتیں سنتے رہتے ہیں۔''
قاضی نے جواب دیا۔''مجھے نہیں معلوم' لیکن میں ان کی طرف سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے ضرر اور سادہ لوح انسان ہیں۔''
سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔''کون سادہ لوح... یہ کون بے ضرر انسان؟''
قاضی نے جواب دیا۔''شیخ قطب الدین اور کون؟ وہ بہت ہی بھلے انسان ہیں۔''
سلطان ناراض ہو گیا۔''میں آپ سے اس درویش کی وکالت نہیں چاہتا۔''
صدر جہاں نے عرض کیا۔''جہاں پناہ کا یہ خیال کہ یہ ناچیز شیخ منور کی وکالت کر رہا ہے' غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں تو امر واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ شیخ منور حد درجہ بے ضرر انسان ہیں۔''
سلطان نے کہا۔''میں اس بے ضرر انسان کو خول کے باہر لانا چاہتا ہوں۔ شیخ منور نے تصنع کی نقاب اپنے چہرے پر ڈال رکھی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس نقاب کو نوچ کر پھینک دیا جائے۔''
صدر جہاں نے عرض کیا۔''یہ ناچیز سلطان کی ہر خدمت بجا لانے کو تیار ہے۔''
سلطان نے اسی وقت ایک فرمان لکھوایا، اس فرمان کی رو سے دو گاؤں شیخ منور کو عطا کیے گئے تھے۔ سلطان نے کہا۔
''یہ فرمان شیخ منور کے پاس لے جا۔ اگر وہ اس کو بہ آسانی قبول کر لیں تو خیر' اور اگر انکار کریں تو خوشامد درآمد اور حیلوں حوالوں سے یہ فرمان ان کے حوالے کر دیا جائے۔ جب وہ یہ فرمان قبول کر لیں گے تو میں انہیں دربار میں بلواؤں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ اے دنیا دار درویش' یہ شاہی عطا اور بخشش کا قبول کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے بعد میں شیخ منور کو وہ سزا دوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے اور دوسرے دنیا دار درویشوں کو اس سے عبرت ہو گی۔''
صدر جہاں نے کہا۔''سلطان کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ شیخ منور سلطان کا یہ فرمان قبول فرمالیں اور یہیں سے ان کے صدق وریا کا امتحان بھی ہو جائے گا۔''
صدر جہاں نے شاہی فرمان لیا اور ہانسی روانہ ہو گئے۔ انہوں نے شاہی فرمان کو ریشمی رومال میں لپیٹا اور اس رومال کو آستین میں چھپا لیا۔ جب شیخ منور کو صدر جہاں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے صدر جہاں کو ایک چبوترے پر بٹھایا۔

شیخ منور نے پوچھا۔ ”حضرت آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

صدر جہاں نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ تو یہاں ایک گوشے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا آپ اس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے مگر آپ کے مقام کا یہ حال ہے کہ خدا نے سلطان کے دل میں آپ کا احترام پیدا کر رکھا ہے، سلطان آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔“

آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”سلطان میری خدمت کرنا چاہتا ہے، آخر کیوں؟ میں نے سلطان کا کیا بگاڑا ہے جو وہ میری خدمت کرنا چاہتا ہے۔“

صدر جہاں نے جواب دیا۔ ”آپ نے سلطان کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ آپ نے سلطان کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ہے، اسی لیے سلطان کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ آپ کے کام آئے، آپ کی خدمت کرے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”صدر جہاں! آخر بات کیا ہے؟ سب کچھ صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتے!“

صدر جہاں نے عرض کیا۔ ”سلطان کو آپ کی بڑی فکر لگی ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے بلا کر کہا کہ جب شیخ منور دن رات یادِ الٰہی میں غرق رہتے ہیں تو وہ دنیاوی امور کس طرح انجام دیتے ہوں گے۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ سلطان نے اسی وقت ایک فرمان تیار کیا۔ اس فرمان کے ذریعے آپ کو دو گاؤں عطا کیے گئے ہیں۔“

اتنا کہہ کر صدر جہاں نے شاہی فرمان آستین سے نکال کر شیخ کی طرف بڑھا دیا، بولے۔ ”میں خوش ہوں کہ شاہی فرمان کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے۔“

صدر جہاں نے شاہی فرمان کو نہایت ادب سے آپ کی خدمت میں پیش کیا مگر آپ نے یہ فرمان نہیں لیا اور فرمایا۔ ”صدر جہاں! زمانہ گزرا، جب اس ملک پر سلطان ناصر الدین کی حکومت تھی اور الغ خان جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن بن گیا، بادشاہ کی طرف سے دو گاؤں کی بخشش کا فرمان لے کر بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں گیا تھا۔ اس وقت بابا فرید نے الغ خان سے کہا تھا کہ ہمارے پیروں نے اس قسم کی چیزوں کو قبول کرنے سے صاف منع فرمایا ہے۔ اس سلطانی فرمان کے طالبوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہیں۔“

یہ کہتے کہتے شیخ منور رک گئے اور قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ ”صدر جہاں! تم جانتے ہو کہ بابا فرید نے اس عطیے کو قبول نہیں کیا تھا پھر میں اس خانوادے کا غلام اس فرمان کو کس طرح قبول کر سکتا ہوں۔“

صدر جہاں نے جواب دیا۔ ”شیخ! میں نے فرمان دیتے وقت سلطان کے چہرے پر جیسی عقیدت اور محبت محسوس کی ہے اس کے پیشِ نظر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس فرمان کو واپس لے جاؤں۔ اس کو تو آپ قبول ہی فرمالیں۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”صدر جہاں! تیرے دل میں بابا فرید کی کتنی عزت ہے؟“

صدر جہاں نے جواب دیا۔ ”اس کا کیا پوچھنا۔ حد درجہ عزت و احترام ہے میرے دل میں مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟“

شیخ نے فرمایا۔ ”آپ صدر جہاں ہیں اور آپ کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے وعظ کہیں، چنانچہ آپ اپنے اس منصب کے پیشِ نظر اس بات کے پابند ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے پیروں کے طریقے کی مخالفت کرے تو آپ اسے روکیں، اس سے منع کریں مگر یہ کیا کہ آپ مجھ کو ترغیب و تحریص کے جال میں خود پھنسا دینا چاہتے ہیں۔“

صدر جہاں نے جواب دیا۔ ”میں نے سلطان کے اخلاص و احترام کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے آپ کے پاس آنے کی جسارت کی تھی۔ اب اگر آپ اس فرمان کو قبول فرمالیں گے تو بندہ سلطان کی نظروں میں سرخرو ہو جائے گا ورنہ ذلت و خواری تو صاف نظر آ رہی ہے۔“

شیخ نے کہا۔ ”صدر جہاں! میں مجبور ہوں۔ میں اس فرمان کو کسی حال میں بھی قبول نہیں کروں گا۔“

صدر جہاں نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”جب میں اس فرمان کو سلطان کے حوالے کروں گا تو وہ بہت برہم ہوگا اور میں ذلیل و خوار ہو کر معلوم نہیں کس سزا کا مستحق قرار دیا جاؤں۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”میں مجبور ہوں صدر جہاں...... میں اس کو قبول نہیں کر سکتا۔“

صدر جہاں نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں سلطان سے اپنی جان بچانے کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤں۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”اس کی کیا ضرورت۔ آپ سلطان سے صاف صاف میری جانب سے کہہ دیں کہ میں یہ دو گاؤں نہیں قبول کروں گا۔“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

صدر جہاں نے پژمردہ آواز میں جواب دیا۔ ''آپ کا ارشاد سرآنکھوں پر۔ میں واپس جاتا ہوں، آپ میرے حق میں دعا فرمائیں کہ وہ مجھے سلطان کے شر سے محفوظ رکھے۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''صدر جہاں! میں تیرا دعاگو ہوں، اللہ نے چاہا تو تو خوش حال اور خوش و خرم رہے گا۔''

آپ نے صدر جہاں کو تھوڑی دور تک چل کر چھوڑا اور دعائیں دیتے ہوئے واپس آ گئے۔ صدر جہاں سلطان کی خدمت میں واپس گئے اور سارا واقعہ بالتفصیل بیان کر دیا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''صدر جہاں! باتیں تو اس نے بڑی معقول کیں...... تیرا کیا خیال ہے، شیخ منور کیسا آدمی ہے؟''

صدر جہاں نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! میں تو پہلے ہی ان کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ شیخ منور ایک فرشتہ صفت انسان ہیں، انہیں نہ چھیڑیے۔''

سلطان نے کہا۔ ''تو یہ بات ہے، خوب۔ بہرحال میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا اور اس شخص کو اس کے اصلی چہرے میں دیکھ کر رہوں گا۔''

☆☆☆

آپ عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے کہ ایک قلندر کہیں سے آ گیا۔ اس نے شیخ سے کہا۔ ''شیخ! یہ کیا کر رہے ہو، کچھ مجھ پر بھی نظرِ التفات ہو۔''

آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ اس کو کھانا کھلایا جائے۔ قلندر کو اسی وقت کھانا کھلایا گیا۔

قلندر نے کھانے کے بعد پھر آپ کو مخاطب کیا۔ ''شیخ! اللہ رازق ہے۔ اس نے کھانا تو کھلا دیا، اب کچھ پہننے کو بھی مل جائے۔''

شیخ نے حکم دیا۔ ''اس کو کپڑے بھی دیے جائیں۔''

قلندر کو کپڑے بھی دے دیے گئے۔ قلندر نے ایک بار پھر صدائے احتیاج بلند کی۔ ''شیخ! کمبل بھی ملے۔''

قلندر کو کمبل بھی پیش کر دیا گیا، اس نے مزید مطالبہ کیا۔ ''شیخ! پیدل سفر کرتے کرتے عاجز آ چکا ہوں، ایک گھوڑا فراہم کر دیا جائے، مہربانی ہو گی۔''

شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ''اس کو ایک گھوڑا بھی فراہم کر دیا جائے۔''

قلندر کی خواہشات کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ گھوڑا ملا تو گھوڑے کے لیے نقدی کا مطالبہ کر دیا۔ بولا۔ ''شیخ! میں قلندر آدمی گھوڑے کو کھلاؤں پلاؤں گا کہاں سے؟ اس کے لیے نقدی کا مستقل انتظام ہونا چاہیے۔''

شیخ نے اسی وقت سو تنکے دے دیے اور کہا۔ ''جب یہ خرچ ہو جائیں تو آ جانا، مزید مل جائیں گے۔''

قلندر نے سو تنکے قبضے میں کیے اور کہا۔ ''بابا! یہ تو گھوڑے کے حساب میں چلے گئے، اب میرے لیے بھی کچھ بندوبست کر دیا جائے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''تیرے لیے کس قسم کا بندوبست کیا جائے؟''

قلندر نے جواب دیا۔ نقدی کا۔ کیونکہ جب نقدی اپنے پاس ہو گی تو اپنا ہر کام بہ آسانی ہو جائے گا۔''

شیخ کو قلندر پر غصہ آ گیا، فرمایا۔ ''قلندر! تو حد درجہ لالچی اور حریص ہے۔ تجھ کو قلندر کون کہے گا؟''

ایک مرید نے شیخ کو غصے میں جو دیکھا تو قلندر کو دبوچ لیا اور اس سے کہا۔ ''تو جاتا ہے یا دھکے دے کر نکالوں۔''

قلندر نے شیخ سے مرید کی شکایت کی۔ ''شیخ! یہ کیسے اجڈ اور جھگڑالو مرید پال رکھے ہیں تو نے!''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میرے مرید میں کوئی خرابی نہیں ہے، خرابی تو تجھ میں ہے کہ تو نے اپنی ہمیانی میں تنکے باندھ رکھے ہیں اور پھر بھی تیری حرص و طمع کا یہ حال ہے کہ مانگے چلا جا رہا ہے۔ پہلے ہمیانی کے تنکے تو خرچ کر، اس کے بعد کچھ مطالبہ کر۔''

مرید کو یہ واضح اشارہ جو ملا تو قلندر سے لپٹ گیا اور اس کی کمر سے ہمیانی کھول لی۔ ہمیانی تنکوں سے بھری ہوئی تھی۔ مریدوں کے چہروں سے حیرت برسنے لگی، کہا۔ ''قلندر! جب تیرے پاس پہلے ہی سے اتنے سارے تنکے موجود ہیں تو پھر یہ طلب اور مطالبہ کیوں؟''

قلندر نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ جس شیخ کو تم لوگ ہر وقت اپنے سامنے اور قریب دیکھتے ہو، وہ کتنا عظیم اور روشن ضمیر ہے ورنہ ہم قلندر لوگ، تنکوں اور گھوڑوں کے چکر میں کہاں پڑتے ہیں۔''

قلندر چلا گیا مگر شیخ کا مقام سب کو بتا گیا۔

آپ کسی ضرورت سے دہلی تشریف لے گئے۔ آپ کے عقیدت مندوں اور پرستاروں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ صبح سے شام تک یہ لوگ آپ کے آس پاس موجود رہتے۔ آپ ان سب کو شرف باریابی بخشتے اور ان سے باتیں کر کے انہیں خوش کر دیتے۔

انہی ارادت مندوں میں ایک ایسا شخص بھی آپ کو ملا جو ذرا پریشان بھی تھا اور بدحواس بھی۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا' وہاں اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تو کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دیتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! پریشان میں نہیں، چار دوسرے لوگ ہیں اور میں انہی کا بھیجا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تجھ کو ہمارے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''خواجہ کافور نے۔ آپ خواجہ کافور سے تو اچھی طرح واقف ہوں گے؟''

آپ نے کہا۔ ''ہاں' میں خواجہ کافور سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کہاں ہے آج کل؟ اور اس نے تجھ کو میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ سلطان، خواجہ کافور اور اس کے تین ساتھیوں سے معلوم نہیں کیوں اور کس بات پر ناراض ہو گیا۔ اس نے چاروں کو قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ اب وہ چاروں قید خانے میں پڑے سڑ رہے ہیں۔''

آپ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''وہ چاروں قید خانے میں سڑ رہے ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جی' وہ چاروں قید خانے میں پڑے ہوئے ہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''اور تو کون ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں ان چاروں کا دوست ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو ان چاروں کا دوست نہیں، اجیر ہے۔ اجرت لے کر کام کرنے والا۔''

وہ شخص شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''یہ غلط ہے کہ خواجہ کافور نے اپنے تینوں ساتھیوں کے مشورے اور منظوری سے تیرے سپرد یہ کام کیا ہے کہ تو ہم سے ان کے حق میں دعائے خیر کرائے؟''

اس شخص نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ''جی پیر و مرشد! میری یہی حیثیت ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جب تو خواجہ کافور سے ملاقات کرنے جائے تو اس کو میری طرف سے یہ بتا دینا کہ تین تو قید سے رہا ہو جائیں گے مگر چوتھا قیدِ زندگی ہی سے نجات حاصل کر لے گا۔''

وہ شخص اس بشارت سے بہت خوش ہوا لیکن بشارت کے آخری حصے سے دکھ بھی پہنچا، بولا۔ ''حضرت! کیا چوتھا شخص واقعی مر جائے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا اختیار؟''

یہ شخص آپ کے پاس سے بشارت لے کر خواجہ کافور کے پاس پہنچا۔ خواجہ کافور نے چوتھے شخص کو اس کے پیامِ مرگ کی خبر نہیں سنائی۔ کچھ عرصے بعد سلطان کے حکم سے ان چاروں کی رہائی ہو گئی، مگر چوتھا بیمار پڑ کر قید خانے ہی میں مر گیا۔ بقیہ تین کو رہائی مل گئی۔

☆☆☆

سلطان محمد تغلق کو حاسدوں نے پھر ورغلانا شروع کر دیا۔ سلطان دہلی سے دور گیا ہوا تھا۔ واپسی میں اس کا گزر ہانسی سے ہوا۔ اس نے ہانسی میں قیام کیا اور اپنے ایک امیر نظام الدین ندر باری معروف بہ مخلص الملک کو اپنے روبرو طلب کیا۔ سلطان کو مخلص الملک اس لیے پسند تھا کہ وہ بھی سلطان ہی کی طرح ظالم اور سخت گیر تھا۔ سلطان نے مخلص الملک سے کہا۔ ''میں تجھ کو لائق فائق سمجھ کر حکم دیتا ہوں کہ ہانسی کے قلعے میں جا اور اس کی شکست و ریخت کی تفصیلی روداد مرتب کر کے میری خدمت میں پیش کر۔''

شیخ منور کا گھر قلعے سے قریب ہی تھا۔ مخلص الملک ان کے گھر کے پاس پہنچا تو اس نے لوگوں کو اس گھر میں داخل ہوتے اور نکلتے دیکھا، کسی سے پوچھا۔ ''اس گھر میں کون رہتا ہے؟''

اسے جواب دیا گیا۔ ''شیخ قطب الدین منور، شیخ جمال الدین کے پوتے۔''

مخلص الملک نے پوچھا۔ ''یہ اتنے سارے لوگ ان کے پاس کیوں آتے جاتے ہیں؟''

جواب دیا گیا۔ ''حیرت ہے کہ تجھے شیخ کے مقام کا پتا نہیں۔ شیخ منور ایک خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ یہ آنے جانے والے لوگ ان کے مرید اور ارادت مند ہیں۔''

مخلص الملک نے پوچھا۔ ''یہ وہی بزرگ ہیں نا جو دہلی کے نظام الدین اولیاء کے مرید اور خلیفہ بھی ہیں؟''

جواب دیا گیا۔ ''ہاں' یہ وہی بزرگ ہیں۔''

مخلص الملک نے بڑی بے مروتی سے کہا۔ ''تب پھر اس کا دماغ بھی ضرور ہی خراب ہوگا۔''

مخلص الملک نے یہ بات جس لب و لہجے میں کہی تھی' اس سے سننے والوں کو تکلیف پہنچی۔ وہ خاموش ہوگئے۔

مخلص الملک نے کہا۔ ''شیخ کو مطلع کرو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

ایک مرید نے یہ خبر اندر شیخ کو پہنچادی۔ آپ نے اس کو اسی وقت اندر بلالیا۔ مخلص الملک سلام کیے بغیر شیخ کے سامنے رعونت سے کھڑا رہا۔ شیخ نے کہا۔ ''مخلص الملک! بیٹھ جاؤ۔''

مخلص الملک نے کہا۔ ''شیخ! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔ یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ سلطان ان دنوں ہانسی ہی میں قیام فرما ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

مخلص الملک نے بدستور کڑک کر کہا۔ ''شیخ! جب تجھے سلطان کی ہانسی میں موجودگی کا علم ہے تو تو نے دربار میں حاضری کیوں نہیں دی؟ سلطان کو سلام کرنے کیوں نہیں گیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فقراء کو دربار سرکار کی فضا راس نہیں آتی۔ میں بھی اپنے پیروں کی طرح ایک گوشے میں بیٹھ کر سلطان کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ دربار میں جاکر سلامتی کی دعا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

مخلص الملک نے طنزاً کہا۔ ''میں تیری یہ بات کس طرح مان لوں کہ تو یہاں بیٹھ کر سلطان کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہے۔ تجھ کو سلطان کو سلام کرنے ضرور جانا چاہیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مخلص الملک! سلام اور حاضری پر اصرار نہ کر۔ تیری طبیعت میں فساد ہے اور تو ایسی باتیں کر رہا ہے جس سے درویش کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ آخر تو چاہتا کیا ہے؟''

مخلص الملک نے جواب دیا۔ ''شیخ! میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا۔ میں سلطان کا نمک خوار ہوں، اس لیے سلطان کی اہانت اور سبکی نہیں برداشت کرسکتا۔''

شیخ منور نے کہا۔ ''جب میں سلطان کے دربار میں حاضری سمجھوں گا، پہنچ جاؤں گا۔ اب تو یہاں سے جاسکتا ہے۔''

مخلص الملک غصے میں کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''شیخ! میں جارہا ہوں مگر تجھ کو سلطان کے دربار میں بلوا کر رہوں گا۔ میں درویش کی طاقت دیکھ لوں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''میں نے سلطان کے دربار کی حاضری سے کب انکار کیا ہے اور میں اپنی درویشی کی طاقت پر کہاں ناز کر رہا ہوں۔ مخلص الملک! خدا کے غضب سے ڈر اور درویش کو خواہ مخواہ تنگ نہ کر۔''

مخلص الملک غصے میں پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا اور کچھ دیر قلعے میں رہ کر اس کی ٹوٹ پھوٹ کا معائنہ کرتا رہا پھر جب وہ سلطان کے پاس گیا تو اس کا دل شیخ کی نفرت سے لبریز تھا۔ اس نے سلطان سے شیخ کی شکایت کی، بولا۔ ''سلطان معظم! قلعے کے قریب اس ملک کا متکبر ترین انسان رہتا ہے۔ وہ آج تک آپ کے سلام کو نہیں آیا۔ جب میں نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اس نے حاضری دینے سے انکار کردیا۔''

سلطان نے نرمی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے شیخ کی دربار میں حاضری اتنی ضروری نہیں' یہ لوگ ایک گوشے میں بیٹھ کر ہی ہمارے حق میں امن و سلامتی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔''

مخلص الملک نے عرض کیا۔ ''وہ تو حضور بجا فرمارہے ہیں لیکن میں نے اس درویش میں عجز و انکساری کے بجائے تکبر اور انا کو محسوس کیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کے سامنے سلطان کا مذاق اڑاتا ہے۔ سلطان معظم! اگر یہ صورتِ حال تادیر قائم رہی تو اس سے بغاوت اور فتنہ و فساد پھیل جانے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ حکومت

کو دبدبہ اور رعب قائم رکھنے کے لیے کبھی کبھی سختی بھی کرنا پڑتی ہے۔''

سلطان بے بس ہوگیا، پوچھا۔''تب پھر ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟''

مخلص الملک نے جواب دیا۔''حضورِ والا! میں شیخ سے کہہ کر آیا ہوں کہ اس کو سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا۔''

سلطان نے کچھ دیر سوچتے ہوئے کہا۔''اگر یہ بات ہے تو شیخ کو میرے دربار میں حاضری دینا پڑے گی۔''

سلطان نے تالی بجائی اور خدمت گار کو حکم دیا۔''شیخ حسن سر برہنہ کو حاضر کیا جائے۔''

تھوڑی دیر بعد شیخ حسن سر برہنہ کو بھی حاضر کر دیا گیا۔

سلطان نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، گو کہ وہ اس وقت سلطان کی طلبی پر حاضر ہوا تھا اس لیے اس کی چال ڈھال اور انداز میں نرمی اور خوش خلقی پائی جاتی تھی مگر اس نرمی اور خوش خلقی میں بھی جاہ و تکبر کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ سلطان نے کہا۔''شیخ حسن! ہانسی میں ایک متکبر انسان رہتا ہے، وہ ابھی تک سلام کرنے نہیں آیا۔ تیرا یہ فرض ہے کہ اس مغرور اور متکبر انسان کے سر کو میرے سامنے جھکا دے۔''

شیخ حسن نے عرض کیا۔''سلطانِ معظم! اس مغرور اور متکبر کا نام؟ سلطان کے ہوتے ہوئے کسی کے تکبر اور غرور کا مطلب؟''

سلطان نے جواب دیا۔''وہ درویش ہے اور اس کی درویشی کے نشے نے اسے از خود رفتہ کر دیا ہے۔''

شیخ حسن نے کہا۔''اس درویش کا نام بتایا جائے۔ میں ابھی اس کا پُر غرور سر سلطان کی بارگاہ میں جھکا دوں گا۔''

سلطان نے جواب دیا۔''اس درویش کا نام ہے شیخ قطب الدین منور۔''

شیخ حسن سر برہنہ چونک پڑا اور آہستہ سے کہا۔''حیرت ہے۔ شیخ تو سراپا عجز و نیاز ہیں۔ ان میں غرور و انانیت کہاں!''

سلطان نے سختی سے کہا۔''اس نے دربار میں حاضری نہیں دی، وہ سلام کرنے نہیں آیا۔ کیا اس میں اس کا غرور و انانیت شامل نہیں؟''

شیخ حسن نے کہا۔''بہرحال میں جاتا ہوں اور شیخ کو دربار میں حاضر کیے دیتا ہوں۔''

شیخ حسن چلا گیا۔ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ تھا جو شیخ حسن کو اپنے حلقے میں لیے شیخ کے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جب دور سے شیخ کا گھر نظر آنے لگا تو شیخ حسن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔''تم سب یہیں ٹھہر جاؤ۔ شیخ کی خدمت میں تنہا جاؤں گا۔''

سپاہی شیخ کے گھر سے دور ہی رک گئے۔ شیخ حسن نے اپنے ہتھیار بھی یہیں اتار دیے اور تنہا شیخ کے در پر چلا گیا۔ اس وقت شیخ دہلیز کی چھت پر یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔ شیخ حسن نے دہلیز پر کھڑے ہو کر اعلان کیا۔''شیخ! ایک کمینہ انسان حاضری کا طالب ہے۔''

شیخ کے مریدوں نے بتایا۔''شیخ اس وقت یادِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ تجھ کو کچھ دیر ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

شیخ حسن نے دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا۔''میں ان کا انتظار کرلوں گا۔''

شیخ کے مریدوں نے شیخ کو شیخ حسن سر برہنہ کی آمد کی اطلاع دی تو آپ نے ادھر کوئی توجہ نہیں دی اور یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ ایک گھنٹے بعد آپ نے شیخ حسن کو بلوایا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ نور الدین نے شیخ حسن کو مطلع کیا کہ چلو طلبی ہوگئی ہے۔

شیخ حسن آہستہ آہستہ مؤدبانہ چل کر شیخ کے روبرو پہنچا اور سلام اور مصافحے کے بعد اجازت لے کر بیٹھ گیا۔

آپ نے پوچھا۔''ہاں شیخ حسن! غایتِ آمد بیان کرو۔''

شیخ حسن نے جواب دیا۔''حضرت! نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ سلطان نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔''

آپ نے پوچھا۔''سلطان نے مجھے یاد کیا ہے، خوب ...... لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس بلانے میں سلطان نے مجھے بھی کچھ اختیار دیا ہے یا نہیں؟''

حسن سر برہنہ نے جواب دیا۔''نہیں، افسوس کہ بادشاہ نے آپ کو کوئی اختیار نہیں دیا۔ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کو سلطان کی خدمت میں حاضر کر دوں لیکن میں اس حکم کی تعمیل میں سختی کے بجائے درخواست کر رہا ہوں۔ براہِ کرم آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔''

آپ نے اوپر دیکھتے ہوئے فرمایا۔''اللہ تیرا شکر ہے کہ میں اپنی مرضی سے سلطان کے دربار میں نہیں جا رہا۔''

اس کے بعد آپ نے اپنے گھر والوں کو مطلع کیا۔ ''اے میرے گھر والو! مجھے سلطان نے اپنے دربار میں بلایا ہے۔ میں جارہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں میرے ساتھ کیا پیش آئے گا اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میری عدم موجودگی میں میرے بعد تم سے کیا سلوک کیا جائے گا۔ میں تم سب کو خدا کی امان میں دے رہا ہوں، خدا حافظ۔''

آپ نے مصلّٰی اپنے کاندھے پر ڈالا اور عصا ہاتھ میں لیا اور حسن سربرہنہ کے ساتھ پیدل چل پڑے۔

حسن سربرہنہ خود تو گھوڑے پر آیا تھا اس لیے اس نے شیخ سے درخواست کی۔ ''حضرت! آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔''

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا سفر پیدل جاری رکھا۔

حسن سربرہنہ کے ساتھ ایک خالی گھوڑا بھی تھا۔ اس نے شیخ سے درخواست کی۔

''شیخ! جب گھوڑا موجود ہے تو آپ پیدل کیوں چلیں، آپ اس پر سوار ہو جائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں پیدل چلنے کی قوت رکھتا ہوں اس لیے گھوڑے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

حسن سربرہنہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! پھر میں گھوڑے پر کیوں سوار ہوں، میں بھی پیدل چلوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، تو اپنے گھوڑے پر بیٹھا رہ۔ تجھ کو خدا نے' بادشاہ نے یہ اختیار دیا ہے کہ گھوڑے پر سفر کرے۔ مجھے خدا نے پیدل چلنے کا اختیار دیا ہے اور اس اختیار پر میں اپنے رب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔''

حسن سربرہنہ نے کہا۔ ''حضرت! آپ مجھ کو حد درجہ شرمندہ و نادم کر رہے ہیں۔''

اس کے بعد وہ خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا اور آپ کے ساتھ پیدل چلنے لگا۔ راستے میں اس کے سپاہیوں نے بھی پیدل چلنے کی روش اختیار کی۔

جب شیخ اپنے آبائی قبرستان کے پاس سے گزرے تو حسن سربرہنہ سے کہا۔ ''اگر تم اجازت دو تو میں اپنے آبا ؤ اجداد کے مقابر کی زیارت کرلوں۔''

حسن سربرہنہ نے جواب دیا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے' زیارت کر لیجیے۔''

آپ مقابر کے پائینتی کھڑے ہو کر بولے۔ ''بزرگو! میں اپنی مرضی سے آپ کے گنج چھوڑ کر نہیں جارہا ہوں بلکہ مجھے زبردستی لے جایا جارہا ہے۔ خدا کے چند بندے جو میرے لواحقین یا متعلقین کہلاتے ہیں، میں نے انہیں بغیر خرچ کے گھر میں چھوڑ دیا ہے، آپ خدا سے کہیے ان کا خیال رکھے۔''

ادھر سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو دیکھا، ایک شخص ان کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ کہاں جارہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''سلطان کے پاس۔''

اس شخص نے کہا۔ ''میں نے ایک نذر مانی تھی، سو پوری ہوگئی۔ یہ کچھ رقم شکرانے کے طور پر لایا ہوں' قبول فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ شکرانہ میرے گھر پہنچا دے کیونکہ میں اپنے گھر میں کچھ بھی دے کر نہیں آیا۔'' وہ شخص چلا گیا۔

سلطان ہانسی سے آٹھ میل دور بنسی نامی بستی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آپ پیدل چل کر بنسی تک پہنچے۔

حسن سربرہنہ سلطان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضورِ والا! شیخ منور تشریف لے آئے ہیں۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

حسن سربرہنہ نے جواب دیا۔ ''باہر...... لیکن اس مختصر سے وقفے میں' میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ حیرت انگیز ہے۔ سلطانِ معظم میں کہہ سکتا ہوں کہ شیخ ایک باکمال بزرگ ہیں۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو نے اس میں کیا کمال دیکھا؟''

حسن سربرہنہ نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! انہوں نے آٹھ میل کا سفر پاپیادہ طے کیا۔ راستے میں جب وہ اپنے آبائی قبرستان میں بزرگوں کے مقابر کے پائینتی کھڑے یہ کہہ رہے تھے کہ میں سلطان کی خدمت میں زبردستی لے جایا جارہا ہوں اور گھر والوں کے خرچ کے لیے کچھ بھی نہیں دیا۔ تو اس وقت میں نے ایک شخص کو روپے لیے کھڑا دیکھا۔ اس شخص نے روپوں کی تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کی اور آپ نے وہ رقم اپنے متعلقین کو بھجوا دی۔ کیا یہ غیر معمولی باتیں نہیں ہیں؟''

سلطان نے حسن سربرہنہ کو گھور کر دیکھا اور نہایت رعونت سے کہا۔ ''تو گویا شیخ کا جادو تجھ پر بھی چل گیا، خوب! شیخ کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔''

لیکن جب حسن سربرہنہ شیخ کو بلانے گیا تو سلطان نے اسی وقت دہلی کوچ کا حکم دے دیا اور خود بھی سفر کرنے لگا۔

مجبوراً شیخ منور کو بھی دہلی جانا پڑا۔ راستے میں شیخ منور کو مطلع کیا گیا کہ ان کے صاحبزادے شیخ نورالدین بھی آگئے ہیں اور وہ اپنے والد کے ساتھ دہلی چل رہے ہیں۔

آپ نے اپنے صاحبزادے سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! یہ تم نے کیا کیا، تم کیوں چلے آئے؟''

نورالدین نے جواب دیا۔ ''باواجان! میں آپ کو تنہا کس طرح چھوڑ دیتا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اللہ ہم پر رحم فرمائے۔''

دہلی میں سلطان نے انہیں فوراً ہی طلب نہیں کیا، شیخ کو بازیابی کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔

اس دوران ان کی ملاقات فیروز شاہ تغلق سے ہوگئی۔ فیروز شاہ سلطان کا بھتیجا اور نائب باربک تھا، وہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ آپ نے فیروز شاہ سے کہا۔ ''ہم درویش لوگ آدابِ شاہی سے واقف نہیں ہوتے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سلطان سے بات کس طرح کی جاتی ہے' اس سلسلے میں ہمیں آپ کی راہنمائی درکار ہے۔ آپ جیسا مشورہ دیں گے' ہم اس پر عمل کریں گے۔''

فیروز شاہ نے کہا۔ ''حضرت! بادشاہ کے دل میں آپ کے خلاف زہر بھر دیا گیا ہے۔ سلطان کا خیال ہے کہ اس کو آپ حد درجہ حقیر اور فضول انسان سمجھتے ہیں' اس پر ذرا بھی التفات نہیں فرماتے اور نہ ہی اس کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں اس لیے آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ جب آپ سلطان سے ملیں تو نہایت تواضع، اخلاص اور نرمی سے پیش آئیں۔''

شیخ نے سنا اور خاموش ہوگئے۔ سلطان نے انہیں طلب کرلیا اور جب شیخ سلطان کی خدمت میں روانہ ہوئے تو صاحبزادہ نورالدین بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ ان کے دونوں طرف امراء اور ملوک کھڑے ہوئے تھے۔ شاہی ٹھاٹ باٹ اور شان و شکوہ نے صاحبزادہ نورالدین کو ہراساں کردیا۔ آپ نے اپنے بیٹے کی اس کیفیت کو محسوس کرلیا اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بابا نورالدین! عظمت اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے اور اسی کو زیب دیتی ہے۔ خطا اور نسیان کے خاکی پتلے انسان سے کیا ڈرنا۔ اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھو اور دل سے خوف و ہراس نکال باہر کرو۔''

شیخ کے ان کلمات نے صاحبزادہ نورالدین کے دل سے خوف و ہراس کو یوں دور کردیا' گویا کافور تھا جو اڑ گیا۔ انہوں نے امرا و ملوک کی طرف حقارت سے دیکھا گویا وہ انسان نہیں جانور تھے۔

دوسری طرف سلطان کو مطلع کیا گیا کہ شیخ منور تشریف لانے ہی والے ہیں تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیر کمان سنبھال کر تیر اندازی میں مشغول ہوگیا۔ جب شیخ' سلطان کے قریب پہنچے تو سلطان نے ان پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور تیر کمان کو ایک طرف رکھ دیا۔

شیخ نے السلام علیکم کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سلطان بھی غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ آگے بڑھانے پر مجبور ہوگیا۔ شیخ نے سلطان کے ہاتھ کو زور سے داب دیا۔

سلطان نے شکوہ کیا۔ ''حضرت! میں آپ کے شہر میں پہنچا لیکن آپ نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی اور میری تربیت نہ فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ نے ملاقات تک نہیں کی۔ ازروئے انصاف آپ خود فرمائیں کہ کیا میں اتنا گیا گزرا انسان ہوں کہ درویش مجھ سے نفور اور گریزاں ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''سلطان! آپ نے ہانسی کو ملاحظہ فرمایا۔ ہانسی کا درویش بچہ آپ کے سامنے کھڑا ہے' اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ میں خود کو بادشاہوں کی ملاقات کے لائق نہیں پاتا مگر پھر بھی میں ایک گوشے میں بیٹھا سلطان اور مسلمانوں کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہوں' اس لیے مجھے حاضری اور ملاقات سے معذور سمجھیے۔''

سلطان نے اس صاف گو انسان کو بغور دیکھا اور قدرے فاصلے پر کھڑے ہوئے فیروز شاہ تغلق سے کہا۔ ''بھتیجے! تم نے سنا یہ شیخ کیا فرما رہے ہیں؟''

فیروز شاہ تغلق نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا سنا۔ شیخ صاف گو' مخلص، سچے اور تکلف و تصنع سے پاک انسان ہیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے انہیں خواہ مخواہ زحمت دی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سلطان! درویشوں سے کدورت نہ رکھ۔ ہمیں دنیا سے کیا لینا دینا' تو دنیا پر حکومت کر۔ ہمیں کونے میں اللہ کی عبادت کرنے دے۔''

سلطان نے فیروز شاہ کو حکم دیا۔ ''بھتیجے! شیخ کی خواہش معلوم کرو اور اسے پورا کر کے عزت و احترام کے ساتھ ہانسی روانہ

کر دے۔"

آپ نے فرمایا۔" سلطان! میری کوئی خواہش نہیں، اس کے سوا کہ میں ہانسی واپس جاؤں اور اپنے آباؤ اجداد کے گنج اور اپنے پیر.... کی خدمت کروں۔"

سلطان نے جواب دیا۔" وہ تو میں نے ہانسی جانے کی اجازت دے ہی دی ہے۔ آپ چاہے یہاں دہلی میں رہیں یا ہانسی چلے جائیں' میری طرف سے آپ کو اجازت مل چکی ہے۔"

جب آپ ہانسی چلے گئے تو محمد شاہ تغلق نے اپنے ایک امیر اعظم ملک کبیر معظم سے کہا۔" کبیر! میں نے آج تک جتنوں سے بھی ہاتھ ملایا ہے، مصافحے کے وقت ان کے ہاتھ کانپا کرتے تھے مگر ابھی جب میں نے شیخ منور سے ہاتھ ملایا تو میری کچھ عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری طاقت گویا ئی سلب کی جا چکی ہے۔ اسی وقت میں نے یہ جان لیا کہ شیخ منور کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔"

ملک کبیر نے عرض کیا۔" سلطانِ معظم! شیخ کی عظمت اور بزرگی کا ایک زمانہ معتقد اور مداح ہے، وہ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔"

سلطان نے مزید کہا۔" میں نے انہیں تکلیف دی، ستایا۔ حاسدوں نے مجھے ان کی طرف سے بدظن کر دیا تھا۔ جب میں نے ان سے مصافحہ کیا اور انہوں نے میرا ہاتھ زور سے دبایا تو میں لرز گیا۔"

شیخ کے جانے کے بعد سلطان کئی دن تک بہت پریشان رہا۔ آخر ایک دن فیروز شاہ تغلق اور مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کو طلب کیا، ان دونوں سے کہا۔" جب سے شیخ گئے ہیں میں نے اپنا سکون کھو دیا ہے، بتاؤ اب میں کیا کروں جو میں سکونِ قلب پاؤں؟"

فیروز شاہ نے جواب دیا۔" شیخ کی تالیفِ قلب سے سکونِ قلبی دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

سلطان نے پوچھا۔" تالیفِ قلب میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

ضیاء الدین برنی نے جواب دیا۔" انہیں مال وزر سے نواز دیا جائے، شیخ خوش ہو جائیں گے۔"

سلطان نے برنی کی تجویز سے اتفاق کیا' حکم دیا۔" انہیں خزانہ عامرہ سے ایک لاکھ تنکے دیے جائیں اور تم دونوں انہیں شیخ منور کی خدمت میں میری طرف سے پیش کر دو۔"

دونوں ایک لاکھ تنکوں کے ساتھ شیخ کی خدمت میں پہنچے اور انہیں ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔" قبلہ شیخ محترم! سلطان نے یہ حقیر نذرانہ آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔" یہ کتنے تنکے ہیں؟"

برنی نے جواب دیا۔" کُل ایک لاکھ۔"

آپ نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے اور کہا۔" معاذ اللہ معاذ اللہ۔ میں انہیں کس طرح قبول کر سکتا ہوں۔ انہیں سلطان کے پاس واپس لے جاؤ، یہ درویش انہیں نہیں قبول کر سکتا۔"

فیروز شاہ نے کہا۔" حضرت! اگر آپ انہیں نہیں قبول کریں گے تو سلطان یہی سمجھے گا کہ آپ نے کفرانِ نعمت کیا ہے۔ آپ انہیں قبول فرمالیں ورنہ سلطان بہت ناراض ہوگا۔"

آپ نے جواب دیا۔" میں اپنے مسلک سے نہیں ہٹ سکتا۔"

دونوں دیر تک خوشامد کرتے رہے مگر آپ نے ان کی ایک نہ مانی۔ آخر دونوں سلطان کی خدمت میں واپس گئے اور اعلان کر دیا۔" سلطانِ معظم! انہوں نے آپ کی مرسلہ رقم قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے، اب ارشاد ہو ہم کیا کریں؟"

سلطان نے کہا۔" شیخ کی خدمت میں دوبارہ جاؤ اور انہیں ایک لاکھ کے بجائے پچاس ہزار تنکے مرحمت فرمائے جائیں۔"

دونوں پچاس ہزار تنکے لے کر دوبارہ آپ کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔" سلطان کی خواہش ہے کہ آپ کم از کم پچاس ہزار تو قبول فرمالیں۔ ایک لاکھ نہ سہی۔"

آپ نے فرمایا۔" یہ تم دونوں کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ سلطان کی خدمت میں میرا شکریہ پیش کرو اور اس سے کہو کہ میں ان پچاس ہزار تنکوں کا کیا کروں گا' مجھے یہ بخشش نہیں چاہیے۔"

دونوں نے بڑی خوشامد کی مگر آپ نہیں مانے اور دونوں کو ایک بار پھر سلطان کے پاس جانا پڑا۔ سلطان نے ان دونوں

کی باتیں سن کر تامل کیا پھر کہا۔ ''تم دونوں کچھ نہ کچھ شیخ کو ضرور دو، ورنہ دنیا کیا کہے گی۔''

فیروز شاہ نے عرض کیا۔ ''حضور والا! شیخ حد درجہ بے غرض اور سادہ لوح انسان ہیں۔ اگر انہوں نے ایک بار رقم لینے سے انکار کر دیا ہے تو اب وہ کسی قیمت پر بھی یہ رقم قبول نہیں کریں گے۔''

سلطان نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تم دونوں کی زبان سے بس یہ سننا چاہتا ہوں کہ شیخ نے یہ رقم قبول فرمالی۔''

دونوں نے کہا۔ ''اچھا پھر ایک بار اور ہم دونوں کوشش کرتے ہیں، خدا کرے کہ شیخ کا دل موم کا ہو جائے۔''

یہ دونوں ایک بار پھر شیخ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ ''شیخ! ہمیں مصیبت میں نہ ڈالیے، سلطان کا اصرار ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ قبول ضرور فرمالیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ میں سلطان کا نذرانہ نہیں قبول کروں گا۔''

فیروز شاہ تغلق نے کہا۔ ''شیخ! آپ نے ایک بار مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا اور یہ وعدہ فرمایا تھا کہ میں جو مشورہ دوں گا، آپ اس پر عمل کریں گے۔ آج میں آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ بات زیادہ نہ بڑھائیں اور کم از کم دو ہزار ٹنکے ضرور قبول فرمالیں۔''

شیخ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سبحان اللہ! جس درویش کو دو سیر کھچڑی اور ذرا سا گھی پورے کنبے کے لیے کافی ہو، وہ ان ہزاروں ٹنکوں کو لے کر کیا کرے گا؟ مجھے سلطانی احسان تلے مت دباؤ۔''

برنی نے عرض کیا۔ ''شیخ! ہم دونوں کو کسی مصیبت میں مت ڈالیے، ہم یہ دو ہزار ٹنکے یا تو آپ کی خدمت میں پیش کر کے رہیں گے، ورنہ ہم دہلی واپس نہیں جائیں گے کیونکہ ہم سلطانی عتاب سے خوفزدہ رہتے ہیں۔''

آپ نے دونوں کے اصرار پر دو ہزار ٹنکے قبول فرمالیے۔ ان میں سے کچھ تو آپ نے سلطان المشائخ اور قطب الدین بختیار کاکی کے روضوں پر صرف کر دیے اور کچھ نصیر الدین محمود (روشن چراغ) کی خدمت میں بھیج دیے اور جو کچھ باقی بچے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیے۔

کچھ عرصے بعد آپ حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر عرس میں شرکت فرمانے تشریف لے گئے۔ یہاں شمس الدین یحییٰ اور نصیر الدین محمود (روشن چراغ) پہلے ہی سے موجود تھے۔ یہاں جب محفلِ سماع گرم ہوئی تو شیخ منور کی حالت ہی غیر ہوگئی، وہ رونے لگے۔ جو بھی انہیں اس حالت میں دیکھ رہا تھا اس کا حال برا ہو رہا تھا۔ پوری محفل میں آپ سے زیادہ وجد اور کیف کسی پر بھی طاری نہ تھا۔

آپ نے عرس کے بعد وہاں چلہ کشی کی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے ارادت مند یہاں بھی آپ کے آس پاس پروانوں کی طرح گھیرے رہتے تھے۔ یہاں ان واقعات کو ایک دوسرے سے بیان کیا گیا جو سلطان تغلق اور آپ کے درمیان پیش آئے تھے۔

کسی مرید نے پوچھا۔ ''آپ نے ایک لاکھ ٹنکے قبول فرمالیے ہوتے، اس سے بہتوں کی حاجتیں پوری ہو جاتیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سلطان کے نذرانے مشتبہ ہوتے ہیں۔ جو چیز میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا، دوسروں کے لیے کیوں پسند کروں۔''

کسی نے پوچھا۔ ''کیا آپ کا مذکورہ طرزِ عمل توکل میں شمار کیا جائے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ توکل ہی تو تھا۔''

مرید نے پوچھا۔ ''توکل کی تعریف کیا ہوتی ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''توکل ایمان کے لوازم میں سے ہے۔ اگر کسی کا اللہ پر توکل نہ ہو تو اس پر بندے کا ایمان بھی نہیں ہوگا کیونکہ ایمان اللہ کی توحید کا نام ہے اور جو شخص غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے، وہ فی الحقیقت موحد نہیں ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے توحید کا اقرار ہی کر رہا ہو۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''جب آپ اپنے صاحبزادے کے ساتھ سلطان کے پاس جا رہے تھے تو میں نے یہ سنا ہے کہ صاحبزادہ نور الدین بہت زیادہ ہراساں تھے۔ شاید ان کے دل و دماغ پر سلطانی شکوہ اور جاہ و جلال غالب آ گیا تھا۔ آپ نے اپنے صاحبزادے کی اس ہراسانی کو کس طرح دور کیا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے نور الدین سے کہہ دیا تھا کہ فضیلت اور کبریائی صرف خدا کو زیب دیتی ہے۔ اس وقت

میرے پیشِ نظر سورۃ آلِ عمران کا یہ حصہ تھا...... ''اور جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو۔ اللہ توکل کرنے والے کو بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

ایک مرید نے عرض کیا۔ ''لیکن غربت بھی تو کوئی اچھی چیز نہیں۔ کیا آپ کو یہ بات نہیں معلوم؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جس چیز کو تو غربت کہہ رہا ہے، میں اس کو فقر کہتا ہوں۔ کیا تو نے سورۃ البقرہ کا یہ حصہ نہیں پڑھا۔ شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شاید تو نے اس مفلسی کو غربت کہا ہے۔''

آپ کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ آپ سے جو بات بھی کی جاتی' آپ اس کا انتہائی اثر انگیز اور مدلل جواب دیتے اور سوال کرنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

کسی مرید نے پوچھا۔ ''یہ فقر کیا چیز ہوتی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فقر کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ فقرِ اضطراری اور فقرِ اختیاری۔ فقرِ اضطراری یہ ہے کہ آدمی کو مال و دولت کہیں سے ملے ہی نہیں اور وہ مفلس اور تنگ دست ہو اور فقرِ اختیاری یہ ہے کہ مختلف حلال ذرائع سے مال تو بہت ملے لیکن آدمی اس کو دوسرے حاجت مندوں میں تقسیم کردے اور خود فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دے۔ فقرِ اضطراری میں اگر صبر ہو تو ایسے فقیر صابر کی فضیلت سے ہم کنار ہوتا ہے اور فقرِ اختیاری وہ شے ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے اسے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے پسند فرمایا تھا۔''

آپ مریدوں کے سامنے دیر تک یوں ہی وعظ و تلقین فرماتے رہے اور سامعین اپنے سر دھنتے رہے۔ عرس کے بعد آپ دہلی سے ہانسی واپس چلے گئے۔

ہانسی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ آپ چپ چاپ رہنے لگے۔ آپ نے اپنے صاحبزادے نور الدین کو بلایا اور کہا۔ ''بابا نور الدین! کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد کی روحیں میرے آس پاس موجود رہتی ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔''

نور الدین رونے لگے، بولے۔ ''باوا جان! ہمیں ابھی آپ کی ضرورت ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تیرے لیے اللہ کافی ہے کیونکہ وہی باقی اور قائم ہے باقی فنا ہے۔''

نور الدین نے پوچھا۔ ''میرے لیے کوئی نصیحت' کوئی وصیت' کوئی ہدایت؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے زندگی بھر اپنے آباؤ اجداد کے شہر اور گنج کو نہیں چھوڑا، میری خواہش ہے کہ تُو بھی میری اتباع کرے۔''

صاحبزادے نور الدین نے وعدہ کیا کہ وہ بھی زندگی بھر ہانسی ہی میں رہیں گے۔

آپ نے صاحبزادے نور الدین سے کہا۔ ''مجھے آباؤ اجداد کے مقابر کی طرف لے چلو۔''

انہیں ان کے آبائی قبرستان میں لے جایا گیا۔ آپ کافی دیر وہاں موجود رہے اور باری باری ہر قبر کے پاس جا کر فاتحہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب اپنے دادا شیخ جمال الدین ہانسوی کے مزار پر گئے تو فرمایا۔ ''بابا نور الدین! یہی وہ جگہ ہے جہاں میں روپوش ہو جاؤں گا۔''

نور الدین نے پوچھا۔ ''باوا جان! کچھ وضاحت سے ارشاد فرمائیں۔''

آپ نے اپنے دادا کے پائنتی خالی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب میں واصل الی الحق ہو جاؤں تو مجھے اس جگہ دفن کرنا۔ دادا کے پائنتی، ان کے قدموں میں۔''

چنانچہ کئی دن بعد جب آپ نے وصال فرمایا تو انہیں ان کے دادا کے قدموں میں دفن کر دیا گیا اور وہ جگہ آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ماخذات

خزینۃ الاصفیا ...مفتی غلام سرور لاہوری، سفینۃ الاولیاء ...شہزادہ داراشکوہ۔
سکینتہ الاولیاء ...شہزادہ داراشکوہ۔ سیر الاولیاء ...میر خورد



ٹوٹے ہوئے لوگ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

یہ ضرب تقسیم کا کلیہ بھی بڑا عجیب ہے۔ کبھی طاقت کو بڑھا دینا اور کبھی کسی ذات کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے کمزور کردینا۔ قیام پاکستان کے دوران بے شمار داستانوں نے جنم لیا... ایسے ہی چند درد ناک لمحات کا احاطہ... جن کی خونیں یادیں صدیوں بھلائی نہ جاسکیں گی۔

گھر، خاندان، اور دلوں کے ٹوٹنے کا دلخراش ماجرا

روپ چند کو کراچی پہنچ کر امریتا رام پریتم داس روڈ پر عبدالرحمان سومرو کا گھر تلاش کرنا تھا۔ روپ چند کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا۔ رحمان سومرو اس کے بچپن کا دوست تھا، دونوں ساتھ ساتھ ہی بڑے ہوئے تھے۔ روپ چند کے باپ خوب چند کی دوستی رحمان سومرو کے باپ الٰہی بخش سومرو سے تھی۔ دونوں شکار پور کے رہنے والے تھے۔ دونوں کی پشتیں اور زمینیں شکار پور میں تھیں۔ خوب چند کا کراچی میں کپڑوں کی آڑھت کا کام تھا اور الٰہی بخش کراچی

کے سندھ مدرسے میں سندھی کا استاد تھا۔
پاکستان بننے سے پہلے روپ چند ٹاور کے قریب کٹرک بلڈنگ کے ساتھ دریالال جیون داس بلڈنگ میں رہتا تھا اور رحمان سومرو امریتا رام پریتم داس روڈ کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ اسے تو ایسا ہی لگا تھا جیسے پاکستان یکایک بن گیا، پھر زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ ہندوستان سے مہاجر کراچی آنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ زندگی کے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب ہندو مسلم فسادات کے فوراً بعد سارا خاندان ہندوستان جانے کو تیار بیٹھا تھا تو اس کی سولہ سالہ بہن کلپنا کا اغوا ہو گیا۔ زندگی جیسے رک گئی تھی۔ وہ تو چھوٹا تھا، آٹھ دس سال کی عمر بھی کیا ہوتی ہے۔ اسے تو یہی یاد تھا کہ ماں اور دادی کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ خوب چند اور الٰہی بخش دن رات کلپنا کی تلاش میں لگے رہے تھے۔ پھر پتا لگا کہ وہ حیدرآباد میں ہے اور مسلمان کے نکاح میں ہے۔ وہ لوگ کلپنا سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔ زندگی درد سے بھری ہوئی ایک طویل چیخ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے باپ نے سندھ دھرتی کی تھوڑی سی مٹی ایک شیشی میں بھر لی تھی۔ پھر بوجھل دلوں کے ساتھ روتے ہوئے کیماڑی سے سمندر کے راستے وہ لوگ بمبئی چلے آئے اور اس نے کبھی ماں جی کو خوش نہیں دیکھا۔ ان کی ہنسی بھی جیسے ایک طرح کی فریاد بن کر رہ گئی تھی۔ دادی کلپنا کو یاد کرتے کرتے ایک دن مر گئی تھیں۔ ماں کی بات سچ تھی، کلپنا اگر مر جاتی تو صبر آ جاتا مگر اس کا اغوا ہوا تھا، اسے زبردستی نکاح میں لیا گیا تھا۔ بھولنے کی ہر کوشش رات کی سسکیوں میں بدل کر رہ گئی تھی۔
ایسا صرف ان کے ساتھ تو نہیں ہوا تھا۔ ہزاروں مسلمان ہندوستان سے پاکستان جاتے ہوئے قتل ہو گئے تھے۔
بمبئی میں کلیان کے فوجی کیمپ میں دوسرے سندھی شرنارتھیوں کے ساتھ آ کر وہ لوگ آباد ہوئے تھے۔ جلد ہی اس جگہ کا نام الہاس نگر ہو گیا۔ مہاراشٹر کی حکومت نے اپنی طرف سے سہولتیں پہنچائی تھیں مگر مہاجر کا تو کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا۔
روپ چند کے باپ خوب چند نے یہاں بھی کاروبار شروع کرنے کی کوشش کی تھی اور چھوٹی سی کپڑوں کی دکان سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا۔ کراچی کی بات اور تھی۔ شہر میں کاروبار تھا اور ہر سال شکارپور سے آنے والی زمینوں کی آمدنی تھی۔ الہاس نگر میں زندگی آسان نہیں، بہت مشکل تھی اور اس مشکل کا سامنا سارے مہاجروں کو کرنا پڑا تھا۔ کچے گھر، پانی کا مسئلہ، بجلی کا مسئلہ، بچوں کے پڑھنے کا مسئلہ، جانوں کو خطرہ الگ، وہ لوگ سندھ دھرتی کی مٹی کی بوتل کو دیکھ کر دل میں روتے تھے۔ کسی نے گھر میں سندھو دریا کا پانی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے سندھ کے کھجور کی گٹھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کسی نے کراچی کے مکان کی چابی رکھی ہوئی تھی۔ ایک تعلق تھا جو ٹوٹا نہیں تھا۔ کلپنا ان کی بیٹی تھی، اس کی بہن تھی، بچپن ساتھ ساتھ گزرا تھا۔ کلپنا نے اسے مارا بھی تھا، چوما بھی تھا۔ کبھی اس سے روٹھی بھی تھی، اور کبھی اسے منایا بھی تھا۔ اسے ایک مہربان چہرہ یاد تھا۔ ایک گرم گرم گود یاد تھی۔ اپنے چہرے پر بوسوں کی بارش یاد تھی۔ جب ماں جی اور پتاجی اسے ڈانٹتے تو وہ کلپنا کی بانہوں میں چھپ جایا کرتا تھا۔ وہی کلپنا سندھ کے شہر حیدرآباد میں کہیں رہ رہی تھی، کسی مسلمان کے گھر میں اس کی بیوی بن کر، گھر میں باندی کی طرح۔ شاید مسلمان ہو کر وہ پچاس سال کے بعد اسی کلپنا کی تلاش میں کراچی آیا تھا۔
بمبئی میں زندگی نے بہت دھوکے دیے تھے۔ لاکھوں شرنارتھیوں کی طرح ان لوگوں کی زندگی بھی گزر گئی تھی۔ آزادی کے بعد جو بھی آئے، دہلی میں یا صوبے کی حکومت میں انہوں نے سبز خواب دکھائے تھے اور بھیانک تعبیریں دی تھیں۔ یہ کیسا ہندوستان تھا، بھارت ماتا، گاندھی کا خواب، اشوکا کی حکومت، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، جہاں کروڑوں انسان روڈ پر بھوکے سوتے ہیں، ننگے رہتے ہیں، جن کے پیروں میں نہ چپل ہے اور جن کے بچوں کے ہاتھوں میں نہ قلم ہے، نہ کوئی کتاب۔ جہاں لڑکیاں گڑ کی بوریوں اور چاول کی تھیلیوں کی طرح بیچ دی جاتی ہیں۔ چکلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ تاج محل ہوٹل سے لے کر بمبئی کی کچی آبادیوں تک۔ اس نے سوچا تھا جب وہ رحمان سومرو سے ملے گا تو وہ اسے کیا بتائے گا، کیسے بتائے گا کہ پتاجی کی موت کیسے ہوئی تھی۔ دادی تو کلپنا کلپنا کا جاپ کرتی ہوئی اور ان لوگوں کو بددعائیں دے دے کر ایک دن خاموشی سے مر گئی تھی اور پتاجی کو کانتا کا غم لے مرا تھا۔
کانتا اس سے چھوٹی تھی۔ کلپنا کی طرح ہی خوب صورت، چنچل، نٹ کھٹ، گھر کے غم زدہ ماحول میں ایک رحمت کے فرشتے کی طرح تھی۔ اس کی باتیں جیسے گیتا کے بول تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اجنتا کے غاروں میں کسی ناری کی تصویر میں جان پڑ گئی ہو اور وہ چھم سے ان کے آنگن میں اتر آئی ہو۔
اسے ہر ایک کا پیار ملا تھا۔ الہاس نگر کی غربت اور روزمرہ زندگی کی کشمکش میں پتاجی نے ماتاجی اور خود اس نے کانتا کو سب کچھ دیا تھا۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ غریب ہیں، اچھے اسکول میں پڑھایا، اچھے کپڑے

پہنائے اور اچھے کالج میں داخلہ دلایا تھا پھر اس نے تو ایک لوہے کی دیوار کی طرح اس کی حفاظت کی تھی۔ شراب پی کر مست ہو جانے والوں سے کانتا کو بچانا آسان نہیں تھا، روزانہ کی جدوجہد تھی۔ اس کی خوب صورتی سارے پریوار کے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کے لیے رشتے کی ہی تلاش تھی کہ یکایک یہ سب کچھ ہو گیا۔ وہ کالج کے کسی لڑکے کے ساتھ چلی گئی تھی، بمبئی کی فلم انڈسٹری میں کام کرنے کے لیے۔ نہ جانے کیا ہوا تھا، نہ کوئی بات، نہ کوئی چیت۔ نہ کوئی بحث نہ کوئی مباحثہ۔ ان لوگوں نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے شاید خود ہی سوچ لیا تھا کہ گھر والے ستیش کی ذات برادری میں اس کی شادی کبھی نہیں کریں گے۔ ستیش نے پیار کی قسمیں کھائی ہوں گی، بولی وڈ کے قصے سنائے ہوں گے اسے، اس کے حسن سے آشنا کیا ہوگا، اسے سمجھایا ہوگا کہ زندگی بہت سندر ہو سکتی ہے۔ بمبئی میں ہی سمندر کے کنارے خوب صورت سا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ بس کسی طرح فلمی دنیا میں پہنچنے کی دیر ہے۔ وہ تھی ہی اتنی خوب صورت، کوئی بھی اسے بہکا سکتا تھا۔

زندگی نے بہت جلد بہت سخت پرانی چال دہرائی تھی۔ اس دفعہ کراچی نہیں تھا، الہاس نگر تھا۔ پاکستان نہیں، ہندوستان تھا۔ کوئی مسلمان نہیں، ہندو تھا۔ ابھی سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ پھر باپ بیٹا کانتا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

بمبئی حیدرآباد نہیں تھا اور بمبئی میں الٰہی بخش بھی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اسے آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ وہ دونوں کام کرتے تھے اور کانتا کو تلاش کرتے تھے۔ نہ جانے پولیس والوں نے کتنے ہی روپے کھا لیے تھے، ایک دن اس نے کانتا کو دیکھا بھی تھا۔ ایک بڑی سی گاڑی میں ایک عربی کے ساتھ۔ وہ دیوانوں کی طرح دوڑا تھا۔ اس ہوٹل کے چپے چپے میں اس نے شور مچایا تھا، پھر اس نے کانتا کے کالج کے دوست ستیش کو دیکھا تھا جس نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے خوب مارا تھا۔

”حرام زادے...... جانتے نہیں ہو، ستیش کون ہیں؟ نیتاجی کے بیٹے ہیں۔ ان پر الزام لگاتے ہو۔ تمہاری بہن کو یہ اغوا کریں گے۔ ارے ان کو کمی کا ہے کی ہے۔ ساری سرکار ان کی ہے۔ سارا علاقہ ان کا ہے۔ دہلی سے بمبئی تک ان کا کام ہے۔ اونچی جگہ ان کی رسائی ہے۔“

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دہلی سے بمبئی تک ان کا کیا کام تھا۔ لڑکیوں کا اغوا۔ فلمی دنیا کا مافیا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں دلالی۔ بیٹا چھوٹا دلال، باپ وزیر تھا، بڑا دلال تھا۔

بڑی مشکلوں سے ہزاروں روپوں کا بندوبست ہوا تھا اور خوب چند نے پولیس والوں کو رشوت دے کر روپ چند کو آزاد کرایا تھا۔

پھر انہیں کانتا کی لاش ملی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ لوگ لاش لے کر بھی نہیں آسکے تھے۔ لاش اس قابل ہی نہیں تھی۔ انہیں تو کانتا کا خط ملا تھا جو اس کی کسی دوست نے اس کے کہنے کے مطابق مرنے کے بعد انہیں بھیجا تھا۔ اس نے معافی مانگی تھی۔ اسے دھوکا دیا گیا تھا۔ ستیش نے اسے اغوا کر کے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے صرف استعمال کیا تھا اور ایک دن وہ سمجھ گئی تھی کہ آگے کا راستہ بولی وڈ کی طرف نہیں بلکہ بمبئی کے چکلے کی جانب جاتا ہے اور پیچھے تو اب صرف دیوار ہی تھی۔ اس نے پتا جی سے، ماتا جی سے اور اس سے معافی مانگی تھی۔ گھر میں جیسے میت ہو گئی تھی۔ ہر کوئی جی بھر کے رویا تھا اور پتا جی خاموشی سے روتے روتے فالج کی نذر ہو گئے تھے۔

اٹھارہ دن اس کی زندگی کے سرکاری اسپتال میں ٹھوکریں کھاتے گزرے تھے۔ گھر پر پہلے ہی بہت قرض تھا، پھر پتاجی کی بیماری، اسپتال میں تو کچھ نہیں ملتا تھا۔ کاغذ کے پُرزے ملتے تھے۔ یہ دوا لاؤ، وہ دوا لاؤ، خون کی بوتل، گلوکوز کی بوتل، خون کا ٹیسٹ، ایکسرے، انہوں نے سسک سسک کر جان دے دی تھی۔ آخری وقت میں ایک ایسوسی ایشن کے کچھ لوگوں نے مدد کی تھی، مگر یہ مدد بھی یہی تھی جس سے تکلیف دہ زندگی کے ختم ہونے میں کچھ مزید دن لگ گئے تھے۔

پتاجی کے مرنے کے بعد وہ ماتاجی کے گلے لگ کر خوب رویا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی کانتا کو معاف نہیں کرے گا۔ نہ اس جنم میں اور نہ کسی اور جنم میں۔ اس نے اس کے لیے جنم جنم کی بددعا دی تھی۔ اس نے ہندوستان کے اس نظام کو بددعا دی تھی جس میں لڑکیوں کو اغوا کر کے طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اس کا پورا خاندان ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سرہانے پڑی ہوئی شیشی کو اٹھا کر چوما تھا جس میں سندھ دھرتی کی میلی نیلی مٹی سونے کی طرح چمک رہی تھی۔

پتاجی کے مرنے کے بعد اس نے جی جان سے دکان پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماتاجی کے کہنے پر پاروتی سے اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ زندگی نے جیسے کچھ دیر کے لیے سکھ کا سانس لیا تھا، پھر نہ جانے کیوں اٹھتے بیٹھتے ماں جی کلپنا کے خواب دیکھنے لگی تھیں۔ ان کی بیٹی کلپنا، اس کی بہن کلپنا زندہ تھی۔ سندھ کے شہر حیدرآباد میں نہ جانے کیسی تھی۔ کتنے اس کے بچے تھے، مسلمان ہونے کے بعد خوش تھی کہ ناخوش۔ وہ لوگ اکثر اس کی باتیں کرتے تھے۔

ایک دن پاروتی کے کسی رشتے دار نے خبر دی تھی کہ وہ لوگ پاکستان گئے تھے، حیدرآباد میں کلپنا سے ملے تھے۔ اسے الہاس نگر والوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پاروتی والے نواب شاہ کے رہنے والے تھے۔ نواب شاہ جانے کی جلدی میں کلپنا سے زیادہ خبر نہ لے سکے تھے۔ اس نے اپنی روتی ہوئی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان جائے گا، ایک بار پھر کلپنا کو تلاش کرے گا، اس کی خبر لے گا۔ اس نے دل میں سوچا تھا کہ ماں جی کے مرنے سے پہلے شاید انہیں وہ کوئی اچھی خبر دے سکے۔ کاش وہ ایسا کر سکتا۔

دہلی جا کر پاکستانی سفارت خانے سے ویزا لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رشوت اور فارم کی فیس ملا کر پورے پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے تو کراچی حیدرآباد کا ویزا ملا تھا۔ شکارپور کا ویزا منع ہو گیا تھا۔ دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے باہر مسلمان، ہندوؤں کا ہجوم تھا۔ بکھرے ہوئے لوگ، بچھڑے ہوئے لوگ، ٹوٹے ہوئے لوگ اور ہر کوئی رشوت دے رہا تھا، اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے۔ ایک سزا تھی جو پوری کرنی تھی۔

رمیش چاچا نے اسے بتایا تھا کہ بندر روڈ پر سندھ زمیندار، سندھ جاگیردار ہوٹل ہے اور میکلوڈ روڈ پر بمبئی ہوٹل ہے جہاں ٹھہرا جا سکتا ہے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کے سامنے مندر ہے اور مسافر خانہ۔ کلفٹن اور گارڈن پر بھی مندر ہے جہاں کچھ جاننے والوں کے فون نمبر انہوں نے دیے تھے مگر روپ چند کا خیال تھا کہ وہ عبدالرحمان سومرو کا پتا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے ابھی تک بچپن کا وہ سومرو یاد تھا۔ املی کا وہ درخت جس کی ٹھنڈی چھایا کے نیچے وہ لوگ کھیلتے تھے، لڑتے تھے، جھگڑتے تھے اور پھر کھیلنے لگتے تھے۔

شاید اس کی قسمت اچھی تھی۔ اتنے بڑے شہر کراچی میں جہاں امریتا رام پریتم داس روڈ کھو گیا تھا۔ جہاں پرانی ہوادار اونچی چھت والی پتھروں کی بلڈنگوں کی جگہ پر بمبئی کی طرح سیمنٹ کے جنگل گھر بن گئے تھے، وہاں اسے سندھ مدرسے میں جا کر ماسٹر الٰہی بخش کے گھر کا پتا مل گیا تھا۔ وہ ایمپریس مارکیٹ کے سامنے ایک عجیب سی بلڈنگ کی چھٹی منزل کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ روپ چند کو ایمپریس مارکیٹ یاد تھی۔ بچپن کی ایمپریس مارکیٹ کراچی کی خوب صورت ترین جگہ تھی۔ وہ پتاجی کے ساتھ کئی دفعہ یہاں ٹرام پر بیٹھ کر آیا تھا۔ کیماڑی سے آنے والی ٹرام بندر روڈ سے ہوتی ہوئی گارڈن روڈ سے مڑ کر ایمپریس مارکیٹ آتی تھی۔ ایمپریس مارکیٹ پر ٹرام بدل کر کینٹ اسٹیشن جایا جا سکتا تھا۔ ایمپریس مارکیٹ سے ہی ٹرام کے ذریعے سولجر بازار، گاندھی گارڈن جا سکتے تھے۔ وہ نریندر ناتھ جگن داس ودیلا۔ این جے وی اسکول کا پڑھا ہوا تھا اور ٹراموں میں بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ ایمپریس مارکیٹ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے جہاں پارسیوں کا آتش کدہ نظر آتا تھا، وہاں دور کینٹ اسٹیشن بھی نظر آتا تھا۔ صاف ستھری سڑکیں، گھنٹی بجاتی ہوئی ٹرامیں، گھوڑا گاڑی پر آنے والے گورے گورے یورپین اور کراچی کے پارسی، ہندو، یہودی اور کرسچنوں کا ایمپریس مارکیٹ میں ہجوم، وہ پرانا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ دور کہیں ٹرام کی آواز، نہ کوئی دھواں نہ کوئی ہاکروں کی غیر قانونی تجاوزات، نہ لوگوں کا ہجوم اور نہ ہی کوئی جھگڑا۔ پرانا منظر نئے منظر میں مل کر بے اختیار سا ہو گیا تھا۔ روپ چند نے سوچا تھا جیسے اس

کے خاندان کے ساتھ کراچی بھی اجڑ گیا ہے۔

عبدالرحمان سومرو ویسا ہی تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ اس کے بتانے پر وہ دونوں گلے ملے تھے۔ بڑی محبت سے اسے گھر میں بٹھایا گیا تھا۔ کچھ پرانی باتیں ہوئی تھیں، کراچی میں گزرے ہوئے بچپن کے دن، نہ سومرو نے اس سے اس کے پتا جی کا پوچھا تھا اور نہ اس نے ماسٹر الٰہی بخش کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔

حیدرآباد میں کلپنا کو تلاش کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ سومرو اور روپ چند کراچی سے حیدرآباد بس پر گئے تھے۔ بس صدر کے علاقے سے نکلی تھی۔ شہر کے درمیان سے ہوتی ہوئی حیدرآباد پہنچی تھی۔ دونوں شہر تقریباً ایک جیسے تھے۔ اسے تو ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ ہندوستان میں گھوم رہا ہو۔ وہی فقیر، وہی گانے، یہاں خدا کے نام پر مانگ رہے تھے۔ وہی ٹوٹی ہوئی سڑکیں، دھوئیں سے بھرا ہوا ماحول، پانی کا رونا، بجلی کی کمی، دھتکارے ہوئے غریب، ذلتوں کے مارے لوگ۔ کچھ بھی فرق نہیں تھا اور اگر تھا تو کوئی خاص نہیں تھا۔

وہ کلپنا کے بڑے سے گھر میں اس سے ملا تھا۔ اس کا نام اب کلثوم تھا۔ اس کے جوان جوان بچے تھے۔ اس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے جیسے اس کی ماں کا چہرہ آ گیا تھا۔ اس کا بڑا دل چاہا تھا کہ اس کے پیروں کو چھوئے، اس کے ہاتھوں کو چومے، اس کے سینے سے لگ کر رو دے۔ ”دیدی! میں ہوں روپ چند...... تیرا بھائی۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ بڑے دن گزر گئے تھے، بہت فاصلہ تھا، مہینوں اور برسوں کا۔ بیتے ہوئے سپنوں کا، کھوئے ہوئے رشتوں کا اور اب تو مذہب کا فاصلہ بھی تھا جو انہیں کھینچ کر دو الگ الگ کناروں پر لے گیا تھا۔

اس نے اسے بتایا تھا کہ ”دادی مر گئی ہے، پتا جی مر گئے ہیں، کانتا بھی مر گئی ہے۔“ رک رک کر ساری کہانی سنائی تھی۔ آنسوؤں کی لڑی تھی جو بہہ رہی تھی، کلپنا روتی رہی، سنتی رہی۔

پھر کلپنا نے بتایا تھا کہ موسیٰ جوکھو کی اب دو اور بیویاں ہیں۔ ایک اسلام آباد میں ہے جبکہ دوسری کراچی کے کلفٹن میں۔ اسے خرچ مل جاتا ہے اور اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ اغوا ہونے کے بعد موسیٰ نے شادی زبردستی کی تھی مگر شروع کے آٹھ سال تک شوہر اچھا تھا، پھر آہستہ آہستہ بدل گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ سیاست شروع کی تھی۔ وہ حیدرآباد میں رہتی تھی اور وہ کبھی کراچی میں اور کبھی زمینوں پر۔ اس کی دو بیویاں مر چکی تھیں اور دو بیویاں اور موجود تھیں۔ میں نے ایک دفعہ بچوں کے نام پر شور کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ یاد رکھنا دو بیویاں مر چکی ہیں، تیسری بھی مر جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ مجھے پتا لگ گیا تھا کہ میری اوقات کیا ہے۔ کلپنا سے کلثوم تک ایک کہانی ہے، ایک قصہ ہے۔

پھر وہ لوگ جدا ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے مسلمان بھانجوں کو پیار کیا۔ کلپنا کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ کلپنا نے کہا تھا۔ ”ماں جی کو بتانا میں خوش ہوں۔ بچے بھلے مسلمان ہیں، میں وہی ہوں، کلپنا۔ بھگوان سے پرارتھنا کرنا میرے لیے۔“ اس نے جھک کر کلپنا کے قدم آخری دفعہ چھو لیے۔

روپ چند کا دل پھر زور سے دھڑکا۔ کیا ہو گیا ہے، کس جنم کے گناہوں کی سزا ہے۔ سرحد کے اس طرف بھی اس پار بھی، ہندوستان میں بے روزگاری، پاکستان میں غربت۔ وہاں کے محلوں میں بیٹھے ہوئے لوگ یہاں کے محلوں میں سمٹے ہوئے لوگوں سے بابر، غوری، پرتھوی اور اورنگ زیب کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ہم لوگ زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ زندہ رہنے کی جنگ ایسی شدید ہوگی، کس نے سوچا تھا۔

سومرو کے ساتھ بوجھل قدم لیے ہوئے روپ چند کراچی لوٹا تھا۔ صدر کے اس فلیٹ میں گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بڑے میاں نظر آئے تھے، عبدالرحمٰن سومرو کے بابا جی۔ وہ چیخ رہے تھے، مر گئے، مر گئے، سب مر گئے۔ رحمان بھی مر گیا، ہائے ہائے۔

رحمان کو دیکھتے ہی جیسے ان کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ اٹھے اور آہستہ آہستہ رحمان کو گلے لگایا اور خاموشی سے اندر چلے گئے، نہ اس کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔

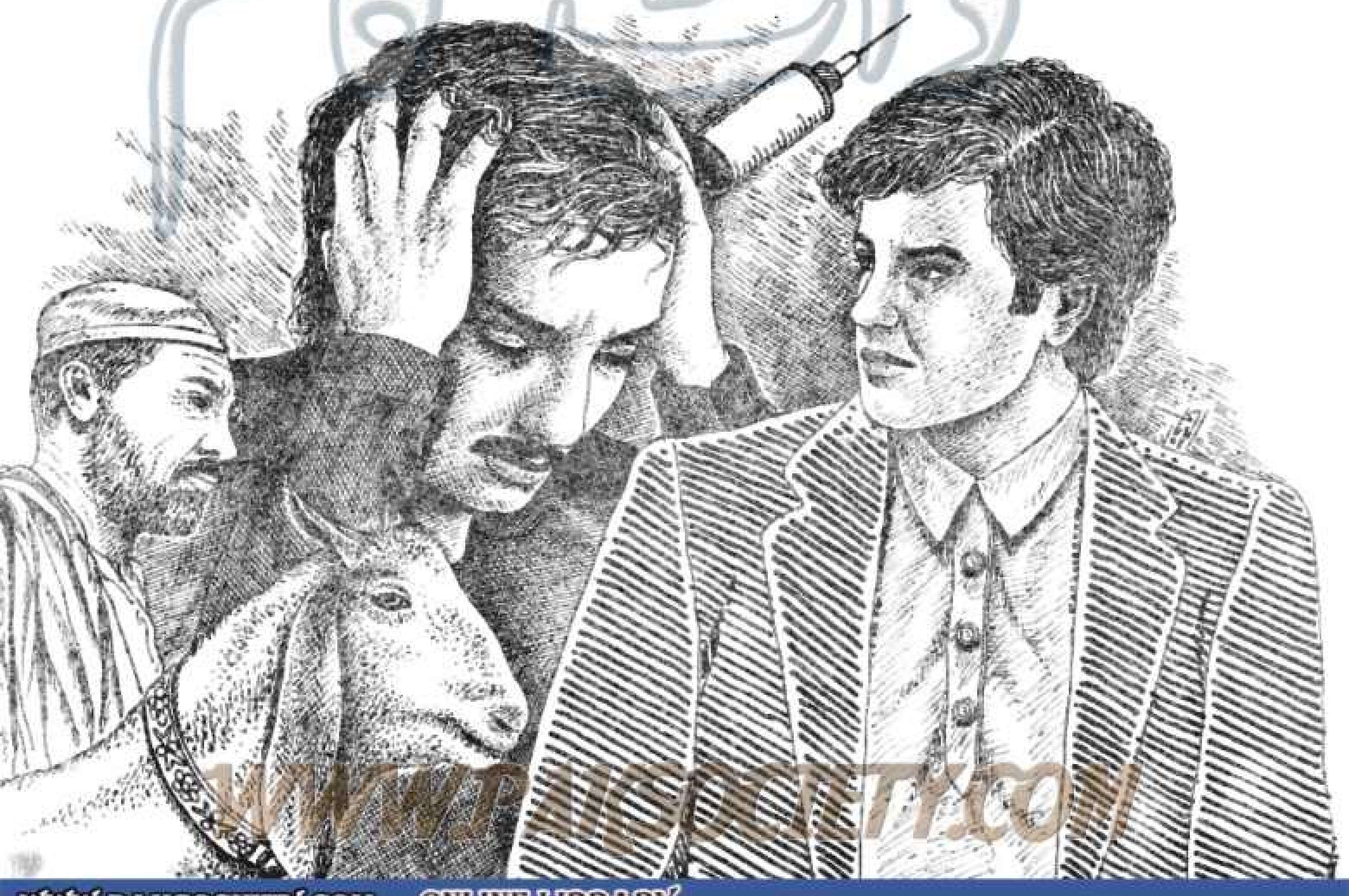
”یہ بابا جی تھے، روپ چند۔ اب تو یہی حال ہو گیا ہے۔ ایک دن بھی اگر میں گھر سے غائب ہو جاتا ہوں تو یہ اسی طرح چیختے چلاتے رہتے ہیں۔ کراچی کے حالات نے بابا جی کی یہ حالت کر دی ہے۔ خوف زدہ سے رہتے ہیں۔ کیونکہ ایک حادثے میں چھوٹا بھائی اور چچا شہید ہو گئے تھے۔ تب سے میں گھر میں نظر نہ آؤں تو یہ چیخنے لگتے لیکن تیرے ساتھ تو مجھے جانا تھا۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے...... ٹوٹے ہوئے لوگ روز جیتے اور روز مرتے رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر سومرو خاموش ہو گیا۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ نہ ہو۔ گویا جگہوں کے بدلنے سے حالات نہیں بدلتے بلکہ دلوں اور کرداروں کے بدلنے سے معاملات میں سدھار آتا ہے۔

معمولی جواز پر کسی کے یقین اور بھرم کے آسمان کو زمیں بوس کرنے والے ایک دغاباز کی داستان

جواز

نعمان اسحاق

پھوٹنے والی ہر نئی کونپل موسم کے بدل جانے کی امید دلاتی ہے... بالکل اسی طرح انسان کے اندر بھی یہ کونپل امید کی شکل میں جنم لیتی ہے کہ شاید آنے والے کل میں موسم کی طرح اس کی زندگی کا منظرنامہ بھی بدل جائے بہرحال ... جب آزمائشوں اور مشقتوں کا سلسلہ طویل ہوجائے اور صبح کا سورج دیکھنے کی امید میں آنکھیں مسلسل رت جگا کرتی رہیں مگر دکھوں کی رات کا کوئی کنارا ہاتھ نہ آئے تو ایسے میں ارادوں میں لرزش اور قدموں میں لغزش آہی جاتی ہے۔ وہ جو یک جان دو قالب تھے لیکن... ایک آسمان اور دوسرا زمین ... بلکہ زمین کا ایک حقیر سا کیڑا... جسے شاید انسان کہلانے کا بھی حق نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کے درمیان دل کا ایک تعلق قائم تھا اور یہی سنگم ہر ایک کے لیے حیران کن تھا... اور ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ... محبتوں کی قدر اور آزمائش... دکھوں کے لمحات میں ہی ہوتی ہے اور جو لوگ اس آزمائش پر پورا نہیں اترتے انہیں دل سے بھی اتار دینا چاہیے کہ یہی عقلمندی اور وقت کا تقاضا بھی ہوتا ہے لیکن ... بے چینی اور... بےکلی کو شاید محبت جیسے جذبے کی اساس بنا کر بھیجا گیا ہے جو انسان کو کسی پل پُرسکون نہیں رہنے دیتیں...





حبس کا موسم تھا۔ ہوا یوں رکی ہوئی تھی گویا سانس لینے کی اجازت نہ ہو۔ وہ ایک سات سالہ لڑکا تھا۔ درمیان سے مانگ نکالے سوت کا سفید کڑھائی والا کرتہ پہنے' پاؤں میں سیاہ سینڈل میجک اسٹرپ والی ڈالے، پھولی سانسوں کے ساتھ چلنے کے انداز میں بھاگتا جا رہا تھا۔ ناہموار اونچی نیچی پگڈنڈی کے اختتام پر ایک کھلیان تھا۔ کھلیان زیادہ ہرا بھرا نہ تھا۔ دور سے کھلیان میں چرتی بکریاں اپنی قامت سے کہیں چھوٹی محسوس ہوتی تھیں۔ اپنی بساط سے بڑے قدم اٹھاتا وہ پگڈنڈی پار کرتا ہوا کھلیان پہنچا۔

دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سوت کا سفید کرتہ پسینے کی وجہ سے کچھ ایسا چپکا ہوا تھا کہ بنیان کی ساخت سو فیصد واضح ہو رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور کنپٹی سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ بچپن کی چمک چہرے پر لیے ارسل کو کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ سوائے دل میں موجود اس ہمک کے جو کچھ فاصلے پر درخت کے سائے میں بیٹھے اپنے ہم عمر لڑکے کی قربت کے لیے تھی۔

شیشم کا یہ درخت اس قدر گھنا ہرگز نہ تھا کہ اپنے سائے تلے ستانے والے کو پُرسکون سایہ فراہم کرتا۔ چرواہا سکون سے بیٹھا تھا۔ سانس لینے میں گرچہ دقت ہوتی تھی، پر گندم کی کٹائی کے موسم کے بعد کسی دمے کے مریض کو سانس لینے میں دقت نہیں ہوتی۔ اس لیے اونچی نیچی سانسوں کو خاطر میں لائے بغیر چرواہا بکریوں پر نظریں جمائے بیٹھا نگرانی کر رہا تھا۔ بکریاں بھی حبس سے کچھ نڈھال محسوس ہو رہی تھیں۔

چرواہے کے بغل میں شیشم کے سائے میں بے فکری سے گنا چوستا بخت بیٹھا تھا۔ کپڑے اس قدر میلے تھے کہ رنگت کھو بیٹھے تھے۔ ہاتھ قدرے صاف تھے پر پاؤں پر میل کی تہ جمی ہوئی تھی۔

سیاہ بکری لاڈو چرتے چرتے دور جا چکی تھی۔ چرواہا اسے باقی ریوڑ کے پاس لانے کے لیے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ...... ارسل آتا دکھائی دیا۔ چرواہے کے چہرے پر تشویش کے سائے پھیلنے لگے۔

"چھوٹے صاحب! اتنی گرمی میں۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟ کولر کی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھتے۔ یہاں تو حبس ہے۔" چرواہے کی پریشانی بے جا نہ تھی۔ ارسل نازوں میں پلا بڑھا تھا۔ ارسل نے کوئی توجہ نہ دی۔ دلچسپی سے دوسری طرف بیٹھے بخت کو دیکھنے لگا جو اب بھی گنا چوس رہا تھا۔ ارسل کے آنے سے بس یہ فرق پڑا تھا کہ نظریں...... چرتی بکریوں اور بھیڑوں کے بجائے ارسل پر جم گئی تھیں۔

چرواہے کو فکر ہونے لگی۔ "آؤ صاحب... میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔" چرواہا ہرگز نہ چاہتا تھا کہ صاحب دھوپ میں جلے۔ وہ چرواہے کو خاطر میں نہ لایا۔ گو پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس کے قدم تیز اٹھتے تھے پر اب وہ قدم قدم چل رہا تھا۔ کچھ ہچکچاہٹ قدموں کو جکڑ رہی تھی۔ چلتے چلتے ارسل بخت کے عین سامنے آرکا۔ گنا چوستا بخت آنکھیں بھر کر ارسل کو دیکھنے لگا۔

"مجھے گنا کھلاؤ گے؟"

بخت کا جگالی کرتا منہ لمحے بھر کو رکا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری اور اس نے ہاتھ بڑھا کر گنا ارسل کے آگے کر دیا۔ وہ گنا جس کا ایک حصہ چوسا جا رہا تھا۔

شیشم کے ادھورے سائے میں کھڑے ارسل نے گنا تھام لیا اور اس جگہ جہاں بخت کے دانتوں کے نشان تھے اپنے دانت گاڑ دیے۔

وہ دو قدم کا فاصلہ ایک جست میں طے کر کے بخت کے پہلو میں آن بیٹھا۔ گنا چوستے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تمہیں کون سی بکری سب سے اچھی لگتی ہے؟"

"مجھے...... وہ کالی بکری...... لاڈو۔" بتاتے ہوئے بخت ہنس دیا۔ معصوم بچے طبقاتی فرق سے ناآشنا تھے اور کس قدر خوش نصیب تھے۔

چرواہا ہکا بکا مالک کے بیٹے کو اپنے بیٹے سے گھلتا ملتا دیکھتا رہ گیا۔ حبس تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دمے کا مرض اس کی سانس مزید ناہموار کرتا تھا۔

☆☆☆

مرکزی دروازے کے عین سامنے بڑا سا آنگن تھا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ آم کا گھنا پیڑ تھا جس کی شاخیں آموں سے لدی تھیں۔ رکے ہوئے ماحول میں ہوا کا ایک جھونکا سرکا۔ آم کی شاخیں لہرائیں اور آم شاخ سے جدا ہو کر گر پڑا۔ یہ ٹپکا آم تھا اور اگر ارسل سامنے موجود ہوتا تو دوڑ کر جاتا اور آم اٹھا کر چوسنے لگتا۔ دھونے کا تکلف بھی نہ کرتا۔ انتظار سامنے ہوتے تو کبھی اسے بہلاتے پچکارتے آم کھانے سے روکتے۔

"بیٹا! ہم روہی کی پیداوار ہیں۔ گرمی ہمارے اندر بسی ہے۔ ٹپکا مت کھایا کر۔ بہت گرم ہوتا ہے۔" گو کہ ارسل کو ساری بات سمجھ نہ آتی پر مفہوم تو سمجھ آ ہی جاتا کہ اسے آم کھانے سے منع کیا جا رہا ہے مگر وہ کبھی باز نہ آتا۔ آم کے

درخت سے چند قدم آگے' مغربی رخ پر نیم کا گھنا پیڑ تھا۔ نیم کا یہ پیڑ اس قدر گھنا اور سایہ دار تھا کہ اس کے سائے پر شکر بجالانے کو جی چاہتا' ایسا ٹھنڈک بھرا سایہ ہر درخت فراہم نہیں کرتا۔

اس نیم کے ٹہنے کے عین سامنے پندرہ گز کے فاصلے پر سفید چونا کیا گیا اونچی چھت والا کمرا تھا۔ کمرے کے سبز دروازے سے اونچی چارپائی پر آن بان سے بیٹھے انتظار نظر آتے تھے۔

ملک انتظار حسین...... سفید لٹھا ان کی پہچان تھا۔ نوروزی کھیڑی ان کی آن بڑھاتی۔ مونچھیں گھنی اور بل دار تھے۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔

''سنو باسط......'' انتظار دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی مونچھوں پر پھیرتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

''باسط نہیں عبدالباسط......'' جمعے کے خطبے میں عبد کی اہمیت کے بارے میں سننے کے بعد عبدالباسط ہر کسی کی تصحیح کرتے تھے مگر مالک کی تصحیح نہ کرپائے، بس دل میں سوچ کر رہ گئے۔

''جی صاحب!'' عبدالباسط نے ادب سے جواب دیا۔ وہ نوروزی کھیڑی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

انتظار عقبی لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے پار دیکھتے رہے۔ سیاہ پشم کے فرسا گھوڑا شتر کے شیڈ میں بیٹھا تھا اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر ارسل اور بخت کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے بچپن کے سہانے لمحے گزار رہے تھے۔

''ستارہ ہے میرا ارسل اور یہ اس کی شانِ بے نیازی ہے کہ اپنی اہمیت جانتا ہے پر کسی کو حقیر نہیں مانتا۔'' دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو مونچھوں کی چبھن اچھی لگتی تھی۔

''بے شک صاحب!'' عبدالباسط نے ادب سے تائید کی۔

''میرے بیٹے نے دوست بنالیا ہے تمہارے بیٹے کو۔ کیا نام ہے تمہارے بیٹے کا؟''

''بلند بخت......''

''بخت!'' انتظار نے منہ ہی منہ میں نام دہرایا۔ نظریں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے پار ان لڑکوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''سمجھو تمہارے بخت نے واقعی تمہارا بخت بلند کر دیا ہے۔ بخت میاں بھی آج سے ہمارے ملازم ہوئے۔ سمجھا دینا اپنے بیٹے کو کہ وہ میرے ارسل کا اچھے سے دل بہلایا کرے۔ میں منشی سے کہہ کر بخت کی تنخواہ مقرر کیے دیتا ہوں۔''

''شکریہ صاحب۔'' عبدالباسط نے ہاتھ بڑھا کر انتظار کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ پیر جو چاند کی روشنی سے دھلے محسوس ہوتے تھے۔

''اوہ باسط! یوں مت کرو۔ مجھے پسند نہیں۔'' انتظار نے پاؤں پیچھے کیے اور پھر اونچے پایوں والی چارپائی پر ہی پسار لیے۔

''تمہارا سانس غیر متوازن لگ رہا ہے۔ کیا آج کل دمے کا اٹیک ہوا ہے؟''

بہت سی باتوں کے درمیان یہ بات بھی گفتگو کا حصہ بن گئی۔

''جی!'' مدھم سی آواز ہوا میں تحلیل ہوئی۔

''تو پھر مرکزِ صحت جا رہے ہو علاج کے لیے؟''

''جی!''

''اچھا ہے۔ سنا ہے مرکزِ صحت میں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔ لوگ بڑی تعریفیں کرتے ہیں اس کے اخلاق کی۔''

انتظار اٹھے اور کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ لوہے کی سلاخوں میں سے ایک سلاخ تھام کر اپنے ارسل کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ محبت جو دل کو گرماتی تھی۔

دور شتر کے سائے میں بیٹھے بچے اپنی ہی دنیا آباد کیے بیٹھے تھے۔

اک غبارِ خاک ہیں
کل کو بکھر ہی جائیں گے
مختصر سی زندگی ہے
کچھ تو اس میں رنگ بھر لیں
آؤ دوستی کر لیں......

''ابو کہتے ہیں جب میں بڑا ہو جاؤں گا اور یہ گھوڑا بوڑھا ہو جائے گا تو وہ مجھے اس گھوڑے سے زیادہ اچھا گھوڑا لے دیں گے۔ اس پر بیٹھ کر میں سارے گاؤں کی سیر کروں گا۔'' ارسل کہہ رہا تھا۔ انتظار کا سچ مچ ایسا ہی ارادہ تھا۔

''پھر مجھے بھی سیر کرانا۔'' بخت کے چہرے کا بانکپن مچلتا۔

''ضرور کراؤں گا۔'' ارسل اپنے دیرینہ دوست کی فرمائش کیسے ٹال سکتا تھا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کل گلی ڈنڈا لاؤ گے۔ لائے کیوں نہیں؟''

''بھول گیا۔ کل لاؤں گا۔ وعدہ...... پکا وعدہ۔'' بخت تجدیدِ عہد کر رہا تھا۔

☆☆☆

بہاول پور کو حاصل پور سے ملاتی ہائی وے پر ایک ذیلی سڑک مشرق کی طرف جاتی تھی۔ یہ پکی سڑک جلد ہی کچے میں تبدیل ہو جاتی۔ کچے پر چند کوس کے فاصلے پر ایک نہر تھی۔ سبک رواں یہ نہر کبھی نہ سوکھتی۔ نوجوان لوگوں نے اپنے بزرگوں سے اور بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے اس نہر کی بے انتہا خاصیتیں سنی تھیں۔ جس کا نام نہر بہشت تھا اور یہ نام کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ نہر کا پانی ایسا شفاف تھا کہ شیشے کا گمان ہوتا اور کچھ ایسا میٹھا تھا کہ شہد ملے دودھ کا ذائقہ دیتا۔ نہر بہشت سے متصل گاؤں کا نام بھی نہر کی نسبت سے تھا۔ مثلِ بہشت۔ روہی کی گرم سرزمین پر وہ جیسے جنت کا ٹکڑا تھا۔ ہر نعمت سے مالا مال۔ گھنے پیڑ' سونا اگلتی زمینیں' پھل دار درخت' پھول دار پودے۔ بے حساب دودھ دیتے چوپائے۔ کون سی نعمت تھی جس سے مثلِ بہشت محروم تھا۔

اور ارسل اسی مثلِ بہشت کا رہنے والا تھا۔

نہر بہشت کے دائیں کنارے جہاں دیسی اور انگریزی کیکر اور سکھ چین کے درخت یکے بعد دیگرے زمین پر پورے قامت سے کھڑے تھے۔ یوں تو ہوا گرم تھی مگر نہر کے پانی کی ٹھنڈک ہوا میں تازگی بھرتی۔ انگریزی کیکر کے سائے میں ارسل بیٹھا تھا، بلند بخت کے ساتھ۔

بخت نے جیب سے گلی نکالی تو ارسل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''دیکھو گلی کیسی نوکیلی ہے۔ ڈنڈا مارو تو ہوا میں ایسے اڑتی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔'' بخت اپنی عمر کے حساب سے گاؤں کے بڑھئی سے بنائی گلی ڈنڈا کی جملہ خصوصیات بیان کر رہا تھا۔

''کھیلیں؟'' ارسل کھیلنا چاہتا تھا۔

''نہ......'' بخت نے نفی میں سر ہلایا۔ ''گلی نہر میں چلی جائے گی پھر کیسے نکالیں گے۔'' بخت یہاں کھیلنے کے نقصان سے آگاہ کرنے لگا۔

''ہم ادھر جا کر کھیلتے ہیں۔'' ارسل نے سامنے اشارہ کیا جہاں بے آباد و بنجر زمین کا ٹکڑا تھا مگر بکریاں پھر بھی کچھ نہ کچھ چر رہی تھیں۔ بخت سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی انہوں نے انگریزی کیکر کا سایہ عبور بھی نہ کیا تھا کہ سکھ چین کے سائے میں بیٹھا چرواہا جس کی سانس میں پہلے جیسی سیٹیوں کی آواز نہ تھی، نے انہیں ٹوک دیا۔

''کدھر جاتے ہو؟''

''ادھر ہم نے گلی ڈنڈا کھیلنا ہے۔''

عبدالباسط لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور بچوں کے سامنے دیوار کی طرح ایستادہ ہو گیا۔

''نہ چھوٹے صاحب! یوں دھوپ میں کھیلنا آپ کی شان نہیں۔ بخار ہو جائے گا۔'' بخت نے باپ کو دیکھا۔ وہ ناسمجھ تھا۔ آٹھ سال کا بچہ ناسمجھ ضرور ہوتا ہے مگر سمجھ حاصل کر رہا ہوتا ہے۔

بخت سمجھتا تھا کہ اس کا باپ ارسل کی اتنی عزت کیوں کرتا ہے؟

''مگر میں نے کھیلنا ہے۔'' ارسل کے لہجے میں فرمائش رچی تھی۔

''نہ صاحب۔'' چرواہے نے ہاتھ جوڑے۔ گویا منت کر کے باز رکھنا چاہتا ہو۔

انتظار تو ارسل کو بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بخت اور ارسل کئی دنوں سے حویلی میں کھیل رہے تھے مگر ارسل گھر سے باہر جا کر کھیلنا چاہتا تھا۔ اسی لیے روز ایک ہی فرمائش کرتا۔

''چاچو عبدالباسط کے ساتھ جانا ہے۔'' انتظار روزانہ منع کر دیتے مگر آج جب ارسل کی فرمائش میں ضد شامل ہونے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تو انتظار انکار نہ کر پائے۔

''دیکھو باسط! نہر کے کنارے چلے جاؤ آج۔ تم پہنچو۔ بچوں کو جیپ چھوڑ آتی ہے۔ ارسل کو دھوپ میں مت نکلنے دینا۔ درختوں کی چھاؤں میں بٹھانا۔ میرا ارسل دھوپ میں جائے تو بیمار ہو جاتا ہے۔'' انتظار نے تحکمانہ انداز میں ہدایت کی تھی۔

عبدالباسط نے کہا۔ ''جو مالک کا حکم۔''

''شام کو گھر پر کھیلیے گا چھوٹے صاحب، جب چھاؤں ہوگی۔'' چرواہا باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سے قبل ارسل کوئی جرح کرتا، دور اونچی نیچی پگڈنڈی پر جیپ آتی نظر آئی۔ جیپ بچوں کو نہر کنارے چھوڑنے کے بعد واپس چلی گئی تھی کیونکہ انتظار کو کسی کام کے سلسلے میں جانا تھا۔ اب پگڈنڈی پر جیپ قریب آتی گئی تو واضح ہوا کہ ڈرائیور کے ساتھ انتظار خود بھی بیٹھے ہیں۔

اونچے لمبے قد کے مالک۔ گھنی مونچھیں، چوڑے شانے۔ کیا شان تھی ان کی۔ ایک رعب تھا ان کی شخصیت میں۔

''آؤ ارسل، میرے شہزادے!'' انتظار جیپ سے اترے۔ لاڈلے کے کپڑے پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ انتظار کو اچھا نہ لگا مگر لاڈلا سمجھتا نہ تھا۔ اسی لیے تو غریبوں میں دوست بناتا۔

ارسل نہیں جانا چاہتا تھا مگر باپ کو انکار بھی نہیں کر سکتا

تھا۔ اتنا تو جانتا تھا کہ اب وہ اسے لیے بغیر نہیں جائیں گے۔

''بخت بھی چلے ہمارے ساتھ؟'' ارسل نے باپ کی طرف دیکھا۔

''نہیں، بخت اپنے گھر جائے گا۔ اس کی امی انتظار کر رہی ہیں۔'' انتظار پیروں کے بل بیٹے کے سامنے بیٹھ گئے اور اس کا گال سہلانے لگے۔

خلافِ معمول ارسل نے مزید سوال و جواب نہ کیے اور جیپ میں آن بیٹھا۔ جیپ روانہ ہوئی تو ارسل جو باپ کی گود میں بیٹھا تھا' اس نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ باپ کی نظریں باہر جمی تھیں۔

''ابو!'' ارسل نے انتظار کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''جی میری جان!'' انتظار نے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا۔

''میری امی کیوں نہیں ہیں؟'' ارسل کے چہرے پر معصومیت تھی۔ یہ سوال ارسل پہلی بار نہیں پوچھ رہا تھا مگر آج بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے پہلی بار ہی پوچھ رہا ہے۔ بخت انگریزی کیکر کے سائے میں کھڑا دور جاتی جیپ کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''یسو، پنجو، ہار، کبوتر، ڈولی۔ یسو، پنجو، ہار...... ہاہاہاہا...... میں جیت گیا۔ لو اب ہاتھ جوڑو اور مار کھاؤ......'' بخت قلقل قلقل ہنسنے لگا۔ آنکھوں میں بے چارگی لیے ارسل نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''یہ یہ ٹھاہ......'' اور تھپڑ ارسل کے ہاتھ پر پڑا۔

''آہ!'' ارسل نے سسک کر آہ بھری۔

''میں نہیں کھیلتا تمہارے ساتھ، تم زور سے مارتے ہو۔'' ارسل بائیں ہاتھ کی پشت سہلانے لگا جو سرخ ہو گئی تھی اور بخت کی ہنسی نہ تھمتی تھی۔

''بس ختم یہ نہیں کھیلتے۔''

''نہ نہ مار کھاؤ۔ بے ایمان۔'' بخت شور مچانے لگا۔ ارسل خاطر میں لائے بغیر جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا اور جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں آم تھا۔

''میرا آم؟'' بخت آنکھیں گھما گھما کر پوچھ رہا تھا۔

''یہ تمہارے لیے ہے۔'' ارسل نے ہاتھ بڑھایا تو بخت نے آم پکڑ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ آم چوس رہا تھا۔ پہلے دائیں طرف دانت گاڑے پھر بائیں طرف۔ آم کا گودا تھوڑا کپڑوں پر جا گرا۔

''بخت! تمہیں جلدی کیوں ہے۔ دیکھو کپڑے بھی گندے کر لیے۔ اس لیے تمہارے کپڑے گندے ہوتے ہیں۔'' جواباً بخت نے اپنے پیلے دانت نکال کر دکھا دیے جن سے آم کے ریشے چپکے تھے۔

''میرے پاس بھی تمہارے لیے کچھ ہے۔'' بخت نے آم کے گودے سے لتھڑا ہاتھ جیب میں ڈال کر باہر نکالا تو اس میں گڑ کی ڈلی تھی۔ ''لو......'' بخت نے ارسل کو پکڑائی۔ ارسل گڑ کی وہ ننھی منی سی آلودہ ڈلی منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔

''پرسوں اسکول کھل جائے گا۔ مجھے اسکول جانا پسند نہیں۔'' ڈلی چوستے ہوئے ارسل ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگا۔

''اسکول میں بہت سارے بچے ہوتے ہیں۔ استاد انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں اور چھٹی کے وقت وہ مختلف کھیل کھیلتے ہیں...... ایسے نا؟'' آم ختم ہو چکا تھا۔ بخت اب پیچھے ہاتھ گالوں پہ ٹکائے آنکھوں میں اشتیاق لیے پوچھ رہا تھا۔

''تم اسکول کیوں نہیں جاتے؟'' ارسل کی ڈلی ختم نہ ہوئی تھی۔ وہ چوس رہا تھا۔

''ابو کہتے ہیں غریب اسکول نہیں جاتے۔ وہ صرف کام کرتے ہیں۔'' بخت کا چہرہ اداس دکھائی دینے لگا۔

''تم اسکول جانا چاہتے ہو؟'' جواباً بخت نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں ابو سے بات کروں گا۔ وہ تمہیں اسکول میں داخل کرائیں گے۔'' ارسل کہہ رہا تھا۔

''سچ؟'' آنکھوں میں گویا ستارے آن بسے تھے۔

''ہاں دوست۔'' ارسل لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ گڑ کی ڈلی حل ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ جوشِ مسرت سے بخت آگے بڑھا اور ارسل کے گلے لگ گیا۔ سوت کا نفیس کُرتہ لمحوں میں کئی جگہوں سے آم کے شیرے سے داغدار ہو گیا۔ پھر وہ اٹھا، بھاگ کر گیا اور نیم کے تنے کے پیچھے چھپی پتنگ کو اٹھا لایا۔ یہ پتنگ اسے یہاں آتے ہوئے راستے میں پڑی ملی تھی۔ ارادہ تھا کہ شام کو اکیلا اڑائے گا۔ ارسل کو نہیں بتائے گا مگر اب ارسل نے کچھ ایسی خبر سنائی تھی کہ دل خوش ہو گیا اور پتنگ اکیلے اڑانے کا خیال دل میں جما نہ رہا۔ پتنگ دیکھ کر ارسل کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور چند لمحوں بعد دونوں لڑکے کھلے میدان میں آگے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

رات نے پَر پھیلا لیے تھے۔ عشا کی اذانیں ہوئے گھنٹا بھر ہوا چاہتا تھا۔ مرکزی دروازے بند ہو چکے تھے۔ وسیع

آنگن میں رہائشی کمروں سے ذرا دور اونچے پایوں والی چارپائی کے ساتھ ایک چھوٹی چارپائی پڑی تھی۔ لائٹ کی روشنی کسی حد تک ان چارپائیوں تک بھی پہنچتی تھی۔ اونچی چارپائی پر انتظار بیٹھے تھے۔ گردن کے پیچھے دو تکیے رکھے وہ ساتھ والی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے دلارے کو دیکھے جاتے۔

''ارسل وہ تمہارا نوکر ہے۔ نوکروں کے ساتھ اتنا گھلا ملا نہیں جاتا۔'' انتظار نے ارسل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جواباً ارسل نے منہ پھلالیا۔

انتظار نیم دراز سے اٹھ بیٹھے اور ہاتھ بڑھا کر دلارے کو گود میں لے لیا۔

''بیٹا! اتنا مت گھلو بخت سے۔''

''ابو! وہ میرا دوست ہے۔ میرا کوئی اور دوست بھی تو نہیں۔'' بیٹے کے پھولے ہوئے گالوں پر انہیں کچھ ایسا پیار آیا کہ انہوں نے چٹاخ چٹاخ بوسے دے ڈالے۔ تبھی صفدر ہاتھ میں ٹرے آیا جس میں دودھ کا بھرا ہوا ایک چھوٹا اور ایک بڑا گلاس تھا۔

''لو شہزادے! دودھ پیو۔'' انتظار نے بڑا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں پینا۔'' ارسل کا لہجہ نروٹھا تھا۔ اپنے گلاس سے ایک گھونٹ دودھ پینے کے بعد انہوں نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر چھوٹا گلاس بھی اٹھالیا اور ابرو کے اشارے سے صفدر کو جانے کا کہا۔ صفدر ان کا خاص اور کل وقتی ملازم تھا۔ صفدر اور اس کی بیوی ہی حویلی کی دیکھ ریکھ کرتے۔

صفدر کے جانے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''اچھا شہزادے یہ دودھ پیو۔ پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔''

''نہیں ابو! میں نہیں پیتا۔'' ارسل کے لہجے کا نروٹھا پن بڑھتا ہی جارہا تھا۔

''اچھا ایک منٹ۔'' انتظار نے دونوں گلاس چارپائی کی پائینتی کے ساتھ ٹکائے۔

''یہ کیا ہیں؟'' انتظار نے انگلی سے زمین پر پڑے ارسل کے جوتوں کی طرف اشارہ کیا۔

ارسل نے ایک خفا نظر باپ پر ڈالی اور بولا۔

''جوتے!''

''کبھی جوتے ہاتھوں میں پہنے ہیں؟''

''ہم ہم ہم......'' ارسل سوچنے لگا۔

''ہاں ابو! جب میں اور بخت اونچ نیچ کا پہاڑ کھیلتے ہیں تو جوتے ہاتھوں میں پہنتے ہیں۔'' اور انتظار جو ارسل کو یہ دلیل دینا چاہتے تھے کہ جیسے جوتے پاؤں میں پہنتے ہیں، ہاتھوں میں نہیں...... اسی طرح نوکروں سے کام لیا جاتا ہے، دوستی نہیں کی جاتی۔ خود لاجواب ہو گئے۔

ایک پل کو انتظار کے جی میں آیا کہ ارسل سے سختی سے پیش آئیں اور بلند بخت سے دور رہنے کا کہیں۔ پر خود کو اس ارادے سے باز رکھا۔ ایک طویل سانس بھرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اپنے شہزادے کی ہر بات مانوں گا۔ بلند بخت کا اسکول میں داخلہ کرا دیتے ہیں۔ پر شہزادے کو بھی وعدہ کرنا ہوگا وہ دل سے پڑھے گا اور بڑا ہو کر ہمیں ڈاکٹر بن کر دکھائے گا۔''

لمحوں میں ارسل کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ آگے بڑھ کر اس نے باپ کے گال پر بوسہ دیا۔

''وعدہ ابو! میں ڈاکٹر بنوں گا۔ محنت سے پڑھوں گا۔ آپ بخت کا اسکول میں داخلہ کروادیں۔''

''جو شہزادے کا حکم۔ اب چلو دودھ پیو۔ لو بیٹا۔'' انتظار نے دودھ کا گلاس ارسل کو پکڑایا اور وہ غٹا غٹ پینے لگا۔

اور یوں اس رات کسی کی قسمت کے کھلنے کی ابتدا ہوئی۔ گو کہ فیصلے انسانی تھے مگر ان انسانوں سے فیصلہ کرانے والی ذات، ذاتِ باری تعالیٰ کی تھی۔

☆☆☆

عبدالباسط نے جوانی پان کھاتے ہوئے گزاری تھی۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں ہوتیں، ڈیوڑھی کے باہر سکھ چین کے درخت کے سائے میں چارپائی پر عبدالباسط میاں لیٹے ہوتے اور ہر آئے گئے کو تاڑتے خصوصاً عورتوں اور نوعمر دوشیزاؤں کو۔ ساتھ ساتھ پان چباتے جاتے اور جب منہ بھر جاتا تو...... پیک پھینکتے۔ کبھی دیوار داغدار ہوجاتی تو کبھی گلیارا۔ پر تیز دھوپ چند ہی دنوں میں یہ داغ کچا کردیتی۔ کچے کمرے میں تو ان پیکوں کے اس قدر نشان تھے کہ یوں لگتا کہ کوئی رنگ ساز کمرے میں زنگ آلود سرخ رنگ کا چھڑکاؤ کر گیا ہے۔

''اوہ! کیوں جوانی خراب کرتا ہے۔ کچھ کام کاج کر لے۔ ہڈیوں کو آرام کی عادت پڑ جائے تو پھر کام نہیں ہوتے۔'' باپ سمجھاتا۔ والد صاحب نے جانور پال رکھے تھے۔ بکریاں، بھیڑیں، گائے اور بھینسیں۔ گائے اور بھینسوں کے لیے تو وہ چارا کاٹ آتا لیکن بکریوں، بھیڑوں کو ساتھ لیے کھلیان کھلیان گھومتا اور کب وہ چرواہا مشہور ہوا پتا ہی نہ چلا۔

''اوئے باسطے! میرے لختِ جگر کام کر لے۔ باپ کے بعد کیسے زندگی گزارے گا۔ چارپائی پر بیٹھ کر صرف پان ہی چبائے جائیں تو زمینداروں کا بھی دوالیا ہو جائے۔'' ماں سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''اماں! کام نہیں ہوتا۔ تجھے پتا تو ہے مجھے دمہ ہے۔'' پان کھاتے ہوئے عبدالباسط لاڈ سے کہتا۔ انہی لاڈ پیار میں دن گزرتے چلے گئے اور پتا ہی نہ چلا کہ شادی ہوئی اور پھر اولاد۔

بلند بخت عبدالباسط کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چھ رحمتوں کے بعد اللہ نے ایک رحمت سے نوازا تھا اور ہر باپ بیٹے کو پڑھانا چاہتا ہے مگر جو واہے کے پاس تو پیٹ بھرنے جتنے پیسے نہ ہوتے' پڑھاتا کیسے۔ پر مسبب الاسباب نے سبب کر دیا تھا۔

ارسل کی دوستی بلند بخت کا نصیب بدلنے لگی۔ وہ لڑکا جو میلا کچیلا آدھا ننگا، صفائی کی کمی کی وجہ سے جلدی امراض میں مبتلا رہتا اور باپ کے ساتھ کھلیان کھلیان گھومتا، اب اسکول جاتا اور شام کو حویلی آکر ارسل کے ساتھ کھیلتا۔

ارسل کی دوستی بلند بخت کے لیے خدا کا انعام ہی تھی۔ پر بلند بخت بھی انسان تھا۔ گو کہ ابھی بچپن تھا۔ عادتیں ابھی بد نہ تھیں، پر بچپن میں ہی تو بنیاد پڑتی ہے، بدعادتوں کی اور برُے جذبات کی۔

یونہی بلند بخت کے دل میں ایک جذبے نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ آٹھ سال کا بچہ فی الحال اس جذبے کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا کہ لوگ ارسل کو کیوں زیادہ اہم جانتے ہیں۔ اگر یہ اہمیت اسے ملتی؟

گزرتے سالوں نے اس کی آبیاری کی۔ ارسل بے لوث ہو کر اپنے دوست کی مدد کرتا رہا اور اسے اپنا بھائی جیسا ہی سمجھتا رہا اور دوست حسد میں مبتلا ہو گیا اور حسد بلاشبہ وہ جذبہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''یہ نیکیوں کو ایسے کھاتا ہے جیسے آگ سوکھی لکڑی کو......''

☆☆☆

موڑ کاٹ کر جیپ اسکول کے دروازے پر رکی۔ مثلِ بہشت میں اسکول مڈل تک تھا پر ہیڈ ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ انشاء اللہ اس سال سے ہائی کلاسز کا بھی آغاز ہو جائے گا۔

اترنے سے پہلے ارسل نے باپ کو بوسہ دیا۔ ایک مستعد خدمت گار نے جو ارسل کے اترنے سے پہلے اتر چکا تھا' ارسل کو جیپ سے اترنے میں مدد دی۔ ہاتھ بڑھا کر خدمت گار نے بیگ بھی لینا چاہا مگر معمول سے ہٹ کر ارسل نے بیگ نہ پکڑایا۔

اس معمول سے ہٹی بات کے علاوہ آج جو الگ بات تھی، وہ یہ کہ آج سارا رستہ ارسل بیگ کو مٹھیوں میں بھینچے گود میں لیے بیٹھا رہا۔ ورنہ عام طور پر بیگ خدمت گار ہی سنبھال کر بیٹھتا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بیگ لیے وہ اسکول میں داخل ہوا۔ بیگ میں اس کی حرکت اب کم پڑ چکی تھی۔

ارسل گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک طویل سانس بھرتے ہوئے انتظار نے جیپ موڑی۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی وقتاً فوقتاً چبھن محسوس کرتی رہی اور گاڑی ٹیڑھے میڑھے راستے پر رواں دواں نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی۔

مثلِ بہشت میں گورنمنٹ اسکول تھا۔ بلکہ آس پاس گاؤں کے بچے بھی تعلیم کے لیے مثلِ بہشت کے اس ایک اسکول پر انحصار کرتے۔ انتظار اسکول کے ناقص معیارِ تعلیم سے مطمئن تو نہ تھے مگر کوئی دوسرا نعم البدل بھی نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھار یہ ضرور سوچتے کہ شہر منتقل ہو جائیں مگر یہاں پر مربعوں کے مربعے زمین، شاہانہ طرزِ زندگی، نوکروں اور خدمت گاروں کی فوج...... یہ سب چھوڑنا آسان نہیں تھا۔

اسکول کے گیٹ کے اندر بچوں کا شور آب و تاب سے تھا۔ اسمبلی شروع ہونے میں وقت تھا۔ اسی لیے خاکی وردی میں ملبوس بچے مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ یوں لگتا جیسے خاکی رنگ سارے اسکول پر الٹ دیا گیا ہو۔ ارسل نے انار کے اس بوٹے کی طرف نگاہ ڈالی جس کے بارے میں اس نے اور بخت نے طے کر رکھا تھا جو پہلے آئے گا ادھر ہی رک کر دوسرے کا انتظار کرے گا۔ بوٹے کے ساتھ بخت نہ کھڑا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی نہیں آیا۔

کمرائے جماعت میں جا کر بیگ رکھنے کے بجائے وہ بوٹے کے ساتھ کندھوں پر بیگ لیے کھڑا ہو گیا۔ اسی اثنا میں بخت بھی آ گیا۔

''آؤ بستے رکھ آئیں۔'' بخت نے ہاتھ پکڑ کر ارسل کو ساتھ لے جانا چاہا مگر ارسل نہ بڑھا۔

''نہ......''

''کیوں؟'' بخت رکا تو ارسل اسے دبے دبے جوش میں بتانے لگا۔

''بستے میں مینڈک ہے۔ ہم مل کر مینڈک پالیں گے اور اس سے کھیلا کریں گے۔'' پہلے پہل تو بخت کی آنکھوں میں استعجاب اترا مگر پھر اس کی آنکھیں بھی ارسل کی طرح خوشی سے چمکنے لگیں۔

اسمبلی کی گھنٹی بج گئی۔ بچے قطاریں بنانے لگے۔ ہر جماعت کی مخصوص قطار تھی۔

"بستہ رکھ آتے ہیں۔ اسمبلی میں اٹھائے رکھا تو ماسٹر صاحب سزا دیں گے۔"

لہٰذا اسمبلی برخاست ہونے کے بعد بچے اپنے اپنے کمرائے جماعت میں پہنچ گئے۔ بخت اور ارسل بس اتنا ہی صبر کر سکتے تھے۔

"مجھے دکھاؤ مینڈک۔" کمرائے جماعت میں ٹاٹ بچھے تھے۔ ارسل اور بخت ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ بخت مینڈک دیکھنے کی فرمائش نہ بھی کرتا تو ارسل اسے مینڈک دکھانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جوش سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے ارسل نے بیگ کھولا۔ بخت نے بیگ کے اندر جھانکا۔ ایک مینڈک جس کا دہانہ مل رہا تھا، موجود تھا۔ اس سے قبل کہ لڑکے کوئی منصوبہ بندی کرتے' کمرائے جماعت میں ماسٹر صاحب آگئے۔ تمام بچے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ ارسل اور بخت دوسری قطار میں بیٹھے تھے' انہیں بھی کھڑا ہونا پڑا۔ قبل اس کے کہ ارسل بیگ کی زپ بند کرتا' مینڈک پھدکا اور بیگ سے باہر آگیا اور پھدکتا پھدکتا دیوار سے جالگا۔

"مینڈک' مینڈک......" جماعت میں ایک بچے نے دیکھا' دوسرے کو بتایا اور پوری کلاس میں شور گونج اٹھا۔

گاؤں کا ماحول تھا۔ بچوں کے لیے مینڈک کوئی نئی چیز نہ تھی مگر بچے تو بچے تھے۔ ماسٹر صاحب نے بہ مشکل چپ کروایا۔

"کیا ہوا؟ گرمیوں میں مینڈک پھرتے رہتے ہیں۔ کتابیں نکالو۔ آج جس بچے نے تیسرا کلمہ نہیں سنایا تو وہ سارا وقت مرغا بن کر کھڑا رہے گا۔" ماسٹر صاحب تنبیہ کر رہے تھے۔

اور ارسل یہ بھی نہ کہہ سکا کہ یہ میرا مینڈک ہے۔

اسکول کا وقت جیسے تیسے کٹا۔ تمام وقت ارسل مینڈک کے بارے میں سوچتا رہا اور چھٹی کے وقت تک مینڈک باقی جماعت کے لیے تو قصہ پارینہ بن چکا تھا مگر ارسل کے لیے نہیں مگر افسوس کہ چھٹی کے وقت تک مینڈک غائب ہو چکا تھا۔ ارسل کا رنج نہ ختم ہونے والا تھا۔ بخت کی تسلیاں بھی اس کا غم نہ کم کر پا رہی تھیں۔

☆☆☆

بنیادی مرکزِ صحت۔ مثلِ بہشت۔

علاقے کی ویکسی نیشن کی ضروریات پوری کرنا' لوگوں کو صحت سے متعلق آگاہی دینا' نزلہ زکام' کھانسی جیسی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرنا...... یہ وہ فرائض تھے جو بنیادی مرکزِ صحت مثلِ بہشت سرانجام دے رہا تھا۔

میڈیکل ٹیکنیشن' ویکسینیٹر اور ڈسپنسر تو تب سے خدمات پر مامور تھے جب سے مرکز صحت قائم کیا گیا تھا مگر ڈاکٹر کی سیٹ اکثر و بیشتر خالی رہتی۔ تا حال گاؤں کا کوئی... فرزند ڈاکٹر نہ بنا تھا۔ شہر کے ڈاکٹر ایسی جگہوں پر پوسٹنگ سے گھبراتے تھے اور اگر کسی بھولے بسرے ڈاکٹر کی پوسٹنگ ہو جاتی تو بھی وہ مرکز پر آنے کا تکلف نہ کرتا۔ کئی سال مرکز ڈاکٹر کے بغیر ہی چلتا رہا۔ اب ڈاکٹر عامر تعینات ہوئے تھے۔ جوان ڈاکٹر تھے۔ دل میں لوگوں کے لیے درد رکھتے تھے۔ اسی لیے تو جب انہیں یہاں تعینات کیا گیا تو ادھر چلے آئے اور اب مرکز کی چاردیواری میں موجود ڈاکٹر کے لیے قائم شدہ رہائش میں رہ رہے تھے۔

اور آج انتظار خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے تھے۔ آفس میں میز کے اس پار ڈاکٹر عامر براجمان تھے، دوسری طرف انتظار اپنی شان سے بیٹھے تھے۔

"یہ ہمارے گاؤں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے۔ دو سال سے تو یہاں کوئی ڈاکٹر تعینات ہی نہ تھا اور اس سے قبل جو ڈاکٹر صاحب تھے وہ بھی چھ مہینے بعد ایک گھنٹے کے لیے تشریف لاتے۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیے کہنیاں میز پر ٹکائے انتظار کہہ رہے تھے۔

"ملک صاحب! بات تو صرف احساس اور ذمے داری کی ہے۔ اور میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے بے حس نہیں بنایا۔" ڈاکٹر صاحب انتظار کے ہم عمر ہی تھے۔ شیریں لہجے میں بات کرتے تو وہ جیسے سامنے والے کو مسحور کر دیتے۔ "ویسے بھی مجھے مثلِ بہشت بہت خوب صورت اور پُراثر لگا۔"

"یہ تو ہے۔ اللہ نے ہمارے مثلِ بہشت کو تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔"

"جی ملک صاحب' بجا فرماتے ہیں لیکن صحت اور تعلیم کی سہولیات ناکافی ہیں۔ یہاں مرکز صحت پر حکومت کی طرف سے دی جانے والی ادویات کم ہوتی ہیں۔ مریضوں کا ہم مکمل علاج نہیں کر پاتے۔ شعبۂ تعلیم کا مجھے مکمل علم تو نہیں' پر سنا ہے صرف ایک اسکول ہے جس میں... اس سال ہی ہائی کلاسز شروع ہوتی ہیں......" انتظار نے ڈاکٹر صاحب کی باتیں دھیان سے سنیں۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی مونچھوں کی چبھن محسوس کرتی رہی۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''آپ ٹھیک فرماتے ہیں ڈاکٹر صاحب! صحت اور تعلیم کی سہولیات تو ہمارے ملک کے کسی گاؤں میں بھی مکمل دستیاب نہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت جو گاؤں والے کر سکتے ہیں وہ تو کیا جا رہا ہے۔'' ڈاکٹر عامر، انتظار کو بے حد پسند آئے۔

اٹھنے سے پہلے خدمت گار کو ابرو سے اشارہ کیا اور وہ جیپ سے آموں کی دو پیٹیاں لے آیا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کے لیے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مطلع کیجیے گا۔'' انتظار نے ڈاکٹر صاحب کو کھانے پر بھی مدعو کیا۔ دونوں میں اچھی راہ و رسم ہوگئی اور انتظار آنکھوں میں اپنے بیٹے ارسل کے ڈاکٹر بننے کا خواب لیے مرکز صحت کا دروازہ پار کرتے ہوئے اس خوش کن ملاقات کو سوچتے آرہے تھے۔ وہ دروازہ پار کر رہے تھے کہ ایک مرد و زن جو اندر داخل ہو رہے تھے، سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

وہ اختر حجام تھا۔ ملک انتظار چند سال پہلے تک اسی حجام کو گھر بلا کر اس کی خدمات حاصل کرتے مگر پھر انہوں نے اس حجام کو گھر بلانا ترک کر دیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی اور وہ خاتون، حجام صاحب کی اہلیہ تھیں۔ چادر سے چہرہ چھپائے ان کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اہلیہ لیڈی ہیلتھ ورکر اور مرکز صحت کے لیے کام کرتی تھیں۔

''سلام ملک صاحب!'' اختر حجام ہاتھ ماتھے تک لے گیا اور سلام کیا۔ انتظار کا دل کچھ ایسا دھڑکا کہ کانوں تک آواز سنائی دی۔ سلام کا جواب دیے بغیر وہ دروازہ پار کر گئے۔

''چلو......'' جیپ میں بیٹھ کر انتظار نے کہا۔ آواز میں تھوڑی لرزش تھی جو ان کی شخصیت پر بالکل نہ جچتی تھی۔

جیپ گرد اڑاتی رواں دواں تھی۔ گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکتے انتظار کے کانوں میں ایک نسوانی آواز گونجی۔ وہ آواز جو بازگشت سی تھی۔

''عورت بچہ نہ پیدا کر سکے تو مرد دوسری شادی کر لیتا ہے اور اگر مرد بچہ نہ پیدا کر سکے تو عورت کو کیا کرنا چاہیے؟''

☆☆☆

روہی کی گرم ہوائیں تھیں۔ گردباد کے جھکڑ تھے۔ گو کہ موسم میں حبس نہ تھا مگر گرمی کمر توڑنے والی تھی جب رمضان کا مہینا شروع ہوا۔ گرمی کے روزے کی فضیلت کا کوئی حساب نہیں مگر کئی لوگ اس فضیلت سے محروم رہتے ہیں۔ گرمی اور کام کا عذر کرتے ہوئے روزے نہیں رکھتے۔

آج کی افطاری پر انتظار نے ڈاکٹر عامر اور ارسل کے اسکول ٹیچر کو مدعو کیا تھا۔ دونوں معزز آدمی تھے۔ انتظار کسی قسم کی کمی کوتاہی نہیں چاہتے تھے۔ تبھی صفدر اور کنیز کو کھانے کے متعلق کئی احکامات دیے۔ آج کل ارسل چڑچڑا ہو رہا تھا۔ دراصل کچھ دن پہلے ارسل کو دھوپ میں سارا دن کھیلنے کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔ انتظار خوب پریشان ہوئے۔ ڈاکٹر عامر سے ہی دوا۔ لی گئی۔ تب انتظار نے چرواہے کو منع کیا کہ چند دن بلند بخت کو حویلی نہ لے کر آئے۔

اسی وجہ سے ارسل کی طبیعت پر چھائی بیزاری، بے جا ضد اور چڑچڑے پن کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ اب بھی وہ منہ پھلائے کسی بات پر انتظار سے ناراض بیٹھا تھا۔ انتظار نے بیٹے کو گود میں لیا۔

''شہزادے کے انداز بدل گئے ہیں۔ ہر وقت اپنے ابو سے ناراض رہتا ہے۔'' انتظار مسکرا کر کہہ رہے تھے۔ ارسل ہنوز منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ بیٹے کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے انتظار گویا ہوئے۔

''ارسل! آج میں نے ڈاکٹر صاحب کو افطاری پر بلایا ہے۔ ان سے اچھے سے ملنا۔ بڑے ہو کر تم نے ان جیسا بننا ہے۔'' وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے۔

''میں ان جیسا بنوں گا پھر آپ میری بات مانیں گے؟'' ارسل کے ہاتھ جیسے اپنی بات منوانے کا داؤ آگیا۔

''بالکل مانوں گا۔''

''ٹھیک ہے پھر بخت کو بلا دیں۔'' انتظار ہنس دیے۔

''عید پر بیٹا۔ عید پر میں اور تم نماز پڑھنے کے بعد تمہارے دوست کے گھر جائیں گے۔ اس کے لیے عیدی لے کر۔ کپڑے جوتے اور کھلونے لے کر۔'' انتظار ارسل کو پچکارنے لگے۔

''ابو آج......'' ارسل منہ پھلائے ضد کرنے لگا اور انتظار طویل سانس بھر کر رہ گئے۔ بچوں کو سمجھانا آسان نہیں ہوتا۔

شام کو افطاری کے وقت استاد صاحب کچھ دیر پہلے تشریف لے آئے۔ نوجوان استاد گاؤں کے سپوت تھے۔ بی اے کرنے کے بعد گاؤں کے اسکول میں استاد تعینات ہوئے تھے۔

''ارسل کیسا ہے پڑھائی میں؟'' انتظار نے پوچھا تو استاد صاحب شش و پنج میں پڑ گئے کہ کیا بتاؤں۔

''ملک صاحب! ارسل آپ کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ آپ کو امیدیں وابستہ ہوں گی۔ گو ابھی اسکول کا طالب علم ہے مگر......'' استاد رک گئے اور انتظار ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

''آپ بتائیں، ایسا کیا کیا جائے کہ اس کی توجہ

پڑھائی کی طرف ہو جاتے۔ شام والے ٹیوٹر سے تو میں مکمل طور پر مطمئن نہیں مگر اور کوئی ٹیوٹر میسر بھی نہیں۔ آپ بھی شام کو نہیں پڑھانا چاہتے۔ میں خود بھی اس کو پڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک ملازم کے بیٹے کو دوست بنایا ہوا ہے' بلند بخت...... اگر آپ کہیں تو اس کے ساتھ کھیلنا کودنا ختم کر دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں سے یوں بھی میں نے بخت کو حویلی آنے سے منع کیا ہوا ہے۔''

''بخت تو بڑا پیارا بچہ ہے۔ پڑھائی میں بھی اچھا ہے۔ اس کی دوستی میں ارسل اچھا پڑھ پائے گا۔ آپ ارسل کو دل سے پڑھنے پر راغب کریں۔'' اس موضوع پر مزید باتیں ہوتیں پر ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور موضوعِ سخن بدلا۔

''ڈاکٹر صاحب! میرا ارسل بھی مستقبل کا ڈاکٹر ہے۔'' ارسل منہ بسورتا آم کھاتا رہا۔

''انشاء اللہ ضرور۔ میں بھی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر عامر مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

یہاں انسان اپنے مستقبل کے ارادے اور خواہشات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ کاتبِ تقدیر قسمت میں کیا لکھ چکا ہے۔

☆☆☆

عید کی نماز سے پہلے' نماز کے دوران اور نماز کے بعد ارسل نظریں دوڑا دوڑا کر عید گاہ میں بخت کو ڈھونڈتا رہا مگر وہ اسے نظر نہ آیا۔ مایوسی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ زرق برق لٹھے کا سوٹ جس کے گلے پر موجود کڑھائی دل فریب تھی۔ سر پر موتیوں سے سجی ٹوپی اور وہ اپنے اندر اتنا صبر بھی نہ پاتا تھا کہ خطبے کے اختتام تک بیٹھ سکے۔

بالآخر خطبۂ عید اختتام کو پہنچا۔ دعا کے بعد امام صاحب نے لوگوں کو عید اور روزوں کی مبارکباد پیش کی۔

سفید کڑکڑاتے سوٹ کے دامن کو جھٹکا دیتے انتظار کھڑے ہو گئے۔ صفدر آگے بڑھا اور ریشم کے دھاگوں سے بنی جائے نماز کو لپیٹنے لگا۔

دوستوں اور معززین سے گلے ملنے کے بعد انتظار جیپ میں آن بیٹھے۔

انتظار نے سر کی پشت سیٹ سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ایک بے کلی جو چاند نظر آنے کی اطلاع سے لے کر اب تک ان پر چھائی تھی' کم نہ ہوتی تھی۔

رباب اور انہوں نے بھی تو وعدہ کیا تھا کہ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے اور جب تک سانس ہے' عیدیں اکٹھی گزاریں گے مگر اس وقت مسکراتے ہوئے پختہ یقین کے ساتھ عہد کرنے والی خاتون وفا نہ کر سکی۔ حالانکہ انہوں نے رباب کو زندگی کی ہر خوشی دینے کی کوشش کی تھی حتیٰ کہ اولاد کے حوالے سے بھی وہ یتیم خانے سے ارسل کی صورت میں خوشی اٹھا لائے مگر اسے تو اپنی اولاد چاہیے تھی۔

''ابو! بخت کے پاس جانا ہے۔'' ارسل کی آواز انہیں ماضی کی یادوں سے حال میں لے آئی۔

''جی شہزادے! حویلی سے تمہارے دوست کا تحفہ اٹھا لیں۔''

حویلی پہنچ کر انتظار نے فطرانہ ادا کیا۔ ارسل اس دوران بھی جلدی کا شور مچاتا رہا۔ آم کی پیٹیاں' سویّوں کا تھال' بادام' کشمش' چینی کی تھیلیاں' ان سلے دو جوڑے' جوتے اور نقد رقم لے کر وہ بخت کے گھر گئے۔

دستک کے جواب میں چرواہا خود دروازے پر آیا۔ میلا کُرتہ اور اس سے زیادہ میلی دھوتی کئی دنوں سے زیب تن کی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول گیا ہے کہ آج عید ہے۔

''صاحب ہمارے دروازے پر؟'' عبدالباسط نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''باسط! ہمارا بیٹا اپنے دوست کو عیدی دینے آیا ہے۔'' مالک کو اپنے دروازے پر دیکھ کر عبدالباسط کے جسم پر لرزش طاری ہونے لگی۔

''آپ کو بٹھانے کے لیے ہمارے پاس شایانِ شان جگہ بھی نہیں۔''

''نہ باسط! تم پردہ کروالو' جیسی بھی جگہ ہے ہم بیٹھ جائیں گے۔ ٹھیک ہے شہزادے؟'' انتظار نے ارسل کی رائے لی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پردہ کیسا صاحب! آپ کے اپنے بچے ہیں۔'' عبدالباسط انہیں اندر لے آیا۔

عبدالباسط کی بیٹیاں اور بیوی دوپٹے ٹھیک کرنے لگیں اور بخت پیڑ کے سائے میں بیٹھا دیگچی کے پیندے سے لگی سویّاں اکھاڑ اکھاڑ کر کھا رہا تھا۔ عید کے نام پر ان کے گھر میں بھی سویّوں کی عیاشی میسر ہوئی تھی۔

ارسل کو دیکھ کر جیسے دل کی کلی کھل گئی۔ کتنے دن ہو گئے تھے ارسل سے ملے ہوئے۔

''تم تیار نہیں ہوئے۔ آج عید ہے۔'' یہ ارسل کا پہلا سوال تھا۔

''ابو کہتے ہیں غریب عید نہیں مناتے۔'' یہ بخت کا

جواب تھا۔

''تمہارا گھر تو بہت گندا ہے۔'' ارسل کے ذہن میں تھا جیسے اس کا عالی شان حویلی نما گھر ہے، بخت بھی ایسے گھر میں رہتا ہوگا۔

بخت کوئی جواب نہ دے پایا۔ ارسل کے منہ سے نکلی بات جیسے اس کے دل میں گڑنے لگی۔

''شہزادے! اپنے دوست کو عیدی دکھاؤ۔'' انتظار درمیان میں مخل ہوئے۔

خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر عیدی کا سامان آگے رکھا۔

آم کی پیٹیاں، سویّوں کا تھال، بادام، کشمش، چینی کی تھیلیاں، ان سلے دو جوڑے اور جوتے۔ سامان دیکھ کر بخت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''مجھے اندازہ نہ تھا باسط کہ تم نے بیٹے کا عید کا جوڑا نہیں سلوایا ہوگا ورنہ ہم عید سے پہلے عیدی دے جاتے۔'' انتظار کا واقعی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا ورنہ وہ ضرور ایسا کرتے۔

''صاحب کی مہربانی وہ تشریف لائے۔'' عبدالباسط ہاتھ باندھے شکریہ ادا کررہا تھا۔ اس کی زوجہ بھی پاس آن کھڑی ہوئی۔

''اوہ باسط! شرمندہ نہ کرو۔'' انتظار کا اشارہ عبدالباسط کے بندھے ہاتھوں کی طرف تھا۔

اور ارسل اس کی دیگچی کا معائنہ کررہا تھا جس کے پیندے سے لگی سویّاں بخت اکھیڑ اکھیڑ کر کھا رہا تھا۔ اگر ارسل نہ آتا تو شاید بخت کی عید بس انہی جلی ہوئی سویاں کھانے تک محدود ہوتی۔

''شام کو بیٹے کو حویلی لانا۔ میرے ارسل کا دل بہلے گا۔'' انتظار عبدالباسط کو ہدایت دے رہے تھے۔

☆☆☆

بنیادی مرکز کے جس کوارٹر میں ڈاکٹر عامر رہائش پذیر تھے، وہاں آدھی رات کو ڈکیت گھس آئے اور پستول کے زور پر ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نقدی اور قیمتی سامان لے گئے۔ یہ خبر جب انتظار تک پہنچی تو ان کے دل میں زوروں سے یہ خواہش ابھری کہ یہ خبر بھی نہ ہو۔

تمام ضروری کام ترک کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کو مرکزِ صحت چلنے کی ہدایت دی اور اگلے لمحے جیپ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر رواں دواں تھی اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ تک پہنچے تو وہ قریب قریب اپنا سامان پیک کرچکے تھے۔

انتظار فیصلہ نہ کر پائے کہ بات کا آغاز کہاں سے کریں۔ ان کی مشکل ڈاکٹر صاحب نے حل کردی۔

''ملک صاحب! لگتا ہے مثلِ بہشت کے لوگوں کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔'' ڈاکٹر عامر کے چہرے پر بجی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

''نہ ڈاکٹر صاحب! یوں مت کہیں۔ آپ تو یہاں کے لوگوں کے لیے نعمت بن کر آئے ہیں۔''

''ملک صاحب! اگر ایسا ہوتا تو ڈکیت گن پوائنٹ پر اکیلے آدمی کو لوٹنے نہ آتے۔ گویا اچھی سیلری کی کشش مجھے یہاں لائی تھی مگر یہ سوچ بھی تھی کہ گاؤں کے لوگوں کی خدمت بھی کروں گا۔ مگر یہاں کے لوگ مجھے بھگانا چاہتے ہیں۔''

انتظار چاہ کر بھی کوئی دلیل نہ دے پائے۔ ''جہاں اچھے لوگ ہوتے ہیں وہاں برے لوگوں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ آپ یوں ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔ مثلِ بہشت کو آپ کی ضرورت ہے۔'' انتظار دل سے چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نہ جائیں۔

''ملک صاحب! آپ ہمیں عزت دیتے ہیں۔ اس کا میں تہ دل سے شکرگزار ہوں۔ میں یہاں اپنی فیملی کو چھوڑ کر آیا تھا۔ سوچتا ہوں اگر رات کو آنے والے ڈکیت فائر کرکے میرا سینہ کھول دیتے تو پھر میری بیوی، میری بچی کا کیا ہوتا.....'' جو ڈر ڈاکٹر عامر کے دل میں بیٹھا تھا۔ کوئی بھی ہوتا ایسے ہی سوچتا۔

''یوں مت کہیں ڈاکٹر صاحب! اللہ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔ تھانے میں تعلقات ہیں میرے۔ سارا گاؤں اپنا واقف ہے۔ آپ مجھے ایک ہفتے کی مہلت دیں۔ میں ان نامرادوں کو آپ کے سامنے لاکھڑا کردوں گا۔ آپ کے نقصان کا گیارہ گنا وصول کریں گے ان سے......''

ڈاکٹر عامر انتظار کو دیکھنے لگے۔ چہرے پر موجود پھیکی مسکراہٹ اب غائب ہوچکی تھی۔

''نہیں ملک صاحب! میری طرف سے معذرت قبول کیجیے، میں مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتا اور نہ ہی تھانے کچہریوں کے چکروں میں پڑنا چاہتا ہوں۔''

انتظار اپنے نئے نئے دوست کو روک نہ پائے اور ڈاکٹر عامر اسی دن، شام مثلِ بہشت کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا تھا تو وہ اپنا کام جانفشانی سے

کررہا تھا۔ وہ بچے جن کی بچپن کی اداؤں پر ہونٹ مسکرا اٹھتے تھے اب ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ ارسل پڑھائی میں درمیانے درجے کا طالب علم تھا اور بخت... کلاس کے پوزیشن ہولڈر میں سے تھا۔

بچپن میں آنکھ مچولی کھیلنے والے اب کرکٹ کھیلتے تھے۔ یہ بڑے گراؤنڈ میں اتنی بڑی شاٹ لگاتے کہ نگاہیں بال کا تعاقب نہ کر پاتیں۔ گرمی، سردی، خزاں اور بہار۔ موسم کے موسم گزرتے جاتے ہیں اور احساس تب ہوتا ہے جب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

چرواہا عبدالباسط اب کافی بوڑھا ہوگیا تھا۔ بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کی بھیڑ بکریاں بدلتی رہتیں۔ ارسل اور بخت کو اب چرواہے کے ساتھ جانے میں دلچسپی محسوس نہ ہوتی۔ وہ اب خود ہی سارا گاؤں گھومتے۔ بغیر روک ٹوک کے کبھی بائیک پر تو کبھی پیدل۔ ارسل تھوڑی بہت جیپ بھی چلالیتا مگر انتظار اسے ابھی جیپ چلانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

اور آنے والی گرمیاں بخت کے لیے ایک اور آزمائش بھی لائیں۔ گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔ چرواہے کو دمے کا اٹیک کچھ زیادہ شدت سے ہوا تھا۔

''یار عبدالباسط... تو اسپتال کا چکر لگا آ۔ میں اپنی بکریوں کے ساتھ تیری بکریوں کا بھی خیال رکھوں گا۔'' دوسرے چرواہے نے اسے مرکز صحت جانے کا مشورہ دیا۔

وہ چرواہے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مرکز صحت کی طرف روانہ ہوگیا۔ مرکز صحت میں اسے جو دوا اور ٹیکے لگتے، وہ اکثر و بیشتر بہتر محسوس کرتا۔ سانس لینے میں دشواری کم ہوجاتی۔

راستے میں تمام کھیتوں میں کٹائی جاری تھی۔ فضا میں نہ نظر آنے والی سبوس کے ذرے اڑ رہے تھے۔ مرکز صحت سے کچھ فاصلے پر عبدالباسط بیٹھ گیا۔

چلنا اب بس میں نہ رہا تھا۔ سانس سے سیٹیوں کی آواز گونجتی تھی اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ بیٹھنے سے سانس متوازن کر پائے گا۔ کس قدر غلط سوچتا تھا۔ سبوس کے ذرے سانس کی نالیوں کا راستہ مزید تنگ کر گئے اور سانس لینا ناممکن ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں نیلے ہونے لگے اور سانس رکنے لگا۔ بے یار و مددگار چرواہا ایک کھلے میدان میں اپنی حالتِ زار پر خدا سے مدد مانگنے لگا اور خدا کی مدد آئی۔ جسم سے جان نکلنا آسان ہوتی گئی۔

☆☆☆

باپ وہ گھنا پیڑ ہے جس کے سائے میں بیٹھ کر آپ بے فکر ہوجاتے ہیں۔ عبدالباسط کے یوں چلے جانے سے بخت پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ گو کہ عبدالباسط نے کوئی آسودہ حال زندگی مہیا نہیں کی تھی پر اپنی بساط کے مطابق جو اس سے ممکن تھا مہیا کیا تھا۔

اور بخت چھ بہنوں کا اکلوتا سب سے چھوٹا بھائی۔ گو کہ اس کی زندگی کے اخراجات انتظار نے اپنے ذمے لے رکھے تھے اور یہ رقم اس قدر چپکے سے دائیں ہاتھ سے دیتے کہ بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہوتی مگر باپ تو باپ تھا۔

رات پہر کے پہر گزرتی جارہی تھی اور بخت کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی منہ موڑ کر بائیں سمت بچھی چارپائیوں کی طرف دیکھا۔

پہلی چارپائی پر ماں لیٹی تھی۔ اگلی تین چارپائیوں پر اس کی بہنیں دو دو کر کے لیٹی تھیں۔ بڑی بہن تیس سال کی ہونے والی تھی اور سب سے چھوٹی اٹھارہ کی۔ سبھی بہنیں شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور تا حال قسمت کے دروازے بند تھے۔

''ابو! آپ اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ میں تو پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ ذمے داریاں کیونکر اٹھا پاؤں گا۔ ابو، ابو......''

کروٹ بدلی تو آنکھوں میں اٹکے آنسو بہہ نکلے اور رخساروں کو گیلا کر گئے۔

رخسار جن پر ہلکی ہلکی سی ڈاڑھی آنا شروع ہوگئی تھی۔ مگر اللہ مسبب الاسباب ہے۔

دوست کی پریشانیاں ارسل سے کہاں چھپی تھیں اور ارسل ان باتوں کا ذکر انتظار سے نہ کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر انتظار ہی تو پریشانیوں کا حل ڈھونڈتے تھے۔

گزرتے سالوں میں انتظار بخت کے لیے بطور ارسل کے دوست بہت زیادہ نہ سہی مگر نرم گوشہ محسوس کرنے لگے تھے کہ بخت کی دوستی ارسل کو سنوارتی ہے بگاڑتی نہیں۔ کلاس کا پوزیشن ہولڈر کلاس کے متوسط درجے کے طالب علم کا دوست ہو تو متوسط طالب علم کا باپ یونہی سوچتا ہے۔

ارسل نے انتظار سے ذکر کیا اور والد صاحب نے اپنے ملازمین' مزارعوں اور خدمت گاروں سے جن کے جواں سال بیٹے تھے اور مزدوری سے جی نہ چراتے تھے' ان سے ذکر کیا۔

اور ملک انتظار حسین اگر ذکر کررہے ہیں اور ایسی خواہش رکھتے ہیں تو کوئی کم بخت ہی ہوگا جو انکار کا سوچے۔ نتیجتاً ایک سال کے اندر سبھی بہنوں کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے گھروں میں خوشحال رہنے لگیں۔

لڑکوں کا اسکول کا آخری سال تھا اور انتظار تو اکثر کہتے تھے کہ وہ اسکول کے بعد کالج کے لیے بیٹے کو اکیلے... ہرگز نہ بھیجیں گے۔ خود بھی ساتھ جائیں گے۔ بہاولپور شہر میں ان کی اپنی ذاتی کوٹھی تھی۔ وہیں رہتے ارسل کے ساتھ، جب تک ارسل پڑھتا۔

لیکن اچانک ایسی بات ہوگئی کہ انتظار وحشت زدہ رہنے لگے۔

ایک دن کے اندر جانے ایسا کونسا واقعہ پیش آ گیا کہ دھیمے انداز والے انتظار کی جگہ ایک ایسے انتظار نے لے لی جو بولتے نہیں گرجتے تھے اور جن کی گرج میں جیسے خوف چھپا تھا۔ جیسے اپنا خوف چھپانا چاہتے ہوں اور انتظار یہ کہتے ہوئے نظر آئے۔ ''ارسل! ہم شہر جارہے ہیں۔''

''کوئی کام ہے ابو؟''

''نہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔''

ارسل اچنبھے سے انتظار کو دیکھنے لگا۔ ''مگر ابو میری پڑھائی......''

''شہر میں ہو جائے گی۔ وہاں بڑے اچھے ادارے ہیں۔'' یہ وہ انتظار نہ تھے۔ ارسل کو سمجھ نہ آیا کیا کہے۔

''ابو! دسویں کے امتحانات ہو جائیں پھر چلیں گے۔ جیسا کہ طے ہے۔'' امتحانات کو چھ مہینے سے بھی کم عرصہ رہتا تھا۔

''ہم کل ہی جارہے ہیں۔ ضروری سامان پیک کرلو۔ اگر کچھ رہ گیا تو صفدر کے ہاتھوں منگوالیں گے۔'' انتظار کا انداز فیصلہ کن تھا اور ارسل چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا اور جب انتظار کمرے کا دروازہ پار کرکے جارہے تھے تب دروازے کی چوکھٹ پر ارسل کی آواز انتظار کے کانوں میں ٹکرائی تھی۔

''ابو! کیا بخت بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟''

☆☆☆

اور یوں وہ باپ بیٹا مثلِ بہشت کو الوداع کہہ کر شہر آن بسے مگر ہمیشہ کے لیے وداع کرنا اتنا آسان تو نہ تھا۔ پرکھوں کی جائداد مربعوں کے مربعے جن کے انتظار وارث تھے اور ایک زمیندار کہاں اپنی زمین بیچنا پسند کرتا ہے۔

انتظار ہفتے کے دو دن مثلِ بہشت گزارآتے۔ زمینوں کا حساب کتاب دیکھتے اور دیگر ضروری معاملات طے کرآتے۔ ارسل اگر ساتھ جانے کی فرمائش کرتا تو سختی سے منع کردیتے اور ارسل سمجھ ہی نہ پاتا کہ ایسا کیوں ہے۔

بخت بھی ساتھ آیا تھا۔ ارسل نے فرمائش کی کہ بخت بھی ساتھ چلے۔ انتظار نے فرمائش پوری کرنے میں دیر نہ لگائی۔ بخت کی والدہ کے ساتھ چھوٹا داماد اور چھوٹی بیٹی آن ٹھہرے اور بخت، ارسل اور انتظار کے ساتھ شہر آن بسا۔

ارسل کا دوست بخت۔ گاؤں والوں میں تو مشہور تھا کہ ارسل کا خدمت گار ملازم ہے۔ چونکہ بخت کے ساتھ رہنے کے عوض انتظار رقم دیا کرتے تھے، ایک بار یہ لفظ بخت کے کانوں میں پڑا۔ وہ کہنے والے سے لڑ پڑا۔

''میں ملازم نہیں ہوں۔ میں اس کا دوست ہوں۔''

''تو کیا تم دوستی نبھانے کے پیسے لیتے ہو؟'' سامنے والے کے جواب نے بخت کو لاجواب کردیا اور وہ حقیقت جس سے بخت اکثر نظریں چرالیتا، ایک بار پھر اس کے سامنے منہ چڑاتی آن کھڑی ہوئی۔

خدمت گار ملازم......

میٹرک کے امتحانات کے بعد انتظار نے لڑکوں کو کالج میں داخل کرادیا۔ شہر کے سب سے بہترین کالج میں۔ اب وہ دونوں پری میڈیکل کے اسٹوڈنٹ تھے اور ارسل کے ڈاکٹر بننے کا خواب جو انتظار نے آنکھوں میں سجایا تھا اب محوِ سفر تھا۔

کالج میں بوائز ونگ اور گرلز ونگ الگ الگ تھے مگر بائیولوجی کی کلاسز لڑکے اور لڑکیوں کی اکٹھی ہوتی تھیں۔

اور بائیولوجی کی کلاس میں ہی ارسل نے ''اُسے'' دیکھا۔

☆☆☆

جویریہ نازک اندام سی لڑکی تھی۔ بہت گوری تو نہ تھی پر رنگت میں ایک جاذبیت تھی۔ ستواں ناک اور چمکتی پیشانی۔ بال لمبے تھے جو موباف میں لپٹے رہتے۔ بالوں کو گرہ لگاتا موباف گردن سے آگے جھولتا اور نظریں موباف میں لپٹے سیاہ بالوں میں الجھ الجھ سی جاتیں۔ عموماً پچھلی نشستوں پر بیٹھتی پر لیکچر توجہ سے سنتی۔ کبھی کبھار لیکچر سنتے ہوئے کاپی پر بیل بوٹے بھی بناتی رہتی اور ارسل کو پتا ہی نہ چلا کب محترمہ اس کے دل و دماغ پر چھانے لگیں اور ایسی چھائیں کہ وہ اور کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا۔

یہ ایک روشن دن تھا۔ مختلف رنگوں کے پھول ہر سو بکھرے تھے اور ان پھولوں کے درمیان ہیٹ سر پر لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے شانِ تمکنت سے پھولوں کی شہزادی بیٹھی تھی اور چونکہ شہزادی کی پشت تھی ارسل چہرہ نہ دیکھ پایا۔ اور چہرہ دیکھنے کے تجسس میں ارسل تیز تیز چلتا شہزادی کے پاس آیا۔ پاس آکر ارسل نے دیکھا کہ شہزادی کے سیاہ بال موباف میں لپٹے ہیں۔ ارسل کی نگاہیں موباف میں لپٹے سیاہ بالوں میں الجھنے لگیں۔

یہ شہزادی جویریہ تھی جس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی تھی۔ مسکراہٹ میں اپنایت اور انسیت تھی مگر ایک تیسری چیز بھی تھی جسے ارسل کوئی نام نہ دے پایا۔

فسوں کا عالم ہو......تم ہو......اور میں ہوں۔ ارسل آگے بڑھا اور پھولوں میں سے اودے پھول چننے لگا۔

"مجھے سرخ پھول پسند ہیں۔" جویریہ کی مترنم آواز ارسل کے کانوں سے ٹکرائی تو اس کے ہاتھ تھم گئے۔

سرخ پھول محبت کی علامت ہوتے ہیں۔ تو کیا مسکراہٹ میں تیسری چیز محبت تھی؟ ارسل کا دل بڑے زور سے دھڑکا اور جب آنکھ کھلی تو ارسل اپنی خواب گاہ کی مسہری پر لیٹا تھا۔ یہ خواب کیسا تھا؟

ملحقہ واش روم میں جا کر ارسل واش بیسن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بیسن کے اوپر لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد آئینے میں عکس کی جگہ ایک منظر ابھرا۔ کچھ دیر پہلے والا خواب ایک بار پھر آئینے میں نظر آنے لگا۔ ارسل نے گھبرا کر نل کھول لیا اور منہ پر چھینٹے مارنے لگا اور بخت سے زندگی کی ہر بات شیئر کرنے والا' ہر موقع پر اس کی مشاورت لینے والے ارسل نے بخت سے بھی اس خواب کا تذکرہ نہ کیا۔

کالج میں سارا دن بائیولوجی کی کلاس کا انتظار کرتا رہا اور جب بائیولوجی کی کلاس کا وقت آیا تو وہ جان بوجھ کر کلاس میں لیٹ گیا تاکہ آخری نشستوں پر بیٹھ سکے۔ بخت اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور جب وہ کلاس میں داخل ہوا تو ابرو کے اشارے سے اس سے لیٹ آنے کی وجہ پوچھی۔

ارسل نظر انداز کرتا ہوا پچھلی نشست پر آن بیٹھا۔

کلاس میں ارسل لڑکوں کی قطار سے آخری لڑکا اور جویریہ لڑکیوں کی قطار سے آخری لڑکی تھی۔

"ایکسکیوزمی! آپ کے پاس ایکسٹرا پین ہو گا؟ میرا پین رک گیا ہے۔"

ارسل پلکیں جھپک کر رہ گیا۔ جویریہ اس سے ہی مخاطب تھی۔

فوراً اپنا پین جویریہ کو دے دیا اور وہ پھر سے لیکچر کی طرف متوجہ ہو گئی اور یہ پہلی گفتگو تھی جو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔

اور پھر یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ اگلے دن جویریہ نے ارسل کو پین واپس کیا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ پین واپس لوٹا رہی تھی۔

"نہیں، آپ رکھ لیں۔ میرے پاس ہے۔" ارسل نے ہاتھ میں دبے نئے پین کی طرف اشارہ کیا۔

اور جویریہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں آنکھوں نے بھی حصہ ڈالا اور اس نے پین رکھ لیا۔

☆☆☆

بخت اب ارسل کی وجہ سے شہر آن بسا تھا۔ اور شہر کی روشنیاں اسے ایسی راس آئیں کہ اسے شہر کے رنگ میں رنگنے میں زیادہ وقت نہ لگا تھا۔

ارسل نے کبھی بخت سے فرق نہ رکھا تھا۔ بچپن گزر گیا۔ جوانی بانہیں پھیلائے سینہ تانے خود میں ضم کرنے کے لیے سامنے کھڑی تھی۔ تب بھی بلند بخت اس کا جگری دوست تھا۔

کالج میں داخلے کے وقت انتظار نے کہا تھا۔

"اب کیا ضرورت ہے کہ بخت آگے پڑھے۔ تمہارا اور تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے۔" انتظار زمیندار تھے، پیسوں کے عوض خدمت خریدتے تھے۔ ان کی سوچ اپنے حساب سے ٹھیک تھی۔

"ابو! میں نے اسے دوست نہیں بھائی بنایا ہے۔ جو میرے لیے، وہ بخت کے لیے۔"

جواباً انتظار نے اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ زندگی گزارنے کے اصول بتائے۔

"ملازموں کے ساتھ بیٹھا بھی جائے تب بھی انہیں یہ باور کروانا چاہیے کہ وہ ملازم ہی ہیں۔" حسب توقع ارسل نے اختلاف کیا۔

"ابو! وہ میرا ملازم نہیں ہے۔" انتظار طویل سانس بھر کر رہ گئے۔ ارسل ان کے قد کے برابر آ گیا تھا اور جوان بیٹے کو سمجھانا آسان نہیں تھا۔ وہ تو اس وقت بھی ارسل کو نہ سمجھا پاتے تھے جب وہ بچہ تھا۔

"جو تم کہو گے سب ویسا ہو گا مگر تم یہ یاد رکھو' وہ ملازم ہے۔" سنجیدگی انتظار کے لفظوں میں لپٹی تھی۔ مزید کچھ کہنے کے بجائے ارسل نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

مگر تنہائی میں بخت سے انہوں نے دو ٹوک بات کی۔

"بلند بخت!" بخت ان کے ہمراہ جیپ میں مثلِ بہشت جا رہا تھا۔

"جی ملک صاحب!" انتظار کے کہنے پر ہی وہ انہیں ملک صاحب بلاتا تھا۔

"میرے ارسل کا اچھی طرح خیال رکھا کرو۔"

"جی!" ایک مدھم سی جی سنائی دی۔

"ایک چودھری کا بیٹا شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے

کالج میں پڑھ رہا ہے تو اس کی وجہ ہے کہ میرا ارسل ایسا چاہتا ہے۔ اگر تم اس کا خیال نہیں رکھو گے تو احسان کا بدلہ کیسے اتارو گے؟'' پہلے انتظار ایسی باتیں نہیں کرتے تھے مگر اب انہیں لگنے لگا تھا کہ یہ باتیں ناگزیر ہیں۔ کیونکہ چرواہے کا بیٹا' زمیندار کے بیٹے سے آگے تھا۔ شہر میں آکر کچھ ایسا گھل مل گیا کہ شہری بابو لگتا۔ ظاہری وضع قطع میں ایسی جوانی اس پر آئی تھی کہ سیکڑوں میں ایک لگتا اور ان کا ارسل پڑھائی میں درمیانے درجے کا تھا۔ شہری رنگ ڈھنگ اسے نہ بھاتے تھے۔

جینز اسے نہ بھاتی تھی۔ ڈریس پینٹ میں وہ کوفت محسوس کرتا۔ گو کہ جوانی نے اسے خوبصورت بنایا تھا مگر بخت کی بات الگ تھی۔

اب انتظار کو کچھ تحفظات درکار تھے تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ ہر باپ کو ہی ہوتے ہیں۔

''جی!'' مدھم سی جی کہہ کر بخت شیشے کے باہر مناظر دیکھنے لگا۔ دل ایسا اچاٹ ہوا کہ ہر چیز ہی بری لگنے لگی تھی۔ خدا نے آخر اسے اتنا غریب کیوں بنایا تھا یا پھر ارسل اتنا امیر کیوں تھا؟

جب جیپ حویلی کے دروازے پر رکی تب ایک نقاب پوش لیڈی ہیلتھ ورکر چاک سے حویلی کی دیوار پر علامتی کوڈ.... لکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس ٹیم کا ممبر اور اس کا شوہر ایک کولر لیے کھڑا تھا۔ لمحے بھر کے لیے لیڈی ہیلتھ ورکر کے ہاتھ کانپے مگر پھر وہ اپنا کام کرنے لگی۔ شوہر نامدار اختر نے آگے بڑھ کر ملک صاحب کو سلام کیا۔

دل کی لے تو ملک صاحب کی بھی الگ ہوئی تھی مگر انہوں نے خود کو سنبھالا تھا۔ یوں بھی کتنے سال گزر گئے تھے اور پرانی زندگی خواب سے زیادہ کچھ نہیں لگتی تھی۔

لیڈی ہیلتھ ورکر اپنی ٹیم کے ساتھ اگلے گھر کی طرف مڑ گئی اور انتظار حویلی کا گیٹ پار کر کے اندر آ گئے۔

خیالوں کا در وا ہوا اور انہیں برآمدے میں رنگین پایوں والی چارپائی پر ملکانی بیٹھی نظر آئی۔ بالوں میں پراندہ ٹانکے وہ زمین پر بیٹھی چوڑیوں کے چھابے کے ساتھ آنے والی چوڑی فروش خاتون سے کہہ رہی تھی۔

''لے شینا! تو پھر ہری چوڑیاں نہیں لائی۔ ملک صاحب نے فرمائش کی تھی میں ہری چوڑیاں پہنوں۔''

''بس ملکانی صاحبہ! شہر کا چکر نہیں لگا۔ نئے مال میں میں نے خاص طور پر ہرے رنگ کے کئی شیڈ منگوائے ہیں۔''

خیالوں کا تانا بانا ٹوٹا اور وہ برآمدے میں بچھی بے نقش پایوں والی چارپائی پر آن بیٹھے۔ ملکانی کے جانے کے بعد انہوں نے سرخ اور سبز رنگ کی ہر اس چیز کو خود سے دور کر دیا تھا جو بیاہتا جوڑے کی نشانی ہوتی ہے اور جو بیاہتا جوڑے پر جچتی ہے۔

صفدر کی بیوی کنیز فوراً ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی اور انتظار نے اسے فوراً منہ سے لگا لیا۔

ماضی میں اس گھر پر حکمرانی کرنے والی خاتون مدت ہوئی ملکانی نہ رہی تھی۔ اب وہ لیڈی ہیلتھ ورکر تھی اور جس گھر کی کسی زمانے میں وہ مالکن تھی، آج اسی گھر کے دروازے پر کوڈ میں لکھ رہی تھی۔

''اس گھر میں پولیو ویکسین پلانے کے لیے کوئی بچہ نہیں۔''

☆☆☆

بخت دو ماہ بعد گھر آیا تھا۔ ماں کا لاڈلا' اکلوتا' دلارا۔ فرط محبت میں ماں نے بیٹے کے لیے خوب دل لگا کر سویاں بنائی تھیں۔ حالانکہ بڑھاپا تھا اور کچھ ہاتھوں میں رعشہ تھا کہ اس سے کام نہیں ہوتا تھا۔ بیٹے کی محبت میں اس نے پروانہ کی مگر شہر میں پیزا' زنگر' میٹھے کے نام پر بیکریوں اور سویٹ پیلس سے نت نئی ڈیزرٹ کے ذائقے سے آشنا ہونے والے کو وہ میٹھے پانی میں ابلی ہوئی سویاں اس بار پسند نہ آئیں۔

''اماں! مجھے بھوک نہیں۔''

''کھا پتر کھا۔ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ کھاتا نہیں ہے کیا؟ اور شہر میں کہاں دیسی خوراکیں ہوتی ہیں۔''

''بس اماں پیٹ بھر گیا۔'' ماں کے بے حد اصرار پر بھی اس نے مزید کچھ نہ کھایا۔ رات کھلے آسمان تلے چارپائی پر لیٹے وہ تاروں بھرے آسمان کو تکتا رہا۔

کیا واقعی ارسل کی نظر کرم اس پر نہ ٹھہرتی تو وہ آج اپنے باپ کی جگہ بکریاں چرا رہا ہوتا؟

''ایک چرواہے کا بیٹا اگر شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے کالج میں پڑھ رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ارسل چاہتا ہے۔ اگر تم اس کا خیال نہیں رکھو گے تو احسان کا بدلہ کیسے اتارو گے۔'' انتظار کی آواز کانوں میں گونجی تو دل میں ایک بے نام سی چبھن جاگی۔

''کیا تم واقعی دوستی نبھانے کے پیسے لیتے ہو؟'' باتوں ہی باتوں میں کتنی بار ایسی باتیں سننے کو ملی تھیں۔ یہ کیسی زندگی تھی۔

بخت نے کروٹ بدلی۔ چند سال پڑھائی۔ ایف ایس سی میں محنت کر کے وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لے۔ میڈیکل کالج کی پڑھائی کے سال اور پھر وہ ڈاکٹر

ہوگا۔ خود کمائے گا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا۔ تب وہ سب کے احسانوں کا بدلہ چکائے گا۔ ارسل کا بھی اور اس کی دوستی کا بدلہ تو ضرور اتارے گا۔

یہ سوچتے ہوئے یہ بات اس کے ذہن میں ہرگز نہ آئی کہ دوست بدلے اتارنے پر اتر آئیں تو وہ دوست نہیں رہتے۔ دشمن بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

ایف ایس سی کے طلبا کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ٹین ایج کے آخری سال مگر ہارمونز کی تبدیلی سے شخصیت میں جو تلاطم آتا ہے اس کی وجہ سے جذبات کے سمندر بہہ جاتے ہیں۔

کالج میں لڑکے لڑکیوں کے گھلنے ملنے پر کچھ زیادہ پابندی نہ تھی اور پتا بھی نہ چلا ارسل اور جویریہ قریب آتے چلے گئے۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے بے ضرر سے فقروں کا تبادلہ ہوتا۔ یہاں تک کہ ایف ایس سی کا دوسرا سال بھی ختم ہونے کو پہنچ آیا مگر پھر بھی ایک ہم آہنگی اور باہمی تعلق کا احساس ہوتا اور ان دونوں کا گھلنا ملنا یہی تھا۔

ایک دوسرے پر نظر پڑ جاتی تو خیر سگالی بھری مسکراہٹ کا تبادلہ ہو جاتا مگر ارسل یہ نہ جان پایا کہ پسندیدگی اور محبت کے جذبات صرف اس کے دل میں پنہاں ہیں یا پھر دوسری طرف بھی یہ معاملہ ہے۔

سالِ اول میں ارسل کچھ ایسے اچھے نمبر نہ لے سکا تھا۔ یہ بات اس کے لیے کچھ ایسی قابل تشویش بھی نہ تھی۔ انتظار کا دل برا ہوا مگر وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

بخت نے حسب معمول شاندار نمبر لیے تھے۔ جویریہ کے بھی اچھے نمبر تھے۔ ایسے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے۔

دوسرا سال بھی ختم ہونے والا تھا اور ارسل یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ جویریہ کو حالِ دل کیسے بتائے۔

میسیج کر کے؟ فون نمبر کا تبادلہ بھی کسی زمانے میں ہو گیا تھا۔ ایک دو دفعہ میسیج بھی ٹائپ کیا تھا۔

''جویریہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا مجھے زندگی بھر کا ساتھی بناؤ گی؟'' مگر پھر یہ طریقہ اوچھا لگتا اور ڈیلیٹ کر دیتا۔

''ارسل! بڑے گم صم رہتے ہو۔'' بخت کالج کے لان میں بیٹھے ارسل کے ساتھ آن بیٹھا اور اسے دھپ رسید کی۔

''نہیں یار! کوئی بات نہیں۔'' ارسل نے گول مول جواب دیا اور بخت ہنسنے لگا۔ وہ اتنا سیدھا نہ تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا۔ یہ تو اس کا دوست تھا۔ اس کے بدلے ہوئے انداز نہ بھانپ پاتا۔ تبھی سہیلیوں کے جھرمٹ میں جویریہ گزری۔

''یار! وہ لڑکی دیکھ رہا ہے جس نے پرپل شیڈ پہنا ہوا ہے؟''

''کون؟'' ارسل کا دل دھڑکا مگر وہ انجان بننے لگا۔

بخت کا دل چاہا قہقہہ لگا کر ہنس دے۔

''جویریہ!'' بخت کے دانت باہر تھے۔

''کیا ہوا اسے؟'' ارسل بکھری ہوئی کتابیں سمیٹنے لگا۔

''مجھے لگتا ہے تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔''

ارسل کے ہاتھوں سے کتابیں پھسل گئیں۔

''نہیں۔'' ارسل کی آواز میں لرزش تھی۔

بخت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''تم تو کہتے تھے' بخت میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔'' ارسل کے انداز میں نقل کی۔ ''تم مجھ سے باتیں نہیں چھپاتے مگر یار حالِ دل تو چھپایا مگر میں بھی جان گیا۔ دیکھ لو۔'' بخت ہنستا رہا اور ارسل ہکا بکا اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

ایک عندلیب بھی تھی۔ جس کالونی میں انتظار کا گھر تھا اسی کالونی میں رہتی تھی۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی گھر کی اور اس کے گھر سے انتظار کے گھر کا لان نظر آتا اور چونکہ پہلے گھر اکثر و بیشتر خالی رہتا۔ اس لیے وہ چھت سے اکثر و بیشتر لان میں جھانک لیتی۔

سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ آرٹس کی طالبہ۔ والدہ صاحبہ بخت گیر خاتون تھیں۔ چاہتی تھیں کہ بیٹی ہر فن میں ماہر ہو مگر جتنی والدہ سختی کرتیں' کام اتنا ہی خراب ہو جاتا۔

''عندلیب! چٹنی صحیح بنانا۔'' والدہ کا بس یہ کہنا ہوتا اور نتیجتاً چٹنی میں نمک زیادہ ہو جاتا۔

''عندلیب! دھیان کرنا چاول ٹوٹ نہ جائیں۔'' اور چاول ایسے ٹوٹتے کے کھانے کے لائق نہ رہتے۔

وہ دوپہر کو رسالہ پڑھ رہی ہوتی۔ والدہ آتیں اور ہاتھ سے رسالہ لے لیتیں۔

''آج روٹیاں کچی تھیں' سزا کے طور پر دو دن تم رسالہ نہیں پڑھوگی۔''

رات کو نیند نہ پوری ہوتی۔ صبح نماز کے بعد سونے کے لیے لیٹتی تو والدہ صاحبہ کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

''خبردار سونا مت۔ فجر کے بعد سونا گھر میں بے برکتی لاتا ہے۔'' اور عندلیب دل مسوس کے رہ جاتی۔

ماں اپنی پیاری غیر شادی شدہ بیٹی کو نہ جانے کیا کیا کہہ دیتی اور دل کرچی نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور تان آ کر ٹوٹتی...

''زندگی اتنی مشکل کیوں ہے؟''

والد صاحب کی مین بازار میں جوتوں کی دکان تھی۔

گھر میں بھی مالی آسودگی تھی اور کوئی مسئلہ نہ تھا مگر عندلیب کو زندگی بہت مشکل لگتی اور وہ سوچتی۔

''شادی کر کے دوسرے گھر جاؤں گی تو سکون آئے گا۔ امی کو بھی پتا چلے گا جب گھر میں دیواروں کو ڈانٹیں گی۔''
گھر میں اتنی آسودگی تھی کہ ملازم رکھے جاسکتے مگر کوئی ملازم نہ ٹکتا۔

دکھی رہنے والی، زندگی کی مشکلات سے تنگ رہنے والی عندلیب کے ہاتھ میں ایک تفریح تھی۔ ساتھ والے گھر میں جھانکنا اور جب سے ساتھ والے گھر میں نوجوان لڑکے آن بسے تھے جھانکنا کچھ اور بھی اچھا لگتا۔

اور اس بولائی بولائی چہرے والی لڑکی کو جھانکتے بخت نے کئی بار دیکھا تھا۔ جب بھی دیکھتا مسکرا دیتا۔ کیسی سادگی تھی چہرے پر۔

مگر وہ جو ماں سے چھپ چھپ کرتا نکا جھانکی کرتی تھی، ایک دن ماں نے دیکھا تو جیسے قیامت ہی آگئی۔

ماں نے کھری کھری سنائیں سو سنائیں۔ دو تھپڑ بھی رکھ دیے اور عندلیب ایک بار پھر سوچنے لگی۔

''زندگی اتنی مشکل کیوں ہے؟'' آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے تھے۔

اور پھر وہ کئی دن چھت سے جھانکتی نظر نہ آئی۔ کسی اور نے محسوس کیا ہو نہ کیا ہو، بخت نے یہ کمی ضرور محسوس کی تھی۔

خدا خدا کر کے کئی دنوں کے بعد ایک دن پھر وہ جھانکتی نظر آئی اور بخت کو یک گونہ سکون نصیب ہوا۔

اور اس نے اس جھانکتی لڑکی کی طرف دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا عندلیب گھبرا کر چھپ گئی۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔

لان میں بکھری رات نے ہر سو خاموشی پھیلا رکھی تھی اور اندر رہائشی حصے میں انتظار بیڈ سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھے۔ ہاتھ سینے پر بندھے تھے اور نظریں سامنے دیوار پر۔ گزرتے وقت میں ان کی شخصیت میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ کچھ وزن کا اضافہ ہوا تھا۔ کن پٹیوں پر سفید بال جھلکنے لگے تھے اور مونچھ میں بھی ایک سفید بال آگیا تھا۔ جسے وہ مکمل تراش لیتے۔

بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر ارسل بیٹھا تھا۔ چہرے پر بانکپن لیے وہ باپ کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار سیدھے ہو کر بیٹھے اور ارسل سے مخاطب ہوئے۔

''ارسل! سیکنڈ ایئر کے امتحان بھی سر پر آگئے ہیں۔ فرسٹ ایئر میں تو تم اچھے نمبر نہ لے سکے۔ اب آگے کیا ارادہ ہے؟''

''ابو! جتنی محنت ہو سکی میں نے کی ہے۔ اب اللہ کو منظور دیکھیں کیا بنتا ہے۔'' ارسل اتنا سنجیدہ نہ تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ اور انتظار چاہ کر بھی اس بات کی نشاندہی نہ کر سکے۔

''میں چاہتا تھا کہ تم ڈاکٹر بنو۔'' چاہتا ہوں کی جگہ چاہتا تھا نے لے لی تھی۔ انتظار کو کم افسوس نہ تھا۔

''ابو! پرائیویٹ ایڈمیشن لے لیں گے۔'' ارسل حل ڈھونڈ چکا تھا۔ اور پھر ارسل باپ کو پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلے کے طریقہ کار اور فیسوں کے بارے میں بتانے لگا۔ جنوبی پنجاب کا شہر بہاولپور پرائیویٹ میڈیکل کالج نہ رکھتا تھا۔ اس کے لیے ملتان یا لاہور جانا تھا۔

''اب یہاں سے ملتان۔ پہلے خبر ہوتی تو شروع سے ہی ملتان شفٹ ہو جاتے۔'' انتظار قدرے مطمئن ہوئے تھے۔

''بخت کے اچھے نمبر ہیں۔ اس کا میرٹ پر میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے گا۔'' ارسل نے بتایا۔ انتظار نے سنی ان سنی کر دی۔ بخت سے انسیت اتنی ہی تھی کہ ارسل کا دوست ہے مگر اب دوست آگے بڑھ رہا تھا تو انتظار نے توجہ دے کر دل جلانا چھوڑ دیا تھا۔

باپ بیٹے میں کچھ مزید باتیں ہوئیں پھر باپ بیٹے کی ملاقات الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ برخاست ہوئی۔ اس دوران کتنی بار ارسل کے دل میں آیا کہ باپ کو بتا دے۔ اس نازک اندام، پری وش جویریہ کے بارے میں مگر بتاتے بتاتے رک جاتا۔ جویریہ سے بات ہو جائے پھر...... آخر جلدی بھی کیا ہے۔

اور وہ باپ کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آکر جویریہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

آسمان سے ایک سیاہ سایہ اترا اور اس نے ارسل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سیکنڈ ایئر کے امتحانات کے بعد پریکٹیکلز کا دور دورہ تھا۔ پریکٹیکل کلاسز کا انعقاد زور و شور سے جاری تھا اور کچھ دنوں میں پریکٹیکلز کے بعد الوداع۔ نئی منزلیں اور نئے راستے......

ارسل حالِ دل سنانا چاہتا تھا مگر موقع ہی نہ مل پا رہا تھا اور ایک دن موقع مل گیا۔

ٹیچر پریکٹیکل کروا چکے تھے اور اب صرف..... پریکٹس کرنے کا کہہ کر جا چکے تھے۔ ارسل الگ تھلگ سا کھڑا بے زار ہو رہا تھا۔ تبھی جویریہ چھوٹے چھوٹے قدم

اٹھاتی اس کے پاس آئی۔

بالوں کو گرہ لگاتا موباف گردن سے آگے جھول رہا تھا اور ارسل کی نگاہیں بالوں میں الجھ سی گئیں۔

"ارسل یہ......" جویریہ نے سیاہ جلد والی ایک خوبصورت ڈائری آگے بڑھائی۔

ارسل نے ڈائری تھام لی اور سوالیہ نظروں سے جویریہ کو دیکھنے لگا۔

"خدا حافظ کہنے کا وقت آگیا ہے۔ میں اپنے تمام دوستوں سے کمنٹس لکھوا رہی ہوں جو ساری زندگی یادگار رہیں۔ جنہیں پڑھ کر میں کئی سال بعد بھی مسکرا سکوں۔ کچھ کمنٹس اچھے سے لکھنا۔" چہروں سے دل کے حال عیاں ہوتے تو اس وقت وہ ایک دوسرے کے دل کے راز پالیتے۔

"ضرور! سیاہ جلد والی ڈائری ہاتھ میں لیے ارسل سوچتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا لکھے۔

ڈائری بالکل خالی تھی۔ شاید جویریہ سب سے پہلے اسی سے کمنٹس لکھوا رہی تھی۔

رات اس نے جاگ کر گزاری۔ نیند آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی اور ارسل کو یہ روٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ رات کے کسی پہر ارسل کی آنکھ لگی تو اس نے وہ خواب دوبارہ دیکھا جو ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو رگ وپے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ دل کی دھڑکن معمول پر نہ تھی۔ ایسی حالت ارسل کی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور یہ کیفیت ہی تھی جس نے ارسل سے ڈائری پر لکھوایا۔ وہ جو کئی گھنٹے بیٹھ کر بھی یہ نہ تعین کر پا رہا تھا کہ اسے کیا لکھنا چاہیے اب ڈائری پر لکھ رہا تھا۔

"آسمان کی خوبصورتی چاند ستاروں سے ہے۔ زمین کی خوبصورتی مسحور کرتے نظاروں سے ہے۔ زمین کی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں میں قید کرنا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کی سیر کو جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا ہاتھ تھام لو۔" الفاظ اہم نہ تھے۔ الفاظ میں چھپے جذبات اہم تھے اور ارسل نے یہ جذبات سرخ روشنائی سے کاغذ پر منتقل کردیے تھے۔

صبح ویسی ہی روشن تھی جیسی وہ خواب میں دیکھ چکا تھا۔ پریکٹیکل کلاس میں اسے جویریہ کی جھلک دکھائی دی۔ مگر پھر وہ نظر نہ آئی تو کالج میں ڈھونڈنے لگا۔

وہ لائبریری میں نہ تھی۔ کینٹین کے گرلز سیکشن میں جھانکا، وہاں بھی نظر نہ آئی۔

روش پر چلتے موباف میں لپٹے بال نظر آئے اور وہ رک گیا۔

آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر تین چار لڑکیاں پشت کیے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ارسل نے دھڑکتے دل کو سنبھالا۔ قدموں میں آئی معمولی سی لرزش پر قابو پایا اور بغیر چاپ قدم اٹھاتا ان لڑکیوں کی طرف بڑھا۔

"جویریہ! اکیلے میں پڑھنا۔" دل میں فقرہ ترتیب دیتا وہ لڑکیوں کے قریب پہنچ گیا۔

لڑکیوں کی پشت تھی۔ انہیں خبر نہ ہوسکی کہ کوئی آرہا ہے۔ اس سے قبل کہ ارسل پکارتا، لڑکیوں کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم نے اسے کیوں ڈائری میں کمنٹس لکھنے کو دے دی۔ نکما لڑکا۔ گاؤں کا پینڈو۔ اسے کیا پتا کہ کیا وشز لکھ کر دیتے ہیں۔" کہنے والی لڑکی اکثر وبیشتر جویریہ کے ساتھ نظر آتی تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس خاموشی کو جویریہ کی آواز نے توڑا۔ وہ آواز نہیں تھی بم تھا جو ارسل کے اعصاب پر گرا تھا۔

"دل بڑھانے کے لیے دی۔ کیسے الگ تھلگ رہتا ہے۔ تھوڑا پینڈو ہے اس لیے لڑکے بھی اسے زیادہ لفٹ نہیں کرواتے۔ میں نے سوچا ڈائری کمنٹس لکھنے کے لیے دوں گی تو اس کا دل بڑھے گا۔ یہ بھی ثواب کا کام ہے۔" آسمان پھٹا اور نہ زمین شق ہوئی۔ ارسل نے موباف میں لپٹے بالوں والی لڑکی کو دیکھا جو ثواب کمانے کے لیے اس سے ڈائری لکھوا رہی تھی۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی لوٹ گیا۔

کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھا وہ کوشش کر رہا تھا کہ سانس لے پائے تبھی موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ گھنٹی اس نے جویریہ کے نمبر کے لیے خصوصاً لگائی تھی۔ بے جان ہاتھوں سے موبائل نکالا۔

"ڈائری؟" جویریہ پوچھ رہی تھی۔

ارسل ہاتھ میں پکڑی سیاہ ڈائری کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ارسل نے ڈائری کھولی۔ ڈائری میں درج سرخ روشنائی سے لکھا واحد صفحہ تھا۔ وہ صفحہ ڈائری سے الگ کیا اور پرزے پرزے کرکے ہوا میں اچھال دیا۔

"بااعتماد لڑکی کے..... مستقبل کے لیے نیک تمنائیں۔" سیاہ روشنائی سے یہ الفاظ لکھے۔ نیچے اپنا نام تاریخ کے ساتھ لکھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے کھڑا ہوا۔ تبھی دور روش پر جویریہ سہیلیوں کے ساتھ آتی نظر آئی۔ وہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے آگے بڑھا اور چلتا ہوا لڑکیوں کے

پاس آیا۔ ڈائری جویریہ کو پکڑائی اور یہ پہلی دفعہ ہوا کہ جویریہ کی مسکراہٹ کے جواب میں اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ سجائی۔

کیونکہ آسمان سے اترنے والا سیاہ سایہ اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں اسرار تھا۔ ماحول ساکن تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ارسل کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔ ہاتھ میں قلم لیے وہ ساکن سا بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے قلم نے حرکت کی۔

''پینڈو......'' اس کے قلم نے صفحے پر یہی لفظ اتارا تھا۔ کئی لمحے وہ یک ٹک اس لفظ کو دیکھتا رہا۔ پھر کاغذ کے صفحے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ ایسے جیسے اس لفظ کو محسوس کر رہا ہو اور پھر اچانک کرسی دھکیلتا ہوا قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنے عکس کو تکنے لگا۔

سوت کا کرتہ ہلکے آسمانی رنگ کا۔ درمیان سے مانگ۔ چہرے پر مونچھیں۔ کیا وہ پینڈو تھا؟

''تھوڑا پینڈو ہے اس لیے لڑکے بھی اس کو لفٹ نہیں کراتے۔ میں نے سوچا ڈائری میں کمنٹس لکھنے کو دوں گی تو اس کا دل بڑھے گا۔ یہ بھی تو ثواب کا کام ہے۔'' ثواب کمانے والی لڑکی کی آواز بازگشت کی طرح گونجی اور آئینے میں نظر آتے پینڈو کے عکس کو کھوجتے ہوئے ارسل کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔

اور کمرے میں موجود ہر چیز ارسل پر ہنسنے لگی۔ صوفہ، بیڈ، رائٹنگ ٹیبل، دروازہ، کھڑکی اور آئینہ بھی۔

آنکھیں رگڑتا، آنسو پونچھتا...... خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا وہ بے حال ہو رہا تھا۔

لفظ 'پینڈو' اسے مارے جا رہا تھا اور محبت بھی جیسے اس لفظ کے نیچے دبی جاتی تھی۔

تبھی دروازے کے ہینڈل پر دباؤ پڑا مگر کنڈی لگی تھی اس لیے دروازہ نہ کھلا۔

''ارسل! دروازہ کھولو۔'' دروازے کے اس پار بخت کی آواز ابھری۔

''ارسل!'' یہ سونے کا وقت نہ تھا اور ارسل کنڈی لگا کر نہ سوتا تھا۔

کیا ماجرا تھا۔ بخت دوبارہ اسے آواز دینے لگا۔

''بخت، صبح بات کریں گے ابھی میرا کسی سے بات کرنے کا موڈ نہیں۔'' ارسل کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

اور دروازے کے اس پار کھڑا بخت کچھ دیر سوچتا رہا۔

کیا کرے، پھر چپکے سے ہٹ گیا۔ حالانکہ اسے زبردستی دروازہ کھلوانا چاہیے تھا۔ وہ بچپن کا دوست تھا۔ اسے معاملے کی خبر گیری کرنی چاہیے تھی مگر وقت سب کچھ بدل دیتا ہے۔

☆☆☆

کبھی ماں سے نہ ملا۔ بچپن میں بھی ماں کی کمی محسوس کرتا۔ بڑا ہونے پر عادی ہو گیا مگر ایک بات اسے ہمیشہ حیران کرتی کہ اس کی ماں نے اس سے ملنے کی کبھی خواہش نہ کی۔ ماں کی محبت کا استعارہ تو خدا نے اپنی محبت کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا ہے (میں اپنے بندے سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہوں) تو کبھی اس کی ماں نے ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس سے ملے، اسے پیار کرے۔ اسے ساتھ بٹھائے۔ اس سے باتیں کرے۔

پینڈو کا لقب پا کر ارسل کا دل ایسا ٹوٹا کہ وہ ٹوٹے دل کو سنبھال ہی نہ پایا۔ تب اس کے دل میں ماں سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک جگہ سے چوٹ کھانے والا مرہم کے لیے دوسری جگہ کا رخ کرتا ہے۔ اس لیے وہ ماں سے ملنے کے لیے اچانک بے چین ہونے لگا۔

انتظار امور کے سلسلے میں مثلِ بہشت گئے ہوئے تھے۔ ڈرائیور اور جیپ کے ہمراہ۔ ارسل انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے رینٹ اے کار ہمراہ ڈرائیور منگوائی اور مثلِ بہشت روانہ ہو گیا۔ ان اڑھائی سالوں میں ارسل خال خال ہی مثلِ بہشت گیا تھا۔ جب سے اسے محسوس ہونے لگا کہ انتظار نہیں چاہتے کہ وہ گاؤں جائے، باپ کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے اس نے بھی ساتھ جانے کی فرمائش نہ کی۔

خالی نظروں سے وہ گزرتے مناظر کو دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ نہر بہشت کے پاس سے گزرنے لگا۔ جب بھی وہ نہر سے گزرتا، بچپن کی یادیں جب وہ اور بخت یہاں آکر کھیلتے تھے پھر سے تازہ ہو جاتیں۔

''ابو سے رنجشیں ہوں گی۔ طلاق بھی ہو گئی۔ اپنا گھر اپنی فیملی۔ امی! آپ مجھے کیوں بھول گئیں؟ میں بھی آپ کا بیٹا تھا۔ مجھے بھی آپ کی ضرورت تھی۔ آج آپ کے ہاتھوں سے کھانا کھائے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

ڈرائیور نے آگے کا راستہ پوچھا۔ گاؤں میں رہتے ہوئے وہ اس بات سے تو واقف تھا کہ اس کی والدہ کا گھر کہاں ہے۔ چنانچہ وہ ڈرائیور کو راستے کی نشاندہی کرنے لگا اور گاڑی کچے راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔

☆☆☆

انتظار کے بعد رباب نے اختر سے شادی کی تھی۔ اختر اس کا دور کا رشتے دار تھا۔ حجام کا کام کرتا تھا۔ اسے پسند کرتا تھا۔ اسی لیے تو اس کے مطلقہ ہونے کی پروا کیے بغیر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ حجام کی کمائی گھر چلانے کے لیے ناکافی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ سمجھ بوجھ رکھتی تھی۔ کچھ ہاتھ پاؤں مارے تو لیڈی ہیلتھ ورکر کی جاب مل ہی گئی۔ پانچ بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے۔ بڑی بیٹی کی شادی وہ اگلے سال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

کہتے ہیں نا مصیبت بتا کر نہیں آتی۔ تو یہی صورتِ حال رباب کی تھی۔ ایمان دار خاتون تھی۔ دل جمعی سے کام کرتی۔ لیڈی ہیلتھ ورکر کے ذمے جو کام تھے سبھی جانفشانی سے سرانجام دیتی۔ چھوٹی موٹی کوتاہیاں تو بشری تقاضا ہے۔ کبھی بڑی غلطی جان بوجھ کر نہ کی۔

اس بار مشکِل بہشت میں رباب کی کمیونٹی میں پولیو کیس سامنے آگیا۔ حالانکہ وہ خود اور ویکسینیٹر کے ہمراہ جاکر تمام بچوں کو قطرے پلایا کرتی تھی مگر جو کیس سامنے آیا تھا وہ بچہ جانے کیسے پولیو کے قطرے سے محروم رہ گیا۔

فوری طور پر رباب اور ویکسینیٹر کو معطل کر دیا گیا۔ ہیلتھ سیکریٹری پنجاب اور ایگزیکٹوڈسٹرکٹ آفیسر ہیلتھ آکر مشکِل بہشت کا دورہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہتے۔

"نہ صحت، نہ تعلیم، نہ ضروریات کی فراہمی اور نہ ہی کوئی سہولت۔ سڑکیں تک کچی ہیں۔ موسم کی گرمی ناقابلِ برداشت۔ جانے کس سیانے نے اس جنگل میں گاؤں کا نام مشکِل بہشت رکھ دیا۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگتے۔ رباب شہر جا جاکر افسروں کے سامنے پیشیاں بھگت رہی تھی۔ اپنی صفائی دیتی کہ وہ جانفشانی سے کام کرتی رہی ہے مگر بات نہ بن پائی۔ آج بھی وہ شہر سے آئی تھی۔ افسران سے بے عزتی کروا کروا کر اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ ابھی گھر پہنچی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

بڑا بیٹا جاکر دیکھ آیا۔

"ملک انتظار کا بیٹا آیا ہے۔ اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہے۔"

رباب پہلے تو نا سمجھی میں بیٹے کو دیکھتی رہی اور جب بات سمجھ میں آئی تو بیٹے سے کہا۔

"جاکر کہہ دو، میں نہیں ملنا چاہتی۔"

بیٹا پیغام ارسل تک پہنچا آیا۔

"میں ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔" ارسل وہیں ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا۔

چہرہ بے تاثر تھا مگر پھر بھی غم کی کہانی سناتا تھا۔ لڑکا عمر میں ارسل سے چند سال چھوٹا تھا اور سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ارسل کو کیسے روانہ کرے۔

"ساری زندگی بھی بیٹھنا پڑے تو بیٹھوں گا۔ پر ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔" ارسل یہی کہہ رہا تھا۔

اور جب لڑکا ماں اور ارسل کے درمیان پیغام رسانی سے اکتانے لگا اور ماں سے الجھنے لگا تو رباب خود چل کر ڈیوڑھی تک آئی۔

"اے لڑکے! ہم پہلے ہی پریشان ہیں۔ ہمیں مزید کیوں تنگ کرتے ہو؟"

"امی!" ارسل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکے بغیر دیکھنے لگا۔

"میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور نہ ہی انتظار تمہارا باپ ہے۔ میں نے تمہیں جنم نہیں دیا۔ جاؤ جاکر انتظار سے تفصیل پوچھو۔ ہمیں بخش دو۔ گھر میں پوچھتے نہیں، دوسرے کے گھر کے سامنے دھرنا ڈال دیتے ہیں۔ اترو یہاں سے۔" رباب کے اشارے میں اتنی طاقت تھی کہ ارسل ڈیوڑھی سے لڑھکتا گلی میں آگیا۔

رباب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور ارسل بے یقینی سے دروازہ تکنے لگا۔

"نہ انتظار تمہارا باپ ہے۔" کیا اس نے صحیح سنا تھا؟

☆☆☆

"رباب مجھے یونیورسٹی میں اچھی لگنے لگی تھی۔ ہم کلاس فیلو بھی تھے اور مجھے جب معلوم ہوا کہ وہ بھی مشکِل بہشت سے ہی یونیورسٹی پڑھنے آئی ہے تو مجھے حیرت ہوئی۔ ان دنوں زمانے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں تو پڑھائی کے لیے شہر نہیں جاتی تھیں۔ جلد ہی یہ حیرت خوشی میں بدلی اور رباب کے لیے پسندیدگی محبت میں۔ یونیورسٹی میں گھلنا ملنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ جلد ہی رباب اور میرے درمیان چھوٹی موٹی گفتگو ہونے لگی اور ایک دن میں نے اسے پروپوز کر دیا۔" انتظار نے آنکھیں جھپکیں تو پلکیں گیلی ہو گئیں۔ ہاتھ بڑھا کر آنکھیں صاف کیں۔ ارسل ساکت بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔

"وہ غریب تھی اور میں زمیندار کا بیٹا۔ بڑی مشکل سے میں نے ابو کو راضی کیا اور ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے ابتدائی سال ہم نے بہت اچھے گزارے۔ محبت سے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوئے۔ ہم نے وعدے بھی کیے کہ کبھی ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے۔ ایسے وعدے جو

تمام جوڑے کرتے ہیں مگر پھر......پھر......" انتظار رک گئے۔ انہیں رکنا پڑا۔ کچھ باتوں کے بارے میں گفتگو کرنا آسان نہیں ہوتا۔

"شادی کو تین سال گزر گئے مگر اولاد نہ ہوئی۔ ہم حیران و پریشان تھے۔ میڈیکل چیک اپ کے لیے شہر کے چکر لگنے لگے۔ تب معلوم ہوا کہ کمی مجھ میں ہے۔ میں باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوں پھر ہر بڑی جگہ گیا علاج کے لیے مگر ناکامی میرا مقدر ٹھہری۔ میرے لیے یہ بات پاؤں تلے سے زمین کھسکنے کے مترادف تھی۔ کسی بھی مرد کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہوتی ہے کہ وہ اپنا وارث نہیں پیدا کر سکتا۔ کتنا عرصہ تو میں اس بات کو جھٹلاتا رہا۔ میری سمجھ بوجھ ختم ہوتی جارہی تھی۔ اللہ سے دعائیں مانگ کر میں تھک گیا مگر......" آنکھیں ایک بار پھر گیلی ہونے لگیں۔

خود پر قابو پاتے ہوئے انتظار نے بات دوبارہ جوڑی۔

"تب رباب کے انداز بھی بدلنے لگے۔ وہ جو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بلاوجہ مسکراتے رہتے اور یہ وعدے کرتے رہتے تھے کہ تمام عمر ساتھ نبھائیں گے مگر سب کچھ ویسا تو نہیں ہوتا جیسے ہم چاہتے ہیں۔ رباب نے کہا تھا۔ عورت بچہ نہ پیدا کر سکے تو مرد دوسری شادی کر لیتا ہے اور اگر مرد بچہ نہ پیدا کر سکے تو عورت کو کیا کرنا چاہیے۔ ایک بار نہیں بار بار کہا تھا اور مجھے اس بات کا مطلب سمجھ میں آگیا تھا۔ بالکل سامنے کی بات تھی، وہ طلاق چاہتی تھی۔ اسے اب مجھ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تب میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ مجھے خودکشی کر لینی چاہیے۔ مجھے اس سے محبت تھی اور میری محبوبہ جو میری بیوی بھی تھی، اب مجھ سے طلاق چاہتی تھی مگر میں کیا کر سکتا تھا۔" انتظار روتے رہے۔

ارسل انہیں چپ بیٹھا حیرت سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی انتظار کو روتے نہیں دیکھا تھا۔

"وہ غلط نہیں تھی۔ اسے اپنا حق چاہیے تھا۔ اولاد کے بغیر کون جینا چاہتا ہے اور میں نے بھی اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے خود کو مضبوط کر لیا مگر اس دنیا کو کیا کہتا میری بیوی مجھے اس لیے چھوڑ گئی ہے کہ میں اسے اولاد نہیں دے سکتا۔ ملک انتظار اپنا وارث پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے اور میں یہ ذلت کیسے برداشت کر پاتا۔" انتظار کی آنکھیں پھر سے گیلی ہو گئیں اور اس گفتگو میں ارسل کے دل کو پہلی بار کچھ ہوا۔

"تب میں نے رباب سے درخواست کی کہ اپنی زندگی کے کچھ ماہ مجھے اور دے دو۔ صرف چند ماہ۔ زندگی کے تین خوبصورت سال گزارنے والی خاتون نے میری درخواست قبول کر لی اور ہم کراچی آگئے۔ اس جھوٹ کے ساتھ کہ رباب حاملہ ہے۔ دس ماہ ہم وہاں رہے۔ میں نے رباب سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کسی کو نہیں بتائے گی کہ تم ہماری اولاد نہیں۔ اور کئی سال اس نے وعدہ نبھایا بھی۔ وہاں سے ہم نے ایک بچہ گود لیا اور واپس گاؤں آگئے اور رباب نے مجھ سے طلاق لے لی۔ دو تین سال پہلے یہ بات میں نے گاؤں میں کسی کے منہ سے سنی کہ تم میرے بیٹے نہیں ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اصل حقیقت کا پتا چلے اسی لیے ہم اچانک شہر میں شفٹ ہو گئے۔ میں نے تمہیں بیٹا بنا کر ہی پالا ہے اور بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے مجھے کہاں سے گود لیا تھا؟" اٹکتے الفاظ ارسل کے منہ سے نکلے تھے۔

"یتیم خانے سے......"

"ان لوگوں کے پاس میرا بائیوڈیٹا تو ہوگا۔ میرے والدین......"

"نہیں۔" انتظار نفی میں سر ہلانے لگے۔

"کوئی نامعلوم عورت تمہیں چھوڑ گئی تھی، اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی بائیوڈیٹا نہ تھا۔"

ارسل سے جیسے کسی نے بولنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ مزید کچھ بولنا اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ وہ خاموشی جو زندگی کے نہ ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

"شکریہ! آپ نے مجھے پالا اور یہ پیغام دیا۔ شکریہ اب اب......ابو۔" ابو کہتے ہوئے ارسل پہلے کبھی نہ اٹکا تھا۔

انتظار نے بے یقینی سے ارسل کو دیکھا۔ کیا وہ واقعی ان سے خفا نہیں تھا۔ آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے انہوں نے بازو پھیلائے۔

"آؤ میرے بیٹے!" آنکھوں میں نمی اتری۔ نمی صاف کرتے ہوئے وہ انتظار کے سینے سے جالگا۔

ایسی اپنائیت دنیا میں کہیں نہیں تھی۔

☆☆☆

بڑا پرانا قصہ تھا۔ اتنا پرانا کہ دھندلا سا یاد آتا ہے۔ خواب سا لگتا ہے مگر آج کل انتظار کو ایسی باتیں یاد آتی تھیں۔ جب سے ارسل حقیقت سے آگاہ ہوا تھا۔ کئی پرانی باتیں یونہی ذہن میں اتر آتیں۔

جمعے کا دن تھا۔ حجامت کے لیے حجام کو حویلی بلایا گیا تھا۔ جمعے کے دن انتظار ضرور حجام کی خدمات حاصل کرتے۔

اختر نوجوان حجام تھا۔ اب وہ مثلِ بہشت کے ماہر حجاموں میں شمار ہوتا تھا۔ بالوں کی سیٹنگ اور شیو کے دوران انتظار نے محسوس کیا کہ اختر کے انداز میں وہ لگن نہیں جو اس کا خاصہ تھی۔ تھوڑا گھبرایا سا محسوس ہوتا تھا۔ انتظار نے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا۔

مونچھیں تراشتے ہوئے قینچی غلط چلی اور دائیں طرف کی مونچھیں باریک ہو گئیں۔ نتیجتاً تمام مونچھوں کو باریک کرنا پڑا۔ انتظار کے ماتھے پر تیوری بھی چڑھی مگر انہوں نے نظرانداز کر دیا۔

''ملک صاحب! اجازت ہو تو ایک بات کروں؟'' اجرت لینے کے بعد اختر پوچھ رہا تھا۔

''بولو......'' اختر کے انداز ایسے تھے کہ انتظار ٹھٹکے۔ بھلا اختر ان سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

''وہ ملک صاحب! آپ کی سابقہ زوجہ رباب بی بی......'' اختر لمحے بھر کو رکا۔

انتظار کا دل لمحے بھر کو اپنی جگہ پر نہ رہا۔

''ملک صاحب! میری دور کی رشتے دار ہے۔ آپ کی شادی سے قبل بھی میں اسے اپنی زوجہ بنانا چاہتا تھا مگر جو رب کی مرضی۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں نکاح کر لوں نہ؟''

اختر انتظار کا غلام نہ تھا کہ اسے ان کی اجازت کی ضرورت تھی اور نہ ملک انتظار کا گاؤں کے دیگر غریب باشندوں سے ایسا دھونس بھرا تعلق تھا کہ وہ غلام نہ ہوتے ہوئے بھی غلام ہوں مگر وہ اجازت طلب کر رہا تھا تو صرف ملک انتظار حسین کی عزت کی بنا پر اور انتظار بھی کون ہوتے تھے روکنے والے۔ جب خاتون ہی انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تو کیا حق باقی رہ جاتا ہے۔

''مجھے کیا اعتراض ہونا ہے۔ اللہ خوش رکھے۔'' انتظار کی آواز بوجھل تھی اور اختر کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

چند ہفتوں کے بعد اختر اور رباب کی شادی کی خبر بھی آگئی اور پھر کبھی انتظار نے اختر سے حجامت کے لیے خدمات نہ لیں۔ کوئی بھی حجام بلا لیا جاتا مگر اختر کبھی نہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انتظار چونکے۔ چوکھٹ پر ارسل کھڑا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی لیے۔

''آؤ بیٹے! رک کیوں گئے؟'' انتظار نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ارسل دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور انتظار کے سامنے صوفے پر ٹک گیا۔ انتظار خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔

''ابو! مجھے اس یتیم خانے کا ایڈریس اور اڈاپٹیشن کے کاغذات مل سکتے ہیں؟ میں ایک دفعہ وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' ارسل کی آواز مدھم تھی۔

انتظار یک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ ''کیوں؟'' اپنے سوال کی بے مائیگی کا احساس انہیں تھا۔

☆☆☆

جہاز نے انہیں چالیس منٹ میں کراچی انٹرنیشنل ائرپورٹ پہنچا دیا۔ ائرپورٹ سے انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل پہنچ گئے جہاں انہوں نے ٹیلی فون پر ہی کمرا بک کروا لیا تھا۔

ارسل اکیلا جانا چاہتا تھا۔ انتظار نے اکیلے جانے کی اجازت نہ دی۔

''بخت کو لے جاتا ہوں۔''

''میں نہیں چاہتا کسی کو پتا چلے۔'' انتظار اپنا بھرم قائم رکھنا چاہتے تھے اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ارسل باپ کو رسوا کرتا۔

''ٹھیک ہے۔'' ارسل کے پریکٹیکل اختتام کو پہنچے تو دونوں باپ بیٹا کراچی آگئے۔ ٹیلیفون پر بھی اس یتیم خانے میں رابطہ کر کے معلومات کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہ ہو پایا۔ دوسری طرف آپریٹر کہتی تھی کہ یہ کسی یتیم خانے کا نمبر نہیں ہے۔ ایک شاپنگ مال کا نمبر ہے۔

''ارسل!'' ہوٹل کے کمرے میں صوفے پر گم صم بیٹھا تھا جب انتظار کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔

''جی ابو!'' ارسل سیدھا ہو بیٹھا۔

انتظار خاموش بیٹھے الفاظ ڈھونڈتے رہے کہ اپنا مدعا مناسب انداز میں بیان کر سکیں۔

''کیا تم اپنے والدین کے ساتھ چلے جاؤ گے؟'' انتظار کی آواز دھیمی تھی۔

ارسل نے دھیان سے باپ کو دیکھا گو کہ وہ اس کے حقیقی باپ نہ تھے مگر انہوں نے اسے پالا تھا۔ صرف باپ بن کر نہیں ماں بن کر بھی۔

ارسل صوفے سے اٹھ کر انتظار کی طرف آیا۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیروں میں بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ ان کے

گھٹنے پر رکھ دیا۔ یہ اپنایت کا اظہار تھا۔ محبت کا اظہار تھا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں ساری زندگی آپ کے ساتھ رہوں گا۔ جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے اور چلنے کے لیے چھڑی کی ضرورت محسوس کریں گے تب میں آپ کو چھڑی نہیں اٹھانے دوں گا۔ میں خود چھڑی بنوں گا۔'' ارسل نے انتظار کا دایاں ہاتھ پکڑا اور اسے لبوں سے چھوا۔

اس اظہارِ محبت پہ ان کی آنکھیں نہ بھیگیں پر دل ضرور تڑپ گیا۔

''ملک انتظار حسین کبھی بوڑھا نہیں ہوگا۔'' انتظار نے کہا تو ارسل بے اختیار ہنسنے لگا۔

''سچ فرمایا......'' کتنی دیر وہ ہنستا رہا اور ہنستے ہوئے ہی اس نے کہا۔

''جانے وہ ملیں گے بھی کہ نہیں۔'' بات ہنس کر کہنے والی نہ تھی۔ ان کے ملنے کی اگر کوئی امید تھی بھی تو وہ رائی برابر سے زیادہ نہ تھی۔

انتظار نے کوئی جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''ابو! آپ کو برا نہ لگے تو کچھ کہوں؟'' ارسل اجازت لینا چاہتا تھا۔ باپ کے قدموں میں بیٹھے ارسل کا ہاتھ اب بھی ان کے گھٹنوں پر تھا۔

''کہو شہزادے!'' انہوں نے ارسل کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کتنی مدت بعد انہوں نے اسے شہزادہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اپنے اصل باپوں کے نام سے پکارے جاؤ۔ اگر میرے اصل والد کا نام پتا چل گیا تو کیا میں ان کے نام سے پکارا جانا چاہوں گا۔''

انتظار خاموش رہے۔ کچھ نہ کہہ پائے۔ کتنی دیر یہی خاموشی کمرے کے طول و عرض میں پھیلی رہی۔ اس خاموشی کو انتظار کی مدھم آواز نے توڑا۔

''ٹھیک ہے شہزادے...... جو تمہاری مرضی۔''

مگر ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ جگہ جہاں بیس سال پہلے یتیم خانہ تھا، آج وہاں ایک تین منزلہ شاپنگ مال تھا۔ یتیم خانے کی بابت معلوم کرنے پر شاپنگ مال کے مالک نے کہا۔

''ابو کے جانے کے بعد میرے لیے یتیم خانہ چلانا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ میں نے شاپنگ مال بنا کر اپنے آپ کو مستحکم کیا۔ اب میں ایک مخصوص رقم ایک دوسرے یتیم خانے کو فنڈ دیا کرتا ہوں۔ ریکارڈ ملنا بھی ممکن نہیں۔'' یتیم خانے کی جگہ شاپنگ مال بنے سولہ سال ہونے کو آئے تھے۔

یہاں تک کہ کراچی والے بھی بھول گئے تھے کہ یہاں یتیم خانہ ہوا کرتا تھا۔ وقت اتنا گزر چکا تھا۔

باپ بیٹا اسی دن کی شام کی فلائٹ سے واپس اپنے شہر آگئے۔

☆☆☆

اتوار کی صبح تھی۔ موسم معتدل تھا۔ ہر چیز پر اتوار کا رنگ چڑھا تھا۔ بخت اپنے کمرے میں کورس کی کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔ شہر آنے کے بعد وہ کبھی یہاں ملازم کی طرح نہیں رہا تھا۔ اس کا کمرا گو چھوٹا تھا۔ آرائش اور سامان بھی ارسل کے کمرے جیسا نہ تھا۔ پر اہم بات یہ تھی کہ اس کا کمرا تھا۔ انتظار کبھی کبھار (وہ بھی اس وقت جب انہیں بخت ارسل سے آگے بڑھتا محسوس ہوتا) اسے یاد دلا دیتے کہ وہ ملازم ہے۔ اسے ارسل کا خیال رکھنا ہے۔ ورنہ وہ ایسے ہی رہتا جیسے گھر کا مکین ہو۔

وہ کافی دیر پڑھائی کرتا رہا۔ جب سر بوجھل ہونے لگا تو اس نے کتاب بند کرلی۔ کچھ دیر یونہی آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

وہ جو یہ سوچا کرتا تھا کہ کاش ارسل کی جگہ وہ ہوتا۔ آج کل یہ سوچ رہا تھا کہ مثلِ بہشت میں کتنے ہی اس جیسے بے یار و مددگار خالی پیٹ پھرا کرتے تھے اور پھرا کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد پیٹ بھرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ خدا کا انعام ہی تھا کہ اسے چنا گیا تھا اور وہ آج شہر کی ایک خوبصورت کالونی کے ایک خوبصورت گھر کے آرام دہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا اور اچھے مستقبل کی جھلکیاں اسے بتاتی تھیں کہ وہ آنے والے کل میں ڈاکٹر ہوگا۔ وائٹ کوٹ پہنے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ ڈالے آرام دہ نشست پر بیٹھ کر مریضوں کو چیک کیا کرے گا۔

آنکھیں موندے وہ کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور جب تھوڑا پُرسکون محسوس کرنے لگا تو موبائل اٹھا کر ارسل کو پیغام بھیجنے لگا۔

''کرکٹ کھیلنا پسند کرو گے؟'' پیغام لکھنے کے بعد وہ ارسل کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''ہاں۔'' خلافِ توقع ارسل کا مثبت جواب آیا۔ ورنہ وہ پچھلے کچھ عرصے سے اداس اداس محسوس ہوتا اور چپ رہتا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتاتا۔

اپنے کمرے سے بیٹ اور بال لیے وہ ارسل کے کمرے میں آیا۔

''کیا کر رہے تھے؟'' بخت ارسل کے ساتھ کاؤچ پر

ٹک گیا۔

''کچھ نہیں۔'' گو کہ ارسل کم گو تھا مگر آج کل وہ جس طرح خاموش رہتا تھا، کوئی تو بات تھی۔ بخت اسے دیکھتا رہا۔

''بغیر بتائے کراچی بھی ہو آئے۔ ویسے ملک صاحب کا کراچی میں کیا کام نکل آیا تھا؟'' ایک زمیندار کو بھلا دور دراز کے شہر میں کیا کام ہو سکتا ہے۔ بخت کا تجسس غلط نہ تھا۔

''بس یار! مجھے بھی سمجھ نہیں آیا کیا کام تھا۔ بس گئے اور آ گئے۔'' ارسل نے گول مول سا جواب دیا۔

''اب اتنی دور گئے تھے تو گھوم پھر لیتے۔ مزارِ قائد، سمندر، عجائب گھر کچھ تو دیکھ آتے۔''

''بس جانا ہی نہ ہوا۔ تم سناؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' ارسل نے پہلوتہی کرتے ہوئے موضوع بدلا۔

''اچھی جا رہی ہے۔ دعا کرو اللہ سرخرو کرے۔'' دعائیں تو اب بخت کے لبوں پہ ہی رہتی تھیں۔ ایف ایس سی کے رزلٹ کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ لڑکوں نے انٹری ٹیسٹ کے لیے اکیڈمی بھی جوائن کر لی تھی۔ ارسل کا یہ معاملہ نہ تھا، بے دلی سے کتاب لیے بیٹھا رہتا۔

''انشاء اللہ میڈیکل کالج تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' ارسل نے کہا تو مسکراہٹ بخت کے لبوں پر آن ٹھہری۔

لان میں آ کر لڑکے کرکٹ کھیلنے لگے۔ ٹاس کے بعد پہلے ارسل بیٹنگ کرنے لگا۔

''اونچی شاٹ مت لگانا، گیند باہر گئی تو خود جا کر اٹھانا۔'' بخت کہہ رہا تھا کیونکہ سامنے والی دیوار چھوٹی تھی۔

کتنی دیر لڑکے کرکٹ کھیلتے رہے اور ساتھ والے گھر میں رہنے والی عندلیب نے جھانک جھانک کر منچلوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھا اور آہیں بھر کر رہ گئی۔ بچپن میں اسے بھی کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔

☆☆☆

وہ فرید گیٹ سے اندر بلا وجہ ہی بازاروں میں گھومتا رہا اور ایسی دکانوں کے سامنے رک جاتا جہاں سے اس نے کبھی خریداری کی تھی اور نہ ہی متوقع تھی۔

وہ یونہی غائب دماغی سے چلتے رکتے وہ وقت گزار رہا تھا۔

''پینڈو، یتیم خانہ!''

ان دو لفظوں نے کیسے زندگی بدل دی تھی۔ کہاں وہ لڑکا جس کے اگر ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ بھی ہوتی مگر دل مسکرا رہا ہوتا اور کہاں یہ ارسل جس کی چپ سامنے والے کو تشویش میں مبتلا کر دیتی۔ فرید گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک رکشے والے کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے رکشے والے کو چڑیا گھر چلنے کا کہا۔

ابھی وہ ٹکٹ لے رہا تھا کہ موبائل فون بجنے لگا۔ انتظار فون کر رہے تھے۔

''بس ابو گھر بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ اس لیے چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔'' وہ انتظار کو بتانے لگا۔

''میں بھی ساتھ چلتا۔'' انتظار کہہ رہے تھے جواباً ارسل ہنس دیا کہ انتظار فون کے دوسری طرف اسے ہنستا سن لیں اگر پتا چلے کہ آپ بے نام و نشان ہیں تو انسان تنہا ہو جاتا ہے۔

ارسل بھی تنہا ہو گیا تھا۔ ایک بھائی جیسا دوست تھا بخت۔ دو تین بار دل مائل ہوا کہ اسے اپنا غم بتائے مگر اسے بتا نہ پایا۔

کیا یہ بتاتا کہ اسے ایک لڑکی سے محبت ہے۔ ہاں وہی لڑکی جس کے بارے میں تم نے کہا تھا، ارسل مجھے لگتا ہے تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ جب میں نے اسے حالِ دل بتانے کا ارادہ کیا تو اس لڑکی کے منہ سے اپنے لیے پینڈو کا لفظ سنا اور یہ کہتے ہوئے بھی کہ وہ مجھ سے اس لیے بات کرتی ہے کہ ثواب کا کام ہے۔

یہ سوچ کر دل ایک بار پھر سکڑا اور سمٹا اور اس نے اپنا چہرہ ہرنوں کے جنگلے کے ساتھ ٹکا لیا۔

اپنے وجود کے بے نام ہونے کا تو وہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ انتظار نے منع کیا تھا۔

جب وہ شیر کے پنجرے کے ساتھ کھڑا، ست روشیر کو سستی سے بیٹھے دیکھ رہا تھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، تب موبائل کی بیپ بجی، کوئی پیغام آیا تھا۔ اس نے موبائل جیب سے نکال کر دیکھا۔

''نہ رپلائی کرتے ہو، نہ فون اٹھاتے ہو۔ ایسا کیوں ہے ارسل۔'' جویریہ کا پیغام تھا۔ ارسل نے دو دفعہ پیغام پڑھا۔

جب سے کالج ختم ہوا تھا، جویریہ کی تین بار کال آ چکی تھی اور یہ دسواں پیغام تھا۔ ارسل نے کال ریسیو کی اور نہ کسی پیغام کا جواب دیا۔

ہاتھ کے انگوٹھے سے موبائل کی اسکرین پر مندرجات ..... اوپر نیچے کرتے ہوئے وہ جویریہ کے آئے ہوئے دسوں پیغامات دیکھنے لگا۔ سب کا متن ایک سا تھا مگر اس اپ ٹو ڈیٹ ماڈرن لڑکی کو ارسل جیسے پینڈو سے اب رابطے کی کیا ضرورت تھی؟

''سوری میڈم! ثواب کمانے کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈیں۔'' یک لخت ارسل کے دل میں آیا، وہ موبائل کا بیک

کور کھولنے لگا۔ موبائل سے سم نکالی اور اسے دو ٹکڑے کر دیا۔

''خدا حافظ!'' سم کے ٹکڑے اس نے زمین کے سپرد کر دیے۔ اب رابطے کی کیا ضرورت تھی۔ گھاس پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

ہجوم میں تنہا بیٹھے ارسل کی نگاہیں ایک چہرے پر ٹک گئیں، چہرہ جانا پہچانا تھا۔ لڑکی کی شکل ساتھ موجود معمر خاتون سے مشابہت رکھتی تھی۔

ارسل سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو کہاں دیکھا تھا؟ کیا کالج میں؟ نہیں۔ ہاں یاد آیا۔ اس لڑکی کو ساتھ والے گھر سے اپنے لان میں جھانکتے دیکھا تھا۔ ایک بار نہیں، کئی بار۔

وہ عندلیب تھی۔

اب دل کو سنبھالنا ہے تو کہیں اور لگانا تو پڑے گا۔ تو پھر عندلیب کیوں نہیں۔ ارسل تب تک عندلیب کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی۔

''جی!'' اجازت ملنے پر صفدر اندر داخل ہوا۔

''بڑے صاحب کہتے ہیں کھانا میرے کمرے میں آکر کھایئے۔'' انتظار ایسے پیغامات اس وقت بھیجتے تھے جب وہ کوئی بات اکیلے میں کرنا چاہتے تھے اور ارسل جو رات کو کھانا نہ کھانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ارسل انتظار کے کمرے میں تھا۔

''لو بیٹا۔'' ملازم کھانا لگا چکا تو انتظار نے ارسل سے کہا۔

''زیادہ بھوک نہیں ابو بس تھوڑا سا۔'' ارسل شریک ہوا۔

''شہزادے! کھانے میں کنجوسی نہ کیا کرو۔''

''ہاں تا کہ توند نکل آئے۔'' دونوں باپ بیٹا ہنسنے لگے۔

''انٹری ٹیسٹ کی کیسی تیاری ہے؟'' انتظار موضوع کی طرف آئے جس پر وہ بات کرنا چاہتے تھے۔

''زیادہ نہیں۔ دراصل ابو میں نے تیاری کی بھی نہیں۔ جتنے ایف ایس سی کے مارکس آئے ہیں اس سے گورنمنٹ میڈیکل کالج کا داخلہ ممکن ہی نہیں اور پرائیویٹ میڈیکل کالج کے داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ میں انٹر ہونا ضروری ہے۔ مارکس کی اہمیت نہیں۔'' انتظار سوچتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

''ہوں...... تو کس میڈیکل کالج کو چنا ہے؟ کچھ معلومات لیں؟''

ارسل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی ابو!'' وہ انتظار کو لاہور کے اس میڈیکل کالج کی تفصیلات بتانے لگا جہاں وہ داخلہ لینا چاہتا تھا۔

''لاہور... ملتان کیوں نہیں؟'' انتظار ارسل کو زیادہ دور نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔

''ابو! میں بڑے شہر جانا چاہتا ہوں۔ بڑے شہر کی طرزِ زندگی، پرسنالٹی گرومنگ چاہتا ہوں۔ اس کے لیے لاہور بہتر ہے۔'' ایک مسکراہٹ انتظار کے چہرے پر آن ٹھہری۔ زیادہ پرانی بات تو نہیں جب انتظار خود چاہتے تھے کہ ارسل اپنا پہناوا بدلے۔ کچھ شہر کے انداز اپنائے مگر ارسل نہ بدلا۔ جو بھی لیتا اس میں سادگی کا عنصر ضرور ہوتا اور جب انتظار کو اپنے بیٹے کی سادگی بھانے لگی تھی تب وہ پرسنالٹی گرومنگ چاہتا تھا اور اس کے لیے بڑے شہر کا انتخاب کر رہا تھا۔

اگر پہلے والی بات ہوتی تو انتظار اسے ملتان کے لیے قائل کر لیتے مگر جب راز راز نہ رہے تھے تب کچھ نہ کچھ تبدیلی تو آتی ہے۔

''جیسے شہزادہ چاہے۔''

کھانا ختم ہوا۔ ملازم برتن اٹھالے گیا۔ ارسل پھر بھی بیٹھا رہا۔

''آج باپ سے باتیں کرنے کا دل ہے کیا۔'' انتظار پوچھ رہے تھے۔

''کچھ خاص کہنا چاہتا ہوں۔'' ارسل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ضرور۔ کیا اپنی گاڑی خریدنا چاہتے ہو؟'' گو کہ انتظار جانتے تھے کہ یہ غلط اندازہ ہوگا۔ ارسل کی دلچسپیاں کبھی اس نوعیت کی نہ رہی تھیں۔

''نہیں۔'' ارسل نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر......''

چند لمحے خاموشی رہی پھر ارسل گویا ہوا۔

''ابو! مجھے ایک لڑکی پسند ہے......عندلیب۔ ساتھ والے گھر میں رہتی ہے۔'' کچھ دنوں میں ملازم کی بابت اسے نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔

''یہ سردار صاحب کی بیٹی۔'' انتظار کی ہمسائیوں سے واقفیت تھی۔

''جی!''

انتظار خاموشی سے ارسل کو دیکھنے لگے۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ ان کا ارسل ہے جو بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے۔

خوشی کے جذبات کے ساتھ انتظار اپنی جگہ سے اٹھے اور ارسل کو گلے لگا لیا۔

''یہ شیر جوان۔ ملک انتظار کا بیٹا۔'' انتظار ارسل کو بھینچے کھڑے تھے۔ ''سردار صاحب سے پرانی جان پہچان ہے۔ میں کل ہی بات کرتا ہوں۔''

☆☆☆

کئی سالوں بعد مشکِ بہشت کے بنیادی مرکز میں ایک بھولا بھٹکا ڈاکٹر تعینات ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مشکِ بہشت آن بسے۔ وسیم رحمانی ڈسپنسر اب کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ سروس کا آخری سال تھا۔ اس لیے اس نے ڈاکٹر کے آنے کا زیادہ برا نہ منایا اور یوں مشکِ بہشت کے لوگوں کو ایک پڑھا لکھا ڈاکٹر میسر آ گیا۔

بخت کی ماں نصیبن کئی دنوں سے پیٹ میں بھاری پن محسوس کر رہی تھی۔ کافی تکلیف میں تھی۔ اس نے مرکز صحت آ کر چیک اپ کرایا۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنہ کیا۔ معائنے کے بعد بیٹے کو بھی کمرے میں بلایا۔

''مجھے کالے یرقان کا شبہ ہوتا ہے۔ آپ انہیں فوراً شہر کے اسپتال لے جائیں۔ وقت ضائع کرنا زندگی ضائع کرنے جیسا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے جس سنجیدگی سے کہا، انہیں معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ گھر پہنچتے ہی بخت سے بات ہوئی۔

''دیر مت کریں، امی کو شہر لے آئیے۔'' اور اگلے دن کی شام نصیبن بی بی شہر میں تھی۔ اگلی صبح انہیں اسپتال چیک اپ کے لیے لے جایا گیا۔

''یہ بیماریاں تو پہلے شہروں تک محدود تھیں۔ اب تو ہمارے گاؤں والے بھی اس کی لپیٹ میں آنے لگے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے بخت اور ارسل کو اپنے کمرے میں بلایا اور گفتگو کی ابتدا کی۔

''کالے یرقان کی وجہ دراصل ہیپاٹائٹس سی وائرس ہے ..... یہ وائرس جگر پر حملہ کرتا ہے۔ اگر بیماری کا پہلے پتا چل جائے تو ٹیکوں اور دوسری ادویات سے وائرس کو جسم میں صفر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اگر بروقت نہ پتا چلے تو جگر کی تبدیلی ہی علاج رہ جاتا ہے یا پھر علامتی طور پر مریض کو ٹھیک کر دیا جاتا ہے۔ جیسے خاتون بھی علاج کے مراحل کے بعد آئی ہیں۔ ان کا جگر بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا کہ ضعیف العمر ہیں۔ اب ہم رفع حاجت کے دوران آنے والے خون کو بند کرنے کی ... ادویات دے رہے ہیں۔'' سینئر ڈاکٹر کے ماتحت کام کرنے والے جونیئر ڈاکٹر نے نوجوان لڑکوں کو مرض کے متعلق اور مریض کی صورتِ حال کے متعلق تفصیلاً بتایا۔

☆☆☆

دستک کے بعد ارسل اندر کمرے میں داخل ہوا۔

''آؤ شہزادے آؤ۔'' انتظار نے ہی ارسل کو بلایا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے، تمہارے دوست کی ماں کی؟'' ارسل کاؤچ پر بیٹھا تو انہوں نے گفتگو کی ابتدا کی۔

''بہتر ہے۔ خون تو نہیں آ رہا مگر یہ عارضی علاج ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں وائرس ان کے جگر کو ناکارہ کر چکا ہے۔ عارضی علاج کے سہارے ہی زندگی گزرے گی۔'' انتظار سوچتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

''اللہ انہیں صحت یاب کرے۔ میں نے تمہیں خاص بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ وہ باتیں جو بیس سال کے ہو کر تمہیں خود ہی سمجھ لینی چاہیے تھیں۔'' انتظار موضوع کی طرف آئے۔

''جی ابو!'' ارسل مزید سیدھا ہو کر بیٹھا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ بات توجہ سے سن رہا ہے۔

''زندگی گزارنے کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ جذبات کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔ زندگی کا کلیہ کچھ لو اور کچھ دو ہے۔'' ارسل کا دل لمحے بھر کو کچھ زیادہ تیز دھڑکا۔ انتظار کیا کہنے جا رہے تھے۔

''بخت تمہارا دوست ہے۔ شاید تم اسے اپنا بھائی مانتے ہو مگر مت بھولو وہ تمہارا ملازم ہے۔ ایک چرواہے کا بیٹا۔ اگر تم نہ چاہتے تو وہ بھی اسکول نہ جاتا۔ تم نے فرمائش کی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شہر چلے۔ میں نے برا نہ منایا۔ اس کی ماں کالے یرقان کی مریضہ ہیں۔ وہ ان کا بیٹا ہے، علاج کروانا اس کا فرض ہے۔ سرکاری اسپتال میں علاج کے لیے لے جانے کے بجائے تم اسے پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے اور کثیر سرمایہ خرچ کر آئے۔ پہلے بھی وہ تمہارے بل پر یہاں ہے۔ پیسوں کی قدر جانو۔ انہیں سوچ سمجھ کر خرچ کرو گے تو ہی یہ تمہارے پاس رہیں گے اور ... بہرحال ہمارے پاس قارون کا خزانہ نہیں۔''

انتظار کی بات سن کر ارسل مسکرانے لگا۔

''ابو! چند پیسوں کے عوض جو محبت حاصل کی کیا وہ کم ہے؟'' چہرہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر جمائے وہ نرم مسکراہٹ سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''پیسوں کے عوض حاصل کی جانے والی محبت طویل العمر نہیں ہوتی اور ایسی محبتیں تم جب چاہو حاصل کر سکتے ہو۔'' انتظار اپنی زندگی کا تجربہ بیان کر رہے تھے۔ ارسل

مسکراتا رہا۔

''ٹھیک ہے ابو جو آپ کہیں۔'' زبان سے باپ کی تائید کرتے ہوئے ارسل کے انداز بتاتے تھے وہ متفق نہیں۔ بعید نہیں مستقبل میں بھی یہی روش اپنائے۔ انتظار نے بھی مزید سمجھانا بے کار جانا۔ اس لیے موضوع بدلا اور وہ موضوع چھیڑا جو آج کل ان کا پسندیدہ تھا۔

''سردار صاحب سے میں نے دعا سلام بڑھا لی ہے۔ انہیں چائے پر بھی مدعو کیا ہے۔ تھوڑا آنے جانے لگیں تو بات کروں گا۔ تب تک تمہارا بھی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو جائے گا۔ تب بات کرتے ہوئے بھی اچھا لگوں گا کہ بیٹا مستقبل کا ڈاکٹر ہے۔'' ارسل کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے پتا بھی نہ چلا۔ میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا۔ وہ قصہ تو سناؤ جب تمہیں عندلیب پسند آئی اور اتنی پسند آئی۔'' انتظار اشتیاق سے پوچھنے لگے۔

''نہیں...... ایسی باتیں باپ کو نہیں بتائی جاتیں۔'' چہرے پر نمائشی مسکراہٹ سجاتے ہوئے وہ جس قدر پہلو تہی کر سکتا تھا' کر رہا تھا۔

☆☆☆

لان میں لیمو کے درخت کے سامنے کرسی ڈالے، دائیں کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹکائے ارسل درخت کے لیموؤں کو تکے جاتا۔ کتنی دیر وہ یونہی اسے تکتا رہا۔ نگاہیں بھٹکتے ہوئے سامنے گھر کی دیوار پر گئیں تو عندلیب کو جھانکتے پایا۔ ارسل کو اپنی طرف دیکھتے پا کر عندلیب غڑاپ سے نیچے اتر گئی اور اب ارسل اس خالی جگہ کو تکے جاتا جہاں کچھ دیر پہلے عندلیب تھی۔

نہ کوئی خواہش ابھری۔ نہ کوئی امید۔ تبھی بخت کرسی کھینچتا نمودار ہوا اور ارسل کے ساتھ کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' بخت نے سوال کیا تھا۔

''کچھ نہیں۔ بس فرصت کو انجوائے کر رہا تھا۔'' ارسل نے جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر بخت گویا ہوا۔

''تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟'' ارسل ہنوز کرسی کے ہتھے پر کہنی ٹکائے بیٹھا تھا۔ چہرہ البتہ بخت کی طرف موڑ دیا۔

''امی کے علاج کے لیے تم نے جو معالی معاونت کی۔ میں چاہوں بھی تو وہ احسان......''

''پلیز!'' ارسل نے بخت کو درمیان میں ٹوکا۔ ''ایسی بات کر کے دوستی کو کم مت کرو۔'' ارسل نے جیسے بات کو ایک فقرے میں سمیٹ دیا اور بخت چاہ کر بھی کچھ کہہ نہ سکا۔

''آنٹی کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

''کافی بہتر ہے۔''

''انہیں اپنے ساتھ رکھو۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔''

''ملک صاحب کو برا نہ لگے۔'' بخت کو یہی ہچکچاہٹ تھی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ابو سے کہہ دوں گا۔''

اس سے ارسل کہاں جانتا تھا۔ بخت کی ماں کا یہاں قیام اس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں لائے گا۔

''اور سناؤ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کیسی ہے؟'' کچھ دنوں بعد انٹری ٹیسٹ تھا۔

''میں تو مطمئن ہوں۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔''

بخت نے ایک طویل سانس بھری۔

دونوں نے مزید کچھ باتیں کیں۔ فضا میں مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں تو وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

''کالے یرقان کے ساتھ آپ کی والدہ شوگر کی بھی مریضہ ہیں اور گولیوں سے شوگر اب کنٹرول نہیں ہو رہی تو انہیں انسولین پہ شفٹ کرنا پڑے گا۔'' بخت ماں کو لے کر میڈیکل چیک اپ کے لیے آیا تھا۔

''پر ڈاکٹر صاحب انسولین لگانے کے لیے تو روزانہ بار بار ٹیکا لگانا پڑتا ہے۔'' بخت نے تشویش ظاہر کی۔

''ہاں یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے بس ایک احتیاط جو بے حد ضروری ہے۔ کالا یرقان بنیادی طور پر سرنج یا دوسرے سرجیکل آلات سے پھیلتا ہے۔ آپ کی والدہ کی استعمال شدہ سرنج حادثاتی طور پر کوئی اور آدمی استعمال کرے اور نہ ایسی جگہ پر رکھی جائیں جہاں سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔'' ڈاکٹر صاحب نے مرض کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔

اسپتال سے نکل کر ماں کا ہاتھ تھامے' روڈ کراس کرنے کے بعد وہ ایک رکشے والے کو اپنے پاس بلانے لگا۔ تبھی موبائل فون گنگنانے لگا۔ بخت نے جیب سے موبائل نکالا۔ ارسل کی کال تھی۔

''بخت یار! انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آ گیا۔'' ارسل کی آواز میں خوشی چھلکتی تھی۔ بخت کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ کانوں میں سنائی دینے لگیں۔

''مجھے میرے مارکس بتاؤ۔'' بے قابو ہوتے دل کو

سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ آواز میں کپکپاہٹ تھی اور پورا جسم جیسے کان بن گیا تھا۔

☆☆☆

شہر شفٹ ہونے کے بعد انتظار نے ڈاکٹر عامر کو کئی بار یاد کیا۔ کئی سال پہلے وہ مثلِ بہشت میں مسیحا بن کر آئے تھے مگر اندرونی سازشوں کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ قیام نہ کر سکے۔ تب انتظار نے ان کا فون نمبر لیا تھا۔ شومئی قسمت نمبران سے کھو گیا اور وہ پھر ان سے رابطہ نہ کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب انتظار کے دل کو ایسے بھائے تھے کہ اب بھی کبھی کبھار ان سے ملنے کی خواہش دل میں جاگتی۔ ڈاکٹر عامر کی سادگی نے انہیں متاثر کیا تھا۔ وہ انسان دوست تھے۔ شاید یونہی سرِ راہ کسی موڑ پر ملاقات ہو جائے۔

صفدر کے ساتھ وہ گروسری اسٹور پر روزمرہ کا سامان لینے آئے تھے۔ مختلف اشیا کے ریکس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنی پسند کی مطلوبہ شے اٹھاتے اور ٹرالی میں رکھ دیتے۔ ٹرالی گھسیٹتے ہوئے صفدر ان کے پیچھے پیچھے چلتا۔

تبھی ان کی نظر ساتھ والے ریکس پر ہیئر کلرز کی ورائٹی پر نظر جمائے آدمی پر پڑی۔ پُروقار شخصیت کا حامل وہ انسان جس کی کن پٹی کے بال سفید تھے، انتظار کو جانا پہچانا لگا۔

”کہاں پر دیکھا تھا؟“ ریکس پر نظر جماتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔

بل ادا ہو گیا اور صفدر سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھنے لگا۔ تب وہ آدمی کاؤنٹر پر کھڑا بل بنوا رہا تھا۔ ساتھ نوعمر لڑکی تھی جو چہرے مہرے سے ان کی بیٹی لگتی تھی۔ گاڑی کے پاس کھڑے گروسری اسٹور کے شیشے کے پار وہ اس آدمی کو دیکھنے لگے۔ تب ان کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا۔

”ارے یہ تو ڈاکٹر عامر ہیں۔“ کئی سالوں بعد دیکھا تھا۔

اور جب وہ باپ بیٹی سامان کے شاپر اٹھائے گروسری اسٹور کے ملازم کی مدد سے سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے، انتظار ان کے پاس آئے۔

”السلام علیکم!“ انتظار نے سلام کر کے انہیں متوجہ کیا۔ سلام کا جواب دے کر وہ انتظار کو دیکھنے لگے۔ آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہ جاگی۔

”معاف کیجیے گا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ ہم پہلے کہاں ملے تھے؟“ ڈاکٹر عامر پوچھ رہے تھے۔

”میں ملک انتظار، مثلِ بہشت سے۔“ مثلِ بہشت کے نام سے وہ چونکے اور پھر انہیں انتظار کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔

”اوہ ملک صاحب! کیسے ہیں آپ؟ اتنے سالوں بعد۔“ وہ گرم جوشی سے گلے ملے۔ ”ملک صاحب! آپ تو بالکل بھی نہیں بدلے۔ لگتا ہے وقت نے آپ کو چھوا ہی نہیں۔ کہیں آبِ حیات تو نہیں پیا ہوا۔“

انتظار کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ”نہ ڈاکٹر صاحب! ایسی بات ہوتی تو آپ مجھے پہچان جاتے۔“

”یہ میری کم نظری ہے کہ میں آپ جیسی معتبر شخصیت کو نہ پہچان پایا۔“

”جانے دیں ڈاکٹر صاحب۔“

”ملک صاحب! میری بیٹی جویریہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے۔“ جویریہ مسکرا کر آگے بڑھی۔ موباف میں لپٹے بالوں والا سر تھوڑا سا جھکا کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! خوش رہو۔“ انتظار نے خوش دلی سے سلام کا جواب دیا۔

”میرا بیٹا بھی میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔ لاہور میں پڑھتا ہے۔ نمبر کم آئے تھے تو پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔“

”ملک صاحب! آپ دھن کے پکے ہیں۔ یاد ہے جب آپ نے افطار پر بلا کر اپنے بیٹے سے ملوایا تھا اور کہا تھا مستقبل کا ڈاکٹر ہے اور آپ نے داخلہ کروا ہی لیا۔“ انتظار ہنس دیے۔

”بس اللہ کی نوازشیں ہیں۔“

انتظار نے انہیں مختصراً اپنے شہر شفٹ ہونے کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اب تو بیٹا لاہور چلا گیا ہے اور اب وہ دوبارہ مثلِ بہشت شفٹ ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے کے نمبر کا تبادلہ ہوا۔ دونوں حضرات رخصت ہوئے۔

☆☆☆

انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ شاندار تھا۔ بخت کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

قائداعظم میڈیکل کالج۔ وہ جگہ جہاں اس نے داخلے کا خواب دیکھا، آج وہ خواب تکمیل کو پہنچا۔ کچھ ہی عرصے میں کلاسز کا آغاز ہو گیا۔ وائٹ کوٹ ہاتھوں میں تھامے میڈیکل بکس شولڈر بیگ میں لیے، وہ بس اسٹاپ پر کالج بس کا انتظار کرتا نظر آتا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹتی۔ شانِ بے نیازی اس کی چال سے ظاہر ہوتی۔

ارسل بھی لاہور کوچ کر گیا۔ لاکھوں روپے فیس بھر کر اس

کا لاہور کے اچھے پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگیا۔ لاہور جا کر اس نے خود کو بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔
جینز سے اس کی وارڈروب بھر گئی۔ ایک اچھے سے سیلون سے جا کر ہیئر اسٹائل تبدیل کروایا، فیشل مساج کو اپنایا۔ باڈی لینگویج اور انگلش بہتر کرنے کے لیے اس نے کوچنگ کلاسز میں داخلہ لے لیا اور ہر وہ کوشش کی جس سے وہ اپنے اوپر لگا پینڈو کا لیبل اتار سکتا۔
ایک مہینے بعد وہ بہاولپور آیا۔ انتظار تا حال یہیں رہائش پذیر تھے۔ اب مکمل طور پر شملِ بہشت جا کر رہنے کا دل نہ کرتا۔ کبھی سوچتے شملِ بہشت چلے جائیں اور کبھی سوچتے یہیں رہیں اور کبھی سوچتے لاہور میں بیٹے کے ساتھ گھر آباد کریں۔ تا حال کوئی مستقل سوچ نہ تھی کہ اسے جامہ پہنایا جاتا۔
ارسل اس قدر بدلا ہوا آیا کہ انتظار حیران رہ گئے۔ خوش رنگ جینز کے ساتھ ٹی شرٹ۔ ٹی شرٹ کے گلے میں اٹکے گلاسز۔ بدلا ہوا ہیئر اسٹائل۔
”شہزادے! تم نے تو ایک مہینے میں خود پر لاہور کا رنگ چڑھا لیا۔“ انتظار مسکرائے۔ ارسل صحیح طرح جھینپ بھی نہ سکا۔ چاہ کر بھی وہ آئینے کے سوا کسی اور سے نہ پوچھ سکا تھا۔ ”بتاؤ اب تو نہیں ہوں پینڈو۔“
”سردار صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ رات کو انتظار کہہ رہے تھے۔
”میں فون کرتا ہوں۔ وہ جب کہیں، مل آتے ہیں۔“
انتظار فون اٹھا کر کال کرنے لگے۔ علیک سلیک کے بعد انتظار مدعے پر آئے۔ سردار صاحب نے کل شام چائے پر مدعو کیا۔
”شہزادہ ہے میرا بیٹا...... دیکھتے رہ جائیں گے۔“ انتظار نے ساتھ بیٹھے ارسل کی پیٹھ پر تھپکی دی۔
چہرے پر سنجیدگی سجائے ارسل چپ بیٹھا رہا۔
☆☆☆
سرخ ٹی شرٹ، سیاہ جینز۔ گلے میں جھولتے گلاسز۔ پاؤں میں فلیٹس۔ خوشبوؤں میں بسا ارسل باپ کے ساتھ سردار صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔
اب بھلا کوئی لڑکی اسے پینڈو کہہ کر مسترد کر سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔
سردار صاحب گرم جوشی سے ملے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ قریب قریب رشتے کے لیے راضی ہیں۔ بس لڑکی والے ہو کر جلدی ہاں نہیں کہنا چاہتے۔ ان کی زوجہ بھی آن بیٹھیں اور ارسل سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرنے لگیں۔ انہیں بھی لڑکا اپنی عندلیب کے لیے اچھا لگا اور تھوڑا ماڈرن بھی لگا۔ ان کی عندلیب نسبتاً سیدھی سادی تھی چلو خیر سبھی فیشن کرتے ہیں۔ عندلیب چائے کی ٹرے لیے اندر آئی۔
آنچل سر پر ڈھکے ہوئے، چہرے پر شرم لیے۔ نگاہیں جھکائے اس نے ٹرے مرکزی میز پر رکھ دی اور پاؤں کے بل بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔
”کتنی چینی؟“ عندلیب نے ارسل سے پوچھا تھا۔ یہ وہ لڑکا نہ تھا جو ساتھ والے گھر میں جھانکتے ہوئے اسے نسبتاً زیادہ اچھا لگتا تھا لیکن خیر جو بھی ہے اچھا ہے۔ عندلیب خود کو مطمئن کرتی رہی۔
”ڈیڑھ چمچ!“ ارسل دیکھنے لگا۔ سیدھی سادی لڑکی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ آنکھیں ایسی کہ شاعری پر اکسائیں۔ چہرے پر معصومیت ایسی کہ دل کرے دیکھتے ہی رہیں مگر ارسل نے نگاہیں پھیر لیں۔
وہ لڑکی چاہے جتنی خوبصورت تھی، جویریہ تو نہ تھی اور دل میں تو جویریہ بسی تھی۔ وہی جویریہ جو اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر اسے پینڈو کہا کرتی تھی۔
ارسل کا دل اچاٹ سا ہوگیا اور وہ اس ملاقات کے اختتام کا انتظار کرنے لگا۔ واپسی پر انتظار ارسل سے کہہ رہے تھے۔
”شہزادے! اس گھر کو اپنا سسرال سمجھنا شروع کر دو۔ سردار صاحب ہاں کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ کچھ ہی دنوں تک ہاں کہہ دیں گے۔ ہاں کہنے میں دیر کرنا لڑکی والوں کی روایت ہے۔“
جب وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے، بخت لان میں بیٹھا اناٹومی کے اسکیچز بنا رہا تھا۔ انتظار اندر کمرے میں چلے گئے اور ارسل بخت کے ساتھ آن بیٹھا۔
”کہاں سے آرہے ہو؟“ یہ معمول کا سوال تھا۔
”اپنے رشتے کے لیے گیا تھا۔“ جواب معمول کا نہ تھا۔
بخت حیرانی سے ارسل کو دیکھنے لگا۔
”کہاں؟“
”ساتھ والے گھر۔“ ارسل نے آنکھ سے اشارہ کیا۔
”وہ لڑکی جھانکتی رہتی تھی، مجھے اچھی لگنے لگی۔“ بخت کی آنکھیں تحیر سے پھیلنے لگیں۔
”کون...... عندلیب؟“
”لو تمہیں تو اپنی بھابی کا نام بھی پتا ہے۔“ دوست کو پہلی بار بتاتے ہوئے وہ نہ مسکرایا اور نہ ہی اس کے دل میں

لڈو پھوٹ رہے تھے۔

ساتوں زمینیں بخت کے پیروں تلے سے کھسک گئیں۔ ساتوں آسمان اس کے سر پر ٹوٹ پڑے اور وہ ساکن سا ہو گیا۔

اس کا دوست اس کی محبوبہ کے گھر اپنے رشتے کے لیے ہو آیا تھا اور اس کی محبوبہ کو اپنی بیوی بنانے کی خوش خبری دے رہا تھا۔ وہ ساکن نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

☆☆☆

آسمان پر گول ٹکیا سا چاند چاندنی بکھیر رہا تھا۔ اس چاندنی میں آسودگی تھی۔

موسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ گو کہ ابھی سویٹر پہننے اور کمبل اوڑھنے کا وقت نہ آیا تھا۔ پھر بھی ایک ٹھنڈ کا احساس تھا۔

ارسل کے کمرے کو انرجی سیور نے روشن کیا ہوا تھا۔ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ارسل ڈھیلی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ یہ اس کا شب خوابی کا لباس تھا۔ سامنے بیٹھے بخت نے جینز پہن رکھی تھی۔ دل ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ رات گئے بھی کپڑے بدلنے کا خیال نہ آیا۔

دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے' بخت کو دیکھتے ہوئے ارسل غور سے بخت کو سنے جاتا۔ نظریں جھکائے بیٹھا بخت، اضطرار جس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سے واضح ہوتا۔ مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا ارسل کب مگر عندلیب مجھے اچھی لگنے لگی۔ میں اس سے محبت کرنے لگا۔ وہ دیوار سے جھانکا کرتی اور میں اسے تکا کرتا۔ میں اس انتظار میں سہ پہر کے پہر لان میں گزار دیتا کہ اب جھانکے کہ ابھی جھانکے۔ وہ جھانکتی اور میں اسے نظر بھر کر دیکھ لیتا پھر سارا دن اچھا گزرتا۔ یہ روٹین دو سالوں سے جاری تھی اور مجھے خود بھی احساس نہ ہوا اور میں نے اعترافِ محبت کر لیا۔ اور اس کے ساتھ حسین خواب دیکھنے لگا۔ مجھے پتا ہوتا کہ تم بھی اسے پسند کرنے لگے ہو تو میں پہلے پیچھے ہٹ جاتا اس قدر آگے نہ جاتا مگر ارسل اب دیر ہو چکی ہے۔ میں واپس نہیں پلٹ سکتا۔ میں پلٹنا بھی نہیں چاہتا۔ تم نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ آج میں میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہوں تو اس کی وجہ تم ہو۔ اب مجھ پر ایک اور احسان کر دو۔''

بخت چپ ہوا تو ارسل گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ بخت کتنے لمحے انتظار کرتا رہا کہ ارسل کچھ بولے مگر جب وہ کافی دیر کچھ نہ بولا تو بخت بولنے لگا۔

''میں سمجھتا تھا تمہیں جویریہ پسند ہے۔ وہ کالج والی لڑکی۔ اب میڈیکل کالج میں وہ میری کلاس فیلو ہے۔ ایک دفعہ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا بھی ہے۔ کیا تم بھی عندلیب کو پسند کرتے ہو یا محبت کرتے ہو؟''

بخت ارسل کو دیکھنے لگا' وہ چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ ارسل کی نگاہوں میں ایسی اپنایت تھی کہ بخت کے دل کو تقویت ملی۔

''ارسل! کچھ بولو تو سہی۔''

''کیا احسان کرنا ضروری ہوتا ہے۔'' ارسل نے کہا تو بخت اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔

''تمہیں چاہیے تھا یوں بھیگی بلی کی طرح نہ آتے اور سر جھکا کر مجھ سے التجا نہ کرتے۔ بلکہ دھڑ سے دروازہ کھولتے ایسے جیسے توڑنے کا ارادہ رکھتے ہو اور مجھے ایسی غصے بھری نگاہوں سے دیکھتے جیسے ابھی کھا جاؤ گے۔ اور کہتے اوئے ارسل...... عندلیب میری نہیں تیری بھابی ہے۔ ہٹ جا ہمارے درمیان سے۔ راستے کا پتھر نہ بن۔ ورنہ تو نہیں یا میں نہیں......'' ارسل ہنسنے لگا اور بخت ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''مجھے عندلیب اچھی لگی تھی اور بھابی کے روپ میں بھی اچھی لگے گی۔ تم پریشان نہ ہو میرے دوست۔'' ارسل نے آگے بڑھ کر اس کے گال تھپتھپایا۔

اور بخت کے چہرے پر گلابوں سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''شکریہ' بہت شکریہ ارسل!''

''کیا احسان اور شکریے کے الفاظ لغت سے ختم نہیں ہو سکتے۔ چلو لغت سے ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں مگر کم از کم تم مت بولا کرو۔ یہ میری آخری تنبیہ ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

بخت کھلتی مسکراہٹ اور دھڑکتے دل کے ساتھ ارسل کے کمرے سے رخصت ہوا۔ بخت کے جانے کے بعد ارسل نے دروازہ بند کیا اور کاؤچ پر آڑا ترچھا بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

''بخت کو لگنے لگا تھا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ کیا تمہیں نہ پتا چلا جویریہ؟'' چشم زدن میں وہ جویریہ سے مخاطب تھا۔ کیا وجہ تھی وہ پری وش بھولتی ہی نہ تھی۔ ان چند ماہ میں کیا کچھ نہ بدلا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ بنا ماں باپ کی پہچان کے ہے۔ اس نے شہر بدل لیا تھا۔ پہننا اوڑھنا بدل لیا تھا۔ دلچسپی کے نئے سے نئے پہلو ڈھونڈے تھے مگر وہ بھولتی ہی نہ تھی۔

☆☆☆

اپنی بقا اور حفاظت کے لیے انسان نے ایٹم بم بنا

لیے اور وہ اپنی حفاظت کرنا بھی کس سے چاہتا ہے؟ دوسرے انسانوں سے۔

اور انسان بھی کیا چیز ہے کبھی جنگی ہتھیاروں کو لڑائی کے لیے استعمال کرتا ہے تو کبھی معاشی ابتری سے حملہ کرتا ہے اور کبھی جراثیم کی منتقلی کا کھیل کھیل کر وبا پھیلاتا ہے۔ بخت نے بھی تو کچھ ایسا کام کیا تھا۔

☆☆☆

بخت نے دروازے پر دستک دی۔ اور اندر جھانکا۔

''اندر آجاؤں؟''

انتظار نے سر کو ذرا سا خم دے کر اجازت دی تو وہ اندر داخل ہوا اور کمرے کے وسط میں جا کھڑا ہوا۔

کمرے کی سجاوٹ میں پُر وقار رکھ رکھاؤ تھا اور کمرے کے وسط میں سرخ قالین کا ٹکڑا تھا جس پر بخت ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

انتظار صوفے پر بیٹھے تھے' تمکنت سے بازو لمبا کر کے صوفے کی پشت پر رکھے۔ آنکھیں غصے سے شرربار تھیں۔

''جی ملک صاحب! آپ نے مجھے یاد فرمایا۔'' بخت کی آواز پر ملک انتظار اسے گھورتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ لمحے بھر کو بخت کا دل اچھل پھل ہو گیا۔ کمرے میں در آئی خاموشی کو انتظار کی گمبھیر آواز نے توڑا۔

''اپنا بوریا بستر باندھو اور نکلو اس گھر سے۔'' بخت نے چونکتے ہوئے انتظار کو دیکھا اور نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آستین کے سانپ...... ساری زندگی تمہیں کھلایا پلایا۔ یہ جو تم چھ فٹ کے نظر آرہے ہو سب ارسل کی وجہ سے ہے اور اب اسی کے منہ کو آرہے ہو۔'' بخت کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ سب انتظار کہہ رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ بھی اسے رسید کر دیا۔ بخت سنبھل ہی نہ پایا اور لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔

سرخ قالین پر گرتے ہوئے بخت نے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ملک انتظار کو دیکھا تھا۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میرے بیٹے کی پسند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھو۔ سردار کی بیٹی میرے ارسل کی دلہن ہے۔ تم دو ٹکے کے لڑکے' باپ کی جگہ بکریاں چراتے یہ اچھا تھا۔ نکلو یہاں سے۔'' انتظار نے اب کے بار پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی۔ بخت اب انتظار کی طرف دیکھ ہی نہ پایا۔ سر جھکائے سرخ قالین کو تکتا رہا۔ اس قدر ذلت، اتنی رسوائی۔

''صبح تک تمہارا منحوس چہرہ مجھے نظر نہ آئے۔ جاؤ یہاں سے۔'' اب انتظار صوفے پر ہانپ رہے تھے۔

بخت نے اپنے وجود کا بوجھ اٹھایا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

انتظار دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ سوچ سمجھ کر بولنے کے عادی تھے۔ ملازمین سے ایک حد کا فاصلہ رکھنا ان کا اصول تھا لیکن ملازمین سے ہمیشہ اچھے سے پیش آتے۔ ضرورت پڑنے پر ڈانٹ دیتے' غصہ ہو لیتے مگر کسی ملازم پر ہاتھ نہ اٹھایا۔

پتا نہیں انہیں آج بخت پر اتنا غصہ کیوں آیا۔ دراصل بخت انہیں ابتدا سے کچھ خاص پسند نہ تھا۔ ارسل کی محبت میں وہ اسے برداشت کر لیتے۔ ارسل کہتا رہا اور وہ اسے مراعات دیتے گئے اور یہاں شہر آ کر تو جیسے وہ ملازم ہی نہ رہا۔ ارسل اور انتظار کی طرح نہ سہی مگر وہ گھر کے فرد کی طرح رہتا اور دیگر ملازمین بھی اس کا کہا مان لیتے۔

وہ ارسل سے آگے بڑھ گیا۔ یہ بات انتظار کو پسند نہ آئی۔ پر خدا کی مرضی، وہ چپ رہے۔ ارسل کو پتا چلا کہ وہ ان کا حقیقی بیٹا نہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ انتظار سے بدظن ہوتا یا لڑائی جھگڑا کرتا وہ چپ رہا' غمگین تو ہوا پر انتظار کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ اگر وہ اسے اپنے سائے میں نہ لیتے تو...... اس بات نے انتظار کو ارسل کے متعلق مزید حساس کر دیا۔

ارسل نے لاہور جانا چاہا وہ متامل تو تھے مگر انہوں نے اسے نہ روکا پھر ارسل نے انہیں بتایا کہ وہ اپنے لیے ایک لڑکی پسند کر چکا ہے۔ اس بات نے تو ان کا جیسے سیروں خون بڑھا دیا۔ لڑکی بھی اچھے خاندان' اچھے والدین کی اولاد' پڑوس کی بات۔ ایک طرح سے دیکھی بھالی تھی۔ وہ بے انتہا خوش تھے۔ رشتہ بھی ڈال دیا اور ان کی طرف سے ہاں کے بھی منتظر تھے۔ مگر پھر ارسل نے انہیں آ کر کہا کہ وہ اس رشتے کو بخت کی طرف موڑ دیں۔

''کیوں؟''

''کیونکہ بخت اس کو پسند کرتا ہے بلکہ محبت کرتا ہے۔ مجھے تو کوئی بھی اور مل جائے گی۔ بخت کو اس کی پسند ملنی چاہیے۔'' انتظار کو خوب تاؤ آیا مگر ارسل کو کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے بخت سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ بخت پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر وہ کونسا لمحہ تھا جب یہ سب ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے ہاتھ بھی اٹھایا اور ٹھوکر بھی ماری۔ وہ تو بس یہی چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ کہیں بھی اور عندلیب ان کی

بہو بن کر آجائے۔

اور رات کے اس پہر انہیں پچھتاوے نے گھیرا ہوا تھا کہ انہوں نے اور کچھ زیادہ برا کر دیا۔

''چلو خیر۔ کھلایا پلایا اس مقام تک بھی پہنچایا کہ وہ کل کا ڈاکٹر ہے۔ کبھی معافی مانگ لیں گے۔'' آرام سے کرسی پر جھولتے ہوئے وہ خود کو تسلی دے رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ تلوار کے گھاؤ بھر جاتے ہیں زبان کے نہیں......

☆☆☆

کمرے میں اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ سیاہی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ وہ سیاہی جو ہر قسم کی اچھائی نگلنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور کرسی پر بیٹھا بخت...... جس کا وجود اس سیاہی میں گم تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ماں سو رہی تھی۔ اسے ماں پر غصہ آنے لگا۔ اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا' ذلت اٹھانے کے لیے کہ لوگ پہلے اسے اپنے گھر میں جگہ دیں اور جب سب کچھ اپنا لگنے لگے تو اسے ٹھوکریں مار کر کہا جائے نکل جاؤ یہاں سے۔

ارسل اس کا دوست... وہ ہمیشہ ارسل کا شکر گزار رہا۔ شعور کی جیسے جیسے منزلیں پار کرتا گیا، اسے احساس ہوتا گیا کہ سب اس لیے ہے کہ ارسل نے خواہش کی ہے۔ ارسل کے ساتھ ہمیشہ ایک ممنونیت کا رشتہ برقرار رکھا۔ گو کہ کبھی کبھار ایک حسد کا بھی جذبہ منہ چڑانے آجاتا اور اسے ارسل برا لگنے لگتا اور وہ یہ سوچنے لگتا کہ ارسل کی جگہ وہ ہوتا۔ مگر اس جذبے نے کبھی اتنی پروان نہ پائی کہ وہ محض اسی جذبے کا اسیر بن کر رہ گیا ہو۔

اب عندلیب اسے پسند تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا۔ ارسل عندلیب سے محبت نہیں کرتا۔ اس صورت حال میں بھی کیا وہ اپنے دوست سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے لیے یوں مت کرو۔ عندلیب سے رشتہ نہ جوڑو۔

بالکل کہہ سکتا تھا۔ پھر ملک انتظار نے ایسا کیوں کیا؟ منظر ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوما۔ کمرے کے وسط میں سرخ قالین پر رخسار پر ہاتھ رکھے وہ بے یقین نگاہوں سے ملک انتظار کو دیکھ رہا ہے اور ملک صاحب اسے ٹھوکر مار رہے ہیں۔

دائیں ران میں جہاں ملک صاحب نے ٹھوکر ماری تھی اچانک سے درد کی شدید لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ گال بھی دکھنے لگا جہاں تھپڑ پڑا تھا۔ ران اور گال دونوں ہی پھوڑے کی طرح دکھنے لگے۔

بخت نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔ لیمپ کی روشنی نے اندھیرے کو چیرا اور اس کے وجود کا ہیولا سامنے دیوار پر بننے لگا اور وہ وحشت بھری نگاہوں سے ہر طرف دیکھنے لگا۔

رات کے دس بجے ملک صاحب نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا جب وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ صبح اجالا پھیلتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا مگر کہاں؟ مشکل بہشت میں اپنے گھر کے علاوہ وہ کہاں جا سکتا تھا اور اس کی پڑھائی۔ اس کا ڈاکٹر بننے کا خواب...... آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔

''کیوں، کیوں، کیوں؟'' کیوں کی تکرار اسے کھائے جاتی۔ وحشت بھری نگاہیں کمرے میں موجود اشیا پر بھٹکتیں۔ کبھی وہ ماں کو دیکھتا' کبھی بستر کو۔ کبھی کپڑوں کی الماری کو تو کبھی جوتوں کے ریک کو اور کبھی ماں کی دواؤں کی تپائی کو اور پھر اس کی نظریں ماں کی دواؤں والی تپائی پر ٹھہر گئیں اور ڈاکٹر کے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

''بس ایک احتیاط جو بے حد ضروری ہے۔ کالا یرقان بنیادی طور پر سرنج یا دوسرے سرجیکل آلات سے پھیلتا ہے۔ آپ کی والدہ کی استعمال شدہ سرنج حادثاتی طور پر کوئی اور آدمی استعمال کرے اور نہ ایسی جگہ پر رکھی جائیں جہاں سے نقصان کا اندیشہ ہو۔''

ماں کی دواؤں کی تپائی جہاں پر پڑی انسولین سرنج بس ایک ہیولا لگتی تھی۔

''یہ معمولی نوعیت کی سرنج ہے۔ اس کی سوئی بے حد باریک ہے۔ ٹیکا لگنے کا درد چیونٹی کے کاٹنے کے درد سے بھی کم ہوگا۔ گہری نیند میں سوئے کسی انسان کو لگائی جائے تو بعض اوقات اس کی نیند بھی نہ ٹوٹے گی۔'' ڈاکٹر کا کہا اسے یاد تھا۔ نگاہیں سرنج پر جمی رہیں اور ڈاکٹر کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔

نفرت نے دل و دماغ پر کچھ ایسے ڈیرے ڈالے کہ دماغ شیطانی سوچیں بُننے لگا اور دل نے اسے ان سوچوں پر عمل پیرا کرنے پر آمادہ کیا۔

سرنج اٹھائے وہ کتنی دیر اسے دیکھتا رہا پھر سرنج ہاتھ میں لیے دبے پاؤں چلتا ہوا ارسل کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ارسل کے کمرے کا دروازہ بند تھا مگر وہ کبھی کنڈی نہ لگاتا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ بنا چاپ کیے وہ ارسل کے قریب آیا۔ نائٹ بلب روشن تھا۔ بنیان اور ٹراؤزر میں ملبوس ارسل سو رہا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سوتے ہوئے اس کی بنیان تھوڑی اوپر اٹھی ہوئے تھی۔ پیٹ اور کمر کا تھوڑا حصہ واضح تھا۔

سرنج ہاتھ میں لیے چند لمحے وہ سوچتا رہا پھر اس نے سرنج ارسل کی کمر میں پیوست کر دی۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کل گلی ڈنڈا لاؤ گے...... لائے کیوں نہیں؟''

''بھول گیا...... کل لاؤں گا وعدہ، سچا وعدہ، پکا وعدہ۔''

''تمہیں کون سی بکری سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے؟''

''مجھے...... وہ کالی بکری...... لاڈو۔''

''میں نہیں کھیلتا تمہارے ساتھ۔ تم زور سے مارتے ہو۔''

''مار تو کھانی پڑے گی۔ بے ایمانی نہیں چلے گی۔''

''بستے میں مینڈک ہے۔ ہم مل کر مینڈک پالیں گے اور اس سے کھیلا کریں گے۔''

''ارسل! بڑے گم صم رہتے ہو؟''

''نہیں یار! کوئی بات نہیں۔''

''اونچی شاٹ مت لگانا۔ گیند باہر گئی تو خود جا کر اٹھانا۔''

تمام باتیں، تمام خوبصورت پل۔ تمام یادیں مٹی کا ڈھیر ہو گئیں۔ سرنج سے جراثیم ارسل کے جسم میں منتقل ہو گئے۔

☆☆☆

سرنج پیوست ہونے سے وہ ہلکا سا کسمسایا۔ آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بخت کو خود پر جھکے پایا۔

''بخت! تم اتنی رات کو...... خیریت تو ہے؟'' ارسل نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ بیدار ہونے کے بعد اسے کمر پر تھوڑی سی جلن محسوس ہو رہی تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے پایا۔ ایسے جیسے چیونٹی نے کاٹا ہو۔

''وہ نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچا باتیں کر لیں۔'' ہاتھ میں دبی سرنج وہ نیچے پھینک چکا تھا اور پاؤں سے اسے بیڈ تلے دھکیل چکا تھا۔

''اوہ بخت! میرے دوست، مجھے تو بہت نیند آرہی ہے۔ سو جاؤ ادھر میرے ساتھ ہی آجاؤ۔'' ارسل پھر سے سرہانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند چکا تھا۔ ڈبل بیڈ کے دوسری طرف وہ بخت کو سونے کا مشورہ دے رہا تھا۔

''جانے کسی چیونٹی نے کاٹا ہے۔ کمر میں درد ہو رہا ہے۔ یہ بستر پر چیونٹیاں کہاں سے آئی ہوں گی۔'' ارسل اوندھا ہو کر کمر مسل رہا تھا۔ بخت کا دل سینہ چیر کر بس باہر آنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم سوؤ اللہ حافظ۔'' بخت جانے لگا۔

''اللہ حافظ! صبح ملتے ہیں۔'' ارسل کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کے ذہن میں سوچ نے چٹکی لی تھی۔ ''یہ اس نے کیا کر دیا؟''

☆☆☆

ہائی ایکس جھٹکے سے موڑ پر رکی۔ کنڈیکٹر نے سامان اتارا اور دونوں ماں بیٹا تانگے پر سوار نہرِ بہشت روانہ ہو گئے۔

''بخت اتنا غمگین کیوں ہے؟'' نصیبن نے بلا مبالغہ بیسویں بار پوچھا تھا۔

''نہیں اماں! تجھے وہم ہو رہا ہے۔'' بخت نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

''وہم نہیں۔ کچھ تو ہے۔'' نصیبن منہ ہی منہ میں کچھ کہنے لگی۔

''بڑے صاحب یا چھوٹے صاحب نے تو کچھ نہیں کہا؟''

بخت نے نفی میں سر ہلایا۔ نصیبن اسے دیکھ کر رہ گئی۔

تانگا اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے ہوتا نہرِ بہشت کے پل سے گزرا۔ نہرِ بہشت جو سوکھی ہوئی تھی۔ تانگے بان نے ایک طویل سانس بھر کر بخت کو مخاطب کیا۔

''او یار! دیکھو ہماری بہشتی نہر کو کس کی نظر لگ گئی۔ دادی کہتی تھی کہ اس کی دادی نے بھی اس نہر کو کبھی سوکھا نہ دیکھا تھا...... وہ نہر جس کو نسلوں نے سوکھا نہ دیکھا ہماری کم قسمتی۔ آج ہم اسے سوکھا دیکھ رہے ہیں۔'' تانگے بان کے لہجے میں افسوس تھا۔ بخت نے یونہی بیزاری سے نہر کی سمت دیکھا۔ نہر کنارے انگریزی کیکر کے سائے میں اسے بچپن کے بخت اور ارسل بیٹھے نظر آئے۔

''گلی ڈنڈا ارشد ترکھان سے بنوایا تھا۔ دیکھو گلی کیسی نکیلی ہے۔ ڈنڈا ماروں تو ہوا میں یوں اڑتی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔''

بچپن کی یادیں ہوا کے جھونکے کی طرح آئیں۔

بخت نے رخ موڑ لیا اور حال کی باتیں بازگشت کی طرح گونجیں۔

''آستین کے سانپ ساری زندگی تمہیں کھلایا پلایا۔ یہ جو تم چھ فٹ کے نظر آرہے ہو، سب ارسل کی وجہ سے ہے اور اب اسی کے منہ کو آرہے ہو۔'' انتظار کی پھنکارتی آواز کانوں میں گونجی اور بخت کی آنکھیں ابلنے لگیں۔

''آئے ہائے...... نہرِ بہشت سوکھ گئی۔ اللہ ہم سے ناراض تو نہیں؟'' نصیبن کی آواز بخت کے کانوں میں پڑی۔

''بس بہن اللہ سے معافی مانگو۔ یہ ناراضی کا

اشارہ ہوسکتا ہے۔ سارا مثلِ بہشت بدل گیا۔ نہر کے میٹھے پانی سے زندگی گزارنے والے اب مشکل سے گزارا کررہے ہیں۔ زیرزمین پانی نہانے دھونے اور پینے کے کام آتا ہے۔" تانگابان مثلِ بہشت کے مکینوں کی زندگی میں آئی تبدیلی سے آگاہ کررہا تھا۔

بخت روٹھا سا بیٹھا نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بے کار کی باتیں سنتا رہا۔

رات کو چارپائی پر لیٹا آسمان کو تکتا رہا۔ ساری زندگی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی۔ جب وہ باپ کے ساتھ بکریاں چرانے جاتا تھا۔ جب ارسل اس سے ملنے آیا تھا۔ جب ارسل اسے عیدی دینے آیا تھا۔ جب وہ اسکول پڑھنے گیا تھا۔ جب وہ شہر شفٹ ہوا تھا۔ جب اس کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہوا تھا۔ جب اسے عندلیب اچھی لگنے لگی تھی۔ اور جب ملک انتظار نے طعنہ دیتے ہوئے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے اوقات یاد دلائی تھی۔

ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ کبھی اس کروٹ تو کبھی اس کروٹ۔ صبح دم ہی وہ ماں سے کہہ رہا تھا۔

"اماں! میں نے شہر جانا ہے۔ پڑھائی کا حرج ہورہا ہے۔" نصیبن حیرت سے بخت کا منہ تکنے لگی۔

"ابھی کل تو آئے ہو۔ دو دن ٹھہر جاؤ۔ بہنوں' بھانجے بھانجیوں سے تو اچھی طرح مل لو۔"

"نہیں اماں! پڑھائی کا حرج ہوگا۔" بخت نے اپنی بات پھر سے دہرائی تھی۔

نصیبن بیٹے کو دیکھنے لگی۔ جانے کیوں وہ اسے بدلا بدلا سا لگتا تھا۔

☆☆☆

"بڑی عجیب بات ہے۔ رات کو کمرے میں آیا کہ باتیں کرتے ہیں اور اب صبح صبح غائب ہے۔" صوفے پر پاؤں پسار کر بیٹھتے ہوئے وہ بخت کو فون کرنے لگا۔

بخت نے فون نہ اٹھایا۔ ایک دفعہ فون کیا' دو دفعہ فون کیا تیسری دفعہ کیا۔ کئی دفعہ کیا مگر بخت نے کال ریسیو نہیں کی۔

"بخت بغیر بتائے چل دیے۔ میرے لاہور جانے کے بعد چلے جاتے۔ مثلِ بہشت کہیں بھاگ نہ جاتا۔ میں تم سے ناراض ہوں۔" پیغام ٹائپ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ پرسوں واپسی لاہور کا ارادہ تھا۔

تبھی انتظار لاؤنج میں آئے اور ارسل کے بالمقابل بیٹھ گئے۔ غور سے ارسل کو دیکھنے لگے۔ بیٹے کے انداز بدل گئے تھے۔ پہننا اوڑھنا بدل گیا تھا۔ ایک لڑکی کے لیے پسندیدگی کا اظہار بھی کردیا تھا مگر پھر بھی بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔ جانے واقعی کوئی مسئلہ تھا یا پھر ان کا وہم تھا۔

"ابو! کیا دیکھ رہے ہیں؟" ارسل انتظار کے یوں یک ٹک دیکھنے پر جھینپ سا گیا۔ انتظار مسکرانے لگے۔

"یہ بخت کو دیکھیں۔ صبح صبح بغیر بتائے چلا گیا۔ میں بخت ناراض ہوں اس سے۔" ارسل بخت سے ناراضی کا اظہار کرنے لگا۔ انتظار نے اپنی رات کو بخت کے ساتھ ہونے والی گفتگو اور ہاتھ اٹھانے کے بارے میں نہ بتایا۔ بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

"ناشتا کرلیا شہزادے؟" انتظار مدعے پر آئے۔

ارسل نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر چینج کرلو۔ شرٹ ٹھیک ہے۔ ٹراؤزر کی جگہ جینز پہن لو۔ میرے دوست نے ناشتے پر بلایا ہے۔ پرانے دوست ہیں ڈاکٹر عامر...... وہ جو مثلِ بہشت میں بھی آئے تھے۔ تمہیں بھی ملوایا تھا۔ شاید یاد ہو۔" ارسل کو اس ملاقات کی ہلکی شبیہہ یاد تھی مگر اس کا کہیں جانے کو دل نہیں کررہا تھا۔ یہ سوچا بھی کہ باپ کو انکار کردے مگر یہ سوچ کر کہ گھر خالی بیٹھ کر کیا کروں گا' وہ راضی ہوگیا۔ ٹراؤزر کی جگہ جینز پہن لی۔ بالوں میں برش بھی کرلیا۔ اور وہ باپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ اس نے بھلا وہاں جاکر کیا کرنا ہے۔ "ابو! آپ تو اپنے دوست کے ساتھ گپیں لگائیں گے' میں کیا کروں گا؟"

"چپ کر کے چلو۔" انتظار گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے اور اگلے پل گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔

"زیادہ دیر مت بیٹھیے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا۔" ارسل کہہ رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے انتظار یوں بیٹھے رہے جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"ابو! میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔" ارسل نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"سن لیا تمہارا عالی فرمان۔" انتظار مسکرا اٹھے۔

"زیادہ دیر ہوئی تو میں رکشا لے کر آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے آجانا۔ میں تو رات کا کھانا کھا کر ہی آؤں گا۔" انتظار بیٹے کو چڑانے لگے۔ ایک مسکراہٹ ارسل کے لبوں کا احاطہ کرگئی۔

"اب آپ کے دوست نے گھر پر ناشتے کے لیے بلایا ہے تو گھر کی بنی ہوئی کوئی چیز بھی ہوگی۔ یہ نہ ہو بازار کے نان چنے اور حلوا پوری سامنے رکھ دیں۔" جواباً انتظار نے گھورنے پر اکتفا کیا۔

ڈاکٹر عامر نے گیٹ پر استقبال کیا اور جس طریقے سے وہ ملے، ارسل کو لگنے لگا ایک گھنٹے میں واپسی ممکن نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لان میں بٹھایا۔ وہ اور انتظار تو باتوں میں ایسے مگن ہو گئے کہ ارسل سوچنے لگا کہ ناشتا تو دوپہر کا کھانا بن جائے گا مگر خیر ملازم ناشتا لگانے لگا۔

نان چنے اور حلوا پوری۔ ارسل کا منہ بن گیا۔ ''یہی کھلانا تھا تو گھر کیوں بلایا؟ میں بھی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔''

جویریہ کے کمرے کی کھڑکی سے لان نظر آتا تھا۔

لان میں اس نے والد صاحب کو اپنے دوست کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ دوست کے ساتھ شاید ان کا بیٹا تھا۔ یونہی سرسری نظر ڈال کر مڑنے لگی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

کیا وہ ارسل تھا؟

اگلے لمحے وہ لان کا دروازہ دھکیلتی ہوئی لان کی طرف جارہی تھی۔

''ارسل تم!'' خوشی جویریہ کے چہرے سے جھلکتی تھی۔

ارسل نے مڑ کر دیکھا تو ساکن ہو گیا۔ موباف میں بال لپیٹے کھڑی لڑکی جویریہ ہی تھی۔ آج بھی ارسل کی نگاہیں موباف میں لپٹے اس کے بالوں میں الجھنے لگیں اور اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔ زندگی ایک بار پھر انہیں آمنے سامنے لے آئی تھی اور اتنی جلدی لائی تھی کہ ارسل کو یقین ہی نہ آرہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے نہیں پتا تھا ارسل تم اتنے بے وقوف ہو گے۔ میں لڑکی تھی۔ میں صرف اشارہ دے سکتی تھی، پہل تو تم نے کرنی تھی۔ پہلی بار میں نے تمہیں مخاطب کیا تھا۔ پین لینے کے لیے۔ ذرا عقل پر زور دو۔ میرے آس پاس کتنی لڑکیاں بیٹھی تھیں... ان میں سے کسی کے پاس اضافی پین نہ ہوتا؟ کیا کوئی مجھے پین نہ دیتا؟ تم سے اس لیے مانگا تھا کہ تم مجھے اچھے لگے تھے مگر میں کیسے بات آگے بڑھاتی۔ تم لڑکے تھے تم کہہ سکتے تھے مگر تم نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ فون نمبر کا تبادلہ بھی میری کوششوں سے ہوا۔ گفتگو بھی ہمیشہ میں شروع کرتی۔ ایک خواب دیکھا تھا۔ میں نے تم سر پر ہیٹ رکھے بیٹھے ہو اور میں دور سے تمہارے پاس آرہی ہوں۔''

لمحے بھر کو ارسل کا دل چاہا کہ اسے ٹوکے اور بتائے میں نے بھی ایسا خواب دیکھا تھا مگر پھر اسے بولنے دیا کہ وہ بولتی اچھی لگتی تھی۔

''ایک بار نہیں کئی بار دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتا میں یہ خواب کیوں دیکھتی تھی مگر یہ خواب میرے اعصاب پر ایسا سوار ہوا کہ مجھے تم ہی تم نظر آنے لگے۔'' جویریہ کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ کب سوچا تھا کہ یہ باتیں وہ کہے گی اور وہ بھی شادی سے پہلے۔

اور ارسل نے پہلی بار جویریہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ آنسو ایسے جیسے جھلمل ستارے۔ عجیب بات تھی اسے جویریہ روتے ہوئے بھی اچھی لگی۔ رونے سے بھی نہ روکا۔

''پھولوں کے درمیان سر پر ہیٹ جمائے شانِ بے نیازی سے بیٹھے ہوئے۔ حقیقت میں بھی اسی شانِ بے نیازی سے ملتے۔ میں کیا کہتی۔ کیا کرتی۔ ایک ڈائری دی تھی مگر تمہیں فرصت نہ ملی ہو گی۔ ڈائری کھول کر دیکھتے درمیان میں ایک صفحے پر میں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔''

''اگر تم مجھے پسند کرتے تو کم از کم ڈائری کھول کر تو دیکھتے' میرا لکھا پڑھتے پر تمہیں کیا پروا۔ با اعتماد لڑکی کے لیے مستقبل کی نیک تمنائیں یہی لکھ دیا تھا۔ یہ بھی کوئی وشز تھیں۔'' جویریہ نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔

''میں نے ڈائری دیکھی تھی۔ مجھے تو ساری ڈائری خالی لگی۔ اب یہ تو قسمت کی خرابی کہ مجھے وہ صفحہ ہی نظر نہ آیا۔'' ارسل نے دل میں کہا۔ زبان سے کہنے کے لیے کوئی اور دن اٹھا رکھا تھا۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں اور اللہ نے یہ دن بھی دکھانا تھا کہ میں خود کہہ رہی ہوں۔'' جویریہ رو رہی تھی۔

''ان آٹھ مہینوں میں تمہیں ہر چہرے میں ڈھونڈا ہے۔ پبلک پارک میں' بازاروں میں' اسٹورز پر اور تم نے آخر نمبر کیوں تبدیل کر لیا تھا؟ تمہارے دوست سے بھی دو بار تمہارا پوچھا۔ نمبر مانگنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ آخر میں لڑکی تھی۔ کیسے نمبر مانگ سکتی تھی۔'' جویریہ اپنے لڑکی ہونے کا غم منا رہی تھی۔

''اور تم کہتے ہو میں نے سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر تمہیں پینڈو کہا۔ اُف...... ارے بھئی اس کی وجہ یہ تھی ارسل جس لڑکی سے میں بات کر رہی تھی وہ میری سہیلی نہیں تھی۔ بس سہیلی بن کر پھرا کرتی تھی۔ دشمن تھی ہمیشہ مجھے ایذا پہنچانے کی کوشش کرتی۔ ارے وہ تو آستین کا سانپ تھی جسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ لیے گھومتی کہ رشتے دار ہے۔ پھوپی کی بیٹی۔ پھوپی کی ایسی بیٹی ہونے سے بہتر ہے پھوپی بے اولاد ہی رہتیں۔ مجھ سے جیلس تھی۔ میرے نمبروں کی وجہ سے جیلس ہوتی... دیکھو اس نے محسوس کر لیا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اس لیے بھری محفل میں تمہیں پینڈو کہا کرتی۔ میں نے بھی محض اسی لیے پینڈو کہہ دیا کہ ساتھ بیٹھی

لڑکیاں میرے دل کا راز نہ پالیں۔ آخر میں لڑکی تھی، کیسے دل کھول کر بیٹھ سکتی تھی۔''

ارسل کے لب مسکرا اٹھے۔ آخر جویریہ لڑکی جو تھی۔

''اور تم دانت نکال رہے ہو، ارسل افسوس ہے اور مجھے بتاؤ کہاں سے تم پینڈو لگتے ہو۔ شلوار قمیص میں تو بالکل.....'' سوچنے لگی کہ کس سے تشبیہ دے مگر کوئی بھی اس معیار پر نہ اترا کہ اسے ارسل سے تشبیہ دی جاتی۔

''شلوار قمیص میں تو بالکل ارسل لگتے ہو۔'' آخر تشبیہ کے لیے اسے ہی چنا۔ ارسل قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''تم سے تو بات کرنا بھی فضول ہے اور میں بھی کیسی لڑکی ہوں جو تم سے یہ باتیں کرنے لگی۔'' جویریہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے باہر جانا چاہتی ہو اور اس نے قدم باہر کی طرف بڑھائے بھی مگر اس نیت سے کہ ارسل آواز دے کر روک لے گا۔

''میری نگاہیں ہمیشہ تمہارے بالوں میں الجھ جاتی ہیں۔ جانے تمہارے بال اتنے خوبصورت ہیں یا وہ موباف اتنے اچھے ہوتے ہیں جن میں تم بال لپیٹتی ہو۔''

الفاظ نے پیروں کو روکا۔ دل اچھل پتھل ہوا۔

''اگر یہ تعریف تھی تو معذرت میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔'' خود کو سنبھالتی وہ لاؤنج کا دروازہ پار کر گئی۔

باہر بیٹھے ڈاکٹر عامر اور انتظار اپنی اپنی جگہ حیران بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے ماحول میں لڑکے لڑکیوں کی یوں الگ تھلگ بیٹھ کر گفتگو کرنے کی روایت نہ تھی۔ جویریہ تو اپنے کزنز سے بھی زیادہ نہ گھلتی ملتی کجا کہ ایک پرانے کلاس فیلو کو یہ کہہ کر ''آپ کی گفتگو تو ارسل کو بور کر رہی ہو گی ہم لاؤنج میں بیٹھتے ہیں۔'' اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

اور انتظار بھی سوچ رہے تھے ارسل ایسا لڑکا تو نہیں جو لڑکیوں سے دوستی اور بے تکلفی رکھے اور نہ ہی ڈاکٹر صاحب کی بیٹی ایسی لگتی ہے پھر......

ان کی حیرانی بجا تھی کیونکہ وہ ان دونوں کے حالِ دل سے ناواقف تھے۔

☆☆☆

واپسی کے سفر میں ارسل کے چہرے پر ایسی جاندار مسکراہٹ تھی کہ انتظار دیکھ کر رہ گئے۔ اپنے آپ میں مست خود ہی مسکرائے جاتا اور انتظار جیسے سمجھ کر بھی نہ سمجھ پائے تھے۔

''ارسل!''

''جی ابو!'' یوں جواب دیا جیسے گنگنا رہا ہو۔

''جویریہ اور تم دوست تھے؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے انہوں نے ایک بھرپور نظر ساتھ بیٹھے ارسل پر ڈالی تھی۔ وہ پہلے کبھی اتنا خوش نظر نہیں آیا تھا۔

''ہاں، نہیں...... بلکہ ہاں۔'' ارسل سوچنے لگا کہ کیا جواب دے۔

''آپ کے دوست نے تو حلوا پوری اور نان چنے ہی کھلائے۔ آئندہ کہہ دیجیے گا کہ بازاری ناشتا نہیں چلے گا۔''

''آئندہ؟'' انتظار دیکھتے رہ گئے۔ ''تم نے جواب نہیں دیا۔ کیا تم اور جویریہ دوست تھے؟''

ارسل لفظ ڈھونڈنے لگا۔

''دوست تو نہیں کچھ اور تھے۔'' وہ سوچ بچار کے بعد بھی مناسب لفظ نہ تراش پایا۔ انتظار طویل سانس لے کر رہ گئے۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو مونچھوں تک لے گئے اور وہ چبھن محسوس کرنے لگی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کی یہ عادت بھی کم ہو گئی تھی۔

''تو کیا تم عندلیب کو نہیں پسند کرتے تھے؟''

''نہیں۔'' نہیں کہنے میں اس نے وقت نہ لیا۔

''تو پھر اس کا نام کیوں لیا تھا؟''

کچھ دیر تو ارسل خاموش بیٹھا رہا پھر وہ باپ کو بتانے لگا۔ لفظ لفظ جوڑنے لگا۔

''مجھے جویریہ اچھی لگتی ہے مگر کالج میں مجھے لگنے لگا کہ جویریہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے میں نے عندلیب کا نام لیا۔ عندلیب تو میری بھائی ہے۔ آپ سے کہا تو تھا سردار انکل سے بخت کے لیے بات کریں۔''

انتظار سوچ کر رہ گئے کہ یہ نوجوان بھی نا...... ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔

''سوچ لو شہزادے! کل کوئی نیلوفر، شمع، سعدیہ، فرح نظر آئے اور تم کہو کہ مجھے تو جویریہ نہیں نیلوفر، شمع، سعدیہ یا فرح پسند ہے۔''

ارسل قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ابو! مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کی حسِ ظرافت اتنی اچھی ہے۔'' طنز میں کہی گئی بات اسے مزاح لگ رہی تھی۔ انتظار اسے گھور کر رہ گئے تھے۔ مگر ادھر کسے پروا تھی۔ انتظار کے گھورنے کی ارسل نے ذرا پروا نہ کی اور انتظار اس سبکی کے بارے میں سوچنے لگے جو انہیں سردار صاحب کے سامنے اٹھانی پڑے گی۔

گھر آ گیا۔ ارسل خوشی سے اچھلتا گاڑی سے اترا۔ باپ سے مزید کچھ کہے بنا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا

اور انتظار اس کے انداز دیکھتے رہ گئے۔ انہیں تو اپنے بیٹے کی خوشی عزیز تھی۔ اگر اس کی خوشی جویریہ تھی تو پھر وہ ہی سہی۔ اب وہ سوچوں میں عندلیب اور جویریہ کا موازنہ کرنے لگے۔ جویریہ نے کچھ زیادہ مارکس لیے۔

''کچھ دن ٹھہر کر شہزادے کے رنگ دیکھتے ہیں پھر ہی ڈاکٹر عامر سے بات کروں گا۔ ٹھیک ہی ہے۔ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہوں گے، زیادہ بنے گی۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف جارہے تھے کہ صفدر نے انہیں روک دیا۔

''صاحب! وہ گاؤں سے مہمان آئے ہیں۔'' صفدر نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

''کون؟'' مثلِ بہشت سے تو کوئی مہمان متوقع نہ تھا۔

صفدر چاہ کر بھی مہمان کے تعارف کے لیے کچھ نہ کہہ سکا۔ انتظار بھی صفدر کے جواب کا انتظار کیے بغیر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ مہمان خاتون تھی۔ صوفے پر پشت کیے بیٹھی تھیں۔

''خاتون مہمان!'' انتظار حیران ہوئے۔

''السلام علیکم!'' کھنکھار پر متوجہ کرتے ہوئے انتظار نے سلام کیا تھا۔

خاتون اٹھ کھڑی ہوئیں اور مڑ کر دیکھا۔

یادوں کے نرم گرم جگنو ٹمٹماتے ہوئے ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہونے لگے۔ ایسے جیسے یہیں بسیرا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

یادِ رفتہ نے سفر شروع کر دیا اور انتظار لمحے بھر کو اپنی جگہ پر بت بن گئے۔ سامنے رباب کھڑی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ دوپٹا سر پر جمائے اور دوپٹے سے جھانکتے سفید بال۔

''وعلیکم السلام!''

رباب کی آواز نے سکوت کا طلسم توڑا اور انتظار مجسمے سے انسان ہوئے اور سامنے والے صوفے پر جا بیٹھے۔ چاہ کر بھی کچھ نہ بول پائے۔

''کیسے ہو انتظار؟'' رباب سوچ کر آئی تھی ملک صاحب کہہ کر پکارے گی مگر......

''ٹھیک!'' یک لفظی جواب دے کر انتظار رباب کو دیکھنے لگے۔

رباب، انتظار کے بولنے کا انتظار کرنے لگی مگر وہ نہ بولے۔ اور رباب سوچنے لگی کہ کس طرح بات شروع کرے۔ خاموشی کی تہ دبیز ہونے لگی۔ دبیز سے دبیز تر اور اس خاموشی کو رباب کی ہچکی نے توڑا۔ وہ رونے لگی تھی۔

زاروقطار۔ آنکھوں کا چشمہ دھندلانے لگا۔ چشمہ اتار کر اسے دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو تب بھی جاری تھے۔

''میں نے سوچا تھا کہ مر جاؤں گی مگر تم سے کبھی نہ ملوں گی۔ میں نے علیحدگی لی میں اس پر آج بھی خود کو حق بجانب پاتی ہوں۔ تمہیں قصوروار بھی نہیں ٹھہراتی کہ جو تھا خدا کی طرف سے تھا۔''

آنکھوں سے آنسو اب بھی جاری تھے۔ انتظار کا دل چاہا اسے روک دیں۔ ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ نئی نسل جوان ہو چکی تھی۔ وہ خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ بائیس سال گزر چکے تھے۔ بائیس سال پہلی والی باتیں دہرانے سے کیا حاصل۔ مگر چاہ کر بھی وہ روک نہ پائے۔

''اگر میں تمہاری قصوروار ہوں تو معافی مانگتی ہوں۔ میں بڑی آس لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ کوئی روزن نہیں تھا۔ سال بھر پہلے میں نوکری سے برخاست کر دی گئی۔ میرے شوہر بستر مرگ پر ہیں۔ اسپتال میں داخل ہیں۔ تمام بچتیں ختم ہو گئیں۔ سرمائے کی ضرورت ہے۔ تم کچھ مدد کر دو۔'' انتظار کچھ دیر سامنے بیٹھی خاتون کو روتے دیکھتے رہے پھر چپ چاپ اٹھے۔ ڈائنگ روم کا دروازہ دھکیلتے چلے گئے۔

رباب یوں چلے جانے کا مطلب نہ سمجھ پائی۔ کیا یہ انکار کا اشارہ تھا؟ کیا اسے چلے جانا چاہیے؟ رباب ابھی اسی شش و پنج میں تھی کہ انتظار دوبارہ ڈائنگ روم میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چیک تھا۔

''محترمہ! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں بلکہ میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے راز کو کئی سال تک راز رکھا۔ ہر انسان کے پاس خودداری کا حق ہے۔ آپ نے اپنا حق استعمال کیا۔ مجھے گلہ نہیں۔ یہ لیں۔ اللہ آپ کے شوہر کو صحتِ کاملہ اور لمبی عمر عطا فرمائے۔'' انتظار کا چیک والا ہاتھ ہوا میں معلق تھا۔

رباب نے ہاتھ بڑھا کر چیک تھام لیا۔

''شکریہ!'' عینک کے شیشے ایک بار پھر دھندلا گئے تھے۔

☆☆☆

جویریہ نے اکتا کر سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی کے ہندسے رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کر رہے تھے۔ بیڈ کی پائینتی سے ہینڈ فری اٹھا کر موبائل فون میں لگائے اور ایئر پیسز جیسے کانوں میں ٹھونسے اور ایف ایم آن کر دیا۔

''ایک پیغام ہی بھیج دیتا۔'' جویریہ کو غصہ آنے لگا مگر افسوس کسی پر غصہ اتار بھی نہیں سکتی تھی۔

ایف ایم کا شو بھی فضول گوئی کی حد تک بے کار لگا۔ اکتاہٹ اور غصہ حدوں کو پہنچ گیا کہ دل چاہا کہ توڑ پھوڑ کی جائے قبل اس کے توڑنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈتی، موبائل فون کی اسکرین چمکی۔

''کیسی ہو؟'' سب اکتاہٹ اور غصہ لمحوں میں تحلیل ہوگیا۔

''ٹھیک ہوں۔تم کیسے ہو؟'' جلدی جلدی ٹائپ کیا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔کیا میرے میسج کا انتظار کررہی تھیں؟'' پیغام کے ساتھ ایک مسکراتے کارٹون کی تصویر تھی۔

''نہیں۔'' اس نہیں کے ساتھ منہ سے دھواں نکالتے غصیلے کارٹون کی تصویر بھی تھی۔

ارسل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آن بسی۔

''یقین نہیں آتا۔'' موبائل اسکرین ایک بار پھر چمکی۔

''مت یقین کرو۔ میں سونے لگی ہوں۔'' اس پیغام کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ سونے لگی ہے۔

''ابھی مت سوؤ۔ مجھ سے باتیں کرو۔'' ٹائپ کرتے ہوئے ارسل نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا۔

''کیا باتیں کروں؟'' الفاظ اسکرین پر چمکے۔

''دل کی باتیں، محبت کی باتیں۔'' جویریہ نے دو دفعہ پیغام پڑھا۔ اسے محسوس ہوا دل کی دھڑکن تیز ہوئی ہے۔

''مجھے نہیں آتیں۔'' ٹائپ کرنے سے پہلے جویریہ نے کئی لمحے سوچا۔

''آئی لو یو۔'' اس فقرے کے بعد بہت سے ڈاٹ لگے تھے۔ ہاتھ کے انگوٹھے سے جویریہ میسج نیچے کرتی گئی کہ پورا میسج پڑھ پائے۔

''اس فقرے کا مطلب بتاؤ۔'' جویریہ کے لبوں پر آئی مسکراہٹ لمحے بھر کو تھم گئی۔

''مجھے نہیں آتا۔''

''میں بتاؤں؟''

''ہاں......''

''تو مجھ سے ملو۔''

''سوری! مصروف ہوں۔''

''پلیز۔ میں نے پرسوں لاہور چلے جانا ہے۔''

''سوچتی ہوں۔''

''کل شام پیزا شاپ۔'' ارسل نے وقت، شاپ کا نام اور مکمل پتا سینڈ کیا اور موبائل ہونٹوں سے لگائے کل ہونے والی متوقع ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا۔

دل کی باتیں کرنا محبتوں کے دھاگے بُننا اچھا لگتا ہے۔

کل شام ارسل وقت پر پیزا شاپ آگیا۔ نسبتاً ایک پرسکون گوشے میں بیٹھ کر جویریہ کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک گھنٹا لیٹ آئی۔ داخلی دروازے سے اندر آکر وہ نظریں دوڑا کر دیکھنے لگی کہ ارسل کہاں بیٹھا ہے۔ ارسل نے اسے دیکھ لیا۔ آگے بڑھ کر پاس آیا۔ ''آؤ ادھر۔'' اس نے میز کی طرف اشارہ کیا اور جویریہ جویہ توقع کررہی تھی کہ ارسل کرسی دھکیلے گا اور پلیز کہتے ہوئے اسے بیٹھنے کی درخواست کرے گا۔ ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ وہ جویریہ کے بیٹھنے سے پہلے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ جویریہ دانت پیس کر رہ گئی۔ اپنا پرس ایک طرح سے میز پر پٹخا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''تم ایک گھنٹا لیٹ آئی ہو۔'' ارسل گھڑی دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جویریہ کا دل چاہا کہ سامنے پڑا گلدان اٹھائے اور ارسل کے سر پر......نہیں نہیں خوامخواہ غریب کا سر پھٹ جائے گا۔

''تو کیا ہوا......لڑکیاں لیٹ ہی آتی ہیں۔''

''تم نے کوئی کتاب پڑھی ہوئی ہے جس کا متن لڑکیاں کیا کرتی ہیں اور لڑکوں کو کیا کرنا چاہیے پر مشتمل تھا۔'' ارسل کے جواب پر وہ سوچنے لگی گلدان سر پر مار دینا چاہیے تھا۔ سر پھٹتا ہے تو میری بلا سے......

''اگر تم میرے نخرے نہیں اٹھا سکتے تو سوری میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''مگر میں نے تمہیں پرپوز ہی کب کیا ہے؟'' ارسل کندھے اچکاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

جواباً جویریہ نے ارسل کو ایسے دیکھا جیسے آنکھوں سے ہی کھا جائے گی۔ میز سے پرس اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں جارہی ہوں۔''

''اللہ حافظ!'' ارسل نے اطمینان سے کہا اور جویریہ کی آنکھیں جو پہلے ہی غصے سے زیادہ ادھ کھلی ہوئی تھیں، اب تو جیسے باہر ابلنے لگیں۔

آنکھوں سے ہی ملامت کرتے ہوئے جویریہ مڑی۔ ارسل گھوم کر اس کے سامنے آگیا۔

''سوری، سوری! مذاق کررہا تھا۔ میں تمہارے سارے نخرے اٹھاؤں گا۔ ساری زندگی اٹھاؤں گا......وعدہ!''

جویریہ کے دل میں ایک پل کے لیے آیا کہ چلی

جائے تا کہ ارسل کو بھی پتا چلے مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔
"پکا وعدہ؟" جویریہ پوچھ رہی تھی۔
"بالکل پکا اور سچا وعدہ۔" ارسل عہد کر رہا تھا۔ وہ عہد جو عہدِ بہار تھا۔

☆☆☆

وہ محبت جو دو سال تک دل میں دبی رہی اور آٹھ ماہ دل میں کسک کی طرح چبھتی رہی، اب ملی تو جیسے صدیوں جیسا طویل فاصلہ لمحوں میں طے کر لیا۔ دونوں ہی اپنی جگہ ایک دوسرے کو یاد کرتے رہے تھے۔ اسی لیے تو حادثاتی اور پُرکشش ملاقات کے دوسرے دن پیزا شاپ بھی مل آئے۔

ارسل کچھ دن اور بھی رک جاتا مگر کالج سے کسی کلاس فیلو نے سرپرائز اسائمنٹ کے بارے میں بتایا جو نا گزیر تھا۔ چنانچہ اس نے لاہور کے لیے قصد کیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ چند دنوں تک دوبارہ آئے گا۔

کہ اب تو دل آنے کے لیے مچلے گا۔

اس وقت وہ اپنا ہینڈ کیری لیے انتظار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک گھنٹے بعد بس کا ٹائم تھا۔ انتظار خود ہی اسے ٹرمینل چھوڑ آئے تھے۔

"ابو! انکل عامر سے بات کر لیجیے گا۔" ارسل تو جیسے اب ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواہاں تھا۔ انتظار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حالانکہ ابھی وہ اس معاملے میں سوچ بچار کا ارادہ رکھتے تھے۔

"بخت کا فون بند ہے۔ پیغام کا جواب بھی نہیں دے رہا۔ یہ کاغذ اسے دے دیجیے گا۔"

انتظار نے تہ شدہ کاغذ کھولا اور ایک نظر دوڑائی۔

"اوئے یار! کہاں گم ہو۔ مجھ سے جلدی رابطہ کرو۔ ایک خوشخبری تمہیں بتانے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔"

انتظار نے کاغذ دوبارہ تہ کر کے سائڈ لیمپ کے نیچے رکھ دیا۔ اور..... سوچنے لگے کہ بخت کے ساتھ انہیں یہ زیادتی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چلو کل جا کر لڑکے کو مثلِ بہشت سے لے آتے ہیں۔ آخر میرے ارسل کا دوست ہے۔

ارسل لاہور روانہ ہوا۔ اگلے دن انتظار مثلِ بہشت سے ہو آئے۔ بخت وہاں نہ تھا۔ نصیبن تو پریشان ہونے لگیں کہ انتظار اسے لینے یہاں آئے ہیں تو ان کا بیٹا کہاں ہے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ہاسٹل میں دوستوں کے پاس ہوگا۔ موبائل شاید کھو گیا کہ رابطہ نہیں ہو رہا۔ وہ پہلے بھی ہاسٹل میں پڑھائی کے سلسلے میں دوستوں کے پاس چلا جاتا تھا۔" انتظار غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ وہ کبھی ہاسٹل قیام کے لیے نہ گیا تھا۔ آئے تو وہ مثلِ بہشت ایک دن کے لیے تھے مگر زمینوں کے کچھ کام نکل آئے تو انہیں چار دن رکنا پڑا۔ واپس شہر آ کر انہوں نے صفدر کو میڈیکل کالج کے ہاسٹل بھیجا کہ بخت کا پتا کرے۔

"صاحب! بخت باؤ ادھر تھے۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈا۔ پر انہوں نے آنے سے منع کر دیا۔"

"چلو ارسل خود آ کر دوست کو منا لے گا۔" انتظار اپنی مصروفیت میں گم ہو گئے اور ارسل کا دیا ہوا خط لیمپ کے نیچے ہی دھرا رہ گیا۔

☆☆☆

مثلِ بہشت سے بہاولپور کا فاصلہ اتنا طویل نہ تھا مگر آج صدیوں جیسا طویل لگا۔ آنکھیں کھڑکی سے پار گزرتے مناظر پر ٹکائے کتنی دیر بخت بیٹھا رہا پھر جیسے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

"اگر تمہارا ارادہ احسان جتانے کا ہے تو بہتر ہے تم احسان مت کرو۔"

گاڑی جھٹکے سے رکی۔ بخت نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کی منزل آ چکی تھی۔ اپنا سامان اٹھاتا وہ بس اسٹینڈ کی ایک سنگی بنچ پر کتنی دیر بیٹھا رہا۔ کہاں جائے۔ جو ٹھکانا تھا وہ اب نہ رہا تھا۔ یوں شہر میں اکیلا۔ دل پہلے ہی دکھ سے بھرا تھا۔ اب یاسیت سی چھانے لگی۔

کچھ پیسے اس کے پاس تھے۔ جب میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا، تب ارسل نے قیمتی موبائل فون تحفتاً دیا تھا۔ ایک موبائل شاپ پر جا کے موبائل بیچا۔ کچھ پیسے جیب میں رکھے اور کچھ بیگ کے پوشیدہ خانوں میں ڈالے اور چل پڑا۔

رکشا لوکل ٹرانسپورٹ کسی چیز پر سوار نہ ہوا کہ پیسے بچانے ہیں۔ اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہاسٹل پہنچا۔ دوستوں سے اتنی دوستی ہو چکی تھی کہ ایک دوست نے اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ امتحان میں چار ماہ رہ گئے تھے۔ پڑھائی کا زمانہ سر پر آ چکا تھا۔ باقی طلبا مسلسل پڑھائی کی تیاریوں میں تھے اور بخت کوئی چھوٹا موٹا روزگار ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک بیکری پر سیلز مین کی جاب ملی۔ سخت کام تھا۔ سارا ٹائم کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اس کے عوض معمولی سی تنخواہ ملتی۔ چند دنوں میں طبیعت بوجھل ہو گئی کہ اتنی محنت کرنے کی عادت نہ تھی۔ پھر ایک ٹیوشن مل گئی۔ کم وقت میں نسبتاً اچھے پیسے مل جاتے۔ گو کہ ابھی اتنے پیسے تھے کہ وہ تین چار ماہ بہ آسانی گزار سکتا تھا مگر پڑھائی کے لیے سال سامنے منہ چڑاتے کھڑے تھے۔ انتظام تو کرنا تھا۔

ٹیوشن ملی تو گزارہ تھوڑا آسان ہوا اور پڑھائی کا وقت بھی ملنے لگا۔ گزری زندگی بھی یاد آنے لگی۔ سوچ عندلیب پر آ کر رک گئی۔

"جانے تم میرے نصیب میں ہو کہ نہیں۔" عندلیب کو سوچتے ہوئے یہ خیال ذہن کے دروازوں پر دستک دیتا۔

☆☆☆

فرحین کو ابھی ایم بی بی ایس پاس کیے دو سال ہی ہوئے تھے۔ وہ گائنا کولوجسٹ بننا چاہتی تھی۔ پارٹ ون کی تیاری کرتے ہوئے ساتھ میں میڈیکل کالج میں بطور ڈیمانسٹریٹر ملازمت شروع کر دی۔ فرسٹ ایئر کی فزیالوجی کی ڈسکشنز کلاسز لیتی۔

جنوبی پنجابی ایریا سے وہ اسٹائلش لڑکا جو خاموش طبع تھا، آج بھی ڈسکشن کلاس میں دوسری رو میں بیٹھا تھا۔ فرحین کو آج اس کی رنگت میں کچھ غیر معمولی پن لگا۔ ایسے جیسے لیمو کا رنگ جلد میں گھلا ہو۔

"کیا نام تھا بھلا؟" فرحین ذہن پر زور دینے لگی مگر یاد نہ آیا۔

"تم۔ نہیں تم۔" فرحین نے ارسل کو مخاطب کیا۔

"ادھر آؤ۔" ارسل اس کی ٹیبل کے پاس آیا۔ فرحین اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"محمد ارسل!"

"اپنا ہاتھ دکھاؤ۔" نہ سمجھتے ہوئے ارسل نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ فرحین نے موبائل ٹارچ اس کی ہتھیلی پر ڈالی۔

"ذرا نیچے ہو۔" اب آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ارسل ناسمجھی میں دیکھنے لگا اور فرحین طویل سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کا علم غلط نہ کہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تھی۔

"لڑکے! مجھے کوئی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔ ٹیسٹ کراؤ، کسی اسپیشلسٹ سے ملو۔" ٹیسٹ کا نام لکھ کر کاغذ ارسل کو پکڑا دیا۔ ارسل کا دل ذرا تیز دھڑکا۔

"اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا۔" فرحین تاکید کرنا نہ بھولی۔

اسپیشلسٹ سے ملنے سے پہلے ارسل نے متعلقہ ٹیسٹ کروائے اور فرحین کے پاس ہی آیا۔

اپنے آفس میں بیٹھی وہ پارٹ ون کی تیاری کر رہی تھی۔

"میڈم! یہ رپورٹس۔" ارسل نے رپورٹس فرحین کی طرف بڑھائیں۔ رپورٹس دیکھ کر فرحین کو افسوس ہونے لگا۔ کیسا سجیلا نوعمر لڑکا تھا اور کیا مرض لاحق ہو گیا تھا۔

"ارسل! میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔" فرحین نے لمحے بھر کو توقف کیا۔

"ہیپاٹائٹس سی۔ کالا یرقان۔ کبھی نام سنا ہے؟"

ارسل کے ذہن میں فوراً بخت کی والدہ آئیں جو اسی مرض میں مبتلا تھیں۔

"جی!" لرزتے دل کو سنبھالتے ہوئے اس نے کہا۔

"تو ارسل میاں! تم اسی مرض میں مبتلا ہو۔ تمہیں کسی اسپیشلسٹ سے ملنا چاہیے۔"

ارسل سراسیمگی سے فرحین کو دیکھنے لگا۔

کیا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی؟

☆☆☆

"مجھے افسوس ہے کہ تمہاری بیماری ڈی کمپنسیشن کے آخری فیز میں چلی گئی ہے۔ قسمت کی بات ہے کچھ لوگوں کی بیماری دہائیوں تک ڈی کمپنسیشن میں نہیں جاتی اور کچھ لوگ وائرس کا شکار ہوتے ہی اس فیز میں چلے جاتے ہیں۔ گو کہ ابھی تم خود کو صحت یاب محسوس کرو گے مگر تھوڑے عرصے میں 'کچھ بھی' ہو سکتا ہے۔ کیا مجھے 'کچھ بھی' کی وضاحت کی ضرورت ہے۔" میڈیسن اسپیشلسٹ ارسل کو بتاتے جا رہے تھے اور ارسل ان کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

"سر! اس کا کوئی علاج؟" ارسل نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جگر کی تبدیلی۔ انتقالِ جگر ہی اس کا واحد علاج ہے مگر اس کے لیے کثیر سرمائے کی اور ڈونر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انتقالِ جگر کے لیے تمہیں اسلام آباد کے اسپتال یا پھر کسی بیرونِ ملک جانا پڑے گا۔" بوجھل دل کے ساتھ ارسل واپس آیا اور ہاسٹل کے کمرے میں اکیلا خالی ذہن لیے بیٹھا رہا۔ جانے کب دل بھر آیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

اس نے موبائل فون پر نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو جویریہ!"

"کیسے ہو ارسل؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"ارسل! کیا تم رو رہے ہو؟"

"تم بتاؤ ایسی کون سی صورتِ حال ہے جب تم مجھے چھوڑو گی؟"

"ارسل! ہوا کیا ہے۔"

"تم میری بات کا جواب دو۔ کب چھوڑو گی؟"

''ارسل لیکن......''

''جویریہ! جواب دو۔''

دوسری طرف کئی لمحے خاموشی چھائی رہی اور اس خاموشی کو جویریہ کی سنجیدہ آواز نے توڑا۔

''میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تاوقت کہ موت ہمیں جدا کرے۔''

ارسل کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

''جویریہ! میں ہیپاٹائٹس سی کا مریض ہوں جس کا علاج بھی آسان نہیں۔ جگر کی تبدیلی۔ جانے کوئی ڈونر مل پائے کہ نہیں۔''

جویریہ نے طویل سانس لی۔

''تم اداس نہ ہو۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ آج کل اور ہمیشہ۔ ہم مل کر اس وائرس کا مقابلہ کریں گے۔ جیت ہماری ہوگی۔'' جویریہ عزم سے کہہ رہی تھی اور اس وقت ارسل کو اسی عزم کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''دوبارہ کبھی اس چوکھٹ پر قدم نہ رکھوں گا۔ چاہے ارسل آکر منالے۔ چاہے کتنی منتیں کرلے۔ چاہے خود ملک انتظار لینے آئیں۔ معافی مانگیں۔ تب بھی نہ جاؤں گا۔'' یہ بخت کا خود سے کیا گیا وعدہ تھا مگر وہ صفدر کے آتے ہی اس کے ساتھ ہولیا۔ خود سے کیا وعدہ وہ ایسے بھولا جیسے کیا ہی نہ تھا۔

اس وقت وہ ہاسٹل کے سامنے لان میں ایک سنگی بنچ پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ امتحان کی تیاریاں شروع تھیں گو کہ ابھی امتحان میں مہینوں رہتے تھے۔ مگر میڈیکل کی پڑھائی مشکل ہوتی ہے اسی لیے طلبا کئی ماہ پہلے ہی امتحان کی نیت سے پڑھنا شروع کردیتے ہیں۔

صفدر ہاسٹل کا مرکزی دروازہ پار کرتا اندر آیا۔ بخت اسے لان میں ہی بیٹھا نظر آگیا۔

''بخت باؤ! آپ کو ملک صاحب بلارہے ہیں۔ لاہور جانا ہے۔ ارسل میاں کی طبیعت خراب ہے۔''

''کیا ہوا اسے؟'' ہونہہ' لاڈلے کو چھینک آئی ہوگی اور یہ لاہور جانے کو تیار ہیں۔ مجھے کیوں بلایا ہے، میں کوئی زرخرید ملازم ہوں؟ سوچ کے گھوڑے دوڑتے ہی چلے گئے۔ اس رات کا صرف وہ حصہ بخت کو یاد تھا جب انتظار نے بخت کو تھپڑ اور ٹھوکر ماری تھی۔ انسولین سرنج۔ سویا ہوا ارسل اور خاموش تاریکی ذہن سے محو ہوچکے تھے۔

کیونکہ......

''خود پر کیا گیا ظلم یاد رہتا ہے اور خود کیا گیا ظلم انسان بھول جاتا ہے۔''

''کالا یرقان۔ ارسل میاں کو کالا یرقان ہے۔ کیسے عالی شان ہمارے چھوٹے صاحب ہیں اور اللہ نے کیسی بیماری لگادی۔''

ہاسٹل کی عمارت پل بھر میں دھڑام سے نیچے آن گری۔ لان میں اگی گھاس سبز نہ رہی' سرخ ہوگئی ایسے جیسے لہو رنگ ہو۔ بخت کا اپنا چہرہ سیاہ پڑتا گیا۔ ایسا سیاہ جسے گناہ سے تعبیر کیا جائے۔

''کیا ہوا ارسل کو؟'' بخت کو خواہش ہوئی کہ اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ لازمی تو نہیں وہ سرنج ارسل کو جراثیم سے آلودہ کرتی۔

''کالا یرقان!'' صفدر نے بیماری کا دوبارہ نام لیا اور ایک بڑی سی سرنج آئی' اتنی بڑی کہ کلاشنکوف لگی اور بخت کا سر چل گئی۔

اک غبارِ خاک
کل کو بکھر جائیں گے
مختصر سی زندگی ہے
کچھ تو اس میں رنگ بھرلیں
آؤ دوستی کرلیں......

بخت اور ارسل کی دوستی کی ابتدا ہیں سے تو ہوئی تھی۔ غبارِ خاک بکھرنے کو تیار تھا اور بخت کا دل چاہا کہ وہ کھڑے کھڑے مرجائے۔ اب اس کے پاس جینے کا حق کہاں رہا تھا؟

☆☆☆

ڈرائنگ روم کی آرائش میں ایک قدامت تھی۔ سیڑھیاں' موڑھے اور گاؤ تکیے اور یہ قدامت ہی ڈرائنگ روم کا حسن تھی۔ جویریہ نے اپنی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے باپ سے بار بار فرمائش کرکے سامان منگوا کر ڈرائنگ روم سیٹ کیا تھا اور اب ڈرائنگ روم کی جگہ بیٹھک لفظ زیادہ جچتا تھا۔

اور ڈاکٹر عامر ہاتھ میں اخبار لیے کوئی خبر پڑھنے میں مصروف تھے جب جویریہ ان کے پاس آئی۔

''ابو! آپ کے دوست کا بیٹا بیمار ہے۔ ہمیں جانا چاہیے۔''

''تمہیں میرے دوست کے بیٹے کی فکر کیوں کر ہونے لگی؟'' انہوں نے اخبار سائڈ پر رکھ دیا اور غور سے بیٹی کو دیکھنے لگے۔ ان کی بیٹی اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ ایک لڑکے کے لیے دل میں جذبات رکھنے لگی تھی۔

جویریہ کوئی جواب نہ دے پائی اور اضطراری طور پر

دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب طویل سانس بھر کر رہ گئے۔

"بیٹا وہ لڑکا ایچ سی وی کیریئر ہے۔ اس کی بیماری ڈی کمپنسیشن فیز میں ہے، میں اپنی بیٹی اس کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ بیماری تو تمہیں بھی اپنا شکار بنا لے گی۔"

"اگر آپ کی بیٹی کو بھی کوئی ایسا مرض لاحق ہو جائے تب بھی آپ یہی باتیں کریں گے؟" اپنی سوچ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر وہ یہ کہنے والی تھی مگر پھر رک گئی۔ یونہی گفتگو کو طول دینے والی بات تھی۔

"ابو! بات اس مقام سے آگے بڑھ گئی ہے کہ ایسی باتیں سوچی جائیں۔ ارسل نہیں تو کوئی بھی نہیں۔" جویریہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ لفظوں میں بھی نمی گھلنے لگی۔ ایسی باتیں باپ سے کر کے وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی مگر کچھ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔ وہ بات نہ کرتی تو کس طرح ارسل کا دفاع کرتی۔

"ابھی وہ لیور ٹرانسپلانٹ کا سوچ رہے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ارسل ایک بار پھر سے مکمل صحت یاب ہوگا۔"

ڈاکٹر عامر بیٹی کو دیکھ کر رہ گئے۔ وہ اس جذباتی فیصلے سے زیادہ خوش نظر نہیں آتے تھے۔

"ہم تیارداری کو ہو آئیں گے مگر تم ابھی مزید اس معاملے کے بارے میں نہیں سوچو گی۔ اگر ارسل مکمل صحت یاب ہو گیا تو تب کی تب سوچیں گے۔" بیٹی عزیز تھی اس لیے درمیانی راہ چننا بہتر لگا تھا۔

آنکھوں کی نمی صاف کرتی جویریہ مسکرانے لگی۔ والد صاحب وقت آنے پر راضی ہو جائیں گے، اسے پختہ یقین تھا۔

☆☆☆

انتظار فوراً سے بیشتر لاہور چلے آئے اور بیٹے کو اسلام آباد کے مطلوبہ اسپتال لے گئے۔ پتھر کا چہرہ لیے بخت بھی ساتھ تھا۔ انسولین سرنج کی شبیہ ہمہ وقت اس کے آس پاس گھومتی اور وہ خواہش کرتا کہ بینائی ہی چھن جائے۔

"میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔" ارسل سے زیادہ انتظار خود کو تسلی دیتے اور ارسل چہرے پر ایک مسکراہٹ لے آتا۔ وہ مسکراہٹ جس کے رنگ پھیکے ہوتے۔

"بخت! تم کیوں اتنے پریشان ہو؟ اپنا چہرہ دیکھو۔ کیسا غمگین ہے...... بجائے مجھے تسلیاں دو مجھے لگتا ہے کہ مجھے تمہیں تسلیاں دینی چاہئیں۔" لیمو کلی رنگت جیسا ارسل بخت کے ساتھ بیٹھا کہہ رہا تھا۔

جواباً بخت نے پٹپٹا کر ارسل کو دیکھا۔ آنکھیں گیلی ہونے لگیں اور دوسرے ہی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"بخت او بخت! مرد نہیں روتے۔" بخت کا سر ارسل کے کندھے سے لگا تھا اور ارسل اسے تسلی دے رہا تھا۔ چاہ کر بھی بخت ارسل کو اپنی کارستانی نہ بتا سکا۔

اسپتال کی لابی میں بیٹھے وہ ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب آئے اور اپنے نمبر پر انہیں اندر جانے کا موقع ملا۔

"جگر یا کوئی انسانی عضو بازار سے ملنے والی چیز نہیں جو فٹ سے ٹرانسپلانٹ کر دی جائے۔ آپ کو ڈونر کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ عموماً قریبی رشتے دار موزوں رہتے ہیں۔" ٹرانسپلانٹ سرجن انہیں معاملے کی سنجیدگی، پیچیدگی اور درپیش مسائل کے بارے میں بتانے لگا۔

"کیا آپ کے اسپتال کا کوئی ایسا ڈیپارٹمنٹ نہیں جو ڈونر کا بندوبست کر دے۔" خشک ہوتے حلق کے ساتھ انتظار نے پوچھا۔

اسپتال میں متعلقہ ڈیپارٹمنٹ تھا مگر ان کے اپنے تحفظات تھے اور ان کے پاس اس ڈیپارٹمنٹ کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔

ڈاکٹر کے کمرے سے وہ بوجھل دل کے ساتھ آئے۔ اللہ سے رحم کی دعا کرتے ہوئے۔

اسپتال کی لابی میں گزرتے ہوئے ارسل جسے پہلے ہی متلی کی کیفیت ہو رہی تھی، ابکائی آئی اور فرش داغدار ہو گیا۔ وہ قے کیے جاتا۔ سرخ خون کی قے۔ پھٹی پھٹی نظروں سے ارسل اپنے منہ سے ابلتے خون کے فوارے کو دیکھنے لگا اور وہ جو مطمئن تھا کہ انتظار ہمراہ ہیں وہ سب سنبھال لیں گے۔ اسے لگنے لگا کہ موت پاس آچکی ہے اور جانشین بنا چاہتی ہے۔

"تو کیا میں مر جاؤں گا؟" ارسل خون ہوتے فرش کو دیکھ کر کانپنے جاتا۔ انتظار بھی دھک سے رہ گئے۔ ان کے شہزادے کو کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا؟

اور کلاشکوف سی بڑی سرنج ایک بار پھر بخت کا سر کچلنے کو آگئی تھی۔

☆☆☆

ارسل کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ خون کی بوتلیں، خون کو روکنے کے لیے دی جانے والی ادویات، اینٹی.... بائیوٹکس، ڈاکٹروں کے مشورے، نرسنگ سہولیات، کسی چیز

میں کمی نہ تھی اور اتنی تدابیر کے بعد بھی ارسل دو دن خون کی الٹیاں کرتا رہا۔ اب تھوڑی طبیعت سنبھلی تھی۔ نقاہت طاری تھی۔ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ تبھی جویریہ والد صاحب کے ساتھ ملنے کے لیے آئی۔

''ارسل! اتنے کمزور اور پیلے کیوں ہو گئے؟'' وہ مضبوط لڑکی جسے خود سے تہیہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ وہ ارسل کے سامنے روئے گی۔ بے تحاشا روئی اور پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''تم پریشان نہ ہو، ہم اس بیماری کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔''

''کیا عورتیں بھی مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں؟'' بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھے ارسل نے جواباً پوچھا تھا۔

کمرے میں موجود بھی نفوس مسکرا دیے، سوائے انتظار کے اور بھلا کس طرح مسکرا سکتے تھے۔ ان کا بیٹا خون کی الٹیاں کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے ڈونر کا بندوبست بھی نہ کر پا رہے تھے۔ کہاں سے کراس میچ جگر لاتے۔ ڈاکٹر تو بار بار رشتے داروں میں سے کسی کا مشورہ دیتے مگر وہ اب ارسل کے رشتے دار کہاں سے لاتے۔

ڈونر کے لیے انہوں نے کثیر رقم کا اعلان کر دیا۔ کوئی اخبار ایسا نہ چھوڑا جس میں اشتہار نہ دیا ہو۔ لاکھوں خرچ کر کے پرائم ٹائم میں چینلز پر بھی خبر چلائی۔ رقم تو ان کے پاس کم نہ تھی، پر کم نہ پڑ جائے انہوں نے زمین کا ٹکڑا بھی بیچا کہ ارسل ہی تو ان کی دنیا تھی۔ ارسل سے شروع ہوتی اور ارسل پر ختم ہوتی۔

ان کا خون نہ سہی 'تھا تو ان کا بیٹا۔

اور انہوں نے اپنے بیٹے کا علاج کروانا تھا۔ یہ ان کا خود سے عزم تھا۔ مضبوط عزم۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' جویریہ وعدہ کر کے چلی گئی اور ارسل خود کو پہلے سے زیادہ بہتر اور توانا محسوس کرنے لگا کہ محبت توانا کرتی ہے۔

رات کو جب جویریہ چلی گئی اور انتظار ساتھ والے کاؤچ پر بیٹھے تھے ایسے جیسے شکستہ دل ہوں۔ سر جھکائے کچھ سوچتے ہوئے۔ ارسل انہیں دیکھنے لگا۔ کتنے کمزور لگنے لگے تھے وہ۔

''ابو! آپ... بہت کمزور لگ رہے ہیں اور تھوڑے بوڑھے بھی آپ ہی تو کہا کرتے تھے 'ملک انتظار بھی بوڑھا نہ ہوگا۔'

''وہم ہے تمہارا بیٹا۔'' انتظار کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔ باپ کو اپنے لیے یوں دیکھنا کیسا طمانیت کا احساس دلاتا تھا۔ مگر انہیں نارمل زندگی کی طرف مائل بھی کرنا تھا۔

''اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو میرا خیال کیسے رکھ پائیں گے۔ دیکھیں مونچھ میں بھی سفید بال جھلک رہا ہے۔'' جواباً انتظار کچھ نہ کہہ پائے بس زرد ہوتے بیٹے کو دیکھتے رہے۔

''میں جانتا ہوں آپ مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ میری اتنی دیکھ بھال اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ گو کہ کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی مگر آپ خود کو اتنا نظر انداز نہ کریں۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے میرے علاج کے لیے مہینوں درکار ہیں۔ تو کیا آپ اتنا لمبا عرصہ اس کاؤچ پر گزاریں گے؟ یہاں کوئی کرائے پر مکان لے لیں۔ آپ کے بہانے ڈاکٹروں کی اجازت سے میں بھی کبھی کبھار چکر لگا لیا کروں گا۔ بخت بھی تو ہے۔'' انتظار چپ کر کے ارسل کو دیکھتے رہے۔

''ٹھیک ہے۔'' ارسل کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''بخت کب سے اندر نہیں آیا۔ کتنی بار اسے کہا ہے امتحان دے آ، پھر آ جانا مگر وہ لڑکا بھی۔ میرے پاس بھی نہیں بیٹھتا اور واپس بھی نہیں جاتا۔ یوں ہی باہر لان میں بیٹھا رہتا ہے۔ غمگین چہرہ لے کر۔ اسے تو کال کر کے بلایئے۔''

''میں اسے بلا آتا ہوں۔ چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔'' فون بج رہا تھا۔ کسی ڈونر کا بندوبست ہو رہا تھا۔ اگر کراس میچنگ ہو جاتی تو کیا ہی اچھا تھا۔ اب بھی وہاں سے فون تھا اور وہ ارسل کے سامنے بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔

باہر جا کر وہ فون پر بات کرنے لگے۔ لان میں بیٹھے بخت سے انہوں نے اندر ارسل کے پاس جانے کا کہا۔

انہیں نہیں پتا تھا کہ یہ لڑکا ان کے بیٹے سے اتنی محبت کرتا ہے...... جب سے ارسل کے بیمار ہونے کی خبر ملی تھی اس قدر رنجیدہ خاطر اور ارسل کے لیے پریشان نظر آتا کہ انتظار کو ہمہ وقت قلق ہونے لگا۔

''یونہی بلا وجہ بے عزتی کی اور مارا بھی۔ اب اسے کھلایا پلایا تھا تو جتایا کیوں تھا۔ خوامخواہ تھوک کر چاٹا۔'' وہ بخت سے شرمندہ تھے اور معافی مانگنے کے لیے موزوں وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

تھکے قدموں کے ساتھ بخت اندر ارسل کے کمرے میں آیا۔ ارسل سے مخاطب بھی نہ ہوا۔ چپ چاپ سر جھکائے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

''تمہیں بھی اب چارج کرنا پڑے گا۔'' اب ہر بندے کو ارسل کو ہی تسلی دینی پڑ رہی تھی۔

بخت کوئی جواب نہ دے پایا۔

''او یار! کچھ تو بولو۔ کوئی ایسا قصہ سناؤ کہ میں کچھ پل کے لیے بھول جاؤں کہ میں اسپتال میں داخل ہوں۔ کچھ ہنس سکوں۔ کچھ قہقہے لگا پاؤں۔ کوئی بچپن کی یاد جب تم بولتے تھکتے نہ تھے یا چلو یہی بتا دو وہ کونسا لمحہ تھا جب تمہیں عندلیب سے محبت ہوئی؟'' ارسل نے ایک ہی سانس میں کہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا سانس چڑھ گیا۔

بخت کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''مجھے معاف کر دو ارسل۔'' روتے ہوئے بخت کہہ رہا تھا۔ ارسل چونکا۔ یہ آنسو اس کی بیماری کے نہ تھے۔ ان پر کچھ اور ہی درج تھا۔

''کیا ہوا بخت؟'' جانے کیوں اسے لگنے لگا جو ہوا ہے بہت ہی برا ہوا ہے۔

''میں احسان فراموش ہوں۔'' بخت روتا ہی جاتا اور ارسل چاہ کر بھی اسے تسلی نہ دے سکا۔ جانے کیوں؟

''تمہیں اس مقام پر میں نے پہنچایا ہے۔ میں نے تمہیں بیمار کیا ہے۔ حسد اور غصے نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ ملک صاحب نے مجھے تھپڑ مارا اور میں نے تمہیں انسولین سرنج سے کالے یرقان کا مریض بنا ڈالا۔'' روتے ہوئے وہ اعتراف گناہ کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' ارسل سمجھ نہ پایا۔

''میں بہت برا ہوں۔ میں نے امی کی انسولین سرنج تمہیں جان بوجھ کر چبھوئی تھی تاکہ تم اس جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جاؤ۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔'' بخت روئے جا رہا تھا۔

ارسل کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلنے لگی۔ جلد ہی اس بے یقینی میں خون گھلنے لگا۔ کمرے کی خاموشی میں بخت کے رونے کی آواز گونجتی رہی اور جب ارسل بولا تو اس کا لہجہ اجنبی اور کرخت تھا۔

''نکل جاؤ اس کمرے سے۔ احسان فراموش۔'' ایسا لہجہ ارسل نے پہلے کبھی نہ اپنایا تھا۔

''ارسل! مجھے معاف کر دو میں......''

''تم جاتے ہو یا میں سیکیورٹی کو بلا کر دھکے دے کر نکالوں۔'' ارسل نے تپائی پر پڑا گلدان اٹھایا اور بخت کو دے مارا۔ گلدان پیشانی پر لگا اور معمولی سا زخم ہی دے پایا۔

''ارسل......''

''دفع ہو جاؤ۔''

روتا ہوا بخت کمرے سے جا رہا تھا۔ جب وہ جا رہا تھا' انتظار کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے بخت کو ہچکیوں سے روتے دیکھا۔ اسے روکا بھی مگر وہ نہ رکا۔

''تمہارا دوست تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ جب سے تم بیمار ہو تب سے وہ اتنا ہی پریشان ہے۔ ایسے دوست ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتے۔'' انتظار کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی نظر فرش پر پڑی۔ جہاں ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور دو تین خون کے قطرے بھی جو بخت کی پیشانی سے گرے تھے۔

''یہ گلدان کیسے ٹوٹا اور یہ خون؟'' خون کے دھبے سیاہ تھے۔ ان کے ارسل کا خون سرخ تھا۔ یہ کس کا خون تھا ارسل کا نہیں تھا۔ اسی لیے پوچھ رہے تھے۔

☆☆☆

''باہر تپتا ہوا دن تھا۔ ایسے روشن اور گرم دن اسلام آباد میں کم ہی ہوتے تھے اور اندر اسپتال کے کمرے میں تکیوں کے سہارے بیڈ پر بیٹھے ارسل کے چہرے پر بے یقینی تھی اور نفرت بھی۔ بخت کے لیے اور بخت کی وجہ سے ساری دنیا کے لیے۔ انتظار خوشی خوشی اندر آئے۔

''ارسل! جگر کراس میچ ہو گیا ہے۔ شان تمہیں جگر دے سکتا ہے۔ یا اللہ کتنی بڑی خوشخبری ہے۔'' شان اس شخص کا نام تھا جو ارسل کو اپنے جگر کا ایک حصہ پیسوں کے عوض ڈونیٹ کر رہا تھا اور انتظار کی خوشی نہ چھپ رہی تھی۔

''مسکراؤ میرے بیٹے۔ اللہ نے پریشانی دی تو اس کو رفع بھی کر رہا ہے۔ آج کا دن میری زندگی کے بہترین دنوں میں سے ہے۔'' انتظار خوشی سے مسکرائے جا رہے تھے۔

''لو تم خود اپنے دوستوں کو بتاؤ۔ بخت کو، جویریہ کو۔ او ہو سوری! جویریہ تو تمہاری دوست نہیں وہ تو کچھ اور ہے۔'' انتظار فون ارسل کی طرف بڑھا رہے تھے۔

ارسل مسکرایا اور نہ اس نے فون تھاما۔

''ابو! آپ کو پتا ہے مجھے یرقان کا مرض کہاں سے لگا؟'' ارسل کہہ رہا تھا۔

''کہاں سے؟'' انتظار کو ارسل کے تاثرات عجیب سے لگ رہے تھے۔

ارسل نے بتانے کے لیے منہ کھولا مگر پھر رک گیا۔

''تمہیں کونسی بکری سب سے اچھی لگتی ہے؟''

''مجھے وہ کالی بکری...... لاڈو''

''گلی ڈنڈا ارشد درکھان سے بنوایا تھا۔ دیکھو گلی کیسی نوکیلی ہے۔ یہ ڈنڈا مارو تو ہوا میں یہ اڑتی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔'' بچپن کی یادیں ذہن پر دستک دینے لگیں اور وہ چاہ کر بھی بخت کا نام نہ لے سکا۔

''پتا نہیں کیسے یہ مرض لگ گیا۔'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ دھیما تھا۔

''بس اللہ کا شکر ادا کرو کہ جگر مل رہا ہے اور مرض رخصت ہونا چاہتا ہے۔ بخت کو تو تم نے امتحان دینے کے لیے بہاولپور روانہ کر دیا۔ لو اسے فون پر یہ خوشخبری تو دو۔ یہاں ہوتے ہوئے کتنا پریشان تھا۔ وہاں جانے کیسا ہوگا۔ میں تم سے معذرت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ بخت سے بھی کروں گا۔ ایک رات میں اس پر غصے بھی ہوا تھا۔ اسے مارا بھی اور احسان فراموشی کا طعنہ بھی دیا۔ بہت برا کیا، اب پچھتاتا ہوں۔ کتنا اچھا لڑکا ہے اور میں کتنا سنگدل بن گیا تھا۔ اپنے دوست سے میری سفارش کرنا کہ میری معذرت قبول کرلے۔'' بخت بھی اب انتظار کو اچھا لگنے لگا تھا۔

ارسل چپ چاپ باپ کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

اعضا کے انتقال کی سرجری' ٹرانسپلانٹ سرجری دنیا کی مشکل ترین اور پیچیدہ ترین سرجری سمجھی جاتی ہے۔ مشکل اور طویل......

صبح دس بجے آپریشن شروع ہوا تھا اور شام پانچ بجے اختتام پذیر ہوا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر بنی بینچ پر بیٹھے انتظار۔ تھیٹر کے اوپر لگے سرخ بلب کو جلتا دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔ آنکھیں پتھرانے لگیں۔ دل میں آتا کہ جائیں اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں۔ گڑگڑا کر اللہ سے اپنے بیٹے کی صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگیں مگر اس بینچ سے ہل نہ پاتے۔ کہیں ڈاکٹر باہر نہ آجائیں اور وہ وہاں موجود نہ ہوں۔

جو دعائیں انہیں آتی تھیں سبھی مانگ لیں۔ اپنے کیے گئے سب نیک کاموں کا واسطہ بھی دیا لیکن پھر ذہن میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اللہ رحیم ہے۔ کریم ہے۔ ان کی نیکیوں کی کیا اوقات۔ انہیں رحم اور کرم مانگنا چاہیے اور وہ رحم مانگتے رہے، کرم مانگتے رہے۔ ڈونر کے لواحقین سے انہیں جائے نماز میسر آگئی۔ وہ وہیں بچھا کر دعائیں مانگتے رہے۔ سجدہ ریز ہوتے رہے۔ روتے رہے۔ گڑگڑاتے رہے۔

رحم' رحم۔ کرم' کرم۔ وقت کی سوئیاں سرکتی رہیں اور وہ صبر سے خود کو سنبھالے دعا گو رہے۔ کلیجا تھا کہ یوں لگتا پگھل جائے گا مگر انہوں نے ہمت سے کام لیا اور خود کو سنبھالے رکھا۔

پانچ بجے کے قریب آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹروں اور معاون عملے کو دیکھنا نصیب ہوا۔

''مبارک ہو مسٹر انتظار۔'' لیڈ کرنے والا ٹرانسپلانٹ سرجن ملک انتظار کو مبارکباد دیتا، کندھا تھپتھپاتا چلا گیا۔ تھکاوٹ سرجن کے چہرے سے عیاں تھی مگر ایک اطمینان بھی جھلکتا تھا کہ اس کی محنت رائگاں نہیں گئی۔

انتظار کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور وہ اسی وقت ایک بار پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔''

...کہ خدا کا شکر لازم و ملزوم ہے۔

☆☆☆

آسمان پر کالے سیاہ گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم برسنے کو تیار ہیں۔ بادلوں کی گرج جہاں دل کو دہلاتی تھی، وہاں یہ خوشخبری بھی لاتی تھی کہ بارش ہونی چاہتی ہے۔

پیپر اختتام کو پہنچا۔ طلبا پرچے سے فارغ ہو کر پرچے میں آنے والے سوالات اور ان کے جوابات زیر بحث لانے لگے۔ امتحان گاہ کے باہر لان میں ایک شور سا برپا ہو گیا تھا۔ وہ شور جس میں لگن تھی' جذبہ تھا' کچھ کرنے کی لگن تھی اور پرچے ختم ہونے کی سرشاری بھی۔

بجھے دل والا بخت اس شور سے الگ دور ایک بینچ پر آن بیٹھا۔ امتحان ختم ہوئے۔ اس کے تمام پرچے مناسب ہوئے۔ مگر اسے دوسری فکر لاحق تھی۔ اس نے کیا کر دیا تھا اور اس کا نتیجہ اس کے بھائی جیسے دوست کو کیا بھگتنا پڑا تھا۔

وہ خون کی الٹیاں۔ وہ نڈھال ارسل اور وہ مختلف ادویات کے ٹیکے لگاتی نرسیں اور وہ ہدایت دیتے ڈاکٹر۔ تمام مناظر ایک بار پھر سے تازہ ہو گئے اور اس نے آنکھیں میچ لیں۔

وہ ملک انتظار سے مسلسل رابطے میں تھا۔ ان کے طفیل انہیں ارسل کی کامیاب سرجری کی اطلاع مل چکی تھی اور اس پر بھی وہ سجدۂ شکر بجا لایا کہ اس کے قبیح فعل نے کم از کم ارسل کو جان سے مار ہی نہ ڈالا تھا۔ ورنہ اس نے تو کوئی

کسر نہ چھوڑی تھی اور انتظار سے گفتگو سے ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ ارسل نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ بھی ارسل کا ایک احسان تھا۔ ورنہ وہ احسان کے قابل کہاں تھا۔

تبھی کوئی اس سنگی بنچ پر اس کے ساتھ آکر بیٹھا۔ وہ جویریہ تھی۔ ارسل کی پسند' محبت اور متوقع منگیتر۔

''پیپر ٹھیک ہوگیا؟'' جویریہ نے پوچھا تھا۔

''ہوں۔'' یوں بھی پرچے ثانوی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ جب کوئی پیارا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہو تو ایسے پرچے اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔

''مبارک ہو۔ تمہارے دوست کو نئی زندگی ملی ہے۔'' ارسل جویریہ کو دیکھنے لگا۔

وہ خوش نصیب لڑکی تھی جس کا جیون ساتھی ارسل جیسا لڑکا تھا۔ پیارا، بانکا سجیلا دل والا۔

اور وہ خود کالے کرتوت والا۔

''خیر مبارک۔ اللہ اسے لمبی زندگی دے۔ میری عمر بھی اسے لگادے۔''

بخت سے وہاں بیٹھا نہ گیا اور جویریہ جو اپنے ارسل کے دوست سے ارسل کی کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی' نہ کرپائی۔

کالج سے ہاسٹل دور نہ تھا مگر بخت یونہی دوسری سمت چلا گیا اور سڑک کنارے چلتا رہا۔ چوراہے پر پہنچ کر رک گیا۔ ہر طرف زندگی رواں دواں تھی اور وہ یاسیت بھری نگاہوں سے زندگی کو دوڑتے دیکھتا رہا۔ تبھی ایک کوسٹر پاس سے گزری اور اس کے دل میں آیا کہ نیچے آکر جان دے دے۔

مگر جان دینا اتنا آسان نہ تھا۔ آسمان پر چھائے کالے گھنگھور بادل ایک بار پھر گرجے اور بارش ہونے لگی۔ ٹپ ٹپ ہوتی بارش موسلا دھار ہوتی گئی اور چوراہے پر کھڑا بخت اس بارش میں بھیگتا رہا۔

☆☆☆

سرجری کے بعد دو تین دن تک ارسل درد سے کراہتا رہا اور بار بار غشی کی حالت میں چلا جاتا۔ چوتھے دن وہ کچھ بہتر محسوس کرنے لگا۔ ساتویں دن درد کی نوعیت معمولی تھی اور اس دن وہ بغیر سہارے کے لان تک بھی آیا۔

اسپتال کا لان تھا۔ پریشان چہروں کی کثرت تھی۔ ارسل آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو کھوجتا رہا۔

''کیا کوئی اور بھی ایسا مریض ہوگا جسے اس کے دوست یا رشتے دار نے بیمار کیا ہو۔''

وہ سوچتا رہا۔ یہ سوچ دل و دماغ پر حاوی ہوتی گئی۔

''بخت! ایسا کیوں کیا تم نے؟'' ارسل کے دل میں بخت کے لیے بہت غصہ تھا' نفرت تھی۔ ایک دو بار تو اس نے ارادہ کیا کہ انتظار کو بتانے کہ بخت نے کیا کیا ہے مگر اپنے آپ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ انتظار تو اسے جان سے مار ڈالتے اور وہ کسی قسم کے لڑائی جھگڑے کا متمنی نہیں تھا۔

یوں بیٹھے آتے جاتے لوگوں کے چہرے دیکھتے اسے خیال آیا۔

''شان......'' اور اس نے ساتھ بیٹھے انتظار کو مخاطب کیا۔

''ابو! شان کیسا ہے؟''

انتظار نے ہاتھ میں پکڑا اخبار لپیٹ کر رکھ دیا۔

''بہتر ہے۔ چل پھر لیتا ہے۔''

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ارسل نے فرمائش کی۔

''کیا کرو گے اس سے مل کر؟'' انتظار تذبذب کا شکار ہوگئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ارسل شان سے ملے مگر روکنے کا کوئی جواز بھی نہ تھا۔

''ابو! اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ وہ زندگی جو مجھ سے کسی نے چھیننی چاہی۔ اب اس آدمی سے نہ ملوں جس نے مجھے نئی زندگی دی۔'' انتظار نے لفظوں پر غور نہ کیا ورنہ ضرور پوچھتے۔ وہ طویل سانس بھر کر رہ گئے اور فون پر نمبر ملانے لگے۔

''کیسا ہے شان؟ جاگ رہا ہے اس وقت۔ میرا بیٹا ارسل اس سے ملنا چاہتا ہے اور شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ کیا ہم آپ کے کمرے میں آجائیں؟'' انتظار پوچھنے لگے اور فون بند کرکے ارسل سے کہا۔

''آؤ شہزادے! مل آتے ہیں۔ تمہارے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر اس کا کمرا ہے۔''

''سرجری سے پہلے بھی سوچتا رہا کہ اس سے ملوں۔ آپ سے کہا بھی مگر آپ نے اَن سنی کردی۔ اس نے ایسا احسان کیا ہے جو میں کسی طور نہیں اتار سکتا۔'' ارسل چھوٹے چھوٹے قدموں سے خود چلتا رہا۔ انتظار اس کا ہاتھ تھامے اسے سہارا دیتے رہے۔

شان کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئے۔ اندر بیڈ پر ایک ذی روح تھا۔ جو یقیناً شان تھا۔ دو لوگ کاؤچ پر بیٹھے تھے اور یقیناً اس کے لواحقین تھے۔ ارسل ان کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور اس نے پلٹ کر باپ کو دیکھا۔

دل کی رفتار میں بھی اضافہ ہوا۔ تو یہ وجہ تھی کہ انتظار پس وپیش سے کام لے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ارسل نہ ملے۔

کمرے میں کوئی مرد نہ تھا۔ چہروں پر شیو کے نشان تھے...مگر ہونٹ لپ اسٹک سے رنگے ہوئے تھے اور کپڑے بھی خواتین والے تھے۔

''شان!'' ارسل بیڈ کے پاس آیا اور مسکرا کر اس بے جنس انسان کو دیکھا جو اسے زندگی دینے کا وسیلہ بنا تھا۔

''کیسے ہو صاحب؟'' اس کی آواز میں بھی نسوانی آمیزش تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ میری وجہ سے تم اتنے دن تکلیف میں مبتلا رہے۔ چیر پھاڑ اور بے انتہا درد بھی... برداشت کیا۔'' ارسل کا ہاتھ قمیص پر پیٹ کے دائیں طرف رک گیا جہاں سرجری کا زخم تھا۔ جہاں پٹی بندھی تھی۔

شان سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سمجھ نہ آیا کیا کہے۔ اس سب کے تو وہ پیسے لے چکا تھا۔ اتنے پیسے جو گنے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ان پیسوں نے اس کی اور اس کے لواحقین کی زندگی سنوارنی تھی۔

''شرمندہ مت کرو صاحب۔'' شان کی آواز دھیمی تھی۔

''نہ نہ۔ تم کس لیے شرمندہ ہو۔ شرمندہ تو میں ہوں۔'' ارسل کو سمجھ نہ آیا مزید کیا بات کرے۔ اسی لیے تو پلٹ آیا۔

دروازے کو پار کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور دو آنسو آنکھوں سے چھلک پڑے۔

''معاشرے کا بوجھ یہ نہ ہو تو کیا فرق پڑے گا۔'' لوگ ایسے کہتے ہیں اور معززین زمانہ کی رائے ان لوگوں کے متعلق ہمیشہ ایسی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بلاوجہ نہیں بنائی۔

اگر شان نہ ہوتا تو نوجوان ارسل کو جگر کا ٹکڑا کون ڈونیٹ کرتا؟

☆☆☆

ارسل کو اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا۔ چنانچہ ابھی روزانہ ڈاکٹر کے پاس فالو اپ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے انتظار اسے بہاولپور لے جانے کے بجائے وہیں کرائے کے فلیٹ میں لے گئے۔

اور یہ فلیٹ پر دوسرا دن تھا جب مہمانوں کی آمد ہوئی۔ سردار حسین اپنی زوجہ کے ساتھ۔ ڈاکٹر عامر اپنی بیٹی کے ساتھ۔

انتظار مہمانوں سے خیر سگالی مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ اب بیٹے کی خواہش ڈاکٹر عامر کا داماد بننے کی تھی تو سردار حسین کو مناسب الفاظ میں منع تو کرنا تھا اور ملتے ملتے مناسب بہانہ مل گیا۔

''ملک صاحب! ارسل ماشاء اللہ ہمارا بچہ ہے مگر ہماری عندلیب نا سمجھ ہے، وہ کیسے ارسل کا خیال رکھ پائے گی۔'' جگر تبدیل ہونا کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا اور انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ انتقالِ اعضا والے مریض اکثر بیمار رہتے ہیں اور ساری زندگی ادویات کھانی پڑتی ہیں۔

انتظار سردار حسین کو دیکھنے لگے۔ ارسل کی بیماری نے غالباً انہیں رشتے کے لیے ہچکچاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

''سردار صاحب بجا فرماتے ہیں تو کیوں نہ آپ بخت کے لیے سوچیں۔ میرے ارسل کا دوست ہے۔ میرے پاس ہی پلا بڑھا ہے۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔ آپ کی بیٹی کو خوش رکھے گا اور آپ کی بیٹی کو اپنے آنگن میں بیٹی کی طرح کام کرتے دیکھنے کی خواہش بھی پوری ہو گی۔''

سردار حسین نے گہری نظروں سے زوجہ کو دیکھا۔ کوئی جواب تو نہ دیا مگر گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور کچھ دیر بعد ڈاکٹر عامر اور جویریہ بھی تشریف لے آئے اور ارسل جو سردار حسین اور ان کی زوجہ کو سلام کر کے اندر کمرے میں گم ہو گیا تھا، اب مہمانوں کے سامنے چپک کر بیٹھا تھا۔

دونوں کے باپ سامنے بیٹھے تھے مگر وہ لڑکا اور لڑکی دھیمی آواز میں انہیں فراموش کر کے اپنی باتوں میں گم تھے۔ ڈاکٹر عامر طویل سانس بھر کر رہ گئے۔ انہیں اس رشتے کے لیے کئی قسم کے تحفظات تھے۔ اپنے پروفیشنل کیریئر میں انہوں نے کئی ٹرانسپلانٹ کے مریض دیکھے تھے۔ کچھ مریض ایسے تھے جو ٹرانسپلانٹ کے پچاس سال بعد بھی نارمل بڑھاپا گزار رہے تھے اور کچھ ایسے بھی جو سال چھ مہینے میں ہی منتقل عضو کے متعلق یا دیگر بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے اور وہ اپنی بیٹی کیسے اس شخص کے حوالے کر سکتے تھے۔ مگر بیٹی کو سمجھانا بھی بے حد مشکل تھا۔ گو کہ ان کے پاس ویٹو پاور تھی۔ سختی سے بیٹی کو منع کر سکتے تھے مگر یہ سب ساری زندگی ان کا وتیرہ نہ رہا تھا تو اب کس طرح کرتے۔ چنانچہ صبر و شکر سے بیٹی کے اچھے مستقبل کی دعائیں مانگنے لگے۔ یوں بھی جویریہ اب چھوٹی بچی نہ تھی۔ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اب اچھا برا سمجھ سکتی تھی اور اس نے یہ فیصلہ یقیناً سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔

سردار حسین نے جانے کی اجازت مانگی۔ انتظار نے

انہیں روکا کہ اتنی دور سے آئے ہیں، آپ کل یا پرسوں آرام سے چلے جایئے گا۔

''ملک صاحب! شہر سبزہ زار میں کچھ رشتے دار رہتے ہیں، ان سے ملیں گے۔'' میاں بیوی رخصت ہوئے اور ماحول میں تھوڑی اور بے تکلفی چھانے لگی۔

''بیٹا۔ ادھر میرے پاس آکر بیٹھو۔'' انتظار نے جویریہ کو پاس بلایا۔

جویریہ اپنی جگہ سے اٹھی اور انتظار کے ساتھ والے صوفے پر ٹک گئی۔ ارسل چہرے پر مسکراہٹ سجائے شوق سے جویریہ کو دیکھنے لگا۔ آج بھی اس نے بالوں کو موباف میں لپیٹا ہوا تھا اور ارسل کی نگاہیں موباف میں لپٹے بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

''کتنی پیاری بیٹی ہے۔'' انتظار نے مسکراتے ہوئے جویریہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شرماتے ہوئے اپنا دوپٹا سیدھا کرنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے اور اپنی بیٹی کی پسندیدگی سے تو آپ واقف ہو ہی چکے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں جب ہم بہاولپور آئیں تو ایک تقریب میں یہ بچے انگوٹھیوں کا تبادلہ بھی کرلیں تاکہ باقاعدہ ایک دوسرے سے منسوب ہوجائیں۔'' انتظار ڈاکٹر عامر سے پوچھ رہے تھے۔

ارسل شوق سے جویریہ کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی شرم سے سرخ ہوتی رہی۔ یہ بات اگر ان کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھ کر کی جاتی تو وہ شرم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ یہاں تو وہ مہمان تھی۔ اس انجمن سے اٹھ کر بھی نہیں جاسکتی تھی۔

☆☆☆

یہ سیکنڈ ایئر کی کلاس کا پہلا دن تھا۔ چونکہ فرسٹ ایئر کا رزلٹ ابھی چند دنوں بعد آنا تھا، اسی لیے طلبا نے زیادہ دلچسپی سے کلاسیں اٹینڈ نہ کیں۔ کلاس کے بعد بخت یونہی بیزار سا باہر نکلا تو اسے جویریہ نظر آئی اور وہ اس کے قریب چلا آیا۔

''کیسا ہے ارسل؟'' جویریہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ ''کیا تم دوستوں میں کوئی لڑائی ہوئی ہے؟''

بخت چپ رہ گیا۔ کیا بتاتا۔

''ہوتی رہتی ہیں۔ لڑائیاں نہ ہوں تو زندگی کا پتا کیسے چلے مگر صلح کرلینی چاہیے۔ یوں بھی ارسل جس مشکل سے ہو کر آیا ہے اسے سہاروں کی ضرورت ہے اور دوست سے اچھا سہارا بھلا کون ہوسکتا ہے۔'' جویریہ کہتی رہی اور بخت سر جھکائے کھڑا رہا۔ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی کی وجہ سے تو ارسل اس موذی مرض میں لاحق ہوگیا تھا، وراب وہ کیسے اس کا سہارا بن سکتا تھا۔

کالج سے ہاسٹل آتے ہوئے اس نے اپنا وہ کالا بھدا سستا موبائل نکالا جو اس نے چند سو کا خریدا تھا۔ ارسل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ حسبِ معمول ارسل نے اس کا فون سننا گوارا نہ کیا۔

کیسی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے دوست کی تیمارداری بھی نہ کرسکتا تھا۔ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ ہاسٹل آیا۔ ہاسٹل کے کمرے کے باہر ہی قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر رکا اور پھر کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کئی اجنبی چہرے تھے۔ سلام کرنے کے بعد اس نے کتابیں رکھیں اور پلٹنے لگا کہ عمر نے اسے آواز دی۔

''بلند بخت! تم سے بات کرنی تھی۔'' عمر وہ لڑکا تھا جس نے اسے چند دنوں کے لیے اپنے کمرے میں ٹھہرایا تھا اور یہ چند دن اب مہینوں پر محیط ہوچکے تھے۔

وہ بخت کا ہاتھ پکڑ کر باہر لایا۔

''یار! جہلم سے میرے کچھ کزنز آئے ہیں۔ کچھ دن یہیں ٹھہریں گے، تم کوئی انتظام کرلو۔ ناراض مت ہونا۔'' عمر اس کا کندھا تھپکتا دوبارہ کمرے میں چلا گیا اور بخت بوجھل قدموں سے کوریڈور پار کرنے لگا۔

پیسے بھی ختم ہونے والے تھے اور اب رہنے کے لیے ٹھکانا بھی نہ رہا تھا۔ کیا وقت آیا تھا۔ بے بسی کے آنسو آنکھوں میں چمکنے لگے۔ جانے تعلیم جاری رکھنا اس کے نصیب میں تھا بھی کہ نہیں۔

اسی شام وہ ایک بیگ لیے بس اسٹینڈ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا اور عشا کی اذان کے وقت تانگے میں بیٹھا نہر بہشت کے پل کو پار کررہا تھا اور تانگے بان کہے جارہا تھا۔

''میری دادی کہتی تھی کہ اس کی دادی نے بھی اس نہر کو سوکھا نہ دیکھا۔ جس نہر کو نسلوں نے سوکھا نہ دیکھا، ہماری کم قسمتی آج ہم اسے سوکھا دیکھ رہے ہیں۔''

☆☆☆

بہاولپور آنے کے ایک ہفتے بعد منگنی کی تقریب رکھی گئی۔ ارسل صحت کی طرف مائل تھا۔ پڑھائی کا سال تو ضائع ہوگیا تھا مگر خیر...... اللہ زندگی دے، پڑھائی تو ہو ہی جاتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور انتظار اندر آئے۔

ارسل شرمندہ ہونے لگا۔

''ابو! مجھے بلا لیتے۔'' اب انتظار ارسل کو اپنے کمرے میں بلانے کے بجائے اس کے کمرے میں چلے آتے۔

''کوئی بات نہیں، تم آؤ یا میں آؤں کیا فرق پڑتا ہے... ویسے... ماشاء اللہ تمہارے چہرے پر سرخی آنے لگی ہے۔ ورنہ پیلا چہرہ دیکھ کر تو میرا دل ہولتا تھا۔'' انتظار خوش تھے کہ ان کا بیٹا ان کے ساتھ ہے۔

''تمہارا دوست بخت......'' انتظار لمحے بھر کو رکے۔

''شاید تم دوست بھی خفا ہو مگر اس خفگی کو طول کیوں دے رہے ہو۔'' انتظار ناواقف تھے اس لیے یہ کہہ رہے تھے۔ لمحے بھر کو ارسل کے ذہن میں آیا اگر وہ بھی ناواقف ہوتا تو کیا ہوتا۔ بخت اسے نہ بتاتا تو اسے کونسا فرشتوں نے آکر آگاہ کرنا تھا۔ یہ بھی تو اس کی شرمندگی کی علامت تھی مگر جو وہ کر گزرا تھا، ارسل کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑی تھی۔ جان بھی جا سکتی تھی۔ تو کیا یہ قابلِ معافی فعل تھا۔ اسے معاف کر دینا چاہیے؟

''خفگی ختم کرو بیٹے۔ اسے بلاؤ۔ وہاں کیسے اپنا حساب کتاب چلا رہا ہوگا۔ پیسوں کا انتظام نہ ہوگا۔ میں نے کچھ پیسے بھیجنے بھی چاہے مگر اس نے نہ لیے اور میں شرمندہ ہوں۔ اس سے تلخ باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں اور مارنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ میری سفارش کرو، اسے لے آؤ۔''

اور ارسل سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کسی کو بتا کیوں نہیں رہا کہ بخت نے اس کے ساتھ کیا ستم کیا۔ کیا وہ اپنے دوست کی پردہ پوشی کر رہا تھا؟ کیا واقعی وہ اب بھی اس کے لیے دوست تھا؟

''ابو! بڑی خفگی ہے۔ سوچتے ہیں مگر منگنی کے بعد۔''

''منگنی میں نہیں بلاؤ گے اپنے دوست کو؟ ایک زمانہ تھا تم اس کے بغیر ایک نوالہ کھانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور اب اسے منگنی میں نہیں بلاؤ گے؟''

انتظار حیران تھے۔

''ابو! زمانے گزرنے اور بدلنے میں کہاں دیر لگتی ہے۔ ابھی نہیں۔'' ارسل کا لہجہ اٹل تھا۔

☆☆☆

منگنی کا جوڑا گلابی رنگ کا تھا۔ ہلکا گلابی اور تیز گلابی کا امتزاج۔ کلیوں والی فراک۔ جویریہ تو جیسے پری لگ رہی تھی۔ قیمتی پتھروں کا سیٹ۔ ایسے لگتا تھا یہ پتھر جویریہ کی خوبصورتی کو نہیں بلکہ جویریہ ان کی خوبصورتی بڑھا رہی تھی۔

سیاہ ڈنر سوٹ کے ساتھ گلابی ٹائی لگائے، ٹائی گلابی اس لیے کہ جویریہ کے سوٹ کے ساتھ میچ ہو، ارسل شہزادہ ہی لگ رہا تھا اور وہ دونوں جیسے پرفیکٹ کپل۔

''دیکھیے ڈاکٹر صاحب! برسوں پرانی شناسائی نے آئندہ زندگی کی کیسی بنیاد رکھی۔ آج ہم رشتے دار بننے جا رہے ہیں۔'' اسٹیج کے سامنے والی کرسی پر انتظار اور ڈاکٹر عامر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

''بجا فرمایا۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈاکٹر عامر مسکرا دیے اور اسٹیج پر بیٹھا ارسل جویریہ کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

''تم نے آج بالوں کو موباف میں کیوں نہیں لپیٹا؟''

''اف ارسل! آج کی تیاری خاص تیاری ہے۔ موباف کیجول ڈریس کا حصہ ہے۔'' جویریہ نے قدرے منہ بنایا تھا۔

''تمہیں معلوم بھی ہے کہ مجھے تمہارے موباف میں لپٹے بال کتنے اچھے لگتے ہیں مگر پھر بھی تم نے میری پسند کو اہمیت نہیں دی۔ مجھ سے بات مت کرنا۔'' ارسل روٹھنے لگا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ ساری زندگی پینڈو کے پینڈو ہی رہنا۔'' وہ بھی جویریہ تھی۔ حساب اسی وقت برابر کیا۔

''پینڈو۔'' ارسل قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''اور تم پینڈو کی بیوی۔''

''بیوی نہیں منگیتر وہ بھی متوقع منگیتر۔'' جویریہ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔ ارسل ہنستا ہی چلا گیا۔

''میں انگوٹھی نہیں پہنوں گی، کوئی اور لڑکی دیکھو۔''

''کونسی کیا وہ سبز سوٹ والی ٹھیک ہے۔ قصہ تو سن لیا ہوگا تم نے۔ ایک زمانے میں میں نے اس سے شادی کی فرمائش بھی کی تھی۔'' چہرے سے مسکراہٹ جدا نہ ہوتی تھی اور وہ سامنے بیٹھی عندلیب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''ہائے، مجھے نہ پتا تھا تم اتنے دل پھینک ہو۔ جاؤ اسی کو انگوٹھی پہنا دو۔''

ارسل کے منہ سے ایک بار پھر ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ جویریہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور سامنے بیٹھے انتظار بیٹے کو یوں ہنستے دیکھ کر نہال ہوتے رہے۔

''اچھا سنو۔''

''میں نے کچھ نہیں سننا۔'' جویریہ نے منہ دوسری طرف ہی رکھا۔

''تمہارے لیے' ہاں صرف تمہارے لیے یہ دل دھڑکتا ہے۔'' ارسل گنگنا کر کہہ رہا تھا۔

اور گلابی لباس میں ملبوس جویریہ کی رنگت میں بھی گلابی پن جھلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

انگریزی کیکر کا وہ درخت اب بوڑھا اور سال خوردہ ہو چکا تھا۔ ایک زمانہ اس نے مثلِ بہشت کے لوگوں کو جب وہ نہر کے کنارے ستاتے یا تفریح کے لیے آتے، سایہ مہیا کیا تھا۔ آج بھی بخت اسی درخت کے سائے کے نیچے بیٹھا تھا۔ نہر بہشت میں پانی رواں تھا۔ بارشوں کے بعد سوکھی پڑی نہر میں پانی آگیا تھا اور مثلِ بہشت کے مکین بے انتہا خوش تھے۔ وہ اس پانی کو اپنی خوش قسمتی سے جوتعبیر کرتے تھے۔

انگریزی کیکر کے سائے میں بیٹھا بخت پانی کی روانی کو دیکھے جاتا اور دیکھے جاتا۔ کبھی کبھار پاس پڑا کنکر بھی لہر میں اچھال دیتا۔ نہر کے پانی میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ ایک دائرہ سا بنتا جو پھیلتے پھیلتے غائب ہو جاتا۔

تبھی پیچھے گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر کسی کے چلنے کی۔ وہ متوجہ نہ ہوا۔ متوجہ ہو کر اب اس نے کیا کرنا تھا۔ تبھی کوئی اس کے پاس آن بیٹھا۔ بیزاری سے اس نے اپنے پہلو میں دیکھا اور چونک اٹھا۔

آنے والا کوئی اور نہیں ارسل تھا۔

بخت چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ پایا۔ سر جھکائے بیٹھا انگلی سے مٹی کریدتا رہا اور زمین پر بے ڈھب لکیریں بناتا رہا۔

''میں نے تو سنا تھا نہر سوکھ گئی اور مثلِ بہشت کے لوگ دودھ ملے شہد سے ذائقے والے پانی سے محروم ہو گئے ہیں مگر نہر تو رواں دواں ہے۔''

بخت اسے نہر کے سوکھنے' چند مہینے سوکھا رہنے اور اب رواں ہونے کی تفصیل بتانا چاہتا تھا مگر وہ کیسے بتا سکتا تھا۔ گناہ گاروں کی کہاں ایسی حالت ہوتی ہے کہ وہ کچھ بتا سکیں۔

''دل چاہتا ہے کہ تمہیں اس نہر میں دھکا دے دوں مگر پھر سوچتا ہوں تمہارا کیا بگڑے گا۔ کیا پتا اس نہر میں تیرتے ڈوبتے تم بہشت ہی پہنچ جاؤ۔''

ارسل جب سے آیا تھا، نگاہیں نہر کے پانی پر جمائے بیٹھا تھا۔ اب اس نے پہلی بار بخت کی طرف دیکھا۔ سر جھکائے بیٹھے بخت نے بھی ارسل کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر لیا۔ اس لیے تو اس کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا اور مٹی کریدتی انگلی ساکن ہو گئی تھی۔

''کیا بات ہے، میری طرف دیکھ بھی نہیں سکتے؟ اتنی ہمت بھی نہیں پاتے؟ تب کہاں سے ہمت آئی تھی جب مجھے جراثیم سے آلودہ کیا تھا؟'' بخت نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ سرخ ڈبڈبائی آنکھیں ارسل کے چہرے پر مرکوز کیں۔ آنکھوں سے آنسو بہنے میں وقت نہ لگا۔ بخت روتا رہا اور ارسل اسے روتے دیکھتا رہا۔

''روتے رہو۔ رونا بہتر ہے۔ تم روؤ گے نہیں تو میں تمہیں معاف کیسے کر پاؤں گا۔'' بخت کے رونے میں شدت آگئی اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا۔ نارنجی کیپ لگی سرنج تھی۔ انسولین سرنج۔

''یہ لو ارسل۔ بدلا اتار لو۔ یہ سرنج مجھے چبھو دو یا مجھے اس نہر میں دھکا دے دو لیکن پلیز مجھے معاف کر دو۔''

... ارسل ساکن نگاہوں سے بخت کے ہاتھ میں دبی سرنج کو دیکھنے لگا۔

''تم نہیں کر سکتے تو میں خود......'' بخت نے سرنج کی کیپ اتاری اور اس سے قبل کہ وہ اسے اپنے جسم پر کہیں چبھوتا، ارسل سرنج پر جھپٹ پڑا اور سرنج بخت کے ہاتھوں سے لے لی اور ایک تھپڑ بخت کے گال پر دے مارا۔

''بے وقوف!''

تھپڑ کھانے کے بعد بھی بخت روتا رہا۔

''میں برا ہوں ارسل۔ تم نے مجھ پر کتنے احسان کیے۔ میری زندگی بدل گئی اور میں ملک صاحب کے ایک رات کے سخت الفاظ اور زدوکوب پر سب بھلا بیٹھا اور تمہیں یرقان کا مریض بنا بیٹھا۔ ایسے احسان فراموش کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ میں حاسد اور فاسق ہوں۔ حاسد اور فاسق کو اس دنیا میں ہی اس کے کیے کی سزا مل جائے تو اچھا ہے۔ آخرت کا عذاب تو کم ہو۔'' بخت روتا جاتا اور کہے جاتا۔ ارسل اس کو دیکھے جاتا۔

کیا اب اس کے پاس کوئی جواز رہ گیا تھا کہ وہ بخت کو معاف نہ کرتا۔

اک عہدِ بہار ہے
آج کر لیتے ہیں
کل کو سنوارتے ہیں
زندگی گزارتے ہیں